علامہ اقبالؒ

اور

فتنۂ قادیانیت

تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر علامہ محمد اقبالؒ کے معرکہ آرا مضامین،
توضیحات، خطبات، مکاتیب اور شاعری کا مربوط و مبسوط مجموعہ

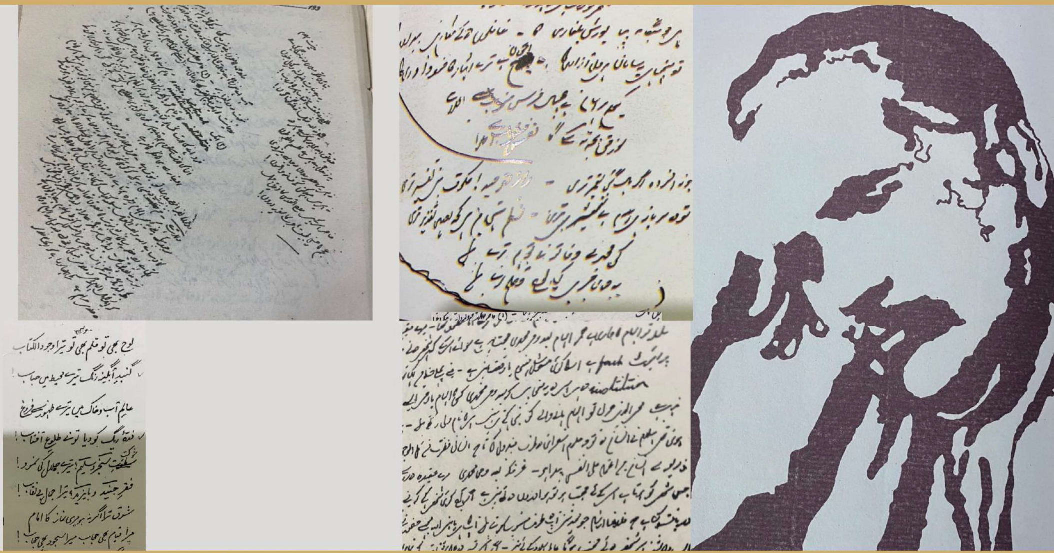

ترتیب و تحقیق

محمد متین خالد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ اقبالؒ
اور
فتنۂ قادیانیت

”ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے۔ اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)۔ مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں، جتنے سکھ، ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگر چہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے۔“

(علامہ محمد اقبالؒ کا خط اسٹیٹسمین (دہلی) کے نام)

”ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔“

(قادیانی ہفت روزہ ”سن رائز“ (Sun Rise) کے جواب میں)

علامہ اقبالؒ

اور

فتنۂ قادیانیت

تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر علامہ محمد اقبالؒ کے معرکہ آرا مضامین،
توضیحات، خطبات، مکاتیب اور شاعری کا مربوط و مبسوط مجموعہ

محمد متین خالد

ILM-O-IRFAN PUBLISHERS

Al-Hamd Market 40-Urdu Bazar Lahore.
37223584‘37232336‘37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers1@gmail.com
www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

95-Y Block Commercial, Basement
Phase-3 DHA Lahore
0333-4067757 | 0333-4359445
7thskybooks@gmail.com
7thskybooks

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت
مصنف	محمد متین خالد
ناشر	ILM-O-IRFAN PUBLISHERS
مطبع	آر۔آر پرنٹرز، لاہور
قانونی مشیر	محمد نوید شاہین ایڈووکیٹ ہائی کورٹ
سرورق	محمد طیب محبوب
کمپوزنگ	طاہر علی، ظفر اقبال
سنِ اشاعت	2023ء
قیمت	-/2000 روپے

ILM-O-IRFAN PUBLISHERS

Al-Hamd Market 40-Urdu Bazar Lahore.
37223584‘37232336‘37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers1@gmail.com
www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

95-Y Block Commercial, Basement Phase-3 DHA Lahore
0333-4067757 | 0333-4359445
7thskybooks@gmail.com
7thskybooks

حسن انتخاب

✡ انتساب		13
✡ اقبال اور قادیانیت	محمد سہیل عمر	15
✡ بانگِ درا	حافظ شفیق الرحمٰن	17
✡ دل کی بات	محمد متین خالد	20
✡ شکریہ		25
✡ چند ضروری گزارشات		27

''نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر''

❑ اقبالؒ کی اسلام سے والہانہ عقیدت	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	33
❑ علامہ محمد اقبالؒ اور عشقِ رسول ﷺ	محمد تحسین	37
❑ جن کا سرمایۂ ہستی تھا فقط عشقِ رسول ﷺ	صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی	55
❑ علامہ محمد اقبالؒ اور غازی علم الدین شہیدؒ	محمد متین خالد	60
❑ اقبال اور قانون توہین رسالت ﷺ	ظفر علی راجا	89
❑ حدیث رسول ﷺ اور شعر اقبال	پروفیسر عبدالحق (دہلی)	101

عقیدۂ ختمِ نبوت

❑ فلسفۂ ختم نبوت	علامہ محمد اقبالؒ	115

❑ علامہ اقبالؒ اور ختم نبوت	سیّد نذیر نیازی	129
❑ علامہ اقبال اور عقیدہ ختم نبوت	سید عزیز اللہ شاہ ایڈووکیٹ	137
❑ اقبالؒ کا تصورِ ختم نبوت	محمد متین خالد	151

مضامینِ اقبالؒ

❑ اسلام اور احمدیت	علامہ محمد اقبالؒ	199
❑ قادیانی اور جمہور مسلمان	علامہ محمد اقبالؒ	225
❑ ’’سٹیٹسمین‘‘ کے جواب میں	علامہ محمد اقبالؒ	231
❑ رومن حکومت کے تحت یہودی سالمیت	علامہ محمد اقبالؒ	234

توضیحات

❑ ’’لائٹ‘‘ کے جواب میں	239
❑ ’’سن رائز‘‘ کے جواب میں	240
❑ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام	242
❑ دین شا کے جواب میں	242

خطوط

❑ پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط	247
❑ مولانا سیّد سلیمانؒ ندوی کے نام خطوط	249
❑ سیّد محمد الیاسؒ برنی کے نام خطوط	257
❑ سید راس مسعود کے نام خط	261

اقبال، تحریکِ آزادیِ کشمیر اور قادیانیت

کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفا	علامہ محمد اقبالؒ	267
تحریکِ کشمیر کی صدارت کی پیشکش کا استرداد	علامہ محمد اقبالؒ	270
آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید و تشکیل	عبداللہ	272
مسئلہ کشمیر اور قادیانی سازشیں	حافظ عبید الرحمٰن	278

''اقبال دشمنی'' کے جواب میں

خاندانِ اقبالؒ میں قادیانیوں کی واحد نقب اور اس کا ردِ عمل	خالد نظیر صوفی	289
مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کی گل افشانیوں کے جواب میں	خالد نظیر صوفی	311
علامہ اقبالؒ کے برادر بزرگ پر قادیانی بہتان	خالد نظیر صوفی	326
''مظلوم اقبال''	ڈاکٹر وحید عشرت	330
قصہ ایک خط کا	ڈاکٹر وحید عشرت	343

علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت

علامہ اقبالؒ اور قادیانیت	مولانا ظفر علی خاں	363
زندہ رُود	جسٹس (ر) جاوید اقبال	368
اقبالؒ اور قادیانیت	آغا شورش کاشمیریؒ	395
قادیانیت، اقبالؒ کی نظر میں	آغا شورش کاشمیریؒ	428
اقبالی مجرم	آغا شورش کاشمیریؒ	431
علامہ اقبالؒ کے خلاف قادیانی پراپیگنڈہ	محمد عطاء اللہ صدیقی	440

❑ اقبالؒ اور قادیانی	نعیم آسی	467
❑ ضربِ کلیم اور احمدیت	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	494
❑ علامہ اقبالؒ اور ان کے نقاد	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	513
❑ فتنۂ قادیانیت اور پیامِ اقبالؒ	مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ	518
❑ اقبالؒ اور قادیانیت	میر شکیل الرحمٰن	527
❑ اقبالؒ اور قادیانیت: تحقیق کے نئے زاویے	بشیر احمد	538
❑ علامہ اقبالؒ، جواہر لال نہرو اور قادیانیت	پروفیسر رحمت علی ظفر	558
❑ نہرو نے قادیانیت کی حمایت کیوں کی؟	ماسٹر محمد احسان	562
❑ علامہ اقبالؒ کے نظریات، تحریف اور تغیر کی زد میں	ڈاکٹر وحید قریشی	565
❑ اقبالؒ کے خطوط میں تحریف کی تازہ مثال	ڈاکٹر وحید عشرت	568
❑ کیا اقبالؒ احمدی تھے؟	ڈاکٹر وحید عشرت	590
❑ علامہ اقبالؒ کے حضور	حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی	601
❑ علامہ محمد اقبالؒ کی قادیانیت شناسی	نقاش	604
❑ اقبالؒ اور قادیانیت	جعفر بلوچ	608
❑ فکرِ اقبال اور قادیانی تحریک	علیم ناصری	613
❑ شورش، اقبالؒ اور قادیانیت	مولانا مشتاق احمد	617
❑ کیا علامہ اقبالؒ اور ان کا خاندان قادیانی تھا؟	سلمان احمد	652
❑ قادیانیوں کی اقبال دشمنی	جی آر اعوان	662
❑ اقبالؒ کے ہاں	خضر تمیمی ایم اے	667
❑ کیا اقبال قادیانیت سے متاثر تھے؟	ڈاکٹر مقبول الٰہی	671
❑ انتخابِ اقبالیات	محمد متین خالد	678
۞ علامہ اقبال، حکیم الامت کیسے بنے؟		678
۞ حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کی گواہی		678
۞ عقیدہ ختم نبوت		679

- اسلامی وحدت کی بنیاد 681
- ختم نبوت کا انکار، اسلام کا غدار 682
- علامہ محمد اقبال کا عقیدہ 683
- ناقابل معافی جرم 683
- قادیانیت، یہودیت کا چربہ 684
- قادیانیوں کی حکمت عملی 684
- قادیانیت، انتشار انگیز تحریک 684
- مرزا قادیانی، مذہبی سٹے باز 685
- قادیانی ڈرامے کے اداکار 685
- قادیانی گستاخ رسول 685
- سیاسی غلامی کے لیے الہامی بنیاد 686
- قادیانیوں کے لیے صرف دو راستے 687
- قادیانیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کرنے کا آئینی مطالبہ 687
- برداشت اور رواداری کی عجیب منطق 688
- لا نبی بعدی 689
- شیخ اور لرد فرنگی را مرید 690
- دو موضوعات پر تحقیق کی مزید ضرورت 691
- بروز کا مسئلہ 691
- کاذب 692
- قادیانیت، جدید نبوت کی اختراع 692
- اسلام کے غدار 692
- مسلمانوں سے اتحاد کی قادیانی خواہش 693
- عجیب و غریب ملغوبہ 694
- قرآن اور فلسفہ ختم نبوت 694
- ختم نبوت اور قادیانیت 696
- حکیم نور الدین کی حکمت؟ 696

❁ مجھے بھی الہام ہوتا ہے	697
❁ اصل ایمان	697
❁ قادیانی جھوٹ کی نقاب کشائی	698
❁ سر ظفر اللہ کا وجود؟	701
❁ قادیان تباہ ہو جائے گا	701
❁ مرزا محمود کے جواب میں	702
❁ اسلام اور قادیانیت	703
❁ ضرب کلیم	704
❁ مالیخولیا کا مریض نبی؟	705
❁ مخبوط الحواس نبی؟	706
❁ جھوٹا	706
❁ اگر میری بیٹی ہوتی تو.....!	706
❁ علامہ اقبال کے مطالبات	707
❁ جہاد اور قادینیت	707
❁ قادیانی Tender	710
❁ نوک جھونک	710
❁ بہاء اللہ ایرانی اور مرزا قادیانی	711
❁ مصلح موعود	713
❁ اقبال دشمنی	714
❁ محاسبہ قادیانیت	718
❁ جہاد کے دفاع میں	721
❁ کوئی جواب نہ دیں	722
❁ احترام قرآن کا صحیح مرزائی جذبہ	722
خلیفہ قادیان پر فحش الزام	723
گورنمنٹ کا جاسوس	724

قادیانیت شکن شاعری

- لا نبی بعدی 729
- اے کہ بعد از تُو نبوت شُد بہر مفہوم شرک 730
- عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید 732
- آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد 734
- کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را! 735
- نبوت 737
- جعلی نبوت 737
- مہدی 738
- مہدیِ برحق 738
- امامت 739
- پنجابی مسلمان 740
- جہاد 741
- الہام 741
- درسِ غلامی 742
- نفسیاتِ غلامی 743
- نکتۂ توحید 743
- علی محمد باب 746
- کتابیات 748

اِنتساب

نابغۂ عصر، سفیرِ محبت، غرقابِ عشقِ رسول ﷺ

جناب ڈاکٹر یٰسین رضوی (مرحوم)

کے نام

جنہوں نے تمام عمر فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں اسلام اور پاکستان
کی نظریاتی سرحدوں کے بہترین محافظ کا کردار ادا کیا۔

؎ تیرے دِیوے دی رُشنائی جاوے وِچ زمیناں

اقبالؒ اور قادیانیت

کون نہیں جانتا کہ علامہ اقبالؒ ذات ختمی مرتبت ﷺ سے ایسی نسبت رکھتے تھے جس میں ان کی فکر، تخیل اور استعدادِ تعلق اپنے منتہا کو پہنچ کر صرف ہو گئی تھی۔ یہ نسبت ان کے لیے موجود ہونے کی واحد اساس اور انتہائی غایت تھی۔ محبت کی وہ سطح جو اکثر لوگوں کے اندر تصور اور آرزد کی حیثیت رکھتی ہے، اقبال نے اسے نفس انسانی کا مرکزی اور انتہائی تجربہ بنا کر دکھا دیا۔ وہ نہ ہوتے تو خدا جانے کتنے لوگ رسول اکرم ﷺ کی محبت کو اتنی بلندی، گہرائی، شدت اور ہمہ گیری کے ساتھ اپنا حال بنانے سے محروم رہ جاتے۔

دوسری طرف دیکھیں تو ایسی احوال گری، ذہن سازی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بقول کسے: ''حال، شعور کے وفور کا نام ہے خواہ یہ شعور ایمانی ہو یا جمالیاتی، عقلی ہو یا اخلاقی۔ بڑا حال مجموعی شعور کی حسی تشکیل سے پیدا ہوتا ہے جس میں شعور کے تمام انواع نقطۂ واحد میں ڈھل جاتے ہیں''......اقبال کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شعور کے مضمرات کو احوال میں ڈھال دکھایا۔ ان کے ہاں عشق رسول ﷺ جذبات سے منقطع ہوئے بغیر عقل و عرفان کے لیے بھی کل اثاثہ بن گیا ہے۔ محبت معرفت کا منتہا ہے اور معرفت محبت کا......علامہ کو پڑھ کر اس قول کی حقیقت کا مشاہدہ بلکہ تجربہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں عقیدہ، محبت اور معرفت کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اقبال عقیدے کو اس کے جوہر میں جس امر پر استوار سمجھتے ہیں، وہ تعلق بالرسول ﷺ ہے، عشق تناظر میں بھی اور عقلی بنیاد پر بھی......یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے ان کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ آپ ﷺ کے مرتبہ رسالت کی تفہیم و توضیح پر مشتمل ہے۔ چونکہ رسالت محمدیہ ﷺ کا کوئی بھی تصور آپ ﷺ کو آخری نبی مانے بغیر بے معنی اور لاحاصل ہے، لہٰذا جب فتنہ قادیانیت کھل کر سامنے آیا تو علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بعد اس پر سب سے کاری ضرب اس وقت اقبال نے لگائی۔ انہوں نے عقیدۂ ختم نبوت کے تمام ممکنہ اطلاقات و مضمرات اور ان کی ہمہ گیر معنویت

کا بیان کرتے ہوئے اس عقیدے کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے عقیدۂ توحید کے برابر ضروری اور اہم قرار دیا۔ اس کے پیچھے ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ جھوٹے مدعی کو کسی بھی درجے کا نبی مان لینے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا سب سے زیادہ محبوب ہونا، محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ حاضر نبی کا امتی گزرے ہوئے نبی کی محبت کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

ردِ قادیانیت میں نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ عقلی استدلال کی بھی ضرورت تھی جو اقبال نے پوری کی۔ انہوں نے قادیانیت کے اخلاقی، نفسیاتی اور معاشرتی مضرات کو جس محکمی کے ساتھ واضح اور ثابت کیا ہے وہ آج بھی ہمارے ایمان کی مضبوطی، ترقی اور حفاظت کا سبب بن سکتی ہے۔ جناب محمد متین خالد کی زیرِ نظر کتاب ''علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت'' میں علامہ اقبال کا پورا موقف خود ان کے الفاظ میں جمع ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ اقبال کے تصورِ رسالت پر مختلف حضرات کے لکھے ہوئے بعض عمدہ مقالات یک جا کر دیئے گئے ہیں، جن سے اقبال کا مؤقف سمجھنے میں مزید آسانی ہو جاتی ہے۔ اس تالیف کی افادیت ظاہر ہے۔ دعا ہے کہ یہ زیادہ لوگوں تک پہنچے اور ان کی ایمانی تقویت اور خود مؤلف کی فلاحِ اخروی کا وسیلہ بنے۔

محمد سہیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی، پاکستان

لاہور

بانگِ درا

دانائے راز، رومی ہند، حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کی شخصیت ایک کثیر الجہات اور جامع الصفات شخصیت ہے۔ فکری، نظری اور علمی محاذ پر انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، یہ بات بلاخوف اشتباہ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو روایتی شاعروں کی طرح کبھی اس پر ناز اور اصرار نہیں رہا کہ وہ ایک بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے ہمیشہ صرف اور صرف اس امر کو مایۂ افتخار و وقار گردانا کہ وہ اسلامیانِ عالم کو ادبار و انحطاط کے قعر مذلت سے اٹھا کر اقبال و عروج کی سدرہ بوس بلندیوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنے مداحین سے یہ شکوہ بھی رہا ہے کہ ''مرا یاراں غزل خوانے شمردند''۔ وہ اپنی شاعری کو بالِ جبریل کی اڑان دے کر اور بانگِ سرافیل کے قالب میں ڈھال کر عارف و عامی کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ مسلم شعرا میں علامہ اقبالؒ وہ واحد شخصیت ہیں جنہیں یہ یکتا و یگانہ اعزاز حاصل ہوا کہ اکابرین ملت نے انھیں بالاتفاق حکیم الامت قرار دیا۔ انہوں نے اپنے شعری و نثری سرمائے کو فکری و نظری سطح پر بیمار ملت کی مسیحائی کے لیے استعمال کیا۔ مولانا رومی کے بعد جنہیں اقبالؒ اپنا مرشدِ معنوی قرار دیتے ہیں، وہ واحد ہستی ہیں کہ وہ الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید کے لیے مجدانہ انداز میں مصافِ افکار و نظریات میں ستیزہ کار ہوئے۔ اس مریدِ ہندی نے مرشد رومی کے ساتھ جس بے پناہ ارادت و عقیدت کا اظہار کیا، اس کی بنیادی وجہ صرف اور صرف عشق رسالت مآب ﷺ ہے۔ علامہ کو اس امر کا کامل ادراک و احساس تھا کہ اسلامیانِ عالم کے بیمار و مضمحل وجود کو حیاتِ تازہ بخشنے کا واحد ذریعہ عشق رسالت مآب ﷺ ہی کی توانائی اور حرارت ہے۔

ہزاروں سالہ معلوم شدہ انسانی تاریخ کے تمام اوراق پر علامہ کی گہری نگاہ تھی۔ ایک وسیع المطالعہ، عمیق النظر اور عبقری مفکر کی حیثیت سے وہ اقوام و ملل کے عروج و زوال کے جملہ عوامل و محرکات کا تجزیہ و تحلیل کر چکے تھے۔ وہ واحد قلم بدست مفکر تھے کہ جو اپنی قوم کو تیغ بکف

دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامیانِ عالم مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کریں تاکہ کوئی باطل اور طاغوتی قوت ان سے نبرد آزما ہونے کا تصور ہی نہ کر سکے۔ انہوں نے اس استعمار ساختہ نبوت کو بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیا جو اپنے آقاؤں کے ایما پر روحِ جہاد کی سرکوبی کے لیے ایک مخصوص دور میں ''تخلیق'' کی گئی۔ علامہ اقبالؒ نے اس جعلی نبوت کی کارستانیوں سے باخبر ہونے کے بعد لازم جانا کہ وہ اسلامیانِ برصغیر کو اس کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ کریں۔ مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کے دسیسہ کارانہ نظریات اور پرکارانہ تصورات کی گہرائیوں میں چھپے مضمرات سے انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو بروقت متنبہ کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے ''قادیانیت'' کے نام سے ایک نئے فتنے کو متعارف کروایا۔ علامہ اقبالؒ جو اسلام کے خلاف جنم لینے والے ہر فتنے اور تیار کی جانے والی ہر سازش کے تار و پود اپنی نوکِ قلم سے بکھیرتے رہے، بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس پر خاموش رہتے۔ ختم نبوت کے اثبات کے لیے علامہ نے جو دلائل و براہین دیئے، وہ جدید اسلامی علم الکلام میں ایک منفرد اور وقیع حیثیت رکھتے ہیں۔ ردِ قادیانیت علامہ اقبالؒ کا ایک محبوب ترین اور مرغوب ترین موضوع تھا۔ اس موضوع پر انہوں نے مضامین، مکاتیب، اشعار اور خطبات کی شکل میں جو کچھ بھی کہا، وہ قولِ فیصل اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ قادیانیت کے حوالے سے علامہ یکے از محرمانِ اسرارِ درونِ خانہ بھی تھے۔

یہ امر میرے لیے باطنی مسرت اور روحانی انبساط کا موجب ہے کہ میں محاذ ختم نبوت پر تیغ و قلم سے سینہ سپر مجاہد برادرم محمد متین خالد کی کتاب ''علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت'' کے ابتدائیے کے طور پر یہ چند معروضات سپردِ قرطاس کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ برادرم محمد متین خالد کی تخصیص و اختصاص آئمہ تلبیس کا محاکمہ ہے۔ آئمہ تلبیس کی طویل ترین فہرست میں مرزا غلام احمد قادیانی، اس کا خانوادہ اور پیروکاروں کی فتنہ طرازیوں کی بے حجابی ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ میں نے اس کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ ردِ قادیانیت کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کی نگارشات اور خدمات کو انہوں نے ایک مربوط گلدستے کی شکل میں یکجا کر دیا ہے۔ یہ کام یقیناً اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے انہیں سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی۔ یہ دقتِ نظری اور دیدہ ریزی کا متقاضی تحقیقی کارنامہ ہے جو محمد متین خالد کے عشق رسالت

مآب ﷺ اور علامہ اقبالؒ کی ارادت کے بادۂ دو آتشہ کی سرمستی و سرشاری نے کروا دیا۔ میں یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ اگر محمود غزنویؒ کا گرز سومنات شکن تھا تو عصر حاضر میں محمد متین خالد کا قلم قادیانیت شکن ہے۔ میں وجدانی سطح پر محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اس شاندار، ثقہ اور مستند کارنامے پر یقیناً حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی روح بھی مسرور و شاماں ہوگی۔ میں انہیں اس خوبصورت کاوش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

حافظ شفیق الرحمٰن

کالم نگار

(بانی و چیئرمین ورلڈ کالمسٹ کلب)

دل کی بات

ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کے شہرۂ آفاق دانشور، عظیم روحانی شاعر، اعلیٰ درجہ کے مفکر اور بلند پایہ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عہد ساز انسان بھی تھے۔ ایسی زندہ و جاوید ہستیاں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا دل ملتِ اسلامیہ کے لیے دھڑکتا تھا۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے وارث اور شارح تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انحطاط اور تنزل کی گھاٹی کی طرف تیزی سے گرتے عالم اسلام کے تن مضمحل میں ایک نئی روح پھونکی، اپنی شاعری سے عالم اسلام کو بیدار اور ایک دوسرے سے مربوط کیا اور یوں انہیں انقلاب کی راہ دکھائی۔

علامہ اقبالؒ کے حوالے سے یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ وہ انسانی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ، نابغہ روزگار اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ جہاں تک قادیانیت کا تعلق ہے تو اس حوالے سے تو وہ محرم رازِ درون خانہ تھے۔ انہوں نے جب بنظر غائر دیکھ لیا کہ مرزائی خود تو مرتد اور غیر مسلم ہیں ہی، لیکن عامۃ المسلمین کو بھی مرتد بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور ''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد'' کے مصداق اسلام کا لبادہ اوڑھ کر انہیں گمراہ کر رہے ہیں تو وہ اسے اپنی اسلامی غیرت وحمیت اور محبت رسول ﷺ کے حوالے سے برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے انتہائی زیرکی اور ژرف نگاہی سے اس اہم مسئلے کا جائزہ لیا اور اپنے تاثرات امت مسلمہ کے سامنے واضح انداز میں پیش کر دیے۔

عاشق رسولؐ علامہ اقبالؒ کو اس بات پر کامل ایقان تھا کہ حضرت محمد عربی ﷺ کی ذاتِ اقدس پر رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، آپ خاتم النبیین ہیں، آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، اگر کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو وہ نہ صرف کاذب و مفتری ہے بلکہ دائرہ اسلام سے بھی خارج ہے۔

قادیانی ہر مشہورِ زمانہ شخصیت کو قادیانی ثابت کرنے میں بڑے حساس اور جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ وہ حد درجہ احساس کمتری اور سفلہ پن کا شکار ہیں۔ یہود ونصاریٰ کی ہر ممکن سرپرستی اور امداد کے باوجود انہیں اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی بڑی اور ہر دلعزیز شخصیات کو اپنے ہاں مختلف پروگراموں میں مدعو کریں اور اس دوران موقع سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر قادیانی سربراہوں کے ساتھ مصافحہ یا معانقہ کرتے ہوئے ان کی تصاویر اتار لیں اور پھر آہستہ آہستہ ان تصاویر کو اپنے مختلف جرائد ورسائل میں شائع کر کے ایک منظّم پروپیگنڈا کے تحت لوگوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ شخصیات قادیانی ہیں یا کم از کم قادیانیت سے متاثر ہیں۔ اس طرح کا شوشہ انہوں نے بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ، حضرت علامہ اقبالؒ اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں وغیرہ کے بارے میں چھوڑا کہ یہ شخصیات قادیانی ہیں تاکہ ان سے محبت وعقیدت رکھنے والے لوگ مختلف شکوک وشبہات کا شکار ہو کر قادیانیت کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لیں اور انہیں بھی مسلمانوں کا ایک فرقہ تصور کر لیں۔ یہ بات قطعی غلط اور حقائق کے منافی ہے کہ مذکورہ شخصیات قادیانیت سے تعلق رکھتی ہیں یا ان کے دل میں قادیانیت کے بارے میں نرم گوشہ تھا۔ آج جھوٹ اور پروپیگنڈے کا بادشاہ گوئبلز زندہ ہوتا تو قادیانی کذب کے سامنے شرمندہ ہو جاتا۔ جہاں تک مذکورہ شخصیات کا تعلق ہے، ان کا قادیانیوں کے بارے میں وہی عقیدہ ہے، جو عام مسلمانوں کا ہے۔

یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ اقبالؒ جیسا راسخ العقیدہ مسلمان جو عمر بھر سازِ دل پر عشق رسولؐ کا یہ نغمہ مضراب ارادت سے چھیڑتا رہا کہ:

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

قادیانیت کے بیمار اور بے روح دانش ور حضور نبی کریم ﷺ کے اس عاشق صادق کو قادیانی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں جب قادیانیت نے پوری طرح اپنے خبثِ باطن سے پردہ نہیں اٹھایا تھا، اس سے متاثر تھے۔ لیکن جب آنجہانی مرزا قادیانی اور اس کے گماشتوں نے اپنی کتابوں میں کھلم کھلا

اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کر دی تو اقبال نے نہ صرف قادیانیت سے اپنی سخت بیزاری کا اعلان کیا بلکہ اس فتنہ کے محاسبہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ انھیں اس بات کا مکمل ادراک تھا کہ ملتِ اسلامیہ کو جن فتنوں نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، ان میں سب سے خطرناک فتنۂ قادیانیت کا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے قادیانیوں کی ملتِ اسلامیہ کے خلاف بڑھتی ہوئی سازشوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات، مضامین، توضیحات، خطوط اور افکار و اشعار کے ذریعے قادیانیت کی سرکوبی کی اور اس تحریک کے عالم اسلام پر دینی، معاشی، سیاسی اور تمدنی اثرات اور ان کے منفی نتائج سے امتِ مسلمہ کو آگاہ کیا۔ علامہ اقبالؒ کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے حکومت کو سب سے پہلے یہ مطالبہ پیش کیا کہ قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے کیونکہ یہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ملتِ اسلامیہ کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے اندر رہ کر ایک نئی امت تشکیل دے رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے پوری زندگی فتنۂ قادیانیت کا بھرپور تعاقب اور محاسبہ کیا جس کی بنا پر قادیانی علامہ اقبالؒ کو اپنا حریف اور دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں تو ان کے در پے آزار تھے ہی، آج بھی وہ زبان و قلم سے مکروہ و مذموم انداز میں ان کی شخصیت کے حوالے سے خرافات کا بازار گرم کرنے میں مصروف ہیں۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا جب قادیانی اخبارات و جرائد یا قادیانی ویب سائٹس پر حضرت علامہ اقبالؒ کی کردار کشی اور تضحیک نہ کی جاتی ہو۔ ان کی روحانی شاعری پر رکیک حملے کیے جاتے ہیں۔ فرضی اور افسانوی بہتان عظیم باندھے جاتے ہیں۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ وہ انتہائی مکروفریب سے کام لیتے ہوئے علامہ اقبالؒ کی نجی زندگی اور شخصیت کی کردار کشی کے لیے خانہ ساز روایتیں گھڑتے اور ان روایتوں کو عام کرنے کے لیے وہ نام نہاد دانشوروں کی خدمات اعلیٰ ترین اعزازیوں کے عوض ہائر کرتے رہتے ہیں۔ یہ اعزاز صرف قادیانی جماعت کو ہی حاصل ہے کہ آنجہانی مرزا قادیانی سے لے کر قادیانی مافیا کے موجودہ گاڈ فادر مرزا مسرور تک ہر چھوٹا بڑا قادیانی سفید جھوٹ بولنے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔ جدید ترین ایجادات اور انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی کوئی شخص یا ادارہ موجود نہیں ہے جو گوئبلز کے پیروکار قادیانیوں کی طرح نہایت مہارت، ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی سے جھوٹ بول سکے۔ جہاں مقام لُد سے مراد لدھیانہ، حضرت عیسیٰؑ سے مراد...... مرزا قادیانی، چادر سے مراد...... بیماری،

موت سے مراد...... فتح، مکہ سے مراد...... قادیان، مدینہ سے مراد...... ربوہ ہو، وہاں آپ کیا علمی بات کر سکتے ہیں؟

زیرِ نظر کتاب حضرت علامہ اقبالؒ کی بے داغ شخصیت پر قادیانیوں کی طرف سے کیے گئے بے جا اعتراضات اور رکیک حملوں کا دندان شکن جواب ہے۔ علامہ اقبالؒ کے افکار و نظریات کی روشنی میں قادیانیت کی اصلیت تک رسائی میں یہ کتاب نہایت مفید اور کارگر ثابت ہو گی۔ امید ہے فکرِ اقبال کے پرستار میری اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشیں گے اور اسے مزید خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اپنی قیمتی آرا سے آگاہ فرمائیں گے۔

محمد متین خالد
mateenkh@gmail.com

شکریہ!!!

- سب سے پہلے میں اپنے مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوں کہ اگر اس کی بے پایاں رحمت وعنایت نہ ہوتی تو یہ کتاب نہ وجود میں آتی اور نہ زیور طبع سے آراستہ ہوتی۔
- اس کے بعد میں شکر گزار ہوں، مجاہدِ ختم نبوت برادرم جناب نعیم آسی مرحوم کا جن کا خوشگوار یادیں اب بھی میری راہنمائی کرتی ہیں، ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''اقبال اور قادیانی'' سے میں نے بھرپور استفادہ کیا جس سے زیرِنظر کتاب کی اہمیت اور جامعیت میں نہایت اضافہ ہوا ہے۔
- معروف ماہر اقبالیات جناب محمد سہیل عمر ناظم اقبال اکادمی اور نامور، کالم نگار و اقبال شناس جناب حافظ شفیق الرحمٰن کا جنھوں نے گراں قدر اور ایمان افروز تقاریظ لکھیں جو قاری کو اقبال اور قادیانیت کے متنوع جہات سے روشناس کراتی ہے۔
- جناب چوہدری مختار احمد کھٹانہ، جناب محمد اختر، جناب چوہدری شبیر احمد، جناب صفدر علی کا جنھوں نے اقبال اکادمی لاہور کی لائبریری میں دوران تحقیق مجھے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کے تعاون کے بغیر یہ کتاب تیار نہ کر سکتا تھا۔
- جناب ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، جناب محمد آصف بھلی، جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، جناب گل فراز، جناب پروفیسر جمیل احمد عدیل، جناب محمد احمد ترازی، جناب محمد ثاقب رضا قادری ایڈووکیٹ، جناب سلمان احمد (ہاشم علی) جناب ڈاکٹر سراج احمد قادری (بھارت)، جناب محمد نواز کھرل، جناب سعید اللہ صدیق، جناب ضیاء اللہ کھوکھر، جناب محمد شاہد حنیف، جناب محمد ہاشمی حنیف اور جناب شبیر احمد میواتی کی علم دوستی کا جنھوں نے اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں بے حد علمی معاونت فرمائی۔

محمد متین خالد

چند ضروری گزارشات

- یہ کتاب 'علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت' کے متعلق گوناگوں، علمی، تحقیقی اور چشم کشا مضامین کا مجموعہ ہے۔ اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ صرف وہی مضامین اس کتاب میں شامل کیے جائیں جن کے لکھنے والوں کی متانت وثقاہت مسلم ہے۔ پھر بھی اسے مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔
- اس کتاب کو تیار کرتے وقت بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ اس لیے اس کی پروف ریڈنگ کو بہتر بنایا گیا ہے، اس کے باوجود غلطی کا امکان ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام کسی قسم کی کوتاہی کو بنظرعفو واغماض دیکھیں گے۔ اگر کسی جگہ کسی قاری کو غلطی نظر آئے تو براہِ کرم مصنف کو ضرور مطلع کرے۔ ان شاء اللہ آئندہ کے ایڈیشن میں اس کا ازالہ کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی حوالہ کے نقل واخذ میں سہو ہوگیا ہوتو قارئین کرام ناصحانہ اور ہمدردانہ طور پر نشان دہی فرمادیں تاکہ اس کی تصحیح کردی جائے۔ شکریہ!
- یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ یعنی، 'ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است' کے مصداق ہر مضمون اپنی جگہ پر خاص اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے کتاب کے بعض مقامات پر حوالہ جات اور تشریحات کی تکرار پڑھنے کو ملے۔ قارئین کرام اسے متعلقہ مضمون کا ضروری حصہ سمجھ کر مطالعہ کرلیں کیونکہ اس کے بغیر خدشہ تھا کہ مضمون ادھورا رہ جاتا۔

محمد متین خالد

علامہ اقبالؒ
اور
فتنۂ قادیانیت

”نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر“

مولانا سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ

اقبالؒ کی اسلام سے والہانہ عقیدت

دنیا کا میدان ابتدا سے جدید ترین دور تک ''اکابر پرستی Hero-worship''
کی جانب رہا ہے۔ ہر بڑی چیز کو دیکھ کر ہذا ربی ہذا اکبر کہنے کی عادت، جس کا ظہور قدیم ترین
انسان سے ہوا تھا، آج تک اُس سے نہیں چھوٹی ہے۔ جس طرح دو ہزار برس پہلے بودھ کی
عظمت کا اعتراف اس مخلوق کے نزدیک بجز اس کے اور کسی صورت سے نہ ہوسکتا تھا کہ اُس کا
مجسمہ بنا کر اس کی عبادت کی جائے، اسی طرح آج بیسویں صدی میں دنیا کی سب سے زیادہ
سخت منکرِ عبودیت قوم (روس) کا ذہن لینن کی بزرگی کے اعتراف کی کوئی صورت اس کے سوا
نہیں سوچ سکتا کہ اس کی شخصیت کے آگے مراسم عبودیت بجالائیں۔

لیکن مسلمان کا نقطہ نظر اس بات میں عام انسانوں سے مختلف ہے۔ اکابر پرستی کا تصور
اس کے ذہن کی افتاد سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ وہ بڑوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کی طرف
ایک ہی صورت سوچ سکتا ہے۔ اللہ نے ان کو زندگی کا سیدھا راستہ بتا دیا تھا جس پر چل کر وہ
بزرگی کے مراتب تک پہنچے۔ لہٰذا ان کی زندگی سے سبق حاصل کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اسی نقطہ نظر سے اس مختصر سے مضمون میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ
جس اقبالؒ کی عظمت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھا ہے، اس کی زندگی کیا سبق دیتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اقبالؒ نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی
یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی ادب، یہی اقتصادیات، یہی سیاسیات، یہی
قانون اور یہی فلسفہ انھوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ
التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے
اکابر فلاسفہ تک کر چکے ہیں۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں، یہ

مرحوم اس کے سمندر پیے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اوراس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے 99 فیصد نوجوان دیکھتے ہیں بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کرتہ تک اُتر چکا تھااوران سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں لوگ اپنے دین وایمان، اپنے اصول، تہذیب وتمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا، اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہےاور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ جو کچھ سوچتا تھا، قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے۔ اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اوراس ایم۔اے، پی ایچ ڈی بارایٹ لا سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبالؒ نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا اور سوائے قرآن کے اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم وفنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے، وہ یہ تھا کہ اصلی علم قرآن ہے، اور یہ جس کے ہاتھ آ جائے، وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند اہم سوالات بھیجے اوران کا جواب مانگا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماری کھلوائیں گے اور بڑی بڑی کتابیں نکلوا کر ان مسائل کا حل تلاش کریں گے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لائبریری کی الماریاں مقفل کی مقفل رہیں، اور وہ صرف قرآن ہاتھ میں لے کر جواب لکھوانے بیٹھ گئے۔

رسول ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انھوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی ﷺ کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن

باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سُن کر ایک لحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ اصحابِ ثلاثہ کے ساتھ کوہِ اُحد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں اُحد لرزنے لگا اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ ٹھہر جا، تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیقؓ اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔'' اقبالؒ نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ مجاز نہیں، بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم آگاہ ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی ﷺ کے نیچے آ کر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں۔ مجازی طور پر نہیں، واقعی لرز اٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں اس کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لیے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے۔ اقبالؒ نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا، اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔ اس کی ایک معمولی مثال سن لیجیے۔ ایک مرتبہ حکومتِ ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبالؒ کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبالؒ نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خود لارڈ ولنگڈن سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہگار آدمی ہوں، احکام اسلام کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں، مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کے حکم کو توڑ دوں۔

قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاصا شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے مگر آخیر زمانہ میں طبیعت کی رقّت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کے دوران میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہوں۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے۔ ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور ''سرصاحبان'' ہوتے ہیں، ویسے ہی وہ بھی ہوں گے، اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا تھا کہ ان کی بارگاہِ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجیے، جس سے اس بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کرسکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبالؒ اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبالؒ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک ﷺ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، انھوں نے بوریئے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اُٹھے اور برابر غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانہ میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانہ ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے، جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے، اس کی اصلی شخصیت کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے۔

محمد تحسین

علامہ محمد اقبالؒ اور عشق رسول ﷺ

اسلام میں عشق رسول ﷺ کی اہمیت کسی بھی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: **قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ.** (آل عمران: 31) (اے حبیب) فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرماں بردار ہو جاؤ، اللہ تم کو دوست رکھے گا۔ قرآن کریم میں جو حضور نبی کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کا عمل حضور ﷺ کے عمل کے تابع اور اس کی ہر عادت حضور ﷺ کی عادت کے مشابہ ہو۔ حضور ﷺ کا تصور اور حضور ﷺ کی یاد اس کا ایمان ہو۔ حضور ﷺ کی اطاعت ہی عشق رسول ہے اور عشق ہی کامل دین و ایمان ہے۔ حضور پاک ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ میں بھی ہے:

- **لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و وَلَدِہٖ والناس اجمعین.** (صحیح البخاری)

ترجمہ: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک میری ذات اسے اس کے والدین، اولاد حتیٰ کہ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے''۔

اور ایک روایت میں ہے کہ ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں''۔

حضور ﷺ کی حدیث مبارکہ کے بعد حب رسول ہی کا ایمان ہونے میں کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا۔ محبت رسول ﷺ کے ظاہر کرنے کا طریقہ جو کہ ادب میں ہے، وہ یہ ہے حضور ﷺ کی تعریف و توصیف اور محاسن جمیلہ کا ذکر مبارک یعنی نعت گوئی جو کہ اردو زبان کے اکثر شعرا کے کلام کا جزوِ اعظم ہے۔

علامہ اقبالؒ کے کلام میں بھی محبت رسول ﷺ کے متعلق بہت بڑا حصہ شامل ہے، بلکہ

اگر یہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کہ اقبال کی شاعری کا خلاصہ عشق رسول اور اطاعتِ رسول ﷺ ہی ہے۔ علامہ اقبال کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سچی محبت تھی اور حضور کی سچی لگن تھی۔ ان کے رگ و پے میں عشق رسول ﷺ سرایت کر چکا تھا۔ ان کا تصور، ان کا خیال، ان کا کلام، ان کے حالات، ان کے واقعات اور ان کی عادات و افعال اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اقبال رسول کریم ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سب مسلمان حقیقی معنوں میں نبی کریم ﷺ کے عاشق صادق بنیں اور آپ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہوں، جس کا ذکر آپ کے اس شعر میں مضمر ہے:

ہر کہ عشق مصطفیٰ ﷺ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

کس قدر صحیح کہا گیا ہے:

محمد ﷺ عربی کآبروئے ہر دو سرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

مزید فرماتے ہیں:

درِ دل مسلم مقام مصطفیٰ ﷺ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ ﷺ است

یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا مقام مسلمانوں کے دل میں ہے اور ہماری عزت آپ ﷺ کے نامِ مبارک میں ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

- ''ڈاکٹر صاحب کی شاعری محبت وطن اور محبت قوم سے شروع ہوتی ہے اور محبت الٰہی اور محبت رسول ﷺ پر اس کا خاتمہ ہوا''۔ (ص 268)

مزید لکھتے ہیں:

''اور لوگ یورپ جا کر اسلام اور اسلامی عقائد سے برگشتہ ہو جاتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب یورپ جا کر ٹھیٹھ مسلمان ہو گئے۔'' (اقبال کامل ص 61)

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ اقبال کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کے زیرِ عنوان

رقم طراز ہیں:

❑ ''......اقبال، اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت راسخ الایمان تھے اور رسول اللہؐ کے ساتھ ان کی محبت، شغف اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا، اس لیے ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندہ وجاوید دین ہے کہ اس کے بغیر انسانیت فلاح وسعادت کے بامِ عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی، نبیؐ رشد وہدایت کے آخری مینار، نبوت ورسالت کے خاتم اور مولائے کل ہیں۔'' (نقوشِ اقبال از سید ابوالحسن ندویؒ، ص55)

خود اقبالؒ فرماتے ہیں:

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل
زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

میر غلام بھیک نیرنگ علامہ اقبالؒ کے سرکار سے قلبی تعلق کے پیش نظر اور حضور نبی کریم ﷺ کے ذکر میں ان کی دگر گوں حالت کے حوالے سے کہتے ہیں:

❑ ''میں نے اس کے سامنے تو نہیں مگر خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ اگر وہ حضور نبی کریم ﷺ کے مرقد پاک پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے''۔ (اقبال لاہور، اکتوبر 1957ء ص20)

فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں کہ اقبال کا دل عشق رسول ﷺ نے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ذکرِ مبارک آ جاتا تو ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے اور آخری عمر میں یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بندھ جاتی تھی۔ آواز تھرا جاتی تھی اور وہ کئی کئی منٹ سکوت اختیار کر لیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔

جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو فقیر سید نجم الدین ان سے ملنے گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے اُن کے سفر کے تجربات کے متعلق بات ہونے لگی۔ اثنائے گفتگو میں سیّد نجم الدین نے کہا: ''اقبال تم یورپ ہو آئے۔ مصر وفلسطین کی سیر بھی کی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ

واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔'' یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہوگئی، یعنی چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحات تک یہی کیفیت رہی، پھر فرمانے لگے:

''فقیر میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔''

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد دوم ص 72)

حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے دیرینہ دوست اور مزاج شناس جناب سید وحید الدین علامہ اقبال کے محبت رسول ﷺ سے لبریز ایمان افروز واقعات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

❑ محترم حکیم احمد شجاع جو علامہ اقبال کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک ایسا واقعہ سنایا، جس سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ اقدس سے کس درجے والہانہ محبت اور بے پناہ عشق رکھتے تھے۔ یہ واقعہ دیکھنے اور پڑھنے میں بہت مختصر ہے، مگر حقیقت میں عشق و محبت کا دفتر بے پایاں ہے۔

ایک روز حکیم صاحب موصوف علامہ کے مکان پر پہنچے تو علامہ کو بہت زیادہ فکرمند، مغموم اور بے چین پایا۔ حکیم صاحب نے گھبرا کر دریافت کیا ''خیریت تو ہے، آپ آج خلافِ معمول بہت زیادہ مضطرب اور پریشان نظر آتے ہیں؟'' علامہ نے خاص انداز میں نظریں اوپر اٹھائیں اور غم انگیز لہجے میں فرمایا:

''احمد شجاع! یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہ ﷺ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے''۔

علامہ مرحوم کی تاریخ پیدائش 9 نومبر 1877ء ہے۔ اس حساب سے 1938ء میں انتقال کے وقت اس عاشق رسول کی عمر رسول اکرم ﷺ کے سن مبارک سے دو سال کم یعنی 61 سال تھی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے علامہ کی اس تمنا اور دعا کو قبول فرما لیا۔

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد دوم ص 72)

❑ ''ڈاکٹر صاحب نے ایک بزرگ کا واقعہ سنایا کہ ان سے کسی شخص نے یہ سوال کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا دیدار کس طرح ہو سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پہلے اسوۂ حسنہ پر عمل کو اپنا شعار بناؤ اور زندگی اس میں ڈھالو پھر اپنے آپ کو دیکھو! یہی اُن کا دیدار ہے''۔

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد اوّل صفحہ 61)

❏ ''میں نے ڈاکٹر صاحب کی صحبتوں میں عشق رسول ﷺ کے جو مناظر دیکھے ہیں، ان کا لفظوں میں پوری طرح اظہار بہت مشکل ہے، وہ کیفیتیں بس محسوس کرنے کی تھیں، جب یہ مقدس ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایک واقعہ بیان کر ہی دوں۔

ایک دن سیرت نبوی پر گفتگو ہو رہی تھی، ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز میں ایک واقعہ سنایا......فرمانے لگے:

ایک معرکہ میں مسلمان سپہ سالار کا گھوڑا زخمی ہو گیا۔ زخموں کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے کا میدان کارزار میں کھڑا رہنا دشوار تھا، یہ بیٹھنا چاہتا تھا، دوسری طرف کا فریلغار کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے، اس عالم میں امیر العسکر نے گھوڑے کو مخاطب کر کے کہا:

''اگر تم نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے تمہاری شکایت کروں گا۔''

یہ واقعہ بیان کر کے ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونے لگے اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس واقعہ سے سپہ سالار کے عشق رسول ﷺ کا اظہار ہوتا ہے''۔

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد اوّل ص 83 تا 85)

❏ ''قتل راجپال کے مقدمہ میں غازی علم الدین کو پھانسی دیئے جانے کے واقعہ کا اثر دوسرے مسلمانوں کی طرح میرے دوست محمد محمود صاحب پی سی ایس (جو اس وقت فلسفہ کے طالب علم تھے) کے ذہن پر بھی تازہ تھا۔ چنانچہ ایک بار چند ساتھی طلبا کے ہمراہ وہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے براہِ راست سوال کر ہی دیا۔

یہ......''کہ علم الدین کی موت شہادت ہے یا نہیں!''

ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا، اس کا انحصار نیت پر ہے۔ اس کے بعد سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے توضیح کی کہ اگر یہ حقیقت ذہن میں ہو کہ حملہ آور کا اصل مقصد پیغمبر کے ذاتی وقار کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اس کے لائے ہوئے پیغام کو مجروح اور اس ایمان محکم کو متزلزل کرنا ہے جو اس پیغام رشد و ہدایت پر قائم و استوار ہے، تو یہ حملہ صرف انسانی یا پیغمبرانہ وقار کا قتل نہیں رہتا بلکہ اس ایمان اور عقیدہ کا قتل بن جاتا ہے۔ اس کوشش یا اقدام کے خلاف ہر مدافعت یقیناً صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہے، اور وہی اس کا ٹھیک اجر دینے والا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر، نہایت رقت انگیز لہجہ میں فرمایا:

''میں تو یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص میرے پاس آ کر یہ کہے کہ تمہارے پیغمبر نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے''۔

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد اوّل ص 100)

❑ ''ڈاکٹر محمد اقبال نے طالب علمی کے زمانہ ہی سے اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں انفعالیت کی جگہ جرأت پیدا ہو۔ وہ دنیا کے تمام مذاہب پر اپنے دینی تفوق کو محسوس کریں اور قومی عظمت کا احساس ان کے اندر بیدار ہو۔ چوہدری نبی احمد (اسسٹنٹ سیکرٹری لیجلسیٹو اسمبلی مغربی پاکستان) نے اس کی تائید میں اس واقعہ کو بیان کیا کہ جن دنوں میں اور میرے ہم عصر خواجہ عبدالرحیم گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے طالب علم تھے، تو مسلمان طلبہ کا یہ عالم تھا کہ ہندو، سکھ اور عیسائی طلبا کے ساتھ بیٹھ کر اپنے پیغمبر کا ذکر دوسرے مذہبی راہنماؤں کے مقابلہ میں تفوق کے ساتھ کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ مسلم طلبا کی گفتگو اس موضوع پر اول تو مختصر ہوتی۔ پھر اندازِ گفتگو میں مصلحت شناسی کی خاصی جھلک پائی جاتی۔ چوہدری نبی احمد کہتے ہیں کہ یہ اقبال ہی تھے، جنہوں نے مسلمان طلبا میں اسلامی قومیت اور اپنی مذہبی عظمت کا شعور پیدا کیا اور سوسائٹی کی خوشنودی کے لیے بنائے ہوئے اس نمائشی بت کو پاش پاش کردیا۔ علامہ اقبال ہی کی بدولت مسلم طلبا میں یہ اخلاقی جرأت پیدا ہوئی کہ وہ معذرت آمیز انداز کے بجائے کھل کر پوری جرأت کے ساتھ اسلام کی جامعیت اور اپنے نبی ﷺ کی عظمت بیان کرنے لگے۔

چوہدری صاحب کا بیان ہے کہ اقبال کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے، جسے ہم زندگی کے آخر لمحہ تک فراموش نہیں کرسکتے، اقبال نے ہم میں روباہی کی جگہ ''اسد اللّٰہی'' پیدا کی''۔

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد اوّل ص 111)

❑ ''میرے عزیز دوست محمد محمود 'پی سی ایس' جنرل منیجر سمال انڈسٹریز حکومت مغربی پاکستان کے عہدے پر فائز ہیں۔ 1933ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے طالب علم تھے۔ ان کا آبائی وطن سیالکوٹ ہے اور وہ شاعر مشرق کے ان خوشہ چینوں میں شامل ہیں جنہیں مرحوم سے بالمشافہ گفتگو کی سعادت حاصل رہی ہے۔ ایک بار فلسفہ کے دوسرے طلبا کے ہمراہ وہ

ڈاکٹر صاحب سے تبادلہ خیال کرنے اور علمی معلومات حاصل کرنے میکلورڈ روڈ والی کوٹھی میں ان کے پاس گئے اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کیا......ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب چلتے تو درخت تعظیم سے جھک جاتے، ہمیں یقین ہے کہ حضرت عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے تھے، لیکن ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہمارا نبی انسانیت کے لیے نمونہ ہے، لیکن اگر قدرت کے مظاہر نبی کے لیے مختلف ہوں اور ہمارے لیے مختلف، تو پھر نبی نمونہ تو نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔تم بالکل سچ کہتے ہو کہ حضرت عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ بات یہ ہے کہ یہ واقعہ پڑھ کر تمہارا ذہن مختلف راستہ پر منتقل ہو گیا ہے، تم الجھ کے رہ گئے ہو، قدرت کے مظاہر اور درختوں کے جھکنے میں۔ بھائی! یہ واقعہ تو صرف حضرت عمرؓ کا عشق بتاتا ہے کہ ان کی آنکھ یہ دیکھتی تھی، کہ درخت جھک رہے ہیں، اس کا درختوں کے جھکنے کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں، اگر تمہیں عمرؓ کی آنکھ نصیب ہو تو تم بھی دیکھو گے کہ دنیا ان کے سامنے جھک رہی ہے۔

عقل انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق''

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد اوّل ص 113 تا 114)

حضرت علامہ کے نزدیک عشق رسول ﷺ سرِّ دین بھی ہے اور وسیلہ دنیا بھی، اس کے بغیر انسان نہ دین کا نہ دنیا کا۔فرماتے ہیں:

ہر کہ از سرِّ نبی ﷺ گیرد نصیب
ہم بہ جبریل امیں گردد قریب
در دل مسلم مقام مصطفیٰ ﷺ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ ﷺ است
زندۂ تا سوز او در جانِ تست
ایں نگہ دارندۂ ایمان تست

علامہ اقبال کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ محبوب اور قابل قدر وصف جذبۂ عشق رسول ﷺ ہے۔ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے ساتھ انھیں جو محبت تھی، جو والہانہ عقیدت تھی، اس کا اظہار ان کی چشم غمناک سے ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی اقبال کے سامنے حضور ﷺ کا

نام لیتا، ان پر جذبات کی شدت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ جاتی۔ رسالت مآب ﷺ کا ذکر آتے ہی اقبال بے قابو ہو جاتے۔ کفارِ مدینہ کے وہ جور وستم جو انھوں نے محسن کائنات ﷺ پر کیے تھے، جو جو ظلم انھوں نے فخر کائنات ﷺ پر ڈھائے تھے اور جس جس طرح سے انھوں نے خیر البشر ﷺ کو تنگ کیا تھا، یہ سب کچھ سن کر اقبال بے اختیار رو اٹھتے اور بہت دیر یہ حالت طاری رہتی۔ اقبال نے حضور کی جو مدح سرائی اور نعت گوئی کی ہے، اس کا انداز سب سے الگ ہے۔ اقبال کو محسن انسانیت اور انسانِ برتر کی تلاش تھی۔ انھیں ان خوبیوں کی حامل ایک ہی ذات نظر آئی اور وہ رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ طاہرہ تھی۔

اقبال نے مغربی تعلیم حاصل کی۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے۔ وہاں کے بڑے بڑے علم کدوں میں صہبائے علم کے ایاغ چڑھائے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کے خیالات سے استفادہ کیا۔ دنیا کے کونے کونے میں گہرہائے علم تلاش کیے۔ ان کا شمار بذاتِ خود عظیم فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عظیم فلسفی شاعر تھے۔ اس زمانے میں فلسفی کا مطلب ہی منکرِ خدا اور منکرِ مذہب لیا جاتا تھا، جسے مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا لیکن اقبال نے بحیثیت ایک فلسفی کے کہا تو یہی کہا:

سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

عشق رسول ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ وہ بہت بڑے فلسفی تھے اور فلسفے کا سارا معاملہ عقل کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ ان معاملات میں وہ ایمان بالغیب کے قائل تھے۔ حضور ﷺ نے جو فرما دیا، وہی دین وایمان ہے اور سر آنکھوں پر۔ ان کی بارگاہ میں چون و چرا کرنے کی گنجائش نہیں۔ **سمعنا و اطعنا** اطاعت اور فرمانبرداری اور غلامی ہی ایمان بلکہ اسلام کی بنیاد ہے:

بہ مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ان کے اور بھی واقعات ایسے ملتے ہیں، جن سے عشق رسول کا والہانہ اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے کلام، ان کے غور و فکر کی بنیاد ہی عشق ذات رسالت مآب ﷺ تھی۔ یہ شہرۂ آفاق شاعر اور فلسفی ہر وقت مدینہ کے خواب دیکھتا ہے۔ مدینہ کا ذکر ان کا دین وایمان ہے اور اس

کا بیان اس انداز میں کرتے ہیں:

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

''بلادِ اسلامیہ'' کے عنوان سے علامہ اقبال نے ایک طویل نظم زینتِ قرطاس کی ہے، جس میں دلی، بغداد، قرطبہ اور دوسرے شہروں کا ذکر بڑے دردانگیز لہجے میں کیا۔ ان کی زبوں حالی کا رونا رویا۔ ان کی حالتِ زار پر ماتم کیا۔ مگر جب مدینہ منورہ کا ذکر زبان پر آتا ہے تو ان کی حالت بدل جاتی ہے۔ ان کا اندازِ فکر تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کے طرزِ گفتار میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مدینہ اطہر کے متعلق فرماتے ہیں:

وہ زمیں ہے تُو مگر اے خواب گاہ مصطفیٰ!
دید ہے کعبہ کو تیری حج اکبر سے سوا
خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانند نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ ہے تیری زمیں

یثرب کی زمیں کی اس بزرگی اور اس عظمت کی وجہ کیا ہے؟ کیوں اس کی بزرگی اور خوبی کے نغمے گائے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ دو عالم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی

اور پھر اس شہنشاہ کی عظمت کا بھی ذکر فرماتے ہیں:

نام لیوا جس کے شہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسند جم کے ہوئے

پھر مدینے کی مرکزیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تُو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تُو

اور پھر کتنی صاف حقیقت نگاری کرتے ہیں:

جب تلک باقی ہے تُو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں، گوہر شبنم بھی ہیں

اپنے اصلی مرکز اور اصلی وطن کو جس سے اُن کا روحانی تعلق ہے نہیں بھولے اور اس کی عظمت و بزرگی بھی ان کے دل پر نقش ہے۔ دنیا کی فریب کاریوں، دغا بازیوں، تباہیوں، جنگ وجدال سے مایوس ہوکر ان کی نظر امید کی کرن کہیں دیکھتی ہے تو وہ مدینۂ اطہر ہی ہے۔ ان کی نگاہیں سہارا ڈھونڈنے کے لیے بے اختیار مدینہ منورہ کی طرف اٹھتی ہیں۔ اس دور میں جبکہ بڑے بڑے سیاست دان دنیا کی راہنمائی کر رہے تھے، اقبال کو اگر راہنما ملتا ہے اور میر کارواں پسند آتا ہے تو وہ میر حجاز ہی ہے۔ ترانہ ملی میں جس کے ہر شعر سے اسلام سے شیفتگی، شعائرِ اسلام سے عشق و محبت ٹپکتی ہے۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

سالارِ کارواں ہے میر حجاز ﷺ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

اقبال مسلمانوں کے دلوں میں عشق رسول کا تصور بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو دوبارہ اُن کے اصلی وطن کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، جسے فراموش کر کے مسلمان قوم ذلت وخواری کے عمیق گڑھے میں جا گری ہے۔ اقبال مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ ان پر مسلمانوں کی یہ غفلت بہت شاق گزرتی ہے۔ وہ کس طرح گوارا کریں کہ ان کے محبوب رسول کی امت خوابِ غفلت میں پڑی سوئے رہے۔ ہندو لیڈر کشمیر کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا مفاد اس میں ہے۔ اقبال وطن کا یہ تصور دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ وہ چلا اٹھے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دین نبوی ﷺ ہے

اس وقت حب اسلام درمیان میں آ جاتا ہے، مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ کر جگاتے ہیں اور ابھارتے ہیں:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

پھر اقبال حبِ رسول کا واسطہ درمیان میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

مسلمان کا اصلی ایمان ہی ارشادِ نبوت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ وطن کے نام پر دین اور سیاست کی آویزش کو اقبال نے محسوس کیا اور فوراً اپنے اسلامی خیالات کو نظم کا جامہ پہنا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا کیونکہ وہ اپنے محبوب رسول ﷺ کی امت کو غلط راستے پر گامزن دیکھ کر چپ نہ رہ سکے تھے۔ کلام اقبال سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ علامہ اقبالؒ کی محبت نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے عشق کا درجہ رکھتی تھی اور عشق رسول ﷺ اِن کی زندگی کا سب سے گہرا، سب سے شدید اور سب سے پائیدار جذبہ تھا جس سے اِن کے تمام ذہنی اور فکری رشتے وابستہ تھے۔ فرماتے ہیں:

چوں گل صد برگ مارا بو یکی ست
اوست جانِ ایں نظام و او یکی ست
شورِ عشقش در نے خاموش من
می تپد صد نغمہ در آغوش من
من چہ گویم از تولایش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست
ہستی مسلم تجلی گاہِ او

طور ہا بالد ز گردِ راہِ او
پیکرم را آفرید آئینہ اش
صبح من از آفتابِ سینہ اش
در تپیدِ دمبدم آرامِ من
گرم تر از صبح محشر شام من
ابر آذار است و من بستان او
تاک من نمناک از باران او
چشم در کشت محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم
خاک یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی مثال گل صد برگ کی سی ہے، کہ ہیں تو اس میں سو پنکھڑیاں مگر سب ایک اصل سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح ہمارے نظام حیات کی روح، رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، اور ظاہر ہے کہ آپ ایک واحد ذات ہیں۔ لہٰذا اس نظام کے تمام افراد بھی فردِ واحد کی طرح ہیں۔ آپ ﷺ کی محبت کا بحر ذخار میرے اندر موجیں مار رہا ہے اور سینکڑوں نغمے میرے آغوش سے اُبلے پڑتے ہیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ آپ ﷺ کی محبت کیا چیز ہے؟ یہ محبت تو وہ ہے جو بے جان چیزوں کو بھی آپ ﷺ کے لیے بے قرار رکھتی تھی۔ چنانچہ منبر کی خشک لکڑی آپ ﷺ کی جدائی میں ایسے زار و قطار اور بلند آواز سے روئی تھی کہ سننے والے ششدر رہ گئے تھے۔ مسلمانوں کا وجود آپ ﷺ ہی کے جلوؤں سے روشن ہے۔ آپ ﷺ کے قدموں کی خاک ایسی مقدس اور بلند رتبہ ہے کہ اس سے طور، جنم لیتے ہیں۔ میرا جسمانی وجود آپ ﷺ کے پرتو سے ظہور میں آیا۔ آپ ﷺ کے نورانی اور مقدس سینے سے میری صبحیں روشن و درخشاں رہتی ہیں۔ ہر لمحہ آپ ﷺ کے فراق میں تڑپنا میرے لیے باعث راحت ہے۔ میری شام فراق صبح محشر سے زیادہ گرم ہے۔ وہ بہار کا بادل ہیں تو میں اس بادل سے شاداب کیا ہوا باغ ہوں۔ میں کہ میرا وجود انگور کی بیل کے مانند ہے، انہی کے باران کرم سے سیراب ہوں۔

میں نے ان کی محبت کی کھیتی بوئی اور اپنی آنکھوں کو ان نظاروں سے فیض یاب کیا جو بیان میں نہیں آسکتے۔ سبحان اللہ! خاک یثرب! یہاں کی خاک دونوں عالم سے بہتر اور بڑھ کر ہے۔ کیا پیارا اور مبارک شہر ہے وہ شہر جہاں ہمارا محبوب آسودۂ خواب ہے۔

ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے اقبال کا عشق اور محبت جس والہانہ انداز میں ہے، وہ چھپائے نہیں چھپتا۔ وہ طرح طرح سے حیلے بہانے کر کے اور مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ سینۂ اقبال میں ملاقاتِ نبی ﷺ کے لیے بے چین ہے۔ جب بے قراری زیادہ بڑھتی ہے تو اس کے مداوے کے لیے تصور کی دنیا میں رسالت مآب کے حضور پہنچ جاتے ہیں اور پھر وہاں کی کیفیت، وہاں کی حالت، وہاں کا واقعہ، جس کیفیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اس کے اثر اور سوز و گداز کا کیا کہنا۔ اس کے بیان سے ہی عجیب کیفیت اور سرور کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

فرشتے بزم رسالت ﷺ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

وہاں حاضری اور طلبی کے بعد کیا ہوا۔ فرماتے ہیں:

کہا حضور ﷺ نے اے عندلیبِ باغ حجاز!
کلی کلی ہے تری گرمئی نوا سے گداز
ہمیشہ سر خوش جام ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجود و نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تُو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تُو آیا؟

یہ سوال بہت نازک تھا۔ اس کا کیا جواب دیا جا سکتا تھا۔ بزم رسالت ﷺ میں سناٹا طاری تھا۔ زبانیں خاموش تھیں۔ یہ سوال اگر بڑے تہجد گزار اور زاہد و عابد سے بھی کیا جائے تو کیا جواب دے۔ وہاں تو بڑے بڑے عاشقوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ بولنے کی تاب نہیں۔

قوت گویائی جواب دے جاتی ہے لیکن اقبال پھر اقبال تھے۔ ان کے ذہن نے فوراً جواب پیدا کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ خلافتِ اسلامیہ اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ فرنگی طاقتیں دنیا پر چھا چکی تھیں۔ قتل و غارت و تباہی ایک کھیل سمجھا جاتا تھا۔ سامراجی طاقتیں ایک قیامت کا سماں پیش کیے ہوئے تھیں۔ طرابلس کے مسلمان اطالیہ کی ہوسِ جوع الارض کا شکار ہو رہے تھے اور شوقِ شہادت کی پونجی لے کر میدان میں اتر آئے تھے۔ حق اور سچائی کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس وقت اقبال کے تصور میں یہ منظر آ گیا۔ وہ یوں گویا ہوئے:

''حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی''

گویہ مجبوریاں اور معذوریاں اپنی جگہ بجا ہیں۔ مگر بارگاہِ نبوت میں نذرانہ حاضر ہے:

''مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی''

وہ کیا چیز ہے جس سے جنت بھی محروم ہے۔ مگر اقبال بزمِ رسالت میں پیش کر رہے ہیں؟

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی نذرانہ ہو سکتا ہے؟ جو اقبال بارگاہِ رسالت ﷺ میں پیش کر سکتے ہیں۔ اقبال نے شکوہ اور جواب شکوہ کے نام سے ایک عظیم الشان اور طویل نظم لکھی۔ اقبال اس میں مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار کا ذکر کرتے ہیں۔ اللہ سے شکوہ عجیب رنگ میں ہے۔ پھر اس کا جواب بھی خوب ہے۔ حضور کی مثال آخر میں لاتے ہیں اور ان کے نام پر ابھارتے ہیں:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اجالا کر دے

اور جس اسمِ مبارک کی برکت سے یہ سب کچھ کرایا جا رہا ہے اس کا ذکر اقبال خدا کی طرف سے اس طرح کرتے ہیں:

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

اس کی وجہ کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

یہ عالم رنگ و بو یہ چمن یہ رونق گلستان سب حضور ﷺ کے دم قدم سے ہی ہیں۔ اس کا ذکر اقبال اپنے اشعار میں کر چکے ہیں۔ کتنی محبت اور عشق ظاہر ہے اس سے۔ اس شخص کی عشق رسول میں کیا کیفیت ہوگی، جس کا کلام اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ ذکرِ رسول ﷺ پر اقبال کے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ رقت طاری ہو جاتی تھی۔ فرطِ محبت سے بے خود ہو جاتے تھے۔ اس نظم کے آخر میں ترجمانِ خدا کے طور پر فرماتے ہیں:

کی محمد ﷺ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مزید فرماتے ہیں:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل ﷺ جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

آخری سالوں میں علامہ اقبالؒ کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام مبارک آتے ہی ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو جاتا اور جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ علامہ اقبالؒ اس بات سے سخت ڈرتے تھے کہ میں قیامت کے روز حضور نبی کریم ﷺ کا سامنا کیسے

کروں گا۔ وہ نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنے نامۂ اعمال کی وجہ سے رسوا ہونے کو عذاب جہنم سے بھی زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ وہ ہر سزا بھگتنے کو تیار تھے مگر اس پر قطعاً تیار نہ تھے کہ ان کا نامۂ اعمال سرکارِ دو جہاں ﷺ کے سامنے پیش ہو۔ وہ بارگاہ خداوندی میں عرض کرتے ہیں:

بہ پایان چُون رسد این عالم پیر
شَوَد بی پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ﷺ ما را
حسابِ من زِ چشم اُو نہاں گیر

اے خدا، تو مجھے میرے آقا ﷺ کی نگاہ میں رُسوا نہ کرنا۔ میری فرد حساب آپ ﷺ سے پوشیدہ رکھنا۔

اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں عرض کرتے ہیں:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

اے خدا...... تو غنی ہے، میں فقیر، قیامت کے دن میرا نامہ اعمال جب پیش ہو تو میرا عذر قبول فرما اور مغفرت فرما دے، لیکن اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرا نامۂ اعمال پیش ہو اور اس کے مطابق مجھے جزا و سزا ملے، تو میرے مولا! اسے نگاہ مصطفیٰ ﷺ سے پوشیدہ رکھنا۔

مذکورہ بالا رباعی علامہ محمد اقبالؒ کی ہے مگر ان کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے یہ رباعی اپنی کتاب ارمغانِ حجاز کے لیے منتخب کر رکھی تھی اور بعد میں محمد رمضان عطائی، ڈیرہ غازی خان کی نذر کر دینے کے بعد ایک نئی رباعی کہی جو ارمغانِ حجاز (فارسی) میں شامل ہے۔

اقبال کی زبان کس قدر حقیقت کی عکاسی کر رہی ہے۔ حبِ رسول ﷺ کا کوئی واقعہ ملے، اقبال اسے اپنا موضوع بنا لیتے ہیں۔ پھر اس میں وہ جوش اور ولولہ اور والہانہ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ قارئین کے قلب پر نقش ہو جاتی ہے۔

اقبال جب رسالت پناہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری دیتے ہیں اور گویا ہوتے ہیں تو

عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے حضور ان کی حالت اور ہوتی ہے اور خود رفتگی اور مستی کا عالم طاری ہوتا ہے۔ اقبال روضۂ اطہر پر حاضر ہوتے ہیں:

بہر دہلیز تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

اس نظم کے آخری شعر میں کہتے ہیں:

با خدا در پردہ گویم باتو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہان و تو پیدائے من

اقبال کی زندگی میں مختلف تبدیلیاں آتی رہیں۔ تغیرات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ مگر عشق رسول ﷺ کو دوام حاصل تھا۔ حب رسول ﷺ کے بعد ویسے بھی کوئی کسی در پر نہیں جا سکتا۔ سیرۃ النبی ﷺ کے متعلق اقبال نے مفصل لکھا اور حضور ﷺ کے اخلاق، حضور ﷺ کے عفو، حضور ﷺ کے محاسن جمیلہ کا نقشہ کھینچا اور اپنی شاعری کو اس سے زینت بخشی۔ اقبال کو علامہ اور حکیم الامت ہوتے ہوئے بھی اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس تھا۔ شروع میں دانشِ افرنگی سے مرعوب بھی ہوئے، وطن کے بت کو ابتدا میں تسلیم بھی کیا مگر جیسے جیسے اسلام سے رغبت، حضور سے محبت اور عشق بڑھتا گیا، واقف اسرار ہوتے گئے، دھبے دھلتے گئے۔ خود التجا کرتے ہیں:

تُو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

عشق و عقل دنیا پر محیط ہے۔ عقل سے کام بگڑتے ہیں اور عشق سے بنتے ہیں۔ عشق تعمیر میں کارفرما ہے تو تخریب میں عقل۔ عشق سے ہی دنیا کا وجود ہے۔ نظام کائنات عشق کے دم قدم سے قائم ہے۔ اقبال پہچان گئے کہ عشقِ رسول ﷺ ہی حاصلِ کائنات ہے۔ زندگی کی کامیابی ہی نہیں بلکہ عالم کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ عقل کے چکر کو وہ سمجھتے تھے۔ اسے ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

عشق کی حالت اور کیفیت عجیب ہوتی ہے۔ جب شاعر کے دل پر کوئی اثر کارفرما ہوتا ہے تو اسے دلاویز طریقے میں پیش کرتا ہے۔ وہ اس حالت اور کیفیت کو لفظوں کے آبدار موتیوں کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ اقبال کا بھی یہی حال ہے۔ انھوں نے عشقِ رسول ﷺ میں بہت کچھ کہا اور جتنا کہا کم کہا۔ ان کے کلام کا وافر حصہ اس بات کا آئینہ دار ہے۔ مدینے سے وابستگی اور رسول خدا ﷺ سے شیفتگی، اقبال کا سرمایہ کلام ہے۔

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

جن کا سرمایۂ ہستی تھا فقط عشقِ رسول ﷺ

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ جنھیں ایک دنیا حکیم الامت، فیلسوفِ مشرق، دانائے راز، شاعر مشرق، مصورِ پاکستان اور علامہ ایسے باوقار اور لازوال القاب وخطابات سے جانتی ہے، اب وہ محض ایک نامور شخصیت نہیں رہے بلکہ مشرق کے لیے ایک معتبر اور مستند حوالہ بن چکے ہیں۔ جتنا کچھ ان پر لکھا جا چکا ہے وہ بھی بہت ہے مگر جبینِ علم وادب میں ابھی ہزار ہا سجدے تڑپ رہے ہیں۔

کوئی مستشرق ہو یا مستغرب، ایشیائی ہو یا یورپی، عربی ہو یا عجمی، بحر ہند کا ہو یا خلیج فارس کا، ملتِ اسلامیہ کا فرزند ہو یا قبیلۂ انسانی کا فرد، بشرطیکہ اسے کسی درجے میں علم وادب سے شغف حاصل ہو، وہ اقبالؒ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور ابھی بہت کچھ جاننے کی آرزو رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کے بچپنے سے لے کر ان کے کمالِ علم وفن تک بے شمار لٹریچر تیار ہو چکا ہے، حکایات و واقعات اور نفسیات و واردات کا بیان اگرچہ تکراری حدود کو چھو رہا ہے مگر یہ تکرار ہرگز ناگوار نہیں بلکہ قندِ مکرر کا درجہ رکھتی ہے۔

اقبال اگر محض شاعر ہوتے تو ان کی ذات کسی ٹی ہاؤس میں موضوعِ سخن بنتی، زاہد خشک ہوتے تو مکتب وخانقاہ میں یاد کیے جاتے، نرے فلسفی ہوتے تو ادق اصطلاحوں کے بوجھ تلے دبے رہتے، روایتی سیاستدان ہوتے تو کب کے طاقچۂ نسیان کی نذر ہو چکے ہوتے، معروف معنوں میں ادیب ہوتے تو مختلف ادبی گروہوں کی ''کھیچ تروہ'' میں نیم جان بلکہ بے جان ہو چکے ہوتے، فقط عالم وواعظ ہوتے تو زیادہ سے زیادہ منبر ومحراب کی آبرو بڑھاتے اور اگر تنہا مفکر ہوتے تو صرف ''اربابِ فکر'' کے کام آتے، ''اصحاب نظر'' کے محبوب نہ بنتے۔

مبدا فیاض ازل نے ہمارے ممدوح کو سر تراشے بغیر ادائے قلندری سے آشنا کیا تھا اور تاج پہنے بغیر شانِ سکندری سے نوازا تھا۔ کاسئہ دماغ علم سے تو بھرپور تھا ہی، دامنِ دل عشق سے

بھی معمور رہا۔ کتاب ان کی رفیقِ تنہائی تھی تو صاحب کتاب سے بھی ان کی شناسائی تھی۔ قدرت نے انھیں پرکھنے کا سلیقہ بخشا تھا تو تڑپنے کا قرینہ بھی عطا کر رکھا تھا۔ محض رازی کے پیچ وتاب سے واقف نہ تھے، رومی کے سوز وساز سے بھی پوری طرح باخبر تھے، فلسفے کے ساتھ ساتھ انھیں تلقینِ غزالی ازبر تھی۔ اقبال ان لوگوں میں سے نہ تھے جو زمانۂ حال سے مرعوب ہو کر نڈھال ہو جاتے اور مستقبل کی جھلک دیکھ کر ماضی کو جھٹک دیتے ہیں، بلکہ حال ان کا صیدِ زبوں، مستقبل ان کا خواب اور ماضی ان کا پیار تھا۔

ہماری ملی تاریخ میں کتنے بڑے نام ایسے ہیں جو میخانۂ یورپ میں قدم رکھتے ہی بہک گئے کہ کباب پیانے میں رکھے اور شراب سیخ پر ڈال دی۔ محفل اغیار میں پہنچتے ہی اپنا اعتبار گنوا دیا، کوچۂ رقیب کی مٹی کو خاکِ شفا سمجھ بیٹھے، خرابات کو کرامات اور ظلمات کو تجلیات مان لیا۔

مگر اقبال میخانۂ یورپ میں بھی حجازی مے سے مخمور رہے، کوچہ رقیب کے موتیوں کی تابانیوں کو ایک نگاہِ غلط انداز کا سزاوار بھی نہ سمجھا اور آنکھ کا سرمہ خاکِ مدینہ ونجف کو بنایا، حکایات ان کی سنیں مگر روایات اپنی برقرار رکھیں، افسانے ان کے حسنِ بے حجاب کے سنے مگر ترانے جمال رسالت مآب ﷺ کے لکھے، دنیا یورپ کی چکا چوند سے خیرہ رہی مگر اقبال اسے ٹمٹماتے چراغ کی آخری بھڑک سمجھے اور اپنے ذرۂ ریگ سے طلوعِ آفتاب کا نظارہ کرتے رہے۔ عام دستور یہی ہے کہ دو چار حرف پڑھے اور لے اڑے، گویا:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور لطف یہ کہ یہ رویہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جنھیں فقط ''دربان'' سے آشنائی ہوتی ہے۔ ''مہربان'' تک رسائی تو دور کی بات ہے، وہاں تک پہنچ پائیں تو نجانے کیا رنگ دکھائیں؟ لیکن علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نگاہِ خاص میں رکھا، نہ آنکھ بہکی اور نہ دل بھٹکا، لوگ تو برگساں کو پڑھ کر خدائے رحمٰن سے لڑ پڑے، اقبال برگساں سے ملے مگر اپنی جڑ سے نہ ہلے، لوگوں نے نطشے کا نام سنا اور ان کے اعصاب سن ہو گئے، اقبال الٹا اس مجذوبِ فرنگی کی حرماں نصیبی پر افسوس کرتے رہے کہ وہ ان سے مل لیتا تو مقام کبریا کو سمجھ لیتا۔

ہمارے ممدوح کو یہ فکری استقامت، یہ ذہنی اصابت اور یہ اعتماد ذات صرف اس لیے نصیب ہوا کہ ان کے علم وفکر کا سرچشمہ قدیم یونان کا فلسفہ اور جدید یورپ کا کلچر نہیں بلکہ حضور ﷺ

کی شخصیت اور تعلیم تھی۔

شخصیت وہ جو بے عیب تھی اور تعلیم وہ جو لاریب تھی۔ بے عیب شخصیت کی نسبت نے اقبال کی فکر کو جھول سے بچالیا اور لاریب تعلیم نے انھیں اشتباہ سے محفوظ رکھا۔ جو مفکر اس سرچشمے سے محروم رہا یا خود کو اس سے بے نیاز سمجھا، وہ تمام عمر غبار ناقہ میں گم اور محمل لیلیٰ سے دور رہ گیا کیونکہ یونان کا فلسفہ قیاسی تھا اور قیاس ظن وتخمین کی پیداوار، اور یورپ کا کلچر مادی ہے اور مادیت آلائش کا دوسرا نام ہے، اس لیے مشرق کا یہ فیلسوف ربودگی اور آلودگی دونوں سے پاک رہا۔ علامہ کا مدارِ فکر اور معیارِ تمدن ہمیشہ اسوۂ حسنہ رہا، اس معاملے میں انھیں نہ ندامت لاحق ہوئی نہ ملامت کی پروا رہی اور نہ ہی معذرت کی ضرورت پیش آئی۔ علم وہ نہیں جو سوزِ دماغ ہے بلکہ وہ جو سوزِ جگر ہے اور عشق وہ نہیں جو بوالہوسوں کا شعار ہے بلکہ جو یزداں شکار ہے۔ علم سے انھوں نے راستہ معلوم کیا اور عشق سے اسے طے کیا، علم سے سراغ لگایا اور عشق سے منزل کو پایا۔

بیکن نے سچ کہا ہے کہ فلسفے کا تھوڑا علم انسان کو خدا بیزار اور گہرا علم خدا کا پرستار بنا دیتا ہے اور اقبال بلاشبہ فلسفے کے گہرے عالم تھے۔ وہ اتنی گہرائی میں اُتر کر عشق رسول ﷺ کے موتی چن کر باہر لائے اور انھیں اپنے دامن میں سجا کر پوری دنیا کو دعوتِ نظارہ دی، اور بڑی بلند آہنگی اور خود اعتمادی سے کہا: اے منطق وکلام کے متوالو! اس کلام کو پڑھو جو اُمی نبی ﷺ پر اترا ہے، شاید تمہارا کام بن جائے۔ اے سقراط اور بقراط کے دیوانو! اُن کی بات سنو، جنھوں نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی مگر ان کا وجود ''الکتاب'' ہے۔ اے افلاطون اور ارسطو کے شیدائیو! ان کی بارگاہ میں پہنچ کر کچھ سیکھو جن کے ہاتھوں نے تختی کو چھوا اور نہ ان کی انگلیوں نے کبھی قلم پکڑا، لیکن لوحِ قلم کے سارے راز ان پر منکشف ہو گئے۔

کون نہیں جانتا اور کون نہیں مانتا کہ اقبال اپنے دور کے بہت بڑے فلسفی تھے اور فلسفی لوگوں کی خشکی ضرب المثل بن چکی ہے۔ فلسفی لوگ ہر لحظہ کھوئے کھوئے، ہر لمحہ اکھڑے اکھڑے، ہر دقیقہ الجھے الجھے اور ہر ثانیہ بجھے بجھے رہتے ہیں، مگر اقبال سے ان کا فلسفہ گرمیٔ عشقِ رسول ﷺ نہ چھین سکا، انھیں رقتِ قلبی سے محروم نہ کر سکا اور ان کی پاکیزگیٔ خیال کو آلودہ نہ کر سکا۔

دیگر علمی مسائل میں تو انھوں نے فلسفے کا خوب استعمال کیا۔ دقیق اصطلاحیں، باریک نکتے، پُر پیچ جملے، منطقی دلیلیں اور تہ در تہ مثالیں ان کی نثر ونظم میں نظر آتی ہیں مگر جب رسول

اکرم ﷺ کا ذکر آیا تو اقبال زمخشری کا لہجہ بھول کر جامی کی زبان میں بات کرتے نظر آتے ہیں، رازی کی طاقت سے دستبردار ہو کر قدسی کی عقیدت میں ڈھل جاتے ہیں، نہ ایں نہ آں اور نہ چنیں نہ چناں، لغت کو پسِ پشت ڈالتے اور تاویل کو نظر انداز کر دیتے ہیں، فلسفہ المباری میں اور منطق میز کی دراز میں رکھ دیتے ہیں۔ محفل کا موضوعِ سخن اگر ذات رسول ﷺ ہے تو اقبال کے نزدیک قیل و قال فضول ہے اور ہر واقعہ اپنے اصل الفاظ میں قابلِ قبول ہے:

بہ مصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

''روزگار فقیر'' میں فقیر سید وحید الدین مرحوم رقمطراز ہیں کہ ''ایک دن سیرت نبوی ﷺ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) نے خاص انداز میں ایک واقعہ سنایا۔ فرمانے لگے، ایک معرکہ میں مسلمان سپہ سالار کا گھوڑا زخمی ہو گیا، زخموں کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے کا میدانِ کارزار میں کھڑا رہنا دشوار تھا، وہ بیٹھنا چاہتا تھا، دوسری طرف کفار یلغار کرتے ہوئے چلے آرہے تھے، اس عالم میں امیر العسکر (سپہ سالار) نے گھوڑے کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اگر تم نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے تمہاری شکایت کروں گا۔''

یہ واقعہ بیان کر کے ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سپہ سالار نے گھوڑے سے جو اندازِ تخاطب اختیار فرمایا، اس کا لطف وہی لے سکتا ہے جو اقبال کی طرح غیر مشروط محبت کا مزاج رکھنے والا ہو۔

اس کتاب میں ایک اور مقام پر درج ہے کہ حضرت علامہ سے کسی نے غازی علم دین شہید کی شہادت کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا علم الدین کی شہادت برحق ہے کیونکہ راجپال نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں دریدہ دہنی سے کام لیا، یہ کہہ کر انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا:

''میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے پاس آ کر کوئی شخص یہ کہے کہ تمھارے پیغمبر ﷺ نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔''

ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ تاثر پیش کرتے ہوئے اقبال فلسفی نہیں، سراپا

محبتِ نبی ﷺ نظر آتے ہیں۔ایک صاحب نے حکیم الامت سے اس بارے میں استفسار کیا کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں حضور نبی کریم ﷺ جب چلتے تھے تو درخت تعظیم سے جھک جاتے، اس کا کیامفہوم ہے؟ کیونکہ یہ بات ماورائے فطرت معلوم ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے جواب دیا، تمہاراذہن مختلف راستے پر منتقل ہوگیا ہے، تم الجھ کر رہ گئے ہو قدرت کے مظاہراوردرختوں کے جھکنے میں، بھائی یہ واقعہ تو عمرؓ کا عشق بتاتا ہے کہ ان کی آنکھ یہ دیکھتی تھی، ''اگر تمھیں عمرؓ کی آنکھ نصیب ہو تو تم بھی دیکھ لوگے کہ کائنات ان کے سامنے جھک رہی ہے۔''

عشقِ انسانی ہے فانی زندہ جاوید عشق

اقبال کا یہی وہ سرمایۂ عقیدت تھا جو انھیں یورپ کی فکری دریوزہ گری سے بے نیاز بنائے رہا۔ان کا یہی جذبۂ عشق تھا جس میں ڈوب کر وہ اپنا سراغ پانے میں کامیاب ہوگئے اور یورپ سے اپنا ایمان سلامت لے کر واپس آئے۔ان کا یہی وہ زاویۂ نظر تھا جو انھیں ہر کجی اور ٹیڑھ سے محفوظ رکھتا رہا، انھیں وہی دل مطلوب رہا جو مرکز عشقِ نبی ﷺ ہو۔انھیں صرف وہ آنکھ درکار تھی جس میں حبِ رسول اللہ ﷺ بینائی بن کر رہے، وہ عمر بھر اس تمنا کا پیکر بن کر رہے:

چھین لے مجھ سے نظر اے جلوہ خوش روئے دوست
میں کوئی محفل نہ دیکھوں، اب تیری محفل کے بعد

محمد متین خالد

علامہ محمد اقبالؒ اور غازی علم الدین شہیدؒ

بنیادی طور پر ہر مسلمان کو حضور رحمت للعالمین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت و احترام ہے۔ وہ آپ ﷺ کی ذات اقدس پر اپنی جان قربان کرنا موجب نجاتِ اُخروی اور شہادت ایسے بلند مرتبے پر فائز ہونے کو باعث صد افتخار سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

- اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ (احزاب:6)

”یعنی مسلمانوں کو حضور نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی اپنی جانوں سے زیادہ مقدم ہے اور ادب و تعظیم کے لحاظ سے رسالت مآب ﷺ کی ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں۔“

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حضور نبی کریم ﷺ سے بے پناہ عقیدت و محبت کے جذبات کو حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے یوں ادا کیا ہے:

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی ﷺ
از خدا محبوب تر گردد نبی ﷺ

یعنی اگر تو میری بات کو سمجھے اور اس فلسفے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آنکھوں سے نظر ڈالے تو دل اور جگر کی تمام قوتیں حضور نبی کریم ﷺ پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور آپ ﷺ کی ذات گرامی خود اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتی ہے۔

حضور رحمت عالم ﷺ کے بہت سے جلیل القدر صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی حرمت پر قربان ہوئے اور بعض عظمت اسلام کا پرچم بلند کرتے ہوئے شہادت کے جام نوش کرتے رہے۔

یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جنہیں آپ ﷺ کی بابرکت صحبت میسر تھی۔ لیکن شمع رسالت ﷺ کے اُن پروانوں کی شہادت کا درجہ کیا ہوگا جو صدیوں بعد محض آپ ﷺ کا مبارک تذکرہ سن کر آپ ﷺ کی عزت وناموس پر قربان ہو جائیں...... غازی علم الدین شہیدؒ بھی اسی شاہراہ جناں کا ایک مسافر ہے۔ یہ بات اظہر من الشمّس ہے کہ ہماری حالیہ تاریخ میں قافلہ جاں نثاران حرمت رسول ﷺ کے سردار غازی علم الدین شہید ہی ہیں۔ پاکستان کے دل لاہور کے وسط میں نئ انارکلی سے متصل ہسپتال روڈ پر ''راجپال اینڈ سنز'' کے نام سے ایک ہندو مہاشے راجپال کی کتابوں کی دکان تھی۔ اس دکان میں اکثر کتب ہندو دھرم سے متعلق ہوتی تھیں اور بعض کتب وہ خود بھی شائع کرتا تھا۔ راجپال کے دوستوں اور اس کی دکان پر آنے جانے والوں کی اکثریت ہندو متعصبین کی تھی۔ 1920ء کی دہائی میں عیسائیوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں میں بھی خواہ مخواہ مسلم دشمنی کا مرض عود کر آیا اور انھوں نے دین اسلام پر رکیک حملے شروع کر دیے۔ ہندوؤں نے اسلام کی مقدس شخصیات کی شان میں کذب وافترا اور دریدہ ذہنی کے ایسے شرمناک مظاہرے کیے جن سے مسلم دل ودماغ میں غم واضطراب کی آندھیاں چلنے لگیں۔ علاوہ ازیں وہ شدھی اور سنگھٹن جیسی بدنام زمانہ اسلام دشمن تحاریک کے ذریعے مسلمانوں کے قلب وجگر چھلنی کر رہے تھے۔ اسی دوران 1923ء میں راجپال پبلشر نے ایک بڑی دلخراش جسارت کرتے ہوئے ہمارے ہادی برحق، فخر موجودات، حضور سرور کائنات ﷺ **(فدہ ابی و امی)** پر انتہائی گستاخانہ اور دل آزار کتاب شائع کر دی جس سے ملت اسلامیہ کا لہو کھولنے لگا اور انھوں نے راجپال سے کہا کہ وہ ہزلیات پر مشتمل اپنی اس کتاب کو تلف کر دے مگر آریہ سماج لیڈران سے گہرا تعلق ہونے کی بنا پر اس نے نہ صرف مسلمانوں کا یہ مطالبہ یکسر نظر انداز کر دیا بلکہ اس گستاخانہ کتاب کا سستا ایڈیشن شائع کرنے کا بھی اعلان کر دیا۔ اس پر ملت اسلامیہ میں اضطراب و ہیجان اور شدید غم وغصہ کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ جب یہ فساد مزید بڑھا تو حکومت برطانیہ نے کتاب کی ضبطی کے ساتھ شہر میں دفعہ 144 کا نفاذ کر کے ہر قسم کے جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی۔ بعد ازاں مسلمانوں کے شدید احتجاج پر حکومت نے ناشر کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں دفعہ 153 الف کے تحت مقدمہ درج کر کے راجپال کو گرفتار کر لیا۔

24 مئی 1924ء کو راجپال کے خلاف زیر دفعہ 153 تعزیراتِ ہند مقدمہ درج کر لیا

گیا۔ عدالت میں طویل سماعت کے بعد مسٹر سی ایچ ڈزنی مجسٹریٹ درجہ اوّل نے 18 جنوری 1927ء کو ڈیڑھ سال قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی جو مسلمانوں کے نزدیک ایسے بڑے جرم اور گستاخی کے لیے سزا نہیں، مذاق تھا۔ راجپال نے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی جس کی سماعت ''ایف نکولس (F. Nicholas)'' نے کی۔ 8 فروری 1927ء کو ماتحت عدالت کے فیصلے میں تخفیف کردی گئی اور سزا صرف 6 ماہ کردی گئی۔ پھر راجپال نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی جس کی سماعت جسٹس ''کنور دلیپ سنگھ (Kanwar Dalip Singh)'' کی عدالت میں ہوئی۔ آخر کار ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال (Sir Shadi Lal) کی ذاتی سفارش پر ملعون راجپال کو 4 مئی 1927ء کو باعزت رہا کردیا گیا۔ جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے فیصلے پر مسلمانوں میں طیش کی شدید لہر دوڑ گئی۔ اس فیصلہ کے خلاف شہر بھر میں جلسے جلوس ہوئے اور بہت ساری گرفتاریاں بھی ہوئیں۔

مسلم اکابرین لاہور کے ایک وفد نے جس میں حضرت علامہ اقبالؒ بھی شامل تھے، گورنر سے مطالبہ کیا کہ ایسی دلآزار تحریروں کی اشاعت ممنوع قرار دینے کے لیے ایک فرمان فوراً جاری کیا جائے۔ چونکہ لاہور میں فسادات برپا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے حکومت نے دفعہ 144 نافذ کردی۔ مجلس خلافت نے اس دفعہ کے نفاذ کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تحریک سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے 8 جولائی 1927ء کو معززین لاہور کا ایک اجلاس بصدارت سر عبدالقادر، برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوا، جس میں علامہ اقبالؒ نے قابل اعتراض کتاب کی مذمت کی۔ بعدازاں اسی سلسلہ میں مسلمانان لاہور کا ایک جلسہ عام 10 جولائی 1927ء کو شاہی مسجد میں منعقد ہوا۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ابتلا نہیں ہوسکتی، جو اس وقت درپیش ہے۔ راجپال کی تصنیف نے جس کا نام لینا میں پسند نہیں کرتا، مسلمانوں کے قلب کے نازک ترین حصہ کو چوٹ لگائی ہے''۔ (گفتارِ اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل)

حرمت رسول ﷺ کے ناپاک مجرم راجپال کو کیفر کردار تک پہنچانے کی سعادت اسلام کے سرفروش مجاہد غازی علم الدین شہید کے حصے میں آنے والی تھی۔ غازی علم الدین 4 دسمبر

1908ء بروز جمعۃ المبارک کو محلّہ چابک سواراں المعروف سرفروشاں (سریانوالہ بازار) لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے آپ کو 6 سال کی عمر میں تکیہ سادھواں کی مسجد میں بٹھا دیا گیا، بعدازاں انھیں اس مسجد سے بازار نوہریاں اندرون اکبری دروازہ بابا کالو کے مکتب کا طالب علم بنا دیا گیا لیکن وہ ابتدائی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کے والد طالع مند اپنی روٹی روزی کے لیے لکڑی کے کام سے منسلک تھے۔ اسی لیے غازی صاحب نے بھی مستری نظام دین سے جو بھاٹی دروازہ کے اندر رہا کرتے تھے، اپنا آبائی پیشہ سیکھنا شروع کر دیا۔ آپ نے یہاں صرف چند ماہ ہی کام سیکھا، پھر آپ نے اپنے والد اور بڑے بھائی محمد دین سے نجاری کے کام میں خوب مہارت حاصل کی۔

یکم اپریل 1929ء کی رات غازی علم الدین شہید اپنے بڑے بھائی محمد دین کے ساتھ دہلی دروازہ کے قریب جلسہ سننے چلے گئے، جہاں سیّد عطا اللہ شاہ بخاریؒ نے بڑی پرجوش تقریر کی۔ دفعہ 144 کا نفاذ تھا جس کی رو سے کسی نوع کا جلسہ یا اجتماع نہیں ہو سکتا تھا لیکن مسلمانوں کا ایک فقید المثال اجتماع بیرون دہلی دروازہ درگاہ شاہ محمد غوثؒ کے احاطہ میں منعقد ہوا۔ وہاں اس بطل حریت نے ناموسِ رسالت ﷺ پر جو تقریر کی، وہ اتنی دل گداز اور پرسوز تھی کہ سامعین پر رقت طاری ہوگئی۔ کچھ لوگ تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ شاہ جیؒ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ''مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں۔ آج کفار نے توہین رسالت ﷺ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انھیں شاید یہ غلط فہمی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دو۔ عزیز نوجوانو! تمھارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گنبد خضریٰ کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آبرو خطرے میں ہے۔ ان کی عزت پر کُتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے روز حضرت محمد ﷺ کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر توہین رسالت ﷺ کرنے والی زبان نہ رہے یا پھر سننے والے کان نہ رہیں''۔

مشہور ادیب ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں کہ اس روز پانی اور آگ یعنی سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے ملاپ سے ان کی تقریر ڈھل رہی تھی۔ شاہ جیؒ نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ''آج آپ لوگ جناب فخر رسل رسول عربی ﷺ کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آج اس جلیل القدر ہستی کی عزت معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت

پر تمام موجودات کو ناز ہے۔ آج کوئی روحانیت کی آنکھ سے دیکھنے والا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ اس دروازے پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ آئیں اور فرمایا کہ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں؟'' ارے دیکھو! کہیں ام المومنین عائشہؓ دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں؟ (یہ سن کر مجمع پلٹا کھا گیا۔ مسلمانوں میں کہرام مچ گیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے) تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو لیکن کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ ﷺ تڑپ رہے ہیں۔ آج خدیجہؓ اور عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ تمھارے دلوں میں امہات المومنینؓ کی کیا وقعت ہے؟ آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ وہی عائشہؓ جنھیں رسول اللہ ﷺ حمیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنھوں نے سید عالم ﷺ کی رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ اگر تم خدیجہؓ اور عائشہؓ کی ناموس کے تحفظ کی خاطر جانیں دے دو گے تو کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے۔ یاد رکھو! جس روز یہ موت آئے گی، پیام حیات لے کر آئے گی۔ اگر کچھ پاس رسالت ﷺ ہے تو ناموس رسالت ﷺ کی حفاظت کرو''۔

شاہ جیؒ کی تقریر سننے کے بعد غازی علم الدین شہیدؒ کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ آپ کے ذہن میں ہمہ وقت شاہ جیؒ کی ایمان افروز تقریر کے شعلہ بیاں الفاظ گونجتے رہتے۔ ایک رات غازی علم الدین شہیدؒ نے خواب میں نہایت نورانی شکل وصورت والے بزرگ کو دیکھا جنھوں نے غازی صاحب سے کہا:

''علم الدین اُٹھو اور جا کر گستاخ رسول ملعون راجپال کا قصہ تمام کر دو''۔

علم الدین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور آپ کا تمام جسم پسینے میں شرابور تھا۔ آپ پریشانی کی حالت میں منہ اندھیرے ہی گھر سے نکلے اور اپنے دوست شیدے کے گھر جا پہنچے۔ پھر اسے ساتھ لیے بھاٹی چوک کی طرف نکلے۔ وہاں جب شیدے کو یہ خواب سنایا تو وہ پھٹی پھٹی نظروں سے آپ کی طرف دیکھنے لگا۔ آپ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ ''یہ خواب میں نے بھی دیکھا ہے۔'' آپ بولے کہ ''پہلے خواب میں نے دیکھا ہے، اس لیے پہلے عمل بھی میرا ہی ہوگا۔ راجپال کی زندگی کا خاتمہ میرے ہاتھوں ہی ہوگا۔'' شیدے نے اعتراض کیا تو علم الدین نے کہا ''ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھے اور کاغذ کے دو ٹکڑے اٹھا لائے۔ ایک ٹکڑا شیدے کو

دیا، ایک اپنے پاس رکھا اور شیدے کو اپنے کاغذ کے ٹکڑے پر نشان لگانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد دونوں نے نشان لگا کر کاغذ کے ٹکڑے زمین پر پھینک دیے اور اسی میدان میں کھیلتے ہوئے ایک بچے کو بلا کر پرچی اٹھانے کو کہا۔ بچے نے جو پرچی اٹھائی، اس پر علم الدین کا نام تھا۔ یہ جان کر وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ ''علم الدین اس طرح نہیں، ایک بار پھر پرچی پھینکو۔'' شیدے نے کہا۔ علم الدین نے ایک بار پھر پرچیاں پھینکیں تو پھر آپ کا نام نکل آیا۔ اس وقت شیدے کا چہرہ بالکل مرجھایا ہوا تھا۔ ''علم الدین دو دفعہ تمہارا نام نکلا ہے صرف ایک بار اور......'' ''نہیں شیدے اب نہیں...... فیصلہ ہو گیا ہے۔'' علم الدین نے کہا تو شیدے نے ان کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔ ''علم الدین......صرف ایک بار پھر پرچی پھینکو......اب کی بار اگر تمہارا نام نکلا تو تمہاری قسمت۔'' ''ٹھیک ہے۔'' اتنا کہتے ہوئے علم الدین نے دونوں پرچیاں دوبارہ پھینکیں۔ جب بچے نے دوبارہ پرچی اٹھائی تو جو نام نکلا وہ پھر علم الدین ہی کا تھا۔ علم الدین کا چہرہ اس جیت کی خوشی سے سرخ ہو گیا تھا اور شیدہ افسردہ حالت میں آپ کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں وہاں سے چل دیے۔

آپ نے 5 اپریل کو دوبارہ اپنے بھائی سے اسی موضوع پر گفتگو کی۔ بھائی نے بتایا کہ ''سوامی دیانند'' کا شاگرد ''مہاشہ کرشن'' ہے جو روزنامہ ''پرتاب'' کا مدیر ہے۔ اس نے یہ گستاخانہ کتاب لکھی جس میں رسولِ پاک ﷺ کی بدترین توہین کی گئی ہے، مگر ڈرپوک اتنا ہے کہ مسلمانوں کے غم وغصہ سے بچنے کے لیے ''پنڈت چموپتی'' کا فرضی نام بطور مصنف لکھ دیا۔ مگر جس شخص نے یہ کتاب چھاپی ہے، اس نے اپنا مکمل پتہ اور نام، کتاب پر درج کیا ہے۔ غازی علم الدین شہیدؒ نے اپنے بھائی سے دوبارہ اس دکان کا راستہ معلوم کیا جہاں راجپال بیٹھتا تھا۔ آپ نے اپنے بھائی سے یہ بھی پوچھا: ''اگر میں راجپال موذی کو واصل جہنم کر دوں تو کیا ہوگا؟'' آپ کے بھائی نے جواب دیا: ''حضور شافع محشر حضرت محمد ﷺ آپ سے راضی ہوں گے اور آپ شہید ہو کر جنت الفردوس میں جائیں گے۔''

چنانچہ 6 اپریل 1929ء کو غازی علم الدین شہیدؒ نے صبح صاف ستھرا لباس زیب تن کیا۔ خوشبو لگائی اور سر پر گلابی رنگ کا رومال رکھا۔ اُس دن آپ نے اپنی والدہ سے اپنی پسند کا کھانا بنوایا۔ بھابھی کے ہاتھ کے بنے ہوئے چاول کھائے۔ اور والدہ صاحبہ سے چار آنے

وصول کیے، حالانکہ اس سے پہلے وہ صرف ایک آنہ وصول کرتے تھے۔

چار آنے وصول کر کے خوشی خوشی گھر سے نکلے اور لنڈا بازار جا کر لوہا بازار سے 13 انچ لمبی خنجر نما چھری خریدی اور اس کی تیز دھار کو پرکھا۔ یاد رہے کہ لوہا بازار اس زمانے میں ''آتما کباڑیے'' کی دکان کے نام سے مشہور تھا۔ آپ نے چھری کو نہایت محفوظ طریقے سے اپنے کپڑوں میں چھپایا۔ نشۂ شہادت میں سرمست ہو کر راج پال کی دکان کی طرف چل دیے۔ دل میں عقیدت کے گلاب کِھل رہے تھے۔ غازی علم الدین شہیدؒ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کی پاسداری کا جذبۂ عظیم اپنے دل و دماغ میں سجائے ملعون راج پال کی دکان پر پہنچے۔ انارکلی میں ہسپتال روڈ پر عشرت پبلشنگ ہاؤس کے سامنے ہی راج پال کا دفتر تھا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ راج پال کچھ دیر پہلے مذکورہ بالا کتاب چھاپنے کے سلسلے میں مقدمہ سے بری ہوا تھا۔ اس وقت دفعہ 295 سی تعزیراتِ ہند میں شامل نہ تھی۔ صرف فرقہ ورانہ فسادات پھیلانے کی دفعہ 295 قانون میں شامل تھی۔

تقریباً ایک بجے دن کا وقت تھا کہ آپ وہاں پہنچے ہی تھے کہ راج پال بھی اپنی کار میں وہاں آ پہنچا۔ راجپال کو دیکھتے ہی غازی علم الدین کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اور پھر ان کی قوتِ سماعت سے وہی الفاظ ٹکرائے:

''علم الدین اُٹھو اور جا کر گستاخ رسول ملعون راجپال کا قصہ تمام کر دو''۔

راجپال اس وقت ''ہری دوار'' سے واپس آ رہا تھا۔ وہ دفتر میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھا اور پولیس کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے فون کرنے کی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں غازی علم الدین دفتر میں داخل ہوئے۔ اس وقت راج پال کے دو ملازم بھی وہاں موجود تھے۔ ''کدار ناتھ'' پچھلے کمرے میں کتابیں رکھ رہا تھا جبکہ ''بھگت رام'' راجپال کے پاس ہی کھڑا تھا۔ راجپال نے درمیانے قد کے گندمی رنگ والے جوان کو دفتر میں آتے دیکھا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ موت اس کے اتنا قریب آ چکی ہے۔ علم الدین نے ابھی راجپال کو صحیح طرح پہچانا نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے پوچھا: ''راجپال کون ہے؟'' راجپال سہم سا گیا اور کہا، ''میں ہی راجپال ہوں، کیا کوئی کام ہے؟'' آپ نے بجلی کی تیزی سے چھری نکالی اور پوری قوت کے ساتھ اس کے سینے میں گھونپتے ہوئے کہا: ''بس یہی کام تھا۔'' یوں آپ نے ملعون راجپال کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور اس بدبخت کے منہ سے صرف ''ہائے'' ہی نکل سکا۔ راجپال کے سینے سے خون کے فوارے پھوٹ

رہے تھے کہ اتنے میں شور بلند ہوا:

''ایک مسلمان نے راجپال کو قتل کر دیا ہے۔ قاتل خون آلود چھرا لہراتا ہوا مشرق کی جانب چلا گیا ہے۔ پکڑو۔ پکڑو......''

اسی اثنا میں مشتعل ہندوؤں نے راہ گزرتے ایک بے گناہ مسلمان فتح محمد کو پکڑ لیا اور اسے شدید زدوکوب کیا۔ غازی علم الدین، ملعون راجپال کو قتل کرنے کے بعد بڑے سکون کے ساتھ ہسپتال روڈ سے ہوتے ہوئے حضرت قطب الدین ایبکؒ کے مزار کے قریب لکڑیوں کے ٹال پر پانی کے نل سے اپنے ہاتھ اور کپڑوں سے خون کے نشانات صاف کرنے لگے۔ اچانک انھیں خیال آیا کہ کہیں وہ ملعون زندہ ہی نہ ہو۔ چنانچہ آپ بجلی کی سی تیزی سے فوراً دوبارہ راجپال کی دکان پر آئے اور غصے سے پریس میں پڑی ہوئی ایک مشین راجپال پر دے ماری۔ اس پر ''ستیارام سوداگر چوب'' کے بیٹے ''ودیانند'' اور دیگر ہندوؤں نے آپ کو پکڑ لیا جو شور سن کر باہر نکلے تھے۔ اسی دوران راجپال کے ملازم کدارناتھ نے آپ کو پہچان لیا اور شور مچا دیا کہ یہی اصل ملزم ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد نے آپ کو قابو کر لیا۔ اس موقع پر جب غازی علم الدین کو علم ہوا کہ ملعون راجپال قتل ہو چکا ہے تو آپ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا: ''خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی کیونکہ میں نے صبح گھر سے نکلتے وقت دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! یہ سعادت آج تو مجھے ہی بخش دے''۔ اسی دوران پولیس آ گئی جس نے غازی صاحب کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے وقت غازی صاحب نے سفید رنگ کی نہایت خوبصورت شلوار قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔ ان کے سر پر گلابی رنگ کا رومال اور ایک فاتح کی طرح چہرے پر نہایت اطمینانیت اور سکون نمایاں تھا۔

لاہور کے گلی کوچوں میں راجپال کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ''راجپال اینڈ سنز'' کے مقتل کی طرف ہندو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ شہر بھر کے ہندو سہم گئے۔ ہندو مسلم کشیدگی پر قابو پانے کے لیے لاہور میں دفعہ **144** کا نفاذ کر دیا گیا۔ رات تک راجپال کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور صبح سویرے ہندوؤں کا ایک ہجوم میو ہسپتال کے اردگرد اکٹھا ہو گیا۔ پورا مجمع ہندو دھرم کی جے اور ویدک دھرم کی جے کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ وہ بھجن گا کر جلوس کو شہر میں سے گزارنے کا مطالبہ کر

رہے تھے لیکن ضلعی حکام ہندو مسلم فساد کا خطرہ مول لینے سے گریزاں تھے، اس لیے وہ ہجوم کا مطالبہ مان کر نئے مسائل میں نہیں اُلجھنا چاہتے تھے۔ بالآخر ضلعی حکام نے راجپال کی دھرم پتنی (بیوہ) سرسوتی دیوی کی طرف سے پرامن رہنے کی یقین دہانی کرانے پر لاش ورثا کے حوالے کر دی۔ راجپال کی نعش کو مہاتما ہنسراج جی نے آگ لگائی، پھر اس کی راکھ کو راوی کی تند و تیز موجوں کے سپرد کر دیا گیا۔

راجپال کے ایک ملازم کدار ناتھ نے اس قتل کی ایف آئی آر انارکلی تھانہ میں درج کرائی تھی جبکہ غازی علم دین کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پولیس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے تفتیش کا دائرہ کار وسیع کر دیا تھا جس کی وجہ سے دوران تفتیش غازی علم دین کے گھر کی ہر چیز توڑ پھوڑ کر ضائع کر دی گئی۔ غازی علم دین کے والد طالع مند کو حکومت کی ناجائز سختیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پولیس میں اکثریت سکھوں کی تھی، انھوں نے غازی صاحب کے اہل خانہ سمیت قریبی رشتہ داروں کو بے حد ذہنی اذیت دی۔ پولیس نے غازی علم دین کے بڑے بھائی محمد دین کو دہلی گیٹ لاہور کے قریب سے گرفتار کیا حالانکہ اُن کا اس واقعہ سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔

راجپال کے قتل کے بعد ہندو اخبارات و جرائد کا رویہ انتہائی متشددانہ اور دلآزار ہو گیا تھا۔ بیہودہ اداریے، مبالغہ انگیز خبریں اور غلط سلط مضامین جن میں کہا جاتا کہ ایک نہیں ہزاروں راجپال پیدا ہوں گے، ایک نہیں ہزاروں ایسی کتابیں لکھی جائیں گے۔ اس ضمن میں ہندو اخبارات ملاپ، پرتاپ، بندے ماترم وغیرہ راجپال ایسے ناپاک ذرے کو آفتاب سے تشبیہ دینے میں سفید کاغذ سیاہ کر رہے تھے۔

اسی دوران قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا قادیانی کے بڑے بیٹے اور قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین نے غازی علم الدین شہیدؒ کے سنہرے کارنامے پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا:

❑ ”اسی طرح اس قوم کا جس کے جوشیلے آدمی قتل کرتے ہیں، خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں، فرض ہے کہ پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبائے اور ان سے اظہار برأت کرے۔ انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے ذریعہ نہیں ہو سکتی، وہ نبی کیا نبی ہے جس کی عزت کو بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنا پڑیں۔ جس کے بچانے کے لیے اپنا دین تباہ کرنا

پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ کی عزت کے لیے قتل کرنا جائز ہے، سخت نادانی......

وہ لوگ (غازی علم الدین شہید، ناقل) جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں وہ بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جوان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے، وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص (راجپال کا) قاتل ہے جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پاس جاوے اور اسے سمجھائے کہ دنیاوی سزا تو تمہیں اب ملے گی ہی، لیکن قبل اس کے کہ وہ ملے، تمہیں چاہیے خدا سے صلح کر لو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔'' (خطبہ جمعہ میاں محمود احمد خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد 16 نمبر 82 ص 7-8 مورخہ 19 / اپریل 1929ء)

جلد ہی غازی علم الدین کے مقدمے کا چالان مسٹر ای ایس لوئیس (E.S. Lewis) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ پیشی کے روز غازی علم دین کو ہتھکڑیاں پہنا کر ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا۔ آپ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے اور چہرے سے کسی قسم کی مایوسی یا اُداسی نہ ٹپکتی تھی۔ مسٹر لوئیس کو سب سے پہلے پولیس کے وکیل نے استغاثہ کی کہانی سنائی۔ بعد ازاں استغاثہ کے گواہان کدار ناتھ، بھگت رام، پرمانند نانک چند اور آتما رام پیش ہوئے۔ ان سب نے اپنے انھی بیانات کو دہرایا جو قبل ازیں پولیس کو دیئے تھے۔ پوسٹ مارٹم کرنے والا سرجن بھی پیش ہوا۔ اس نے بتایا کہ مقتول کی موت اس کے پیٹ میں چھرا گھونپنے سے ہوئی۔ نقشہ نویس نے بھی پیش ہو کر اپنی کارروائی بتائی۔ اس کے بعد مسٹر لوئیس نے غازی علم الدین پر فرد جرم عائد کرتے ہوئے اس کا بیان لیا اور بغیر صفائی لیے 25 اپریل 1929ء کو مقدمہ سیشن عدالت کے سپرد کر دیا۔

سیشن کورٹ میں ایسے مقدمات سننے کے لیے بمشکل ایک سال بعد باری آتی ہے مگر ہندوؤں کے اثر ونفوذ کی وجہ سے یہ کیس صرف ایک ہفتے بعد ہی سنا جانے لگا۔ مسٹر ٹیپ (J.K.M.Tapp) سیشن جج تھے۔ ٹیپ نے رسمی کارروائی کرتے ہوئے گواہان استغاثہ کے بیانات لینے شروع کیے۔ کئی دن تک سماعت ہوتی رہی۔ غازی علم دین کی طرف سے مسٹر سلیم بار ایٹ لاء نے انتہائی مدلل دلائل دیے اور اپنی قانونی گفتگو اور بحث سے قریباً قریباً یہ ثابت کر دیا تھا کہ اصل ملزم غازی علم دین نہیں ہے کیونکہ اسے واردات کرتے ہوئے راجپال کے ملازمین نے

نہیں روکا، پھر وہ فرار بھی نہیں ہوا بلکہ اس نے آسانی سے گرفتاری دے دی، حالانکہ وہ بھاگ کر قریب ہی انارکلی کے پرہجوم بازار میں لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوسکتا تھا۔ 22 مئی 1929ء کو سلیم صاحب نے مزید دلائل دیئے اور جج صاحب سے درخواست کی کہ علم دین کسی غلط فہمی کی بنا پر مجرم بن گیا ہے اور چونکہ یہ اصل قاتل نہیں، اس لیے اسے بری کیا جائے۔ عین اسی لمحے غازی علم دین زور زور سے چلانے لگے کہ ''شاتم رسول کا قاتل میں ہوں۔ میں نے ہی اس نابکار راجپال کو جہنم رسید کیا ہے''......غازی علم الدین کے اقبال جرم کے بعد عدالت میں درمیانی مدت کا وقفہ ہوگیا، پھر کچھ ہی دیر بعد عدالت نے غازی علم دین کو موت کی سزا کا حکم سنا دیا۔ پھر ضابطہ فوجداری کی دفعہ 374 کی رو سے اپنے فیصلے کے لیے یہ مسل ہائی کورٹ میں بھجوا دی گئی۔ فیصلے کے وقت عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور فیصلے کے بعد سب لوگوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے جبکہ تنہا علم دین ہی بہت مطمئن اور مسرور تھا۔

نوجوان عاشق رسول غازی علم الدین کا مقدمہ سب مسلمانوں کا مقدمہ بن گیا تھا۔ عدالت کی طرف سے غازی علم دین کی سزائے موت کا سن کر پورے ملک میں کہرام مچنا لازمی تھا۔ لاہور میں بہت سے احتجاجی جلسے منعقد ہوئے اور ہائی کورٹ میں مقدمہ لڑنے اور کسی قابل وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے لیے چندہ مہم شروع کی گئی تو ایک خطیر رقم جمع ہوگئی۔ اس زمانے میں مسٹر تیج بہادر سپرو ایک شہرت یافتہ وکیل تھے، بعض حضرات نے ان کا نام تجویز کیا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کا گھرانہ ان دنوں علمی و ادبی اور دینی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا، علامہ اقبال خود بھی غازی علم دین کے بڑے قدردان تھے، اس لیے انھیں بھی اس مقدمہ سے بہت گہرا لگاؤ تھا اور اکثر رات کو ان کے ہمعصر دوستوں کی مجالس میں غازی صاحب کے مقدمہ کا بھی ذکر ہوتا۔ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں جب باقاعدہ یہ معاملہ پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ سر تیج بہادر سپرو ایک شہرہ آفاق وکیل ہیں اور عربی کے بہت بڑے سکالر بھی، مگر میرے خیال میں اس کیس کے لیے محمد علی جناح بہتر وکیل ثابت ہوں گے۔ سیشن کورٹ کے فیصلے کی مصدقہ نقل حاصل کرکے نامور وکلا نے اس کے بغور مطالعے کے بعد ہائی کورٹ میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کردی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال کے مشورے سے ''علم دین ڈیفنس کمیٹی'' کے معززین نے بمبئی میں قائد اعظم محمد علی جناح سے رابطہ کیا اور پھر اس کیس کی پیروی کے لیے انھیں قائل کرکے لاہور لے

آئے۔لاہور کے معروف ماہر قانون مسٹر فرخ حسین بیرسٹر ایٹ لاء نے ان کی معاونت کی۔مسٹر جے لال کپور مقتول راجپال کی جانب سے اور دیوان رام لال سرکار کی طرف سے پیش ہوئے۔ 15 جولائی 1929ء کو اس مقدمے کی سماعت جسٹس براڈوے (Broadway) اور جسٹس جان سٹون (Johnstone) ہائی کورٹ پنجاب نے کی۔اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے بڑی فاضلانہ اور مدلل بحث کرتے ہوئے عدالت کو مندرجہ ذیل نکات بتائے:

- اگر کدار ناتھ اور بھگت رام چشم دید گواہ ہیں تو ان دونوں نے مل کر مقتول کو بچانے اور قاتل کو پکڑنے کی کوشش کیوں نہ کی؟
- کدار ناتھ اور بھگت رام کی شہادت اس لیے بھی غیر مؤثر ہے کہ یہ دونوں مقتول کے ملازم ہیں۔
- تھانے کی FIR میں بھگت رام کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔اس لیے یہ شہادت غیر مؤثر ہے۔
- مقتول نے تحریر کے ذریعے مسلمانوں کی عظیم ترین مقدس ہستی حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کی جسے کوئی بھی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا۔مقتول کا یہ فعل محض اشتعال انگیزی ہے۔اس لیے ملزم کے خلاف دفعہ 302 قتل عمد کے بجائے زیر دفعہ 308 قتل بوجہ اشتعال کارروائی کی جانی چاہیے اور ملزم کو موت کے بجائے زیادہ سے زیادہ سات سال کی قید کا مستوجب سمجھنا چاہیے۔
- استغاثہ کی کہانی کے مطابق ملزم نے چھرا آتمارام دکاندار سے خریدا ہے۔آتمارام مذکور بہت ہی بوڑھا ہے،اس کی نظر اتنی کمزور ہے کہ وہ ملزم کو بآسانی شناخت نہیں کرسکتا۔
- آتمارام گواہ کا بیان ہے کہ اس نے ایک نیا چھرا ملزم کے پاس بیچا تھا۔مگر پولیس نے جو چھرا برآمد کر کے عدالت میں پیش کیا ہے، وہ پرانا ہے اور اس کی نوک شکستہ ہے، اس سے کسی انسان کا قتل ہونا مشکل ہے۔
- حضور نبی کریم ﷺ کی ذات پر رکیک حملے کرنا اور اس طرح مختلف مذاہب میں نفرت پھیلانا، زیر دفعہ 153۔الف جرم ہے۔متنازعہ کتاب انتہائی گستاخانہ اور دلآزار ہے۔اسے پڑھ کر کوئی بھی مسلمان اپنے نبی ﷺ کی عزت و ناموس کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔اندریں حالات اس جرم کو قتل عمد زیر دفعہ 302 ہرگز شمار نہیں کرنا چاہیے بلکہ زیر دفعہ 308 کے تحت پھانسی کے

بجائے زیادہ سے زیادہ سات سال قید کی سزا ملنی چاہیے۔

قائداعظم محمد علی جناح کے مدلل اور ناقابل تردید حقائق بیان کرنے کے بعد مقتول کے وکیل مسٹر جے لال کپور نے دلائل دیئے جو غازی علم دین کی اپیل کے خلاف اور اس کی موت کی سزا بحال رکھنے کے حق میں تھے۔ چونکہ حکومت میں تمام لوگ ہندو یا سکھ تھے، اس لیے رحم کی اپیل کے خلاف انھی کا زور چل رہا تھا۔ چنانچہ فریقین کے دلائل سننے کے بعد حاضرین کو کمرہ عدالت سے باہر نکلوا دیا گیا۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل رام دیوان لال کے دلائل سنے بغیر 17 جولائی 1929ء کو غازی علم دین کی اپیل خارج کر دی اور ماتحت عدالت کا فیصلہ بحال رکھا۔ اس بار بھی جب جیل میں غازی علم دین کو ہائی کورٹ میں اپیل نامنظور ہونے کے بارے میں بتایا گیا تو وہ قطعاً ملول ہونے کے بجائے بہت فرحاں وشاداں دکھائی دیے اور ان کا چہرہ تمتمارہا تھا۔

بال چراغ عشق دا میرا روشن کر دے سینہ

دل دے دیوے دی رشنائی جاوے وچ زمیناں

مسلمان اگرچہ سرکار انگلشیہ کے یکطرفہ اور معاندانہ رویے سے بہت غمگین تھے مگر پریوی کونسل (Privy Council) (برطانوی بادشاہ کی خاص مجلس مشاورت، جس کا فیصلہ حتمی اور آخری ہوتا ہے) کے دروازے پر دستک دینے میں بھی ایک خاص مصلحت کارفرما تھی جبکہ بعض راہنما تو ابتدا ہی سے مقدمہ بازی کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ غازی علم دین اور عدالت کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس معاملہ میں اپیل گناہ ہے اور غازی علم دین کو ایسی حسین موت کی آغوش سے چھین لینا غازی علم دین کی ذات پر بڑا ظلم ہے مگر علامہ اقبال اور دیگر زعماء کی رائے تھی کہ اگر اپیل نہ کی گئی تو غیر مسلم اس کا یہ مطلب نکالیں گے کہ علم دین لاوارث ہے۔ چنانچہ حجت پوری کرنے کے لیے یہ قانونی کارروائی بھی ہونی چاہیے۔ پریوی کونسل لندن میں اپیل کے لیے کافی اخراجات درکار تھے، جس کے لیے فوری طور پر چندہ جمع کیا گیا اور پھر اس اپیل کا مسودہ بھی قائداعظم محمد علی جناحؒ کی نگرانی میں تیار ہوا جس میں واقعات اور قانونی ضابطوں کی نشاندہی کرنے کے علاوہ اس امر پر زیادہ زور دیا گیا تھا کہ پریوی کونسل یہ امر تسلیم کرے کہ مسلمان اپنے آخری نبی الزمان ﷺ سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی حرمت پر کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کی سزا

موت ہونی چاہیے اور ایسے شاتم کو قتل کرنے والے کو غازی کا خطاب ملنا چاہیے۔ لیکن افسوس پریوی کونسل نے وہی کیا جس کی توقع تھی یعنی غازی علم دین کی اپیل نامنظور کر دی۔ اصل میں وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو زیادہ خوش کرنا چاہتی تھی۔ غازی علم دین کو جونہی اس فیصلے کی اطلاع ملی تو وہ ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگا کر خوشی سے اچھل پڑے اور کہا کہ ''کاتب تقدیر نے شہادت کا رتبہ پانا میری قسمت میں روزِ ازل ہی سے لکھ دیا تھا۔ ان شاء اللہ اب مجھے دربار رسالت ﷺ میں حاضری دینے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یقیناً میری قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لی ہے اور وہ دن دور نہیں، جب میری روح بہشت بریں میں آقائے نامدار ﷺ کی زیارت سے مستفید ہو رہی ہوگی......'' اس کے بعد وہ انتہائی خوش و خرم رہنے لگے اور حقیقی منزل تک پہنچنے کے لیے بے قرار نظر آنے لگے۔

پریوی کونسل کے فیصلے سے مسلمان سخت غصے میں آ گئے کہ اتنی مہذب اور متمدن قوم کے ججوں کو جو خود بھی اہل کتاب ہیں، کیوں ایک پیغمبر کی حرمت کا احساس نہ ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کے جوش و اشتعال کو دیکھتے ہوئے کہ مبادا شہر میں کہیں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات نہ شروع ہو جائیں، حکومت نے مجاہد تحفظ ناموس رسالتؐ غازی علم دین کو لاہور سے بہت دور میانوالی جیل منتقل کر دیا۔

ذیل کا واقعہ قارئین کے لیے نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مغربی پاکستان کے سابق گورنر نواب آف کالاباغ ملک محمد امیر خاں مرحوم کے والد نواب عطا محمد، غازی علم الدین شہیدؒ سے بے حد عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ وہ ہر روز صبح کے وقت غازی علم الدین کے لیے فروٹ کی ایک ٹوکری بھیجا کرتے۔ وہ میانوالی جیل میں غازی صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے اکثر حاضر ہوا کرتے۔ ایک موقع پر انھوں نے میاں طالع مند سے کہا ''اگر آپ اجازت دیں تو میں علم الدین کو (غالباً معروف زمانہ محمد خاں ڈاکو کے ذریعے) جیل سے فرار کروا دیتا ہوں'' جب یہ بات برادر غازی کے ذریعے حضرت علامہ اقبال تک پہنچی تو آپ نے فرمایا ''ہم ایسا کبھی نہ کریں گے۔ اگر غازی علم الدین کو فرار کروایا گیا تو غیر مسلم ہمیں بزدلی کا طعنہ دیں گے، وہ سمجھیں گے کہ مسلمان ناموس رسالت ﷺ پر قربان ہو جانے کے بجائے اپنی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نکالا جائے کہ غازی علم الدین اپنے اس فعل پر پچھتانے لگا تھا، پھر یہ ایک ایسا

داغ ہوگا جو کبھی دھل نہ سکے گا''۔

غازی علم الدین شہیدؒ کی عظمت پر مبنی ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ کیجیے:

❑ ''1953ء کی تحریک ختم نبوت میں عالمی مجلس تحفظِ ختم نبوت کے امیر قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ گرفتار ہو کر میانوالی جیل میں قید ہوئے۔ دورانِ قید میں ان کی ملاقات عبداللہ نامی ایک ایسے خوش نصیب قیدی وارڈن سے ہوئی جو جیل میں غازی علم الدین شہید کی نگرانی پر مامور تھا۔ عبداللہ نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو کئی مواقع پر غازی علم الدین شہیدؒ کے حالات و واقعات سنائے۔ ایک دن عبداللہ وارڈن نے قاضی صاحب کو بتایا کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ غازی علم الدین شہیدؒ والی کوٹھری میں قید ہیں۔ قاضی صاحب نے عبداللہ سے درخواست کی کہ وہ غازی علم الدین شہیدؒ کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ سنائے۔ عبداللہ وارڈن کے چہرے پر مزید نورانیت اور بشاشت اتر آئی۔ پھر اس نے بتایا کہ 31 اکتوبر 1929ء کو جب غازی علم الدین شہید کو پھانسی ہونا تھی، اس سے ایک روز پہلے میں حسب معمول غازیؒ کی کوٹھڑی کا پہرہ دے رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے میں کوٹھری سے ذرا فاصلے پر عام قیدیوں کی بیرک کی طرف آ گیا۔ مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ غازی کا کمرہ خوبصورت اور دلکش روشنیوں سے بھر گیا ہے۔ میں یہ سمجھا کہ شاید غازی علم الدین شہیدؒ نے اپنے کمرے کو آگ لگا لی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نور کا ایک بادل ہے جو تیزی سے آسمانوں کی طرف چلا گیا۔ چنانچہ میں بھاگم بھاگ غازیؒ کی کوٹھری کی طرف بھاگا۔ اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پورا کمرہ بہترین اور مسحور کن خوشبوؤں سے معطر اور منور تھا۔ غازیؒ حالت سجدہ میں زار و قطار رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اٹھے تو میں نے ان کی قدم بوسی کی اور خود بھی بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ پھر میں نے عرض کی، غازی صاحب یہ کیا ماجرا تھا؟ غازی صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر عرض کی کہ حضرت! آپ یہ اہم راز اپنے سینے میں لے کر نہ جائیں اور اس واقعہ کی تفصیلات ضرور بتائیں، بہر حال غازی صاحب نے میرے بے حد اصرار پر فرمایا، عبداللہ! تمھیں معلوم ہے کہ مجھے کل پھانسی ہو رہی ہے۔ میری دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے شافع محشر، حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اپنے خاص صحابۂ کرامؓ کے ساتھ یہاں خود تشریف لائے اور بڑی محبت اور شفقت فرمائی۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے مجھ سے پوچھا کہ غازی بیٹا! تمھیں پھانسی کا خوف تو

نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا۔ حضور! بالکل نہیں۔ فرمایا: بیٹا اگر کوئی خوف ہے تو آؤ ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے پھر عرض کیا۔ حضور! نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ پھر پیارے آقا و مولا حضور نبی کریم ﷺ نے میرے سر پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا: غازی بیٹا! پھانسی کے وقت جیل حکام تم سے تمہاری آخری خواہش پوچھیں گے، تم کہنا کہ میرے ہاتھ کھول دیں۔ میں پھانسی کا پھندا چوم کر خود اپنے گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان اپنے پیارے نبی ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تم روزہ رکھ کر آنا، میں تمام صحابہ کرامؓ اور فرشتوں کے ہمراہ حوض کوثر پر تیرا استقبال کروں گا اور ہم سب روزہ اکٹھے افطار کریں گے''۔ یہ ہے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کا صلہ!

عین اسی وقت دوسری جانب ایک عجیب ہلچل مچی ہوئی تھی۔ غازی علم دین کے ورثا کی یہ درخواست مسترد ہو گئی تھی کہ علم دین کو پھانسی میانوالی کے بجائے لاہور میں دی جائے۔ انھیں اپنے اس مطالبہ کا واضح جواب ملنے کے بجائے کسی اور ذریعہ سے اس خبر کی بھنک لگ گئی کہ علم دین کو جلد ہی پھانسی دی جائے گی اور یہ کہ میت کو بھی لاہور لانے کی اجازت نہیں...... یہ خبر پورے لاہور میں تیزی سے پھیل گئی۔ بڑی تعداد میں لوگ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں گشت کرنے لگے۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد اخبارات کے دفاتر کا رُخ کر کے تازہ ترین صورت حال جاننے کی کوشش کرتی۔ چاروں جانب ''اللہ اکبر'' کے نعرے گونجنے لگے۔ علم دین زندہ باد کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ مسلمانوں کو اس بات پر بہت اشتعال تھا کہ میت کو لاہور لانے سے روکنے کے بہانے کیوں تراشے جا رہے ہیں جبکہ غازی علم دین کی واضح وصیت ہے کہ انھیں لاہور میں دفن کیا جائے۔ مگر وقت کے حاکموں نے کسی کی ایک نہ سنی۔

31 اکتوبر **1929**ء بروز جمعرات پروانہ شمع رسالت غازی علم دین نے حسب معمول تہجد کی نماز پڑھی اور درود و وظائف میں مصروف تھے کہ انھیں کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کمرے کے بند دروازے کے سامنے ہی کسی کے رکنے کی آواز کے کھٹکے پر غازی صاحب نے جو ادھر دیکھا تو پھانسی دینے والے عملہ کو اپنا منتظر پایا۔ اس موقع پر داروغہ جیل کی آنکھوں سے شدت جذبات سے آنسو بہہ نکلے...... آپ نے اس کی طرف دیکھا اور کہا تم گواہ

رہنا کہ میری آخری آرزو کیا تھی۔ آپؒ نے معمول سے بھی کم وقت میں نماز ادا کی......اتنی جلدی آخر کس لیے تھی۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ کہیں مجسٹریٹ یہ تصور نہ کرے کہ محض زندگی کی آخری گھڑیوں کو طول دینے کے لیے دیر کر رہا ہوں۔ داروغہ جیل نے بند دروازہ کھولا......آپ اٹھے اور مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ دایاں پاؤں کمرے سے باہر رکھتے ہوئے انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا۔ چلیے ! دیر نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ تیز تیز قدم اٹھاتے تختۂ دار کی جانب چل پڑے۔ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے آپ نے ہاتھ اٹھا کر ایک قیدی کو خدا حافظ کہا......جواباً اس نے نعرۂ رسالت ﷺ بلند کیا۔ تب جیل حکام اور مجسٹریٹ کو معلوم ہوا کہ جیل میں سبھی قیدی علم الدین کو مبارک باد دینے کے لیے ساری رات سے جاگ رہے ہیں۔ کلمہ شہادت کے ورد سے فضا گونج رہی تھی۔ علم الدین لمحہ بھر کے لیے رکے...... مجسٹریٹ اور پولیس کے دستے کی طرف دیکھا، ان کے لب ہلے اور پھر چل دیے۔ تختۂ دار کے قریب متعلقہ حکام کے علاوہ مسلح پولیس کے جوان بھی کھڑے تھے۔ سب کی نظریں آپ پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کی نظروں نے اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو تختۂ دار تک پہنچتے دیکھا تھا لیکن جس شان اور قوتِ ارادی سے انھوں نے علم الدین کو تختۂ دار کی جانب بڑھتے دیکھا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ جو ''حیات'' علم الدین کو نصیب ہونے والی تھی، اس کا تو ہر مسلمان آرزومند رہتا ہے۔ اس وقت آپ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی ہوئی تھی اور آپ کو مخصوص لباس پہنا دیا گیا۔ جب مجسٹریٹ نے آپ سے آپؒ کی آخری خواہش پوچھی تو آپ نے فرمایا: ''میں پھانسی کا پھندا چوم کر خود اپنے گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں تا کہ دنیا کو معلوم ہو کہ حضور نبی کریم ﷺ کی عزت و ناموس کا دفاع کرنے والے موت سے نہیں ڈرتے اور بصد فخر و انبساط اس کا انتظار اور استقبال کرتے ہیں''۔ مجسٹریٹ نے آپ کی یہ آخری خواہش مسترد کر دی۔ بعد ازاں علم الدین کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ اس دوران میں آپ نے اردگرد کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''تم گواہ رہو کہ میں نے حرمت رسول ﷺ کے لیے راجپال کو قتل کیا ہے۔ اور گواہ رہنا کہ میں عشق رسول ﷺ میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے جان دے رہا ہوں۔ آپ نے کلمہ شہادت باآوازِ بلند پڑھا اور پھر رسنِ دار کو بوسہ دیا۔ علم الدین حقیقت میں ہر اس شے کو مبارک سمجھتے تھے جو ان کو بارگاہِ حبیب میں پہنچانے کا ذریعہ بن رہی تھی۔ آپ کے گلے میں رسہ ڈال دیا

گیا۔مجسٹریٹ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور ایک خفیف اشارے کے ساتھ ہی آپ کے پاؤں کے نیچے سے تختہ کھینچ لیا گیا...... چند لمحوں میں ہی آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی......اس نے جسم کو تڑپنے پھڑکنے کی بھی زحمت نہ ہونے دی۔گویا حضرت عزرائیلؑ نے عاشق رسول ﷺ کی جان ان کے جسم سے رسہ لٹکنے سے پہلے ہی قبض کرلی ہو اور پھانسی کی زحمت سے بچالیا ہو۔ڈاکٹر نے موت کی تصدیق کی اور آپ کی نعش کو پھانسی کے تختہ سے اتارا گیا۔ **انا للّٰہ و انا الیہ راجعون**

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

فرنگی حکومت نے غازی علم دین شہیدؒ کو موت کی سزا دے کر ہندو اکثریت کو تو خوش کرلیا تھا مگر اس سے بھی اہم مسئلہ غازی موصوف کے کفن دفن کا تھا۔انگریز کا خیال تھا کہ اگر غازی علم دین کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے میت کو لاہور بھیجا گیا تو یقیناً ہندو مسلم فسادات شروع ہو جائیں گے جن پر قابو پانا مشکل ہوگا۔غازی علم الدین شہیدؒ کی شہادت پر میانوالی میں فرنگی حکومت کے خلاف زبردست احتجاجی جلوس نکلے، ہڑتالیں ہوئیں، شہیدؒ کا سوگ منایا گیا، غم وغصہ کا اظہار رہا۔ حکومت وقت نے میانوالی کے کئی افراد کو گرفتار کیا، ان پر مقدمہ چلایا جس میں ان کو چھ چھ ماہ قید اور جرمانے کی سزا دی گئی۔غازی علم الدین شہیدؒ کی شہادت کے بعد ناعاقبت اندیش گورنر کی ہدایت کے مطابق جنازہ کے بعد غازی شہیدؒ کو بے یار و مددگار اور بے بس قوم کا فرد سمجھ کر اس کی پاک میت کو میانوالی جیل کے ایک احاطہ میں دفنا دیا گیا۔ یہ خبریں جب لاہور اور ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچیں تو پوری مسلمان قوم گھروں سے باہر آگئی اور انھوں نے غازی موصوف کی میت لینے کے لیے اپنے مطالبے میں انتہائی شدت پیدا کی۔لاہور کی تمام شاہراہوں بلکہ گلی کوچوں کے در و دیوار پر بھی جلی حروف میں لکھا پڑھا جا رہا تھا: ''غازی علم دین کی میت ملت اسلامیہ کے حوالے کرو۔'' کچھ مسلمان تو جوش ایمانی میں معہ بوریا بستر میانوالی پہنچ گئے کہ چاہے کتنی ہی مصیبت کیوں نہ اٹھانی پڑے، جب تک رسالت مآب ﷺ کے فدائی کی میت نہیں ملے گی، ہم واپس نہ آئیں گے۔چنانچہ اسی روز (31 اکتوبر 1929ء) اکابر لاہور کا ایک جلسہ تین بجے برکت علی محمڈن ہال میں بلایا گیا، جس میں اکابر اور رضا کاروں کے علاوہ اخبارات کے ایڈیٹر بھی موجود تھے۔علامہ اقبال صدرِ جلسہ قرار پائے۔چونکہ گورنر پنجاب کے بارے میں کوئی

قطعی اطلاع نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں، اس لیے جلسے کی رائے کے مطابق علامہ اقبال نے مسٹر سٹو وزیرِ فنانس سے ٹیلی فون پر وقت مقرر کر کے ان سے ملاقات کی جہاں مسٹر ایمرسن، چیف سیکرٹری بھی موجود تھے۔

یہ ملاقات ایک گھنٹے تک جاری رہی جس میں علامہ اقبال نے مسلمانانِ لاہور کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی، قیامِ امن کی ذمہ داری اٹھائی، میت کے لیے راستہ مقرر کرانے پر رضامندی اور ذمہ داری کا اظہار فرمایا مگر آخری جواب یہ ملا کہ گورنر پنجاب کے حکم کے مطابق میت کو میانوالی میں دفن کیا گیا ہے، اس لیے اب اس میں ردّوبدل نہیں ہوسکتا۔

اسی دوران میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تاروں پر سنسر ہے اور جو تار یہاں سے بھیجا جاتا ہے وہ روک لیا جاتا ہے یا دیر سے پہنچایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن بھر میں جتنے تار دیے گئے تھے، ان کا کوئی جواب نہ آیا۔

چھ بجے کے قریب علامہ اقبال مسٹر سٹو اور مسٹر ایمرسن سے مل کر برکت علی محمڈن ہال میں تشریف لائے، جہاں لوگ بدستور جمع تھے۔ علامہ ممدوح نے ساری کیفیت بیان فرمائی۔ دوبارہ فیصلہ ہوا کہ گورنر پنجاب کے پاس ایک وفد بھیجا جائے لیکن اب مصیبت یہ پیش آئی کہ گورنر کا پتہ نہ چل سکا۔ جس ذمہ دار افسر سے پوچھا گیا اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ عام خیال یہ تھا کہ دیدہ و دانستہ گورنر کے پتہ سے لاعلمی ظاہر کی جارہی ہے۔ آخر جلسۂ مشورت ملتوی کر دیا گیا۔ علامہ اقبال اور میاں امیر الدین فون کے ذریعہ سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا گورنر لاہور میں ہے یا نہیں، میاں عبدالعزیز کے ساتھ ان کے مکان پر چلے گئے۔

یکم نومبر 1929ء کو حضرت علامہ اقبال کے مکان پر ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں میاں عبدالعزیز اور دوسرے اکابر شریک ہوئے۔ ملک لال دین قیصر، ڈاکٹر سلطان محمد اور بشیر احمد خاص طور پر کوشاں تھے۔ تین بجے کے قریب ملک لال دین قیصر نے برکت علی محمڈن ہال میں ایک خاص مجلسِ شوریٰ بلا رکھی تھی۔

2 نومبر 1929ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال کی تحریک سے ایک قرارداد اس مضمون کی منظور کی گئی کہ علم الدین شہید کی نعش مسلمانوں کو نہ دینا حکومت کی سخت غلطی ہے۔ نیز اس قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ حکومت اب بھی

اس غلطی کی اصلاح کر کے مسلمانوں کے غیظ وغضب کو ٹھنڈا کرے۔

4 نومبر 1929ء کو مسلمان معززین کا ایک وفد سوا چار بجے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر پنجاب سے ملا۔ ارکانِ وفد میں سترہ میونسپل کمشنر، ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر میاں محمد شفیع، چودھری دین محمد، سیّد مراتب علی شاہ، میاں عبدالعزیز بیرسٹر اور دیگر حضرات شامل تھے۔ سر میاں محمد شفیع نے غازی علم الدین کی نعش مسلمانانِ لاہور کے حوالے کیے جانے کے لیے گورنر سے طویل گفتگو کی۔ گورنر نے جواب دیا کہ آپ کے بعض نکات ایسے ہیں کہ ان پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا میں ماتحت حکام سے مشورہ کر کے کل پانچ بجے شام مکمل جواب دوں گا۔ سر میاں محمد شفیع کا خیال تھا کہ حکومت ہمارا مطالبہ تسلیم کر لے گی۔ دیگر اراکینِ وفد بھی آپ کے ہم خیال تھے۔

غازی علم الدین کی نعش کی واپسی کے سلسلے میں اکابرِ لاہور کی مساعی جمیلہ کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ ''انقلاب'' نے لکھا:

❑ ''آج مسلم اکابرِ لاہور کا جو وفد غازی علم الدین شہید کی لاش کے لیے گورنر کی خدمت میں گیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ گورنر نے ان کو تسلی بخش جواب دیا ہے۔ مسلم اکابر میں ہر طبقے اور ہر گروہ کے بزرگ موجود تھے۔ مثلاً علامہ اقبال، سر محمد شفیع، آغا سیّد مراتب علی شاہ، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاوغیرہ تمام اصحاب نے مسلمانوں کے جذبات کی نہایت عمدہ طریق پر ترجمانی کی۔ حکومت کو امن قائم رکھنے کا پورا پورا یقین دلایا۔ کل شام کو پھر گورنر سے ملاقات ہوگی۔ اگر حکومت نے لاش دے دی جس کی بظاہر قوی امید ہے تو ہمیں بے حد خوشی ہوگی اور مسلمان بھی اس بات کی بے حد قدر کریں گے کہ ان کے مخلصانہ جذبات سے بے پروائی نہیں برتی گئی۔ مسلمانوں کا جوش وخروش ظاہر ہے، لاہور کا ایک ایک فرد قربانی پر آمادہ ہے۔ باہر کے شہروں میں بھی بے حد جوش ہے۔ میانوالی میں غیرت وحمیت آفتاب کی طرح آشکارا ہے۔ کیا ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ حکومت تمام حالات پر نظر رکھتے ہوئے صحیح فیصلہ کرے گی۔

(روزنامہ انقلاب 7 نومبر 1929ء ص 4)

حسبِ پروگرام 5 نومبر 1929ء کو مقررہ وقت پر مسلمانوں کا ایک وفد جو سر محمد اقبال، سر محمد شفیع اور ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین پر مشتمل تھا، گورنر سے ملا۔ طویل عرصہ تک گفتگو کے بعد وفد سر محمد اقبال کے مکان پر آیا اور آتے ہی ایک کمرہ میں صلاح ومشورہ شروع کر دیا۔

گورنر اور وفد کی گفتگو بالکل خفیہ رکھی گئی۔

گورنر پنجاب سے وفد کی ملاقات پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ ’’انقلاب‘‘ نے لکھا:

❑ ’’بعض خاص ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے غازی علم الدین شہید کی نعش مسلمانانِ لاہور کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن گورنر نے چند ایک شرائط پیش کی ہیں۔ گورنر کی شرائط پر غور وخوض کرنے کے لیے رہنمایانِ اسلام کا ایک پرائیویٹ اجتماع ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بنگلے یا محمڈن ہال میں منعقد ہوگا۔ جہاں اگر ضرورت ہوئی تو ان شرائط میں ترمیم یا تنسیخ کی جائے گی۔ وفد کے ارکان شرائط کا بالکل تذکرہ نہیں کرتے، یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتاتے کہ گورنر نے وفد سے کیا کچھ کہا؟ بہرحال مسلمانوں میں مختلف قسم کی افواہیں پھیل رہی ہیں۔ ایک طبقہ تو کہتا ہے کہ علم الدین کی نعش وارثوں کے حوالے کر دی جائے گی جو بادامی باغ سٹیشن سے سرکلر روڈ پر ہوتے ہوئے چوبرجی گراؤنڈ میں نمازِ جنازہ پڑھ کر ’’پیر بودیاں والہ‘‘ کے مقبرے کے پاس دفن کر دی جائے گی۔ عوام کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ بات مصدقہ طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ نعش سنٹرل جیل لاہور میں لائی جا چکی ہے یا کل پہنچ جائے گی۔ جنازہ اس صورت میں بھی یونیورسٹی گراؤنڈ میں پڑھایا جائے گا۔ مسلم راہنما کل آپس میں مشورہ کر کے چھ بجے شام پھر گورنر سے ملاقات کریں گے اور امید ہے کہ کل یا پرسوں صبح جملہ معاملات طے ہو جائیں گے۔ فساد کے متعلق مسلم رہنما...... ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر محمد شفیع، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، میاں عبدالعزیز بیرسٹر، مولوی غلام محی الدین قصوری و دیگر معزز مسلمان رہنما حکومت کو ضمانت دیں گے کہ مسلم ہجوم کو بے قابو نہیں ہونے دیا جائے گا۔‘‘ **(روزنامہ انقلاب 8 نومبر 1929ء ص 5)**

مسلمان رہنماؤں نے جس جوش وخروش اور حمیتِ اسلامی کا مظاہرہ کیا اور میاں علم الدین شہید کی نعش واپس لینے کے سلسلے میں جو شاندار خدمات انجام دیں، مسلم زعما کی مساعی جمیلہ کے بعد گورنر پنجاب نے ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

روزنامہ ’’انقلاب‘‘ علامہ اقبال، سر محمد شفیع اور دیگر اکابر کی شاندار خدمات اور کامیابی پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

❑ ’’معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ گورنر پنجاب نے علامہ اقبال، سر محمد شفیع اور دیگر مسلم اکابرین کے مطالبہ کی معقولیت اور مسلمانوں کی پُر زور ترجمانی سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ

علم الدین شہید کی نعش مسلمانانِ لاہور کے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ اس کے متعلق عنقریب ایک اعلان شائع ہونے والا ہے۔شہید کی نعش لاہور لانے میں غالباً تین چار دن اور لگ جائیں گے کیونکہ حکومت نے اُسے میانوالی سے لاہور پہنچانے کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے۔اس کے بعد یہ نعش مسلم اکابر کے حوالے کر دی جائے گی، تاکہ وہ حسب قرارداد نمازِ جنازہ ادا کر کے اُسے سپردِ خاک کر دیں۔مسلمانوں کو چاہیے کہ اب نہایت سکون سے شہید کی نعش کے آنے تک انتظار کریں۔مسلمانانِ لاہور نے اپنے اس مطالبہ میں جس کامل اتحاد کا ثبوت دیا ہے اور گورنر پنجاب نے اس مطالبہ کو تسلیم کر کے جس مدبرانہ دوراندیشی کا اظہار کیا ہے، اس کا جابجا چرچا ہو رہا ہے۔اس کامیابی کا سہرا اکابرِ لاہور، مولانا ظفر علی خان، کارکنانِ علم الدین کمیٹی اور سرفروش مجاہدین کے سر ہے۔امید کی جاتی ہے کہ ان تمام حضرات کے تعاون سے شہید کی نعش کی تدفین بوجہ احسن انجام پائے گی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہوگا۔'' (روزنامہ انقلاب 9 نومبر 1929ء ص 4)

غازی علم الدین شہید کی نعش کی واپسی کے سلسلے میں مسلم اکابر کی مساعی بار آور ثابت ہوئیں اور حکومت پنجاب نے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ شہید کی نعش کو لاہور میں دفن کرنے کی اجازت دیتے ہوئے 7 نومبر 1929ء کو مسٹر ایچ، ڈبلیو ایمرسن، چیف سیکرٹری حکومت پنجاب نے کئی ایک شرائط کے ساتھ نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ مشتہر کیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک وفد سید مراتب علی شاہ گیلانی اور مرزا مہدی حسن مجسٹریٹ کی قیادت میں 13 نومبر 1931ء کو میانوالی پہنچا۔راجہ مہدی زمان خان ڈپٹی کمشنر نے فرائض میزبانی ادا کیے۔ دوسرے دن علی الصبح شہید کی میت کو بصد احترام ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لایا گیا۔ وہاں اسے سید مراتب علی شاہ کے بنوائے ہوئے ایک مضبوط تابوت میں بند کیا گیا۔اس تابوت کے اندر جست لگا ہوا تھا اور جست پر روئی کی دبیز تہہ تھی۔ سر کی طرف نرم و ملائم تکیے رکھے تھے۔ وفد اور میانوالی کے موجود الوقت لوگوں کا بیان ہے کہ دو ہفتے گزر جانے کے باوجود میت ایسی تھی کہ جیسے ابھی انھیں شہید کیا گیا ہو حتیٰ کہ چہرے پر جلال و جمال کا حسین امتزاج تھا اور ہونٹوں پر گلاب ایسی مسکراہٹ تھی۔ قبر کی مٹی سے جنت کی خوشبو آ رہی تھی۔ میت کو گیلانی صاحب نے تابوت میں خود اپنے ہاتھوں سے رکھا اور ایک گاڑی میں اسے میانوالی ریلوے اسٹیشن لے آئے جہاں ایک سپیشل ٹرین غازی علم دین کی میت لاہور پہنچانے کے لیے منتظر کھڑی تھی۔ یہ تاریخی گاڑی شام ساڑھے

چار بجے میانوالی سے روانہ ہوئی اور 14 نومبر کو 5 بج کر 35 منٹ پر لاہور سٹیشن پر پہنچی۔ جیل کی دو گاڑیاں شہید اور اس کے محافظوں کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ محکمہ ریلوے نے میت محکمہ جیل کے حوالے کی اور محکمہ جیل نے وہ تابوت جس میں حرمت رسول ﷺ کا فدائی استراحت فرما رہا تھا، مسلم لیگ کے دو نمائندوں یعنی ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ اور سر محمد شفیع کے حوالے کر کے رسید لے لی۔ میانوالی سے لاہور تک کا سفر بہت ہی آرام اور شان و شوکت سے طے ہوا۔ ہر جگہ عوام صرف گاڑی کی زیارت کرنے کے لیے دور دور سے آئے تھے۔ جہاں جہاں گاڑی رُکی، مسلمانوں نے شہید پر اپنی عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے اور پر جوش نعرے لگائے۔

جلوس کے راستے میں جگہ جگہ میت پر پھولوں کی بارش کی گئی۔ شہید کے عقیدت مند ٹوکریوں، جھولیوں اور ٹوپیوں میں تر و تازہ پھول بھر بھر کر لا رہے تھے۔ بعض لوگ گلاب، چنبلی، موتیا اور رابیل کے عطر اور عرق کی بوتلیں انڈیل رہے تھے۔ کلمہ شہادت کا ورد بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اخبارات ضمیمے شائع کر کے تازہ ترین حالات بتا رہے تھے۔ اکثر اخبارات کے حاشیے سیاہ تھے مگر اخبار ''سیاست'' کا سرورق شہید کے خون کی طرح سرخ تھا۔ اسی اخبار کے مالک سید حبیب ایک جید عالم اور مقبول مسلم راہنما تھے۔ آپ کے آنے پر علامہ اقبال نے پوچھا کہ شہید کی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف کسے ہونا چاہیے؟ حبیب صاحب نے کہا کہ یہ شہید کے والد کا حق ہے جسے وہ نوازیں۔ طالع مند پاس ہی کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ حق مجھے ہے تو میں اسے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کو تفویض کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے سید حبیب کے مشورے سے سن رسیدہ اور عالم بے بدل مولانا سید دیدار علی شاہ انوری کا نام تجویز کیا مگر وہ رش کی وجہ سے بروقت تشریف نہ لا سکے تھے۔ چنانچہ پہلی دفعہ نمازِ جنازہ مولانا محمد شمس الدین خطیب مسجد وزیر خان نے پڑھائی اور دوسری دفعہ نمازِ جنازہ سید دیدار علی شاہ نے پڑھائی۔

نماز جنازہ کے اختتام پر میت کا جلوس پھر میانی کی طرف روانہ ہوا۔ جنازے کے جلوس نے چوبرجی سے میانی صاحب تک کا نصف میل کا فاصلہ ایک گھنٹہ میں طے کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے قبر اپنی نگرانی میں بنوائی تھی۔ یہ بہاولپور روڈ اور عید گاہ کے شمال میں ایک پختہ سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے لحد میں اتر کر اس کی جسامت کا جائزہ لیا اور کہا ''کاش! یہ مقام مجھے حاصل ہوتا''۔ مولانا محمد دیدار علی شاہ انوری اور علامہ اقبال نے میت کو اپنے

ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔لوگوں نے فرط جذبات سے لحد کے اندر اتنے پھول پھینکے کہ میت ان سے چھپ گئی۔کچی اینٹوں سے تعویذ کو بند کیا گیا۔کلمہ شہادت اور درود شریف کی گونج میں قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔

شہید ناموس رسالت غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازہ پر امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ علی پوریؒ نے اپنی روحانی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''دولت کا لالچ کیا ہے، نہ میرے دل میں کبھی حکومت کی خواہش پیدا ہوئی، نہ میں کسی دنیاوی حاکم سے آج تک کبھی مرعوب ہوا، حمد ونعت کی وارفتگی میں میری تار نفس بجتی رہتی ہے۔ میں نے کسی کے آگے بڑھ جانے کے متعلق بھی نہیں سوچا، حسد کی آگ سے خداوند قدوس نے مجھے ہمیشہ بچائے رکھا مگر غازی علم الدین شہیدؒ کا حال دیکھ کر میرے دل میں اس آرزو نے ضرور انگڑائی لی، کاش! یہ خوش قسمت موت مجھے نصیب ہوتی! میں نے بیت الحرام میں نمازیں ادا کیں، مسجد نبوی ﷺ میں سجدہ ریزیوں کا لطف بھی اٹھایا، مگر جو کیفیت غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازے میں شامل ہو کر حاصل ہوئی، وہ مجھے کسی اور جگہ نہ ملی۔کیا عجب ہے کہ خود سرکارِ دوعالم ﷺ اپنے غلام کے جنازے میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہوں اور میری اس کیفیت سرشاری کا سبب بھی یہی ہو''۔

غازی علم الدین شہید کی میت کی واپسی، نماز جنازہ اور تدفین کے سلسلے میں مسلم اکابرین کی مساعی پر انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے روزنامہ انقلاب ''ارمغانِ تشکر و سپاس'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''سر محمد شفیع، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خان، ملک لال دین قیصر، غلام مصطفیٰ حیرت، حکیم احمد حسن، جنھوں نے ہجوم کو قابو میں رکھنے کی انتہائی کوشش کی، کی خدمات قابلِ استحسان ہیں۔(روزنامہ انقلاب 16 نومبر 1929ء ص4)

علم الدین شہید کی میت کو لاہور لانے کے لیے جن بھائیوں اور بزرگوں نے جدوجہد فرمائی، ان کا دلی شکریہ۔حضرت علامہ اقبال، سر محمد شفیع، جملہ مسلم ارکان بلدیہ لاہور اور جملہ مسلم اکابر کا دلی شکریہ، جو ساری تحریک میں عام مسلمانوں کی خواہشات کے مطابق پوری کوشش فرماتے رہے اور جنھوں نے امن کی ضمانت دے کر شہید کی آخری وصیت پوری کی یعنی اسے

لاہور میں دفن کیا۔‘‘ (روزنامہ انقلاب 17 نومبر 1929ء ص 3)

شہید اعظم میاں علم الدین کی تجہیز و تکفین کے بعد 17 نومبر 1929ء کو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے چھ دیگر ممتاز رہنماؤں کے ہمراہ جن میں سر محمد شفیع، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، میاں عبدالعزیز بیرسٹر، میاں امیر الدین، سیّد محسن شاہ، ملک محمد حسین اور مولوی غلام محی الدین شامل تھے۔ مسلمانانِ لاہور کی طرف سے گورنر اور حکومتِ پنجاب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعے ایک بیان جاری کیا۔ اکابرِ لاہور کو خراجِ تحسین پیش کرتے اور حکومت پنجاب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے روزنامہ ’’انقلاب‘‘ 20 نومبر 1929ء کی اشاعت میں ’’ہدیہ تشکر و سپاس‘‘ کے عنوان سے لکھتا ہے۔

❑ ’’شہید علم الدین کی میت کے معاملے میں ہر چھوٹے بڑے مسلمان نے پوری سرگرمی اور تن دہی سے حصہ لیا اور اس لیے ہر مسلمان تشکر و سپاس خصوصی کا مستحق ہے لیکن بعض مسلمان اکابر اور بعض مسلمان خاص طور پر شکریے کے مستحق ہیں جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ علامہ اقبال، سر محمد شفیع، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا، مولانا غلام محی الدین قصوری، ایڈووکیٹ، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، تمام اسلامی اخباروں کے ایڈیٹر، ملک لال دین قیصر، بشیر احمد رفیقی، غلام مصطفیٰ حیرت، حکیم احمد حسن امرتسری، امیر بخش پہلوان۔

حضرت علامہ اقبالؒ کا حضور نبی کریم ﷺ سے لامحدود اور غیر مشروط عشق و محبت اور قلبی لگاؤ اظہر من الشّمس ہے۔ یہ تخلیقی جذبہ ان کی پوری زندگی پر محیط ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا چلا گیا۔ اس جذبہ کی بدولت علامہ اقبالؒ حکیم الامت کہلائے۔ حضور نبی کریم ﷺ سے بے پایاں عقیدت و احترام کی بناء پر علامہ اقبال عاشقان رسولؐ سے بھی بے حد محبت کرتے تھے۔ فدا کار رسالت کو سپردِ خاک کرنے کے بعد اقبال نے عرض کیا ’’غازی علم الدین شہید! جب دربارِ رسالت میں پہنچنا تو آقا و مولا کی بارگاہ میں میرا اسلام پیش کرنا اور اسلامی ممالک خصوصاً برصغیر کی سیاسی آزادی کے لیے دعا کرنا۔‘‘

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے حضرت علامہ اقبالؒ کے جو ملفوظات محفوظ کیے ہیں، ان میں علامہ اقبالؒ کا نہایت حسرت بھرے جذبات میں فرمایا ہوا یہ شہرہ آفاق جملہ بھی تھا جسے پہلی بار غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازہ کے موقع پر اور بعد ازاں کئی مجالس میں علامہ اقبالؒ کی زبان سے

بار بار سنا گیا:

- ''اسیں تے گلاں ای کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا''۔ (یعنی ہم باتیں ہی بناتے رہے اور بڑھئی کا لڑکا ہم سب سے بازی لے گیا)

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں ان ﷺ کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا!

عجیب اتفاق ہے کہ اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہے، جسے بجا طور پر داستانِ عشق رسول ﷺ کا گم شدہ ورق کہا جا سکتا ہے۔ اس واقعے کے کئی پہلو ہیں کہ اہانتِ رسول ﷺ کی ناپاک جسارت کرنے والے کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اور ہونا چاہیے؟ غیرت مند مسلمان عظمت و ناموسِ رسول ﷺ کے معاملے میں کس قدر حساس، سرفروش اور جاں نثار ہوتے ہیں؟ اور یہ کہ علامہ محمد اقبالؒ اپنے تمام فلسفیانہ افکار اور عقلیت کے باوجود ایسے موقعوں پر جذبہ عشق رسول ﷺ کا اظہار واضح طور پر کرتے تھے۔ یہ واقعہ ہے شہیدِ ناموس رسالت غازی عبدالقیوم شہیدؒ کا جو نوجوانی میں اپنے آقا و مولا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حرمت پر قربان ہو گیا۔

''روزگارِ فقیر'' کے مؤلف سید وحید الدین، غازی عبدالقیوم شہید کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ 1933ء کے اوائل کا ذکر ہے، جب سندھ صوبہ بمبئی میں شامل تھا، ان دنوں آریہ سماج حیدرآباد (سندھ) کے سیکرٹری نتھو رام نے ''ہسٹری آف اسلام'' کے نام کی ایک کتاب شائع کی، جس میں آقائے دو جہاں، سرکار دو عالم ﷺ کی شان اقدس میں سخت دریدہ ذہنی کا مظاہرہ کیا گیا، مسلمانوں میں اس کتاب کی اشاعت کے سبب بڑا اضطراب پیدا ہوا، جس سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت نے کتاب کو ضبط کیا اور نتھو رام پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا، جہاں اس پر معمولی سا جرمانہ ہوا اور ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔ عدل و انصاف کی اس نرمی نے نتھو رام کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے وی ایم فیرس جوڈیشل کمشنر کے یہاں ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ کمشنر کی عدالت نے اس گندہ دہن، شاتم رسول کی ضمانت منظور کر لی۔ اس سے مسلمانوں کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور فکر مند تھے کہ توہین رسولؐ کے اس فتنے کا سدباب آخر کس طرح کیا جائے۔ ہزارے کا رہنے والا عبدالقیوم نام کا ایک نوجوان تھا

جو کراچی میں وکٹوریہ گاڑی چلاتا تھا۔ جونا مارکیٹ کی کسی مسجد میں اس نے اس واقعہ کی تفصیل سنی اور یہ معلوم کر کے کہ ایک ہندو نے حضور سرورِ کائنات ﷺ کی توہین کی ہے، اس کے غم و اضطراب اور اندوہ و ملال کی کوئی حد نہ رہی۔ ستمبر 1934ء کا واقعہ ہے کہ مقدمہ اہانت رسولؐ کے ملزم نتھو رام کی اپیل کراچی کی عدالت میں سنی جا رہی تھی، عدالت دو انگریز ججوں کے بنچ پر مشتمل تھی۔ عدالت کا کمرہ وکیلوں اور شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔ غازی عبدالقیوم نہایت اطمینان کے ساتھ دوسرے تماشائیوں کے ساتھ وکلا کی قطار کے پیچھے نتھو رام کی برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ عین مقدمے کی سماعت کے دوران وہ اپنا تیز دھار چاقو لے کر نتھو رام پر ٹوٹ پڑا اور اس کی گردن پر دو بھرپور وار کیے۔ نتھو رام چاقو کے زخم کھا کر زور سے چیخا اور زمین پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ غازی عبدالقیوم نے پولیس کی گرفت سے بچنے اور فرار ہونے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی۔ اس نے نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ انگریز جج نے ڈائس سے اتر کر اس سے پوچھا:

تم نے اس شخص کو کیوں قتل کیا؟

غازی عبدالقیوم نے عدالت میں آویزاں جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ تصویر تمھارے بادشاہ کی ہے۔ کیا تم اپنے بادشاہ کی توہین کرنے والے کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دو گے؟ اس ہندو نے میرے آقا اور شہنشاہ کی شان میں گستاخی کی ہے جسے میری غیرت برداشت نہیں کر سکی۔''

غازی عبدالقیوم پر مقدمہ چلا۔ اس نے اقبال جرم کیا۔ آخر کار سیشن جج نے اسے سزائے موت کا حکم سنایا۔ غازی عبدالقیوم نے فیصلہ سن کر کہا:

''جج صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے، اگر میرے پاس ایک لاکھ جانیں بھی ہوتیں، تو ناموس رسول ﷺ پر نچھاور کر دیتا۔''

اس فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔ دیندار مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ غازی عبدالقیوم کا قانونی دفاع کرنے کے لیے سامنے آ گیا۔ سیّد محمد اسلم بار ایٹ لا کو عبدالقیوم کی پیروی کی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس مردِ مجاہد (عبدالقیوم) نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے قانونی مشیر پر واضح کر دیا کہ میں نے ماتحت عدالت میں جو اقبالی بیان دیا ہے، اس کے خلاف کچھ کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گا۔

غازی عبدالقیوم کے پیروکار سید محمد اسلم نے اقدام قتل کے لیے اشتعال کے مفہوم کی اہمیت پر جو قانونی نکتہ پیش کیا تھا، اگر وہ تسلیم کرلیا جاتا، تو ناموسِ رسالت ﷺ پر حملہ کرنے کی مذموم تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی اور آئندہ کوئی اس جسارت کا تصور بھی نہ کرسکتا۔ لیکن عدالت عالیہ نے یہ اپیل خارج کر دی۔ غازی عبدالقیوم کے لیے سزائے موت بحال رہی۔ پُر جوش اور مضطرب مسلمانوں کے لیے یہ وقت بڑی آزمائش کا تھا۔ بالآخر فروری 1936ء میں کراچی کے مسلمانوں نے ایک وفد حکیم الامت علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وفد جس میں مولوی ثناء اللہ، عبدالخالق اور حاجی عبدالعزیز شامل تھے، لاہور پہنچا اور میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مقدمے کی روداد تفصیل کے ساتھ سنائی۔ اس کے بعد عرض کیا کہ آپ وائسرائے سے ملاقات کریں۔ اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لائیں اور انھیں اس پر آمادہ کریں کہ غازی عبدالقیوم کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی جائے۔ وفد نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ نے سعی وتوجہ فرمائی، تو پوری توقع ہے کہ غازی عبدالقیوم کی جانب سے رحم کی اپیل حکومت ہند ضرور منظور کرلے گی۔''

علامہ اقبالؒ وفد کی یہ گفتگو سن کر دس بارہ منٹ تک بالکل خاموش رہے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وفد کے ارکان منتظر اور مضطرب تھے کہ دیکھئے علامہ کیا فرماتے ہیں۔ توقع یہی تھی کہ جواب اثبات میں ملے گا کہ ایک عاشقِ رسولؐ کا معاملہ دوسرے عاشق رسولؐ کے سامنے پیش ہے۔ اس سکوت کو پھر علامہ اقبالؒ ہی کی آواز نے توڑا۔ انھوں نے فرمایا: ''کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟'' ارکانِ وفد نے کہا: ''نہیں اس نے تو ہر عدالت میں اپنے اقدام کا اقبال اور اعتراف کیا ہے۔ اس نے نہ تو بیان تبدیل کیا اور نہ لاگ لپیٹ اور ایچ پیچ کی کوئی بات کہی۔ وہ تو کھلے خزانے کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے۔ مجھے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی کوشش مت کرو۔''

علامہ صاحبؒ اس مقدمہ سے پہلے ہی آگاہ تھے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ انھوں نے برہمی کے لہجے میں فرمایا: ''جب عبدالقیوم خود کہہ رہا ہے کہ میں نے یہ شہادت خریدی ہے تو میں اس کے اجر وثواب میں کیسے حائل ہوسکتا ہوں؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایک ایسے مسلمان کے لیے وائسرائے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو غازی اور مر گیا تو شہید ہے؟''

چنانچہ وہ وفد چپ چاپ کراچی واپس آ گیا۔ رحم کی اپیل مسترد ہونے کے فوراً بعد 19 مارچ 1935ء کو صبح 4 بجے چپکے سے غازی عبدالقیوم کو تختہ دار پر چڑھا کر پھانسی دے دی گئی۔ شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ نے غازی عبدالقیوم کے جذبہ جوش شہادت سے کافی اثر قبول کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ''ضربِ کلیم'' میں غازی علم دین شہیدؒ اور غازی عبدالقیوم شہیدؒ کو ''لاہور و کراچی'' کے عنوان سے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین وعقیدت یوں پیش کیا:

ے نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خون جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ ''**لا تدع مع اللّٰہ الٰھا آخر!**''

بقول جناب نذیر نیازی: ''علامہ اقبال کے ان اشعار میں کس قدر عزیمت اور استقامت پائی جاتی ہے۔ تیسرے شعر میں توحید خالص کو کتنے دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان اشعار سے اس کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس قسم کے واردات و معاملات میں علامہ کا اندازِ فکر کیا تھا۔ لاہور اور کراچی میں عشق رسول ﷺ کی ان زریں مثالوں کے لیے یہ اشعار زندۂ جاوید خراجِ عقیدت ہیں''۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را''

(روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین جلد دوم ص 39)

ظفر علی راجا ایڈووکیٹ

اقبال اور قانون توہین رسالت ﷺ

یہ ایک تسلیم شدہ قانونی حقیقت ہے کہ کسی فریق کے کردار اور قانونی رویّے جانچنے کے لیے تین امور کو پیمانہ بنایا جاتا ہے۔یعنی

1- ذہنی رجحان (STATE OF MIND)

2- بیان (STATEMENTS)

3- عمل (CONDUCT)

توہین رسالت ﷺ کے حوالے سے دیکھا جائے تو بیرسٹر محمد اقبال مندرجہ بالا تینوں پیمانوں کے مطابق شاتم رسولؐ کی سزائے موت کے حوالے سے اپنا ایک نظریہ رکھتے تھے۔شاتمِ رسولؐ کے لیے موت کی سزا کا قانون حدیث اور سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے۔لیکن چونکہ تعزیراتِ ہند میں ایسا کوئی قانون موجود نہیں تھا جسے روبہ عمل لا کر شاتمانِ رسولؐ کو رائج الوقت عدالتی نظام کے ذریعے قرار واقعی سزا سنائی جا سکتی، اس لیے گاہے بگاہے مسلمان نوجوان اپنے پیغمبر ﷺ کی توہین برداشت نہ کر پاتے تھے اور مذکورہ جرم کے مرتکب شخص کو غیرتِ اسلامی کے تحت موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔بیرسٹر محمد اقبال کی زندگی میں دو ایسے واقعات پیش آئے۔اس کے علاوہ کشمیر میں قرآن کی توہین اور لاہور میں مسجد شہید کرنے کے سانحات بھی رونما ہوئے۔ان تمام جرائم پر مقدمات میں تعزیراتِ ہند کے مطابق ججوں نے فیصلے سنائے۔لیکن علامہ اقبالؒ نے اپنے قول و فعل سے ثابت کیا کہ وہ تعزیراتِ ہند کے مقابلہ میں اسلامی تعزیری قانون کو ترجیح دیتے ہیں۔اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کے قول و فعل کی تصدیق مندرجہ ذیل واقعات سے ہوتی ہے۔

سلیم یوسف چشتی نے اپنے ایک مضمون ’’اقبال کے بعض ملفوظات‘‘ میں اقبال سے ایک ملاقات کا احوال قلمبند کیا ہے۔یہ ملاقات 3راکتوبر 1930ء کو بیرسٹر اقبال کے میکلوڈ روڈ

والے گھر (یا دفتر) میں ہوئی تھی۔ سلیم یوسف چشتی راوی ہیں کہ انہوں نے ایک جرمن عالم الٰہیات شلائر میخر کی کتاب میں پڑھا کہ مذہب کی بنیاد عقل کے بجائے فیلنگ (FEELINGS) پر ہے تو مذکورہ ملاقات میں اس فلسفے کی روشنی میں اقبال سے یہ سوال کیا:

''مذہب کا دارومدار عقل پر ہے یا جذبات پر؟''

یہ سُن کر اقبال نے فرمایا:

''یہ سوال ہی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایگو (EGO) یعنی خودی اپنے اِردگرد کی دنیا کا جائزہ لیتی ہے تو اس میں جذبہ، شعور اور ارادہ تینوں کارفرما ہوتے ہیں۔ مذہب کا تعلق انسان سے ان تینوں پہلوؤں سے ہے۔ کوئی جذبہ ایسا نہیں جس میں خودی کے دوسرے پہلو (شعور اور ارادہ) شامل نہ ہوں۔ انسان خالص جذبات یا خالص شعور یا خالص ارادے سے نا آشنا ہے۔ مثلاً علم الدین شہید کا جذبہ اس کی مکمل شخصیت کی گہرائی سے ابھرا تھا اور اس میں شعور اور ارادہ بھی شامل تھا۔''

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس گفتگو کے حوالے سے لکھا ہے کہ اقبال تا دمِ وفات علم الدین کے عشق رسول ﷺ کے مداح رہے اور ہمیشہ اس کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

(منتخب مقالات۔ اقبال ریویو مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، صفحہ 410)

خواجہ عبدالوحید لاہور کی سماجی زندگی کے شناسا تھے۔ وہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے بچپن میں اقبال کو دیکھا اور اقبال کی زندگی کے آخری ایام تک ان کا تعلق خاطر قائم رہا۔ اندرون بھاٹی دروازے میں خواجہ عبدالوحید کے والد خواجہ کریم بخش کی رہائش گاہ لاہور کا ایک اہم ادبی مرکز گردانی جاتی تھی۔ یہاں بیرسٹر سر عبدالقادر، مولوی احمد دین وکیل، بیرسٹر شہاب الدین، اسلامی قوانین کے ماہر مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا ظفر علی خان اور بیرسٹر شیخ محمد اقبال اکثر اپنی شامیں گزارا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالوحید نے اپنی ڈائری میں 29/اپریل 1935ء کے دن حسب ذیل عبارت لکھی:

''پرسوں رات علامہ سر محمد اقبال نے بڑی پُر جوش باتیں کیں۔ جب کبھی ان سے ملتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ ان کی باتیں لکھتا جاؤں لیکن ایسا نہیں ہوسکتا اور بعد میں اکثر باتیں بھول جاتا ہوں۔ اس روز آپ نے فرمایا...... ''جو جذبہ آج شاتم رسولؐ کی سزا کے طور پر ہندو کے

خلاف ظاہر ہو رہا ہے وہ عنقریب انگریزوں کی طرف رُخ پھیرنے والا ہے۔" (خواجہ عبدالوحید کی "یادایام" میں ذکر اقبال، مضمون ڈاکٹر انور سدید، روزنامہ نوائے وقت 21/اپریل 2011ء)

شاتم رسولؐ کی سزا کے حوالے سے بیرسٹر محمد اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا، ان کی بنیاد غازی عبدالقیوم شہید اور غازی علم الدین شہید کے وہ اقدامات تھے جن کے نتیجے میں دو شاتمانِ رسولؐ کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

توہین رسالت کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کے سلسلے میں بیرسٹر اقبال کی کاوشات کا اندازہ اس بات سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہسپتال روڈ لاہور کے ایک ہندو کتب فروش راجپال نے توہین رسالت پر مبنی کتاب "رنگیلا رسول" شائع کی تو لاہور کے ساتھ ساتھ دیگر شہروں میں بھی مسلمانوں نے راجپال کی اس جسارت کے خلاف عمومی مظاہرے شروع کر دیئے۔ اس پر صورتِ حال کو منظّم رکھنے کے لیے بیرسٹر اقبال نے ایک خصوصی اجلاس بلایا۔ اس اجلاس میں بڑے مشہور اور خطاب یافتہ وکلا اور جج صاحبان نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں ناموسِ رسول ﷺ پر حملہ کرنے والوں کے خلاف استغاثہ دائر کرنے والے مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندگان بھی شامل کئے گئے۔ استغاثہ مکمل ہونے پر مروجہ طریقہ کار کے مطابق اسے مسٹر فیل بوتھ (اینگلوانڈین) مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر کیا گیا۔ استغاثے کی پیروی کے لیے اقبال کے مشورے سے شیخ محمد نصیب ایڈووکیٹ کو منتخب کیا گیا تھا۔ اقبال کے کہنے پر شیخ محمد نصیب نے مولانا غلام مرشد سے متعدد ملاقاتیں کیں اور جرح و بحث کی تیاری کی۔ مولانا غلام مرشد بتاتے ہیں کہ مقدمہ کی تیاری کے سلسلے میں مشاورت کے دوران اکثر علامہ اقبال کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ مقدمہ جب انجام کو پہنچا تو عدالت نے راجپال کو مجرم قرار دے کر چھ ماہ کی سزا سنا دی۔ (اقبالیات نقوش از تسلیم احمد تصور، صفحہ 268 تا 271) اس فیصلے پر اقبال نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ (بعد ازاں راجپال نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی جسے ایک غیر مسلم جج نے سنا اور راجپال کو بری کر دیا)۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ 6 اپریل 1929ء کو جبکہ راجپال اپنی دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ محلّہ سریانوالہ اندرون شہر کے ایک ترکھان علم الدین نے چاقو سے حملہ کر کے اسے واصل جہنم کر دیا۔ علم الدین کے خلاف تعزیرات ہند کی دفعہ 302 کے تحت مقدمہ چلا۔ مقدمہ کے اختتام پر سیشن جج لاہور نے

مورخہ 22 مئی 1929ء کو علم الدین کو سزائے موت سنائی۔اس فیصلے کے خلاف علم الدین کی طرف سے لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔علم الدین کی جانب سے اپیل کی پیروی بیرسٹر محمد علی جناح اور بیرسٹر فرخ حسین نے کی۔اپیل کا فیصلہ 15 جولائی 1929ء کو سنایا گیا جس میں سزائے موت کی توثیق کی گئی۔اس کے بعد علم الدین کی جانب سے لندن میں رحم کی اپیل کی گئی۔ یہ اپیل بھی مسترد کر دی گئی۔ 31 اکتوبر 1929ء کو میانوالی کی جیل میں اس عاشق رسولؐ کو تختہ دار پر کھینچ دیا گیا۔اس طرح اٹھارہ انیس سال کا یہ نوجوان شہادت کا رتبۂ بلند پر فائز ہو کر مکین جنت بنا۔

غازی علم الدین کا مقدمہ لاہور کی سیشن عدالت میں زیر سماعت تھا۔ ہندو جاتی راجپال کے قتل پر احتجاج کا دائرہ وسیع کر رہی تھی۔ 9/اپریل کو اس سلسلے میں ہندوؤں نے لاہور کے علاوہ قصور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گجرات، راولپنڈی، گوجر خان، راجہ جنگ، کوہاٹ اور موجودہ آزاد کشمیر کے اضلاع میرپور اور کوٹلی میں احتجاجی اجلاس منعقد کیے۔ان اجلاسوں میں راجپال کے قتل کی مذمت اور غازی علم الدین کو سزائے موت دینے کے مطالبات کیے گئے۔ ہندوؤں کے اس احتجاجی دباؤ کا توڑ کرنے کے لیے لاہور میں بیرسٹر محمد اقبال، بیرسٹر میاں عبدالعزیز، بیرسٹر محمد شفیع اور مراتب علی شاہ نے ایک اجلاس میں علم الدین کے حق میں قرارداد پاس کروائی۔اس کے بعد اس کی پیروی میں دوسرے شہروں کے مسلمانوں نے بھی علم الدین کے حق میں قراردادیں پاس کیں۔(غازی علم الدین شہید از ظفر اقبال نگینہ صفحہ 47) موجودہ آزاد کشمیر کے اضلاع میرپور اور کوٹلی تک ان قراردادوں کا سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

غازی علم الدین کے مقدمہ کی پیروی کا آغاز بیرسٹر فرخ حسین نے کیا۔ بعدازاں اس ذمہ داری میں بیرسٹر خواجہ فیروزالدین بھی شامل ہو گئے۔(غازی علم الدین شہید از ظفر اقبال نگینہ صفحہ 52) بیرسٹر خواجہ فیروزالدین اقبال کے نہ صرف بہت عقیدت مند تھے بلکہ ان کے رشتہ دار بھی تھے۔اس لیے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ انہوں نے یہ ذمہ داری سنبھالنے سے قبل بیرسٹر اقبال سے مشورہ نہ کیا ہو۔خود علامہ اقبالؒ چونکہ توہین رسالت کے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے حق میں تھے اور ان کا ایمان تھا کہ شاتمِ رسولؐ کو جہنم واصل کرنے والا جنت اور بخشش کا حقدار بن جاتا ہے۔اس لیے وہ قانونی حیلہ سازیوں کے ذریعے اس کی آخرت کو خراب کرنے کے حق میں رائے نہیں دیتے تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ان غازیان اسلام سے پوری ہمدردی رکھنے کے

باوجود ان کے خلاف قائم مقدمات میں بطور وکیل شامل نہیں ہوئے۔

لاہور کے دانشوروں اور قانون دانوں نے باہمی رضامندی سے علم الدین ڈیفنس کمیٹی بھی تشکیل دی۔ اس کمیٹی میں بھی بیرسٹر عبدالعزیز، بیرسٹر محمد شفیع اور بیرسٹر اقبال شریک ہوتے رہے۔ غازی علم الدین پر تحقیق کے حوالے سے خصوصی شہرت رکھنے والے وکیل سیف الحق ضیائی نے راقم الحروف کو مولانا محمد بخش مسلم اور بیرسٹر عبدالعزیز مالواڈہ کے حوالے سے بتایا کہ مقدمے کے دوران بیرسٹر اقبال شروع سے آخیر تک عدالتی کارروائی سے آگاہی حاصل کرتے رہے۔ ایسا بھی ہوا کہ غازی علم الدین سیشن کورٹ میں مقدمہ کی پیشی پر آئے تو بیرسٹر اقبال نے ان کا ماتھا چوما اور سینے سے سینہ لگا کر ملے۔ اس روایت کا ذکر سیف الحق ضیائی ایڈووکیٹ نے اپنی کتاب غازی علم الدین شہید میں بھی کیا ہے۔ (غازی علم الدین شہید از سیف الحق ضیائی صفحہ 205)

لاہور ہائی کورٹ میں 2011ء کے دوران بیرسٹر فاروق حسن نے غازی علم الدین کا کیس ری اوپن کرنے کے لیے رِٹ دائر کی۔ اس رِٹ کے ایک پیرے سے انکشاف ہوتا ہے کہ سزائے موت کے خلاف اپیل میں وکالت کے لیے بیرسٹر محمد علی جناح کو وکیل مقرر کرنے میں بھی بیرسٹر محمد اقبال سے مشورہ کیا گیا تھا اور علم الدین ڈیفنس کمیٹی کی جانب سے بیرسٹر اقبال نے بیرسٹر محمد علی جناح کو پانچ سو روپے فیس بذریعہ منی آرڈر ارسال کی تھی۔ بیرسٹر محمد علی جناح نے یہ فیس وصول کر کے رسید واپس بھجوائی اور اس کے ساتھ ایک ہزار روپے کا منی آرڈر اپنی طرف سے بھیجا اور ہدایت کی کہ یہ رقم علم الدین ڈیفنس کمیٹی کے فنڈ میں جمع کر لی جائے۔

غازی علم الدین کو 31/اکتوبر 1929ء کے دن میانوالی میں پھانسی دی گئی۔ اس روز جیل کے باہر علم الدین کے والد طالع مند اور سینکڑوں مسلمان انتظار میں موجود تھے کہ وہ غازی کا جسدِ خاکی وصول کر کے شانِ شایان طریقے سے شہید کی تدفین کریں گے۔ لیکن حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے جیل حکام نے حکومت سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ شہید کی نعش مسلمانوں کے حوالے نہ کی جائے۔ فسادِ خلق کے خوف سے جیل حکام نے قیدیوں کے قبرستان میں ایک گڑھا کھود کر اس میں شہید کی نعش کو بغیر غسل دیئے رکھا اور اس کے اوپر ایک کمبل ڈال کر اسے پاٹ دیا۔ اس خبر کے باہر آتے ہی مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار زمیندار کا خصوصی ضمیمہ شائع کیا۔ جس کی شہ سرخی میں لکھا تھا:

''میاں علم الدین جنت میں جا پہنچے''

''حکام نے ان کی نعش ان کے والد کی اجازت کے بغیر جیل کے احاطہ میں دفن کر دی۔ سرکار کی فرعونیت اور حکام کے عدمِ تدبر کا شرمناک مظاہرہ۔''

مسلمانانِ ہند نے جب یہ خبر پڑھی تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ماتمی جلوس نکلنے لگے۔ ہڑتالیں، جلسے اور قراردادیں پاس ہونے لگیں۔ غازی کا جسدِ خاکی وارثان کے حوالے کرنے کے پُر جوش مطالبے ہونے لگے۔ ہزاروں لوگ میانوالی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیل حکام اس صورتِ حال سے خوف زدہ ہو گئے اور انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں لوگ زبردستی شہید کا جسدِ خاکی نکال کر نہ لے جائیں۔ لہٰذا اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے پولیس کے مسلح دستے قبرستان میں متعین کر دیئے گئے۔

31 اکتوبر کو لاہور میں مسلمانوں کا ایک بڑا جلوس ننگے سر نکلا۔ اندرون لاہور سے سفر کا آغاز کر کے یہ جلوس بھاٹی دروازہ سے گزر کر بلدیہ کے باغات سے موری گیٹ، لوہاری گیٹ اور شاہ عالمی دروازے سے ہوتا ہوا موچی دروازہ پہنچا جہاں بہت بڑا جلسہ ہوا اور مقررین نے علم الدین شہید کے جسدِ خاکی کے حصول کے لیے پُر جوش تقاریر کیں۔ جلوس کے احترام میں مسلمانوں نے اپنی دکانیں بند رکھیں۔ مسلمانوں کی مشتعل جذباتی کیفیت کے پیشِ نظر بیرسٹر سر محمد شفیع، بیرسٹر محمد اقبال، بیرسٹر عبدالعزیز اور مولانا محی الدین قصوری پر مشتمل ایک وفد نے گورنر پنجاب سے ملاقات کی اور نعش کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ جوابی طور پر گورنر نے یہ مطالبات وفد کے سامنے رکھے کہ:

''موجودہ ایجی ٹیشن کو بند کیا جائے۔ اخبارات ایسی خبریں اور مضامین شائع نہ کریں جن سے حالات خراب ہوں۔ جلسے جلوس روک دیئے جائیں۔ نعش لے کر لاہور شہر کے اندر جلوس نہ نکالا جائے اور جنازہ میں شریک لوگ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے کسی خاص قوم کے جذبات کو ٹھیس لگے۔''

بیرسٹر اقبال اور دیگر قانون دانوں نے باہم مشورے کے بعد وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے ان امور پر عمل کے لیے اپیل کریں گے۔ گورنر نے صورتِ حال پر مزید غور کے لیے وقت مانگا۔ لہٰذا شام سات بجے بیرسٹر اقبال، بیرسٹر سر محمد شفیع، بیرسٹر عبدالعزیز اور مولانا محی الدین

قصوری نے دوبارہ گورنر سے ملاقات کی جس میں طے پایا کہ نعش کی حوالگی کی اطلاع مسلمانوں کو بیس گھنٹے پہلے دی جائے گی اور ایک مسلمان مجسٹریٹ شہید کی نعش میانوالی سے لاہور لائے گا۔

13 نومبر کو ایک سپیشل ٹرین علم الدین شہید کی صندوق میں بند نعش لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوئی اور بغیر کہیں رکے ہوئے لاہور چھاؤنی کے سٹیشن پر ٹھہر گئی۔ بعدازاں شہید کی نعش سینٹرل جیل کے حکام کے حوالے کی گئی جنہوں نے پونے سات بجے پونچھ ہاؤس کے سامنے بیرسٹر اقبال، بیرسٹر سر محمد شفیع اور میونسپل کمشنر کی موجودگی میں مسلمان معززین کے حوالے کر کے باقاعدہ رسید حاصل کی۔ سات بجے کے قریب میّت چوبرجی کی جنازگاہ میں لائی گئی۔ 14/نومبر کی صبح جنازے کا وقت مقرر ہوا۔ علی الصبح مولانا سیّد حبیب کے جنازگاہ میں پہنچنے پر بیرسٹر محمد اقبال نے سوال کیا کہ جنازہ کون پڑھائے گا۔ شہید علم الدین کے والد سے پوچھا گیا تو انہوں نے یہ حق اقبال کو دے دیا۔ اقبال نے سیّد حبیب سے مشورے کے بعد حضرت مولانا سیّد محمد دیدار علی شاہ کا اسم گرامی تجویز کیا۔ لیکن شاہ صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کے آنے میں تاخیر ہو سکتی ہے، اس صورت حال میں دوسری مرتبہ قاری محمد شمس الدین کا نام تجویز ہوا جو مسجد وزیر خان کے امام تھے۔ لہٰذا نماز جنازہ قاری محمد شمس الدین نے پڑھائی۔ جنازے میں شرکت کے لیے مسلمانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تابوت کے ساتھ چل رہا تھا جس میں مستورات کی بھی ایک بڑی تعداد کلمہ شہادت کا ورد کر رہی تھی۔ تمام راستہ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب تدفین کے مراحل شروع ہوئے تو مولانا ظفر علی خان تدفین سے قبل شہید کے لیے بنائی قبر میں اتر گئے اور فرمایا:

''کاش یہ سعادت مجھے نصیب ہوتی''

شہید کے لاشے کو اشک بار آنکھوں کے ساتھ جن لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا، ان میں بیرسٹر محمد اقبال بھی شامل تھے۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا:

❑ ''یہ جوان ہم سب پڑھے لکھوں سے بازی لے گیا۔''

جنازے کے جلوس میں آغاز سے اختتام تک بیرسٹر محمد شفیع، بیرسٹر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خان، حکیم احمد حسن، غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال خان قیصر ہجوم کو پُرسکون اور قابو میں رکھنے کے لیے مصروفِ عمل رہے۔ 18 نومبر کو مذکورہ بالا کمیٹی کی جانب سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے

ذریعے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا گیا:

''چونکہ میاں علم الدین شہید کی میّت حکام نے ہمارے حوالہ کردی اور شہید کی وصیت کے مطابق امن اور بغیر کسی ناگوار واقعہ کے میانی صاحب میں سپرد خاک کردی گئی۔ ہم مسلم قوم کی طرف سے ہز ایکسیلینسی سر جافرے ڈی مونٹ مورنسی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے از راہ عنایت ہمارے وفد کی اس درخواست کو قبول کر لیا کہ میّت لاہور میں دفن کرنے کے لیے ہمارے حوالے کر دی جائے۔ حکومت پنجاب کی طرف سے دور اندیشانہ یہ فعل نہ صرف اہل وفد بلکہ تمام مسلم قوم کے لیے عمیق اطمینان کا موجب ہوا ہے۔ جنازہ کے موقع پر مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع نے جس بردباری کا ثبوت دیا ہے، تمام جماعتوں اور مسالک کے باشندگانِ لاہور اس کی تعریف کرتے ہیں۔''

اس اعلان پر جن اکابر نے دستخط کیے ان میں بیرسٹر محمد شفیع، بیرسٹر ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال، بیرسٹر میاں عبدالعزیز، سیّد محسن شاہ ایڈووکیٹ جیسے قانون دانوں کے علاوہ میاں امیر الدین، ملک محمد حسین اور مولوی غلام محی الدین کے نام نامی شامل ہیں۔

توہین رسالت ﷺ اور ختم نبوت سے متعلق اسلام کے قانون اور عقیدے پر اقبال کے تحریر کردہ ایک انگریزی مضمون کا حوالہ بھی اہم ہے۔ اس مضمون کا عنوان "ISLAM AND AHMEDISM" ہے۔ بیرسٹر اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کی جاری کردہ احمدی تحریک پر مباحث کے تسلسل میں اپنا نکتہ نظر واضح کرنے کے لیے یہ مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ مذکورہ مضمون پہلی مرتبہ مجلّہ ''اسلام'' کی اشاعت 22 جنوری 1936ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوا۔ (تصنیفات اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ صفحہ 337) بعد ازاں اس مضمون کا اردو ترجمہ تصدق حسین تاج نے کیا اور اسے اپنی مرتب کردہ کتاب ''مضامین اقبال'' میں شائع کیا۔ یہ کتاب 1943ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس مضمون میں ختم نبوت اور توہین رسالت ﷺ کی سزا سے متعلق اقبال کی تحریر کا ایک اقتباس اس طرح ہے۔

❑ ''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یا کہ مجھے الہام ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل ہے۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا...... حالانکہ

جیسا طبری لکھتا ہے وہ حضور رسالت مآبؐ کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالت مآبؐ کی نبوت کی تصدیق تھی......'' (مضامین اقبال از تصدق حسین تاج، تصنیفات اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ......رفیع الدین ہاشمی صفحہ 362، روزنامہ نوائے وقت، کالم: علامہ اقبال اور اصول ختم نبوت (محمد آصف بھلی ایڈووکیٹ)، مورخہ 21 ستمبر 2011ء)

علم الدین شہید کی پھانسی کے بعد ایک روز کچھ طلبا بیرسٹر اقبال سے ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں سے ایک طالب علم محمد محمود نے ان سے سوال کیا:

''علم الدین کی موت شہادت ہے یا نہیں۔''

اقبال نے جواب دیا:

''اس کا انحصار نیت پر ہے۔ اگر یہ حقیقت ذہن میں ہو کہ حملہ آور کا اصل مقصد پیغمبر کے ذاتی وقار کو نقصان پہنچانا ہی نہیں بلکہ اس کے لائے ہوئے پیغام کو مجروح اور اس ایمان محکم کو متزلزل کرنا ہے جو اس پیغام رشد و ہدایت پر قائم و استوار ہے تو یہ حملہ صرف انسانی یا پیغمبرانہ وقار کا قتل نہیں رہتا بلکہ اس ایمان اور عقیدہ کا قتل بھی بن جاتا ہے۔ اس کوشش یا اقدام کے خلاف ہر مدافعت یقیناً اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہے اور وہی اس کا ٹھیک ٹھیک اجر دینے والا ہے۔''

فقیر سیّد وحیدالدین جو اس موقع پر موجود تھے، لکھتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد اقبال نے نہایت رقت انگیز لہجہ میں فرمایا: ''میں تو یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص میرے پاس آ کر کہے کہ تمہارے پیغمبرؐ نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔''

(روزگارِ فقیر سیّد وحیدالدین صفحہ 113)

بیرسٹر اقبال اسلام کے قانونِ توہین رسالت پر ایمان رکھتے تھے اور چونکہ تعزیراتِ ہند میں ایسا کوئی قانون موجود نہیں تھا جو اسلامی قانون کا متبادل ہوسکتا اور اس کے مطابق شاتمانِ رسولؐ کو سزا مل سکتی، اس لیے وہ تعزیراتِ ہند کے تحت علم الدین اور عبدالقیوم جیسے غازیوں کے مقدمات میں بطور وکیل خدمات دینا ان غازیان کے اجر و ثواب کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف خیال کرتے تھے۔ اس بات کا ثبوت اقبال کی مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات میں ہونے والی گفتگو سے بھی ملتا ہے۔ عدالتوں نے غازی عبدالقیوم کی جب حتمی طور پر

سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا تو مسلمانوں کا ایک وفد بیرسٹر اقبال کے پاس آیا اور اقبال سے استدعا کی کہ وہ وائسرائے ہند کے پاس رحم کی اپیل داخل کریں اور کوشش کریں کہ سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہو جائے۔ اقبال نے کچھ دیر اپیل کی تجویز پر غور کے بعد دریافت کیا کہ کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے۔ جواب میں وفد نے بتایا کہ نہیں وہ تو بار بار کہتا ہے کہ میں نے گستاخ رسولؐ کو قتل کر کے شہادت خریدی ہے، مجھے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی کوشش مت کرو۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے تو میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں۔ (مکالماتِ اقبال، راشد سعید، صفحہ 163، 164)

راشد سعید اپنی کتاب ''مکالمات اقبال'' میں لکھتے ہیں کہ ''ضربِ کلیم'' میں لاہور اور کراچی کے عنوان سے جو اشعار ہیں، وہ (علم الدین شہید کے مقدمے) اور غازی عبدالقیوم کی رحم کی اپیل دائر کرنے سے بیرسٹر اقبال کے انکار کے پس منظر میں دیکھنا چاہئیں۔ اقبال نے توہینِ رسالت کے حوالے سے ہندوستان یا برطانیہ کی عدالتوں سے انصاف طلب کرنے کو بے فائدہ قرار دیا اور بہ زبان شاعری کہا۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے، فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر

بیرسٹر اقبال نے اپنی زندگی ہی میں مذہبی اہمیت کے مقامات اور انبیا کرام کی توہین کے خلاف قانون سازی کی کاوشات کا آغاز کر دیا تھا اور اس سلسلے میں ایک مسوّدہ قانون بھی تیار کر لیا تھا۔

تعزیراتِ ہند پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ 1898ء میں فوجداری قانون میں دفعہ 158-A کا اضافہ کیا گیا جس میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے اور اس کے نتیجے میں فتنہ فساد پھیلانے والوں کو دو سال قید اور جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی تھیں۔ شاتمانِ رسولؐ کے خلاف مقدمات بھی اسی دفعہ کے تحت عدالتوں میں زیرِ سماعت آتے تھے۔ 1927ء میں مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے دفعہ 295-A کو فوجداری قوانین میں شامل کیا گیا۔ اس دفعہ

میں کہا گیا تھا کہ مذہب یا مذہبی عقائد کی توہین کرنے یا ایسی کوشش کرنے والے کو دوسال تک قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔

قانون توہین رسالت و مذہب کے حوالے سے بیرسٹر اقبال نے جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد 23/مارچ 1956ء سے شروع ہوا جب دفعہ 295-A میں پہلی ترمیم کی گئی۔ بعد ازاں 1980ء میں ایک ترمیمی آرڈیننس کے ذریعے تعزیراتِ پاکستان میں 298-A کا اضافہ کیا گیا جس کے ذریعے اُمہات المؤمنین، اہل بیتؓ یا خلفائے راشدینؓ یا اصحابِ رسولؐ کی بے حرمتی، توہین یا ان پر طعنہ زنی اور بہتان تراشی پر تین سال کی سزا یا سزائے تازیانہ یا بیک وقت دونوں سزائیں نافذ العمل بنائی گئیں لیکن اس قانون میں کوتاہی یہ ہوئی کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی تھی۔

بعد ازاں ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس کے قانون دانوں سے طویل مشاورت کے بعد، جن میں سپریم کورٹ کے سینئر وکیل جناب محمد اسماعیل قریشی اور یہ خاکسار راقم الحروف بھی شامل تھا، قومی اسمبلی کی رکن محترمہ نثار فاطمہ نے قومی اسمبلی میں بل پیش کیا جو فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ نمبر 3 سال 1986ء کی صورت میں منظور ہوا۔ اس کے نتیجے میں تعزیراتِ پاکستان میں دفعہ 295 سی کا اضافہ کیا گیا۔ اس دفعہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

حضور نبی کریم حضرت محمد ﷺ کی شان میں اہانت آمیز کلمات کا استعمال

''اگر کوئی شخص الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں، تحریری یا مرئی نقوش کے ذریعے بہتان تراشی کرے یا اشارتاً یا کنایتاً، بالواسطہ یا بلا واسطہ حضور نبی کریم حضرت محمد ﷺ کے مقدس نام کی توہین کرے، تو اسے موت یا عمر قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔''

متذکرہ بالا قانون میں اہانتِ رسولؐ کی سزا موت تو رکھی گئی تھی لیکن متبادل سزا عمر قید بھی تجویز کی گئی تھی جو قرآن وسنت کے منافی تھی، لہٰذا ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس کے صدر جناب محمد اسماعیل قریشی نے شریعت کورٹ میں اس قانون کے مذکورہ حصہ کو حذف کروانے کے لیے وفاقی شرعی عدالت پاکستان میں پٹیشن دائر کر دی۔

وفاقی شرعی عدالت نے جناب محمد اسماعیل قریشی کی پٹیشن 30/اکتوبر 1990ء کو ایک تفصیلی فیصلہ صادر کرتے ہوئے منظور کر لی اور قرار دیا کہ اہانتِ رسولؐ کی سزا بطورِ حد صرف سزائے موت ہے۔ اس فیصلہ میں حکومت کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ اس دفعہ میں ایک اور شق کا اضافہ کیا جائے جس کی رُو سے دوسرے پیغمبروں کی اہانت کی سزا بھی سزائے موت مقرر کی جائے۔(PLD 1991 FSC 10) اس طرح توہینِ رسالتؐ کے قانون نے حتمی حیثیت اختیار کر لی۔

فقہ اسلامی کی رُو سے توہینِ رسالت کے تعزیری قانون کے حوالے سے اقبال کے جذبے کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے راجا رشید محمود نے لکھا ہے کہ سورۃ القلم میں خالق کائنات نے ولید بن مغیرہ، جس نے اللہ کے رسول کو ''مجنون'' (نعوذ باللہ) کہہ کر ان کی توہین کی تھی، کے دس عیب گنوائے اور اسے ''**ذَالِکَ زَنِیم**'' (یعنی تخم حرام) قرار دیا تھا۔ اقبال نے قرآنی احکامات کی پیروی کرتے ہوئے حضور ﷺ کی توہین کرنے والوں کے خلاف آواز بلند کی اور تمام عمر جہاد کیا۔ (اقبال اور احمد رضا، راجا رشید محمود صفحہ 54)

بیرسٹر اقبال نے توہینِ رسالت کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں حضرت محمد ﷺ کے زمانے ہی میں گستاخِ رسول مسیلمہ کذاب کے واجب القتل ہونے کو قانونی جواز بنایا تھا یعنی اسے اسلامی قانون کے مطابق درست قرار دیا تھا۔ اقبال کے وژن کو پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں نے 1991ء میں ایک مستقل قانون کے سانچے میں ڈال کر فقہ اسلامی کے حوالے سے اقبال کی قانون فہمی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

پروفیسر عبدالحق (دہلی)

حدیثِ رسول ﷺ اور شعر اقبال

سیرتِ سرورِ عالم ﷺ شعری ثقافت کا سب سے محترم موضوع سخن ہے۔ تقریباً ہر سخن ور نے ذکرِ رسالت مآب ﷺ سے اپنی تخلیق کو پرنور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض شعراء اس نسبت کی برگزیدی سے بلندی پر فائز ہوئے۔ ان کی ناموری ناموس نبوت ﷺ سے قائم ہوئی۔ شعری تخلیق کا ایک گراں قدر حصہ ذکر وفکر میں وظیفۂ روز وشب ٹھہرا۔ شعرا کے جذب وشوق کا اظہار قاری کو عرفان وآگہی کے سوز وساز سے سرشار کرنے کا باعث بنا۔ فن میں عشق وعقیدت کی یہ وارفتگی اور فراوانی کسی اور شخص سے وابستہ نظر نہیں آتی۔ ہماری ادبی ثقافت کا یہ امتیاز بھی ہے۔ ذات گرامی ﷺ کا تخلیقی محرک بن جانا معجزۂ فن کی دلیل ہے۔ تخلیق کی اس معجز نمائی کا مشاہدہ کرنا ہو تو کلام اقبال کا مطالعہ کیا جائے۔ صرف یہی موضوع پیشِ نظر رکھیے تو حیرتوں کا ایک جہان دیگر دکھائی دے گا۔ اقبال کے سرمایۂ قلم میں نہ نعت ہے اور نہ سیرتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کوئی کتاب مگر تخلیقات میں ذکر حبیب ﷺ کی نور فشانی ہر سو جلوہ گر ہے۔ کہیں برملا وبے حجاب ہے تو کہیں پُر اسرار حرفِ راز بن کر معنی کے نہاں خانوں میں پوشیدہ۔ اس ادراک کے لیے نگاہ کا شریک بینائی ہونا لازم ہے۔ تخلیقی تاریخ میں یہ ایک منفرد مثال ہے۔

شعرا اور سیر نگاروں نے پیغمبرِ اعظم وآخر ﷺ کی سیرت وشمائل کے بیان میں بے مثال عشق وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔ تاریخ وتلمیح کے سہارے عرفانِ رسالت کے جو نذرانے قلم بند کیے ہیں، وہ بنی نوع انسان کی علمی وتخلیقی سرمایہ کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ کائنات کی کسی شخصیت سے نہ یہ عشق ملتا ہے اور نہ سرمایۂ علمی ہی محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کی سب سے عظیم اور مقدس سعادت ہے۔ اقبال کا یہی خاص امتیاز ہے کہ حضور رسالتِ مآب ﷺ سے ان کا عشق اور وفورِ شوق جذب وجنوں کی انتہاؤں سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے رسولِ کریم ﷺ کی

ذاتِ مبارک کو حکمت و دانائی میں سراپا نور قرار دیا ہے۔ یہ مفکرانہ نسبت اقبال کو بہت محبوب ہے کیوں کہ حضور ﷺ کی شخصیت مفکر اعظم و آخر کی ہے۔ اقبال نے اپنے عشق کو وجدان والہام سے ہم آمیز کیا ہے۔ جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ احادیث کے انتخاب میں یہ پُر اسرار نکتہ پیش نظر رہا ہے۔ اس موضوع پر گفتگو میں اقبال کے اس اقرار و اعتراف پر توجہ لازم ہے۔

این ہمہ از لطف بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

(در حضور رسالت مآب ﷺ پس چہ باید کرد)

اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے بیکراں لطف و عنایت کے آغوش میں ان کے فکر و نظر کی پرورش ہوئی ہے۔ اس بے پایاں احسان کا اقرار مطالعۂ اقبال میں بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اقبال کی دروں بینی کے اس احساس تک دریابی کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ گویا ان کے فکری نظام کا مصدر اعظم نبی برحق کی ذات گرامی ﷺ ہے۔ اقبال نے اشارے کیے ہیں کہ ان کے علم و مطالعہ میں دانشِ افرنگ نے اضافہ کیا ہے۔ اور مشرق کے صاحبِ نظراں نے سینے کو پُر نور کیا ہے مگر خاکِ مدینہ نے فکر و نظر اور لوح و قلم کو بینائی بخشی ہے۔ اقبال معترف ہیں کہ عالم آب و خاک میں اسی کے ظہور سے سب کو فروغِ نظر حاصل ہے۔ اسی ذات مبارک کی بدولت ہر ذرۂ ریگ کو طلوعِ آفتاب کی تابانی میسر ہے۔ اس ذات تک رسائی ہی دین و دانش کا مقصود و منتہا ہے۔

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

کلامِ اقبال میں عشق و عقیدت کے بے پایاں جذب و شوق کی سایہ نشینی سے پوری فضا جمال آفریں ہے۔

کیوں ازکہ خدا محبوب تر گردد نبی ﷺ

جب یہ صورت ہو تو محبوب کے تمام متعلقات یا مناسبات سبھی عزیز تر ہوتے ہیں۔ سیرت و شخصیت کے ساتھ اقوال و کردار کی سبھی ادائیں جسم و جان سے زیادہ پیاری ہو جاتی ہیں۔ اقبال کے اشعار میں جگہ جگہ اسوۂ رسول ﷺ یا منصبِ نبوت کا تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی ذاتِ اقدس ﷺ کے ارشادات کا حوالہ بھی منظوم ہوا ہے۔

فکرِ اقبال کا سب سے اہم سرچشمہ قرآن ہے۔ اقبال کی تحریروں میں قرآن کریم کے

حوالے جس کثرت سے ملتے ہیں، وہ تخلیقی ادب میں ایک نایاب نظیر ہے۔ شعر اقبال کی بلاغت اور فکر کی بلندی کا ایک اہم سبب صحفِ سماوی کے حوالے ہیں۔ اقبال کی آرزو تھی کہ وہ قرآن کی تفسیر قلم بند کرتے۔ دوسرے تصنیفی منصوبوں کی طرح یہ اہم کام بھی انجام نہ پا سکا۔ رموزِ بیخودی میں سورۂ اخلاص کی منظوم تشریح و تعبیر ان کی بنیادی فکر کے اہم ترجمان بن گئے ہیں۔ مختصر سورت کے لیے ایک سوسولہ اشعار منظوم کیے گئے ہیں۔ قرآن اور اقبال کے سلسلے میں اقبالیات میں قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔ مستعمل آیات میں جن نکات کی طرف اقبال کے اشارے ہیں وہ اقبال کے تفسیری رویے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اقبال نے نثری تحریروں میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال قلم بند کیے ہیں اور ان کی فلسفیانہ تشریح بھی کی ہے۔ قرانی آیات کے ساتھ احادیث رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شرح و تفصیل بھی اقبال کے پیشِ نظر ہے۔ انہوں نے خطبات میں سیرت سرورِ کونین ﷺ کے حکیمانہ پہلوؤں پر اپنی وسعتِ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ''مضامین اقبال'' میں حضور نبی رحمت ﷺ کے قولِ مبارک پر ایک مقالہ قلم بند کیا ہے جو نظریۂ ادب کا سب سے اہم اور مہتم بالشان ضابطۂ تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے کا عنوان ہے ''حضور رسالت مآب ﷺ کا ادبی تبصرہ'' میں آپ ﷺ نے امراء القیس کی شاعری پر ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ **"اشعر الشعرا وقائدھم الی النار"** یعنی وہ شاعروں کا سردار تو ہے مگر جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔ تخلیق کا یہ نصب العین نہیں ہے کہ حقائق زندگی سے گریز سکھائے اور تخیلات کی ساحری میں گمراہ کرے۔ ادب نشاطِ زیست کا ترجمان نہیں ہے۔ گویا فن برائے فن ایک اندوہ ناک تصور ہے۔ اسی حدیث کو اقبال نے مرقعِ غالب کے مقدمہ میں بھی دہرایا ہے۔ اسی مقالے میں اقبال نے مشہور شاعر عنترۃ کے شعر پر نبی کریم ﷺ کے تعریفی کلمات کو نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندے کو دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔ عنترہ کا شعر صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی اور بولتی تصویر ہے جو تعیش کی جگہ سخت کوشی وجد و جہد کو دعوت دیتا ہے۔ یہی تخلیق کی معراج ہے کہ زندگی کی کشاکشوں سے نبرد آزما ہو۔ گویا آپ نے چودہ سو برس پہلے ادب برائے زندگی کو خوش آمدید کہا تھا۔

''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے پہلے خطبہ علم اور مذہبی مشاہدات میں مشہور حدیث **'لاتسبو الدھر '** کی تشریح کی گئی ہے۔اس سے یقین ہوتا ہے کہ احادیث نبوی ﷺ سے فکرِ اقبال کو ایک فلسفیانہ گرویدگی ہے۔عقیدت واحترام سے قطع نظر انہیں اقوال رسول ﷺ سے مفکرانہ نسبت ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سرورِ کونین ﷺ کو حکمت و دانائی کا عظیم پیکر تسلیم کیا ہے۔اشعار میں دانائے سبل، گوہر حکمت، الکتاب اور لوح وقلم کے معنی خیز الفاظ موجود ہیں۔

گوہر حکمت بہ تارِ جانِ امت سفتۂ ای

(باقیات)

در جہانِ ذکر و فکرِ انس وجاں
تو صلوتِ صبح تو بانگِ اذاں
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب وجستجو عشق حضور و اضطراب

اشعار میں منظوم احادیث کی فکر افروز حکمت بہت نمایاں ہے۔اقبال مفکر شاعر ہیں۔ لازم تھا کہ ایسے ہی اقوال کا انتخاب ہو جو فلسفیانہ جہانِ معنی سے معمور ہوں۔اقبال نے احادیث سے اجتہادی استدلال بھی کیا ہے۔جیسے آپ ﷺ کا قول **'لانبی بعدی '** اس کا منطقی نتیجہ ہوگا کہ لاقوم بعدی۔اس سے اقبال کے فکری منہاج ومعیار اور طریقِ استلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

اقبال نے تخلیقی حسن آفرینی کے ساتھ کلام میں احادیث رسول ﷺ کو جزوِ فن بنادیا ہے۔حدیث پاک کے حوالوں کی کثرت فارسی شاعری میں ہے۔یہ اردو میں بہت کم منظوم ہوئے ہیں۔باقیات میں حسبِ ذیل احادیث منظوم کی گئی ہیں۔

تیرا رتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے۔

اے کہ حرفِ **اطلبوا لو کان بالسین** گفتہ ای۔

ماعرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری۔

یہ دونوں مصرعے نظم ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' اور 'فریادِ

امت سے' ماخوذ ہیں۔ نظم ''ماتم پسر'' کا مصرع ہے۔

مقصد **لحمک لحمی** پر کھلی ان کی زبان۔

اردو کلیات میں بس برائے نام حوالے ہیں۔ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا یہ مصرع ضعیف حدیث کا ترجمہ قرار دیا گیا ہے۔

میر عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' کے مصرع میں مشہور حدیث منظوم ہے۔

سماں **الفقر فخری** کا رہا شانِ امارت میں

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث

مومن نہیں جو صاحبِ **لولاک** نہیں ہے

بال جبریل کی غزل ۴۶ کے مقطع میں بھی یہ حدیث دہرائی گئی ہے۔

جہاں مقام ہے میراث مرد مومن کی

میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اردو کے مجموعوں میں ذکر حدیث کی یہ صورت نہیں ہے سبب نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ضرور ہے کہ فارسی میں موضوعات اور مواقع مختلف النوع ہیں۔ ان حوالوں کی وہاں زیادہ گنجائش تھی۔ راقم کا یہ محض قیاس ہے۔

قرآن کریم کی طرح اقبال نے اقوالِ رسول ﷺ سے بھی اپنے فکر ونظر کی تشکیل میں بڑی مدد لی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فلسفہ زمان ومکاں کے سلسلے میں اقبال فکری طور پر اضطراب سے دوچار تھے۔ معاصر علما و اکابرینِ دانش سے دریافت کرتے رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی رہ نمائی نہ ہو سکی۔ لیکن انہیں حدیثِ رسول ﷺ نے بڑی استقامت بخشی۔ اسرارِ خودی، ان کی پہلی شعری اور فکری تخلیق ہے۔ خودی کے وجود و نمود اور پہنائی کا مسئلہ خاصا پیچیدہ تھا۔ انہوں نے قول نبی ﷺ سے مدد لی اور زمان ومکاں کے تصورات کو مربوط کیا۔

زندگی از دہر ودہر از زندگی است

لا تسبو الدھر فرمانِ نبی ﷺ است

اقبالیاتی مطالعہ میں یہ موضوع خاصا اہم اور دقیق مسائل پر مشتمل ہے۔ انہوں نے

رموزِ بیخودی اور پیامِ مشرق میں **الوقت سیف**ؐ اور 'نوائے وقت' کے عنوان سے نظمیں لکھی ہیں۔ 'زمانہ' کے نام سے بالِ جبریل میں بھی ایک نظم کے علاوہ متفرق اشعار ہیں جو اس فکری نکتے کی وضاحت کرتے ہیں۔ ضربِ کلیم کا یہ شعر بڑی حکیمانہ معنویت کا حامل ہے۔

خرد ہوتی ہے زمان ومکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

'اسرارِ خودی' میں سب سے پہلے اس حدیث پر نظر پڑتی ہے جو 'خودی از سوال ضعیف می گردد' کے ذیل میں نقل کی گئی ہے۔

آں کہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رفت
مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

ذاتِ گرامی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے '**الکاسب حبیب اللّٰہ**' یعنی محنت کش مزدور اللہ کا دوست ہے۔

تا کجا روز وشب باشی اسیر
رمزِ وقت از **لی مع اللّٰہ** یاد گیر

حدیث **لی مع اللّٰہ** وقت کی طرف اشارہ ہے۔

'رموزِ بیخودی' میں پہلی حدیث ہے۔

بہرآں شہزادۂ **خیر الملل**
دوش ختم المرسلین **نعم الجمل**

یہاں حدیث '**ونعم الجمل جملکما ونعم العدلان انتما**' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پیشِ پیغمبر چو کعب پاک زاد
ہدیۂ آورد از بانت سعاد
گفت **سیف من سیوف اللّٰہ** گو
حق پرستی جز براہِ حق مپو

آپ کا قول ہے '**سیف من سیوف اللّٰہ**'' اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار پیغمبرِ اعظم و آخر ﷺ کے بارے میں ایک بہت مشہور اور معتبر حدیث مروی ہے۔

کنت نبیا و آدم بین الماءِ والطین

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز
بود اندر آب وگل آدم ہنوز

ترمذی شریف میں ہے **قال آدم بین الرّوح والجسد** (کہا اور آدم ابھی روح اور جسد کے مابین تھے)

ایک دوسری حدیث کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے۔

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود **باطیب وصلٰوۃ**

سورہ اخلاص کی تفسیر میں حدیث کا اشارہ ملتا ہے۔

آں امنّ الناس بر مولائے ما
آں کلیم اولِ سینائے ما

حدیث کے الفاظ ہیں۔ **امنّ الناس علیٰ فی صحبتہٖ ومالہٖ ابوبکر**

لست **منّی** گویدت مولائے ما
وائے ما اے وائے ما اے وائے ما

آپ نے فرمایا تو میری قوم سے نہیں ہے۔

'پیامِ مشرق' میں ایک آیت کریمہ کا حوالہ ہے مگر حدیث کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں اقبال کا نٹشے کے بارے میں جو مصرع بہت مقبول ہوا۔

قلبِ او مومن دماغش کافر است

محسوس ہوتا ہے کہ بدونِ حوالہ حضور نبی کریم ﷺ کے ایک قول کا اشارہ ہے۔ حضور رسالتِ مآب ﷺ کے عرب شاعر امیہ ابن الصلت کے لیے فرمایا تھا۔ **امن لسانہٗ وکفر قلبہٗ**

اقبال کے مطالعہ اور یادداشت کو آفریں ہو کہ انہوں نے احادیث واقوال کو حافظے کے نہاں خانے میں محفوظ رکھا اور تخلیق میں نگیں سازی سے کام لیا۔ ان کے کئی اشعار بدون حوالۂ حدیث کے بھی ہیں جن میں جزوی عبارت یا اشارے موجود ہیں۔ حدیث کے بے کراں ذخیرۂ علمی پر ان کی حکیمانہ نگاہ ہے۔ جن کی مدد سے وہ کلام کو علمی تقدیس سے ہم آمیز کرتے ہیں۔ تخلیق

کو تقدیس کے مقام معراج تک رسائی کے لیے اقبال کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مشرقی ادبیات میں اقبال کا یہی مقام محمود ہے۔ بنی نوع بشر کی نغمہ سرائی فکرِ اقبال کا سب سے نمایاں امتیاز و افتخار ہے۔ وحدتِ آدم کے تصور پر اقبال سے زیادہ کسی مفکر نے توجہ نہیں دی ہے۔ انھوں نے قوموں کی وحدت کو اندوہ ناک بتایا ہے۔ اور وحدت آدم کو ترجیح دی ہے۔ اس تصور کے سرچشمے احادیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں موجود ہیں۔ تمام عالم کو عیال اللہ کہا گیا ہے۔ اقبال کا شعر ملاحظہ ہو جس میں حدیث کا حوالہ نہیں ہے۔ مگر مفہوم کی معنویت پورے موثرات کے ساتھ موجود ہے۔

حرفِ بد را برلب آوردن خطا است
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است

اس طرح کے کئی اشارے کلام میں قلم بند ہوئے ہیں جو حدیث کے ترجمان ہیں۔

'زبورِ عجم' اور 'گلشنِ رازِ جدید' میں بھی بہ ظاہر کوئی حدیث درج نہیں ہے۔ 'جاوید نامہ' میں کئی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ جو موقع کی مناسبت سے بہت موزوں ہیں اور فکر کی تازگی اور تمازت سے معمور ہیں۔ ان کی مدد سے اقبال نے اپنے افکار کو معنویت سے آراستہ کیا ہے۔ زاوان کہ روح زمان و مکانست کے ذیل میں حدیث پر نظر پڑتی ہے۔ اس حدیث کو دو شعروں میں دہرایا گیا ہے۔

لی مع اللہ ہر کرا در دل نشت
آن جواں مردے طلسم من شکست
گر تو خواہی من نباشم درمیاں
لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

اس سے قبل اس حدیث پاک کو 'اسرار خودی' میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو زمان و مکاں کے تصورات کی تشکیل و تعبیر میں سرورِ کونین ﷺ کے ارشاد سے توثیق و تصدیق ہوئی۔ جاوید نامہ میں دوسری حدیث بھی بڑی خوبی سے شعر میں ڈھالی گئی ہے۔ افغانی کی زبان سے ادا کی گئی ہے۔

از حدیث مصطفیٰ ﷺ داری نصیب
دین حق اندر جہاں آمد غریب

حدیث ہے کہ **'الاسلام جاء غریب......'**

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ صرف ایک لفظ سے حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ متن کو پیش نہ کر کے صرف ایک لفظ سے پوری حدیث کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اقبال نے کئی مقامات پر قرآن کی آیات کے ساتھ بھی اختصار و اشارے کی اس صورت سے کام لیا ہے۔ جاوید نامہ میں خواجۂ اہل فراق کی زبان سے حدیث پاک نقل کی گئی ہے۔

گفتمش ''بگذر ز آئین فراق

ابغض الاشیاء عندی الطلاق

جاوید نامہ کے اختتام 'خطاب بہ جاوید' کے آخر میں دو حدیثوں کا ذکر ہے۔

ضعیف ایمان است ودل گیری است غم

نوجوانا ! نیمۂ پیری است غم

نیمۂ پیری سے اشارہ ہے۔ **اللّٰھم نصف الحرام**

می شناسی ؟ حرص فقر حاضر است

من غلام آنکہ بر خود قاہر است

یہاں بھی فقرِ حاضر کہہ کر حدیث مراد ہے جس کا متن ہے۔ **ایّاکم و الطمع فانّہٗ الفقر الحاضر**

کبھی کبھی شعری ضروریات یا مجبوری کے سبب بھی صرف اشاراتی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی ایسا کیا ہے۔ اگرچہ عام قاری کی بساط فہم کے لیے یہ اشارے مشکل ہوتے ہیں۔ لیکن شارحین اور مترجمین نے تفہیم آسان کر دی ہے۔ اقبال نے اقرار کیا ہے کہ سیلِ معانی کو ضبط کرنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی قلندر نے اسرارِ کتاب کی وضاحت کر دی۔

مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' ایک مختصر شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی چند احادیث مذکور ہیں۔ 'فقر' کے ذیل میں یہ شعر ہے جس میں متن کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے حدیث کا متن یا اس کا کوئی حصہ نقل نہیں کیا گیا ہے۔

موموناں را گفت آں سلطانِ دیں

مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں

حضور اکرم ﷺ کی مشہور حدیث کی طرف تلمیح کا اشارا ہے جس میں ارشادِ رسول ﷺ کے مطابق ''تمام روئے زمین میری مسجد ہے''۔ 'دراسرارِ شریعت' میں دوسری حدیث ہے۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول
نِعمَ مَالٌ صَالحٌ گوید رسول ﷺ

اسی نظم میں تیسری اور انتہائی فکر انگیز حدیث پاک کو منظوم کیا گیا ہے۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست
چشمِ او ینظر بنور اللّٰہ نیست

آپ ﷺ نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ''**اتقو فراست المومن فانه ینظر بنور اللّٰہ**''

'سیاسیاتِ حاضرہ' نظم میں ایک بہت ہی مشہور حدیث کو منظوم کیا گیا ہے۔

در بدن داری اگر سوز حیات
ہست معراج مسلماں در صلوٰت

اس تلمیح میں قولِ نبی ﷺ کو دہرایا گیا ہے کہ نماز مومن کے لیے معراج ہے۔ **الصلوۃ معراج المومنین.**

نظم 'حرفے چند با امتِ عربیہ' کا مطلع ہے۔

اے در و دشتِ تو باقی تا ابد
نعرۂ لا قیصر و کسریٰ کہ زد

ذاتِ گرامی کا ارشاد ہے کہ **هلک قیصر فلا قیصر بعده**......

مثنوی 'مسافر' میں حسب ذیل حدیث پاک کی تلمیح موجود ہے۔ **لی خرقتان الفقر والجهاد**

خرقۂ آں ''برزخ **لا یبغیان**
دید مش در نکتہ **لی خرقتان**

یہاں قرآن اور حدیث دونوں کی تلمیح موجود ہیں۔ 'ارمغانِ حجاز' میں بھی چند اقوال

رسالت مآب ﷺ کے حوالے بہ طور تلمیح موجود ہیں۔ایک رباعی کے آخری شعر میں ’**من رانی فقد راء اللّٰہ**‘ کو منظوم کیا گیا ہے۔مشہور حدیث۔ ؎

دو چارم کن بہ صبحِ ’من رانی‘
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

حدیثِ پاک کا مفہوم ہے ”جس نے مجھے دیکھا اس نے اللہ کو دیکھا“ ارمغان کی ایک رباعی میں دو حدیثوں کو دو شعروں کے قافیے میں قلم بند کر کے اقبال نے جذبِ دروں کو شعری پیکروں میں پیش کیا ہے۔

مسلماں را ہمیں عرفان و ادراک
کہ در خود فاش بیند رمزِ **لولاک**
خدا اندر قیاسِ ما نگنجد
شناس آں را کہ گوید **ما عرفناک**

ذاتِ گرامی ﷺ کے مقام و منصب کے عرفان و ایقان کے لیے دونوں حدیثیں بار بار پیش کی گئی ہیں یعنی کائنات کی تخلیق کا سبب ذاتِ مبارک کا وجود ہے۔گویا آپ نہ ہوتے تو عالم افلاک نہ ہوتا نہ یہ ارض و سما ہوتے نہ ہی کوئی شے خلق ہوتی۔دوسری حدیث کو اقبال پہلے بھی نقل کر چکے ہیں۔’**ماعرفناک حق معرفتک**‘ محمد ﷺ کا عرفان ہی اللہ کا عرفان ہے یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عرفان کے بغیر ذاتِ باری تعالیٰ کا عرفان ممکن نہیں ہے۔ جیسے کہ رسول کریم ﷺ کی محبت یا اطاعت ہی اللہ سے محبت اور اس کی اطاعت ہے۔یہی مرکز محبت ہے اور یہی مقامِ نبوت بھی جس کے ذکر و فکر سے اقبال کا کلام اپنی نور فشانی میں بے نظیر تخلیقات کا روشن آتش کدہ ہے۔جس میں نورِ نبوت کا ہر شرر شعلۂ جہاں تاب کی طرح جلوہ ساماں ہے۔سیرتِ رسول ﷺ کے کردار و گفتار سے نسبتوں کے فسانے اور زمانے دونوں عجیب ہیں جو فردائے قیامت تک کے لیے سخن کے سوز و گداز کو حقیقت ابدی میں بدل دیتے ہیں۔اس معروضے اور مشاہدے کے لیے بارِ ثبوت کے طور پر کلام اقبال کافی ہے۔ ؎

مسجد من آں ہمہ روئے زمین است

عقیدۂ ختمِ نبوت

علامہ محمد اقبالؒ

فلسفۂ ختم نبوت ٭

(1)

اس سے پہلے کہ ہم اپنی بحث میں آگے بڑھیں، ضروری ہے کہ اسلام کے ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی تصور...... میرا مطلب ہے عقیدۂ ختم نبوت **(مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ.** (1) (الاحزاب: 40۔ مترجم) کی ثقافتی قدرو قیمت پورے طور پر ذہن نشین کر لی جائے۔

ایک اعتبار سے نبوت کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں وارداتِ اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کر جاتیں اوران قوتوں کی پھر سے راہنمائی یا ازسرِ نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیا علیہم السلام کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز (انسانی خودی۔ مترجم) اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے (اپنے مبدا، وجود سے اتصال کی بدولت۔ مترجم) تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے۔ وہ ماضی (یعنی انسان جس راستے پر چل رہا تھا۔ مترجم) کو مٹاتا اور پھر زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے (تا کہ ایک نئی ہیئت اجتماعیہ کی تعمیر ہو سکے۔ مترجم) لیکن اپنی ہستی اور وجود کی اساس سے انسان کا یہ تعلق کچھ اسی کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآن مجید نے لفظ وحی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے، ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور ایسا ہی عام جیسے زندگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جوں جوں اس کا گزر مختلف مراحل سے ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ جیسے جیسے وہ ارتقا اور نشو ونما حاصل کرتی ہے، ویسے ہی اس کی ماہیت اور نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ یہ کسی پودے کا زمین کی پہنائیوں میں آزادانہ سر نکالنا، یہ کسی حیوان میں ایک نئے ماحول کے مطابق کسی نئے عضو کا نشو ونما، یہ انسان کا خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے

نور اور روشنی حاصل کرنا، یہ سب وحی کی مختلف شکلیں ہیں، جو اس لیے بدلتی چلی گئیں کہ اس کا تعلق جس فرد سے تھا یا جس نوع میں اس کا شمار ہوتا تھا، اس کی مخصوص ضروریات کچھ اور تھیں۔ اب بنی نوع انسان کے عالم صغر سنی میں ایسا بھی ہوا کہ اس کی نفسی توانائی کا نشو و نما (جس کا اظہار غور و فکر، ارادہ و اختیار، ادراک و تعقل، حکم، تصدیق یعنی اعمال ذہنی میں ہوتا ہے۔ مترجم) شعور کی وہ صورت اختیار کر لے جسے ہم نے شعورِ نبوت سے تعبیر کیا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا، نہ ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ ان کی پسند کیا ہو اور ناپسندیدگی کیا؟ انھیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے لیے کیا راہِ عمل اختیار کریں؟ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی، یہ نہیں کہ انھیں اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے (معروف و منکر، امر اور نہی، کی تعیین میں **لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ**) (2) شعور نبوت کو گویا کفایت فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے (کیونکہ اس طرح ہمیں فرداً فرداً ان امور کا فیصلہ نہیں کرنا پڑتا۔ صرف ایک فرد کا حکم اور انتخاب ہماری راہنمائی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مترجم) لیکن جہاں عقل نے آنکھ کھولی (تاکہ ذہن انسانی کو خود اپنی بصیرت، فہم اور تدبر سے کام لینے کا موقع ملے، یہ امر بھی منجملہ ان مقاصد کے ہے جو نبوت کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ مترجم) اور قوتِ تنقید بیدار ہوئی تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں ہے کہ ارتقائے انسانی کے اوّلین مراحل میں ہماری نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا، ان کا ظہور اور نشو و نما رُک جائے۔ انسان جذبات کا بندہ ہے اور جبلتوں سے مغلوب رہتا ہے (جن کو اگر ٹھیک راستے پر نہ ڈالا جائے تو ایک دوسرے سے رقابت اور فسادِ اخلاق کو تحریک ہوتی ہے جس کا انجام ہے ہلاکت۔ مترجم) وہ اپنے ماحول کی تسخیر کر سکتا ہے تو عقل استقرائی کی بدولت (جس میں وہ اصولِ علم کی بناء پر عالم خارجی کا مطالعہ کرتا ہے۔ مترجم) لیکن عقل استقرائی اس کے اپنے حاصل کرنے کی چیز ہے۔ (تجربے اور امتحان، مشاہدے اور تحقیق و تجسس کی حدود سے۔ مترجم) جسے ایک دفعہ حاصل کر لیا جائے تو پھر مصلحت اسی میں ہے کہ حصول علم کے اور جتنے بھی طریق ہیں، ان پر ہر پہلو سے بندشیں عائد کر دی جائیں تاکہ مستحکم کیا جائے تو صرف عقل استقرائی کو (عالم فطرت کی تسخیر اور زندگی کو واقعیت کی نظر سے دیکھنے کی خاطر۔ مترجم) اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے قدیم نے

بڑے بڑے عظیم نظاماتِ فلسفہ پیدا کیے۔ (تعلیماتِ نبوت سے باہر محض حکیمانہ غور وفکر کی بدولت۔ مثلاً ارضِ یونان یا قدیم ہندوستان میں۔ مترجم) مگر یہ اس وقت جب انسان اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا اور اس پر ایمان اور اشارے کا غلبہ تھا۔ (یعنی وہ اپنی عقل اور سمجھ کے بجائے وہی کچھ کرنے لگتا تھا جو دوسرے کرتے تھے۔ مترجم) لہٰذا ماضی کے یہ فلسفیانہ نظامات مجرد فکر کی بناء پر مرتب ہوئے، لیکن مجرد فکر کی بناء پر ہم زیادہ سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہ مذہبی عقائد اور مذہبی روایات میں تھوڑا بہت ربط و ترتیب پیدا کر دیں۔ رہا یہ امر کہ عملی زندگی میں ہمیں جن احوال سے فی الواقع گزر کرنا پڑتا ہے، ان پر قابو حاصل کیا جائے تو کیسے؟ اس کا فیصلہ فکر مجرد کی بناء پر نہیں کیا جا سکتا۔ (اور یہی فی الحقیقت مسئلہ ہے زندگی کا خواہ اس میں کوئی بھی راستہ اختیار کیا جائے۔ مترجم) اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے (جس کا ظہور آپ ﷺ کی تعلیمات کی بدولت ہوا۔ مترجم) بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے (جس کی آپ ﷺ نے راہنمائی کی۔ مترجم) لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ﷺ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے (یعنی جن کی زندگی کو راہنمائی کے لیے ضرورت تھی۔ مترجم) لہٰذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا، استقرائی عقل کا ظہور ہے۔

اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ (جیسا کہ تعلیماتِ قرآنی کا مقصود بھی ہے۔ مترجم) یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے (کہ انسان اپنے وسائل سے کام لے، اس کے قوائے فکر و عمل بیدار ہوں اور وہ اپنے اعمال و افعال کا آپ جواب دہ ٹھہرے۔ مترجم) کیونکہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے، جو باعتبارِ نوعیت (ان معنوں میں کہ اس کا تعلق ادراک بالحواس سے نہیں۔ مترجم) انبیا کے

احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے آفاق و انفس (3) دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے، اور اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہی کا ظہور محسوسات و مدرکات (محسوسات، یعنی ہماری وارداتِ شعور، ہمارے داخلی احوال اور تجربات اور مدرکات، یعنی ہمارے وہ مشاہدات جن کا تعلق عالم فطرت کے مطالعہ سے ہے۔ مترجم) میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے (لہٰذا اس کی تنقید لازم ٹھہری۔ مترجم) حاصل کلام یہ کہ تصورِ خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے، جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے، نہ ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں۔ اس لیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائیں۔ (اور ہم ان کا مطالعہ عقل و فکر اور تعلیمات نبوت کی روشنی میں کریں۔ مترجم) بعینہٖ جس طرح اسلامی کلمہ (**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**۔ مترجم) کے جزو اوّل نے انسان کے اندر یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات (بالفاظ دیگر مظاہر فطرت یا قوائے طبیعیہ۔ مترجم) کا مطالعہ نگاہِ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے۔ (یعنی ان کو دیوی دیوتا تصور نہ کرے۔ مترجم) جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا دستور تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ ان کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو، ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسے اپنی دوسری واردات اور اس لیے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں۔ حضور نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔ (4)

(2)

یقین ٭ کیجیے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقا میں بڑی رکاوٹ اور کوئی

نہیں۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چونکہ وحی وتنزیل پر ہے، جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنی ظاہری خارجیت (بمقابلہ ہماری ذات کے۔ مترجم) کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے۔ (کیونکہ اس سے درحقیقت ہماری فطرت ہی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔** (1) مترجم) ہمارے لیے تو زندگی کی روحانی اساس ایمان ویقین کا معاملہ ہے جس کی خاطر ایک غیر تعلیم یافتہ مسلمان بھی برضا ورغبت اپنی جان دے دے گا۔ پھر اسلام کے اس بنیادی تصور کے پیشِ نظر کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے، لہٰذا اب کوئی ایسی وحی نہیں کہ ہم اس کے مکلّف ٹھہریں۔ ہماری جگہ دنیا کی ان قوموں میں ہونی چاہیے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ استخلاص حاصل کر چکی ہیں۔ (ہماری جگہ سب سے زیادہ استخلاص یا نجات یافتہ قوموں میں ہونی چاہیے، یعنی بحالتِ موجودہ۔ لیکن ہم خود سب سے زیادہ استخلاص یافتہ، قوم ہیں، یعنی روحانی اعتبار سے جو آزادی اور حریت ہمیں حاصل ہے اور کسی قوم کو حاصل نہیں اور یہی فی الحقیقت حضرت علامہؒ کا مطلب بھی ہے۔ مترجم) شروع شروع کے مسلمانوں کو جنھوں نے ایشیائے قبل اسلام کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی، اسلام کے اس بنیادی تصور (خاتمیت۔ مترجم) کی ٹھیک ٹھیک حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے لیکن ہمیں چاہیے آج اپنے اس موقف کو سمجھیں (کہ بابِ نبوت ہر نوع اور ہر جہت سے مسدود ہے۔ مترجم) اور اپنی حیاتِ اجتماعیہ کی ازسرنو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی راہنمائی میں کریں، تا آنکہ اس کی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشوونما جو اس کا مقصود ومنتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے۔"

(3)

راجہ صاحبؒ کا مضمون میں نے نہیں دیکھا۔ دیکھا تو تھا پڑھا نہیں۔ آپ اپنے مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔ ان کے خیالات کی تردید ضروری نہیں۔

نبوت کے دو اجزاء ہیں:

1- خاص حالات واردات، جن کے اعتبار سے نبوت روحانیت کا ایک مقام خاص تصور کی جاتی ہے۔ (مقام تصوفِ اسلام میں ایک اصطلاح ہے۔)

2- Socio-political Institution قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام۔ اس Institution کا قیام گو ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہے، جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات تک پہنچتا ہے، اور جو فرد اس نظام کا ممبر نہ ہو یا اس کا انکار کرے وہ ان کمالات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں۔ گویا اس دوسرے جزو کے اعتبار سے نبی کا منکر کافر ہے۔

دونوں اجزاء موجود ہوں تو نبوت ہے۔ صرف پہلا جزو موجود ہو تو تصوفِ اسلام میں اس کو نبوت نہیں کہتے، اس کا نام ولایت ہے۔

ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ (1) مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا حالانکہ طبری (2) لکھتا ہے وہ رسالت مآب ﷺ کی نبوت کا مصدق تھا، اور اس کی اذان میں حضور رسالتماب ﷺ کی نبوت کی تصدیق تھی۔ (3)

لیڈنگ سٹرنگز (4) Leading Strings سے مراد لیڈنگ سٹرنگز آف ریلیجن نہیں بلکہ لیڈنگ سٹرنگز آف فیوچر پرافٹس آف اسلام ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک کامل الہام و وحی کی غلامی قبول کر لینے کے بعد کسی اور الہام اور وحی کی غلامی حرام ہے۔ بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک کی غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات ہو جائے اور لطف یہ کہ نبی آخر الزمان ﷺ کی غلامی، غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے کیونکہ اس کی نبوت کے احکام دین فطرت ہیں۔ یعنی فطرتِ صحیحہ ان کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرتِ صحیحہ کا انھیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس واسطے عین دین فطرت ہیں۔ ایسے احکام نہیں جن کو ایک مطلق العنان حکومت نے ہم پر عائد کر دیا ہے اور جن پر ہم محض خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلام کو دین فطرت کے طور پر Realise (5) کرنے کا نام تصوف ہے اور ایک اخلاص مند مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کیفیت کو میں نے لفظ Emancipation (6) سے تعبیر کیا ہے۔

محمد اقبال (7)

(4)

(1) عقل اور وحی کا مقابلہ یہ فرض کر کے کہ دونوں علوم کے مواخذ ہیں، درست نہیں ہے۔علوم کے مواخذ انسان کے حواسِ اندرونی و بیرونی ہیں۔عقل ان حواس ظاہری ومعنوی کے انکشافات کی تنقید کرتی ہے اور یہی تنقید اس کا حقیقی Function (1) ہے اور بس۔ مثلاً آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب کی طرف حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ حواسِ ظاہری کا انکشاف ہے۔عقل کی تنقید کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حواس کا انکشاف درست نہ تھا۔

(2) وحی کا Function (1) حقائق کا انکشاف ہے یا یوں کہیے کہ وحی تھوڑے وقت میں ایسے حقائق کا انکشاف کر دیتی ہے جن کو مشاہدہ برسوں میں بھی نہیں کر سکتا۔ گویا وحی حصولِ علم میں جو Time (2) کا عنصر ہے اس کو خارج کرنے کی ایک ترکیب ہے۔انسان کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں اس ذریعہ علم کی بے انتہا ضرورت تھی کیونکہ ان مراحل میں انسان کو ان مقامات کے لیے تیار کیا جارہا تھا جن پر پہنچ کر وہ قوائے عقلیہ کی تنقید سے خود اپنی محنت سے علم حاصل کرے۔محمد عربی ﷺ کی پیدائش انسانی ارتقا کے اس مرحلے پر ہوئی جبکہ انسان کو استقرائی علم سے روشناس کرانا مقصود تھا۔میرے عقیدہ کی رو سے بعد وحی محمدی کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔سلسلہ تو الہام کا جاری ہے،مگر الہام بعد وحی محمدی حجت نہیں،سوائے اس کے کہ ہر شخص کے لیے جس کو الہام ہوا ہو۔ بالفاظ دیگر بعد وحی محمدی الہام ایک پرائیویٹ Fact (3) ہے۔اس کا کوئی سوشل (4) مفہوم یا وقعت نہیں ہے۔

میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ نبوت کی دوسری حیثیت ایک Socio Political Institution (5) کی ہے۔اس کے یہ معنی ہیں کہ بعد وحی محمدی کسی کا الہام یا وحی ایسے Institution (6) کی بنا قرار نہیں پا سکتا۔تمام صوفیہ اسلام کا یہی مذہب ہے۔ محی الدین ابن عربی (7) تو الہام پانے والے کو نبی کہتے ہی نہیں،اس کا نام ولی رکھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام سے پہلے بنی نوعِ انسان میں شعورِ ذات کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔ اسلام نے انسان کی توجہ علوم استقرائی کی طرف مبذول کی تا کہ انسانی فطرت فی کل الوجود کامل ہو اور اپنی ذاتی محنت سے حاصل کردہ علم کے ذریعہ سے انسان میں اعتماد علی النفس پیدا ہو۔غرضیکہ بعد وحی محمدی میرے عقیدہ کی رو سے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔جس شخص کو ہوتا ہے،اس کے لیے

حجت ہوتو ہو، اوروں کے لیے نہیں ہے۔ اگر آج کوئی شخص کہے کہ میں نے بالمشافہ حضور رسالتماب ﷺ سے مل کر دریافت کیا ہے کہ فلاں ارشاد جو محدثین آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں، آپ کا ہے یا نہیں؟ اور مجھے حضور ﷺ نے کہا ہے کہ نہیں، تو ایسا مکاشفہ اس شخص کے لیے حجت ہوگا، تمام عالم اسلام کے لیے نہیں۔ اگر اس قسم کے مکاشفات کو تمام عالم اسلام کے لیے حجت قرار دیا جائے تو عام تنقیدی تاریخ کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا بالفاظ دیگر روایت و درایت استقرائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

محمد اقبال(8)

عقیدہ ختم نبوت پر حضرت علامہ اقبالؒ کی ایک تاریخی تحریر کا عکس (1)

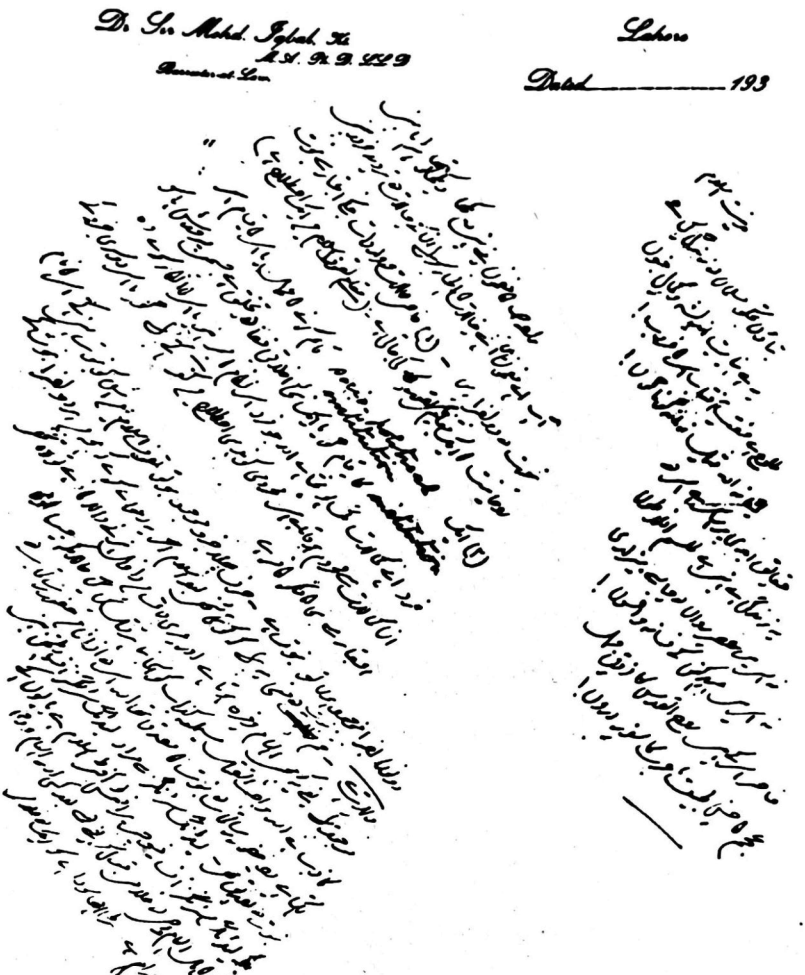

سے ہماری بعض غلطیوں سے نجات ہو جائے

اور لطف یہ ہے کہ نبی اکرم کا ارشاد نہ صرف بحر علوم نہیں

بلکہ آزادی ہے کیونکہ اس سے ثابت ہے اسلام دین فطرت ہے یعنی

جو نئی فطرت صحیحہ اس کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرت صحیحہ کا

اس کو خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کے گہرے اصولوں سے

پیدا ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ مہر فطرت رکھتے ہیں۔ ایسے احکام [illegible] جگہ

ایک مطلق الفاظ کی قسم ہیں پر حاوی کر دیا ہے اور جس پر بغیر خوف کے عمل کرتے ہیں

مجبور ہیں۔ اسلام کو دین فطرت کہہ کر Realise کرنے کا نام تقریب ہے

اور ایک لفظ میں فلسفہ اس کا یہ ہے کہ وہ ایک کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے

اس کیفیت کو اپنے لفظ manifestation سے تعبیر کیا ہے۔ والسلام

محمد اقبال

[illegible] ترجمہ دنیا سے دور ایک گھریلو زبان کہی اور یہ بھی [illegible]
[illegible] اور وقت بڑھتا جائے انگریزی زبان کا رواج تمام ملک میں ہو جانے گا۔

عقیدہ ختم نبوت پر حضرت علامہ اقبالؒ کی ایک تاریخی تحریر کا عکس (2)

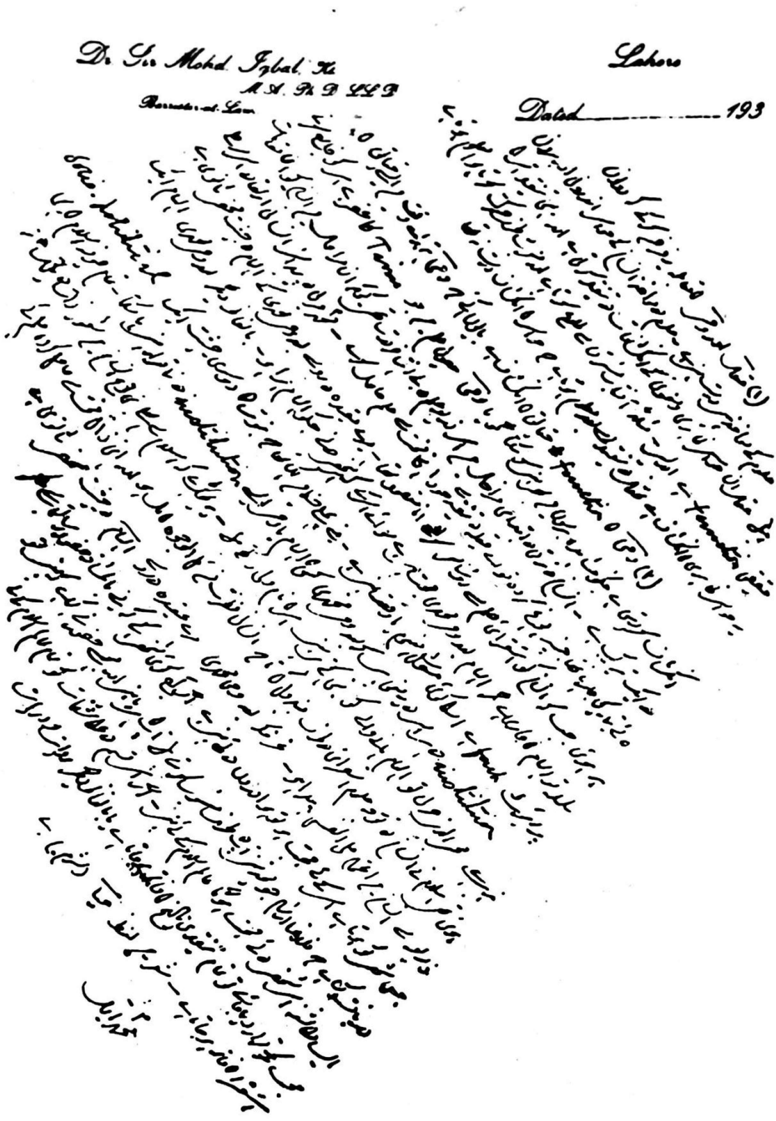
Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated ________ 193

حواشی

(ترجمہ اور حواشی محترم نعیم آسی مرحوم کے قلم سے ہیں)

(1)

° یہ مضمون تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے اخذ کیا گیا ہے، جو حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے ان مایہ ناز انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ ہے، جو انھوں نے مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر 1928-29ء میں مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں ارشاد فرمائے۔ یہ خطبات فلسفیانہ رنگ میں اپنے موضوع پر ایک اچھوتی تخلیق ہیں۔

-1 (حضرت) محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ (الاحزاب:40)

-2 ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ (الحدید:25)

-3 حضرت علامہ نے انگریزی میں آفاق و انفس کا مرادف **Self and world** لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

The Reconstruction of Religious Thought in Islam. Page 120. By Sir Muhammad Iqbal, II Edition 1934.

-4 تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص190 مترجمہ سیّد نذیر نیازی۔ شائع کردہ بزم اقبال، لاہور۔

(2)

° یہ اقتباس بھی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور کا ص276۔

-1 اگر تم جانو تو یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ (الصّف:11)

(3)

° نمبر 4,3 کے ذیل میں دی گئی تحریریں 1935ء میں حضرت علامہؒ نے سیّد نذیر نیازی، تب ایڈیٹر طلوع اسلام، دہلی) کے نام لکھیں۔ ان کا شانِ نزول خود انھی کی زبانی سنیے:

”......(ان) کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ 35ء میں انجمن احمدیہ اشاعت اسلام، لاہور کے انگریزی ہفت روزہ لائٹ، نے بلاوجہ حضرت علامہؒ کے انگریزی خطبات بالخصوص پانچویں خطبے پر

اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ جو حضرت علامہؒ کہتے ہیں کہ بابِ نبوت مسدود ہے، یہ دراصل مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ حضرت علامہؒ نے کہیں عقل استقرائی کا ذکر کر دیا تھا۔ مدیر لائٹ اس کا صحیح مفہوم تو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے فرمایا یہ دیکھئے اقبالؒ عقل کو نبوت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ مغرب زدگی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ مضمون شائع ہوا تو راجہ حسن اختر صاحب نے انگریزی زبان ہی میں مدیر لائٹ کے نام ایک خط لکھا، جس میں ان کے غلط خیال کی تردید بڑے معقول طریقے سے کی گئی تھی۔ اتفاق سے لاہور میں راجہ صاحب سے لائٹ کے اس مضمون کا ذکر آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ پرچہ چونکہ ایک انجمن کا ہے، جس کی ایک مخصوص دعوت ہے لہٰذا مجھے اس کا ترجمہ اردو میں شائع کر دینا چاہیے۔ حضرت علامہؒ نے بھی اس خیال سے اتفاق فرمایا۔ پھر جب ضمناً بعض دوسرے مسائل کی وضاحت ضروری نظر آئی اور میں نے حضرت علامہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے ازراہِ عنایت (یہ) دو تحریریں مرحمت فرمائیں، (مکتوباتِ اقبالؒ ص 300، مرتبہ سیّد نذیر نیازی، یہ طویل اقتباس صرف اس لیے درج کیا گیا ہے تا کہ آپ ان تحریروں کے پس منظر سے پوری طرح آ گاہ ہو سکیں۔

-1 خط کشیدہ الفاظ میں دی گئی یہ عبارت وہی ہے جسے بشیر احمد صاحب ڈار نے اپنی کتاب انوارِ اقبال میں حذف کر دیا ہے جبکہ علامہ مرحوم کی تحریر کے عکسی متن میں یہ موجود ہے اور صاف پڑھی جاتی ہے۔

-2 ابی جعفر محمد بن جریر الطبری، تیسری صدی ہجری کے مایہ ناز مسلمان مورخ، محدث اور مفسر۔

-3 علامہ طبری کے الفاظ یہ ہیں: **كَانَ يُؤَذِّنُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَشْهَدُ فِي الْآذانِ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَكَانَ الَّذِیْ يُؤَذِّنُ لَهٗ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ النَّوَاحَةَ وَكَانَ الَّذِیْ يُقِيْمُ لَهٗ حُجَيْرُ ابْنُ عُمَيْرٍ وَيَشْهَدُ لَهٗ وَكَانَ مُسَيْلَمَةَ اِذَا دَنَا حُجَيْرٌ مِّنَ الشَّهَادَةِ قَالَ صَرِّحْ حُجَيْرٌ فَيَزِيْدُ فِیْ صَوْتٍ وَيُبَالِغُ التَّصْدِيْقَ نَفْسَهٗ (تاریخ طبری، ج 3 ص 244)**
کہ نبی کریمؐ کے لیے اذان دیتا تھا کہ..... محمد اللہ کے رسول ہیں۔ (مسیلمہ کذاب کے لیے) اذان عبداللہ بن النواحہ دیتا اور اقامت حجیر بن عمیر کہتا اور جب حجیر شہادت کے قریب پہنچتا تو مسیلمہ کہتا: اے حجیر! خوب زور سے کہو (یعنی شہادت کو بلند آواز سے کہو تا کہ لوگوں کو اچھی طرح سنائی دے) پس حجیر آواز کو بلند کرتا۔ اس طرح مسیلمہ اپنی تصدیق میں مبالغہ کرتا۔

-4 یہ اشارہ ہے حضرت علامہ کے پانچویں لیکچر کے اس جملہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا: **Life cannot for ever be kept in leading strings.**
The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Page

120. By Sir Muhammad Iabql.

-5 ثابت۔ -6 نجات۔

-7 انوارِ اقبال ص45 مرتبہ بشیر احمد ڈار شائع کردہ، اقبال اکادمی، کراچی۔

(4)

-1 منشاء غرض و غایت۔ -2 وقت۔

-3 کسی ایک ذات سے تعلق رکھنے والی حقیقت۔

-4 معاشرتی و سماجی۔ -5 سماجی و سیاسی مکتب فکر۔ -6 مکتب فکر۔

-7 شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اسلامی اندلس کے ایک مشہور صوفی بزرگ جو چھٹی صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔

-8 انوارِ اقبال ص 47 مرتبہ بشیر احمد ڈار۔

سیّد نذیر نیازی

علامہ اقبالؒ اور ختم نبوت

آج سے چند ماہ پہلے جب علامہ اقبال مدظلہ نے احرار اور قادیان کی باہمی آویزش کے متعلق اپنا مشہور بیان شائع کیا (1) تو اس میں ختم نبوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ ندرتِ تخیل کے اعتبار سے اس عقیدے کی حیثیت بنی نوع انسان کے افکار اور تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس پر قادیان کے علاوہ بعض مسلم اور غیر مسلم حلقوں میں جو رد و کد ہوتی رہی، اس سے قارئین ''طلوعِ اسلام (2)'' بے خبر نہیں ہوں گے۔ لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ علامہ ممدوح نے جو سوال اٹھایا تھا، اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ کیے بغیر جریدہ ''لائٹ (3)'' نے بھی اس موضوع پر رائے زنی کرنا شروع کر دی۔ جہاں تک ختم نبوت کا تعلق ہے، مدیر ''لائٹ'' ڈاکٹر صاحب کے ارشادات سے حرف بحرف متفق تھے لیکن کبھی نہ معلوم اختلالِ ذہنی کی بنا پر انھوں نے سمجھ لیا کہ ختم نبوت سے مقصد یہ ہے کہ انسان دینی قیود سے آزاد ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس غلط اور بے بنیاد تعبیر کو کوئی صحیح الفہم انسان ایک لمحے کے لیے بھی قبول نہیں کرے گا۔ جریدہ ''ٹروتھ'' (4) نے ایڈیٹر صاحب کو اس غلط بیانی پر متنبہ بھی کیا تھا۔ پھر راجا حسن اختر صاحب نے اپنے ایک مراسلے میں جس کو ہم دوسری جگہ شائع کر رہے ہیں، ''لائٹ'' کے شبہات کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ''تشکیلِ جدید'' کے پانچویں خطبے میں یہ بحث کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، جس کے مطالعے کے بعد کسی غلط فہمی کا احتمال نہیں رہے گا لیکن ایڈیٹر ''لائٹ'' غالباً فلسفہ سے ناواقف ہیں، اس لیے کہ ان افسوس ناک غلط فہمیوں کے اعتراف کے بجائے جن کی بغیر کسی احساسِ ذمہ داری کے انھوں نے بڑے جوش و خروش سے اشاعت کی ہے، وہ بدستور اپنی رائے پر قائم رہے اور تشکیلِ جدید کی عبارات میں کچھ اس قسم کی معنوی تحریفیں کی ہیں، جن کو دیکھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے

شبہات خلوص اور دیانت داری پر مبنی ہیں لیکن جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے انھیں ''شاعر کی ذات سے عقیدت اور نیاز مندی کا دعویٰ ہے۔'' اور اس امر کا اعتراف بھی کہ ''نوجوانانِ اسلام کی خوابیدہ روحیں اقبال ہی کی شاعری سے بیدار ہوئیں۔'' لہٰذا سوچنے کی بات تھی کہ ان کا ذہن جس غلط نتیجے پر پہنچا ہے اس کی ذمہ داری خود انہی کے عجز و فہم پر عائد ہوتی ہے، یا راجا صاحب کی تصریحات پر۔ یہ اس لیے کہ شاعر کا پیغام تمسک بالکتاب، اتباعِ رسول ﷺ اور پابندیِ دین کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہر کیف ایڈیٹر ''لائٹ'' کی ساری مشکل، ''تشکیلِ جدید'' کی یہ عبارت ہے:

''اسلام کا ظہور...... استقرائی علم کا ظہور ہے...... اسلام نے نبوت کی تکمیل سے خود نبوت کو ختم کر دیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ قیود کا پابند نہیں رکھا جا سکتا۔ شعورِ ذات کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے۔''(5)

ان سطور سے ہمارے فاضل صحافی نے یہ عجیب و غریب نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''اقبال نے عقلِ انسانی کو وحی پر ترجیح دی ہے۔ ان کے نزدیک ذات یا ''انا'' تمام عظمتوں کا دار و مدار ہے...... یہ نطشے کا اثر ہے...... مغربیت کی جھلک...... اگر ختم نبوت سے مطلب سلسلہ وحی کا انقطاع اور عقل کا ظہور ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اب ہماری نجات قرآن سے وابستہ نہیں...... اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شعورِ نبوت ایک قسم کی کفایتِ فکر ہے، جس کا تعلق انسان کے عہدِ طفولیت سے تھا...... وغیرہ وغیرہ......''

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب ''لائٹ'' اگر وحی و عقل کے باہمی فرق اور تاریخِ انسانی کے مختلف ادوارِ تمدن سے ناواقف ہیں، لہٰذا ''تشکیلِ جدید'' کی عبارتوں کا مطلب نہیں سمجھے تو خیر یہ ان کی معذوری تھی۔ لیکن انھوں نے راجا صاحب کی فہمائش کے باوجود بعض ضروری عبارات کو نظر انداز کر دیا اور اس طرح تحقیق و تنقید کی دنیا میں ایک شدید ناانصافی کے مرتکب ہوئے۔ تشکیلِ جدید کی پوری عبارت یہ ہے:

''اسلام کا ظہور جیسا کہ ہم آگے چل کر ظاہر کریں گے، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام نے نبوت کی تکمیل سے خود نبوت کو ختم کر دیا۔ اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ قیود کا پابند نہیں رکھا جا سکتا۔ شعورِ ذات کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے...... اسلام نے دینی پیشوائی اور بادشاہت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ علیٰ ہذا قرآن مجید

نے انسان کے محسوسات و مدرکات اور غور وفکر پر بار بار زور دیا ہے اور کہا ہے کہ تاریخ اور فطرت دونوں علم کے ذرائع ہیں۔ یہ سب اس خیال کے مختلف پہلو ہیں جو انقطاعِ نبوت کی تہ میں کام کرتا ہے لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ باطنی واردات، الہام وکشف (مدیر) کو جو باعتبار کیفیت شعور نبوت سے مختلف نہیں، اب زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ قرآن مجید نے انفس اور آفاق دونوں کو علم کا ماخذ ٹھہرایا ہے۔ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور (داخلی) محسوسات اور (خارجی) مدرکات دونوں میں ہوتا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ اپنی واردات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا رہے اور اس طرح معلوم کرے کہ ان میں کہاں تک حصول علم کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں کہ اب زندگی پر عقل کی حکمرانی مقدر ہو چکی ہے، اس میں جذبات کو دخل نہیں ہوگا۔ ایسا ہونا نہ ممکن ہے نہ مقصود۔ عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے باطنی واردات کے متعلق ایک آزاد اور ناقدانہ طرزِ عمل کرنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرے گا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر ہمیں اپنی اطاعت کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ پس ختم نبوت کا مقصد یہ ہے کہ ہماری داخلی واردات کی دنیا میں بھی نئے نئے مظاہر علم کا انکشاف ہو۔'' (6)

کیا ایڈیٹر صاحب لائٹ انکار کر سکتے ہیں کہ یہ انسان کے شعور ذات کی تکمیل میں ایک ضروری مرحلہ تھا جس کی اہمیت کا شاید وہ اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے ٹھیک اندازہ نہیں کر سکے۔

بہرکیف ختم نبوت کا مسئلہ اس قدر اہم ہے اور اس کے متعلق علامہ اقبال نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اگر ان کی مزید تشریح کر دی جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ یوں بھی ایک علمی اور دینی بحث کی حیثیت سے اس بارے میں کسی مزید غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہنی چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ''تشکیل جدید'' کی جس عبارت سے ایڈیٹر ''لائٹ'' نے ٹھوکریں کھائی ہیں، ان کا موضوع عقلی اعتبار سے ختم نبوت کی تائید کرنا ہے۔ یعنی یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد بعثتِ انبیا کا سلسلہ بند ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے امور ذیل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ عقل اور وحی دونوں کو علم کا ماخذ ٹھہرا کر ان کا باہم مقابلہ کرنا صحیح نہیں۔ اس لیے کہ علم کا ذریعہ انسان کے داخلی اور خارجی حواس ہیں۔ عقل انکشافاتِ حواس کی تنقید کرتی ہے۔ خواہ علوم فطرت کی دنیا میں ہمیں اپنے خارجی حواس کی بدولت جو علم حاصل ہوتا ہے۔ عقل نے

اس کی صحت وعدم صحت کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف نظریوں اور اصول وکلیات کی بنا رکھی اور انسان کو اس کے بعض مغالطوں پر مطلع کیا۔ مثلاً طلوع وغروب آفتاب یا سکونِ زمین......اسی طرح تکمیلِ وحی کے بعد عقل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر مدعی الہام وکشف کی نفسیاتی حالت کی تنقید کرے تاکہ اس امر کا پتہ چل سکے کہ جو شخص الہام وکشف کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی شخصیت کیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملت اسلامیہ میں اس تنقید کا مدار قرآن وسنت پر ہوگا۔

دوسرے یہ کہ وحی بیشک حصولِ علم کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس میں اور علم بالحواس میں فرق یہ ہے کہ جہاں علم بالحواس محنت اور انتظار کا پابند ہے اور اس کے لیے قیدِ زمانی شرط وہاں وحی میں علم کا یہ زمانی عنصر غائب ہو جاتا ہے۔ گویا یہ ایک لمحے یا ''طرفتہ العین'' میں ان حقائق کا انکشاف ہے جن کو ہم اپنے حواس کی مدد سے ہزارہا سال کی مدت میں بھی معلوم نہیں کر سکتے۔ باعتبار کیفیت اگر ہم علم بالوحی کا تصور کرنا چاہیں تو اس کے لیے الہام وکشف یا آرٹ اور فلسفہ وحکمت کی دنیا میں ''القا'' کی مثال پیش کی جاسکتی ہے لیکن جس طرح بلحاظ قدر وقیمت الہام وکشف کا درجہ ''القا'' سے بلند ہے اسی طرح کشف والہام کو وحی سے کوئی نسبت نہیں کیونکہ کشف والہام کی کیفیت انفرادی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے حجت نہیں۔ برعکس اس کے وحی ایک اٹل اور ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس سے جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ان کی پابندی ہر شخص پر فرض ہے۔ لہٰذا اصطلاحاً وحی کا لفظ اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے جب خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو ہم کلامی کے لیے منتخب کرے اور اس طرح اس سے انسان کی ہدایت وراہنمائی کا مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کی حیثیت ہمیشہ اجتماعی ہوتی ہے اور اس کا وجود ہمارے لیے حجت۔ ضروری نہیں کہ ہم عقلاً اس کی تمام مصلحتوں کو سمجھ سکیں۔

تیسرے یہ کہ اسلام سے پہلے جو ادوارِ تمدن گزرے ہیں، ان میں باوجود اختلافات کے ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ ان سب کی بناء استخراج پر تھی، جو استقرا کے برعکس تحقیقِ حق اور تسخیر فطرت کا ایک سہل مگر ناقص طریق ہے، اس لیے کہ یہ وہ منہاج علم ہے جو تجربہ اور مشاہدہ اور محنت وانتظار کی سعی وجہد سے آزاد ہے۔ اسی لیے وحی الٰہی کی ضرورت تھی کہ بار بار انسان کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کرے۔ لہٰذا اس کے رشد وہدایت کے لیے ہر جگہ اور ہر زمانے میں انبیا علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے۔ جن کی تبعیت وپیروی فرض تھی۔ یہ گویا تاریخ انسانی کا عہد طفولیت

ہے جس میں انسان اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ وحی الٰہی نے بتدریج اس کی تربیت کی۔ اگر یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تو ناممکن تھا کہ انسان کے اندر اعتماد علی النفس پیدا ہوتا اور وہ اپنے شعورِ ذات کی من کل الوجوہ تکمیل کر سکتا کیونکہ اس کے لیے کوئی نظام حیات آخری اور قطعی نہیں تھا۔ تکمیل وحی کی ضرورت خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے قبل انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی لیکن اس سے ان برگزیدہ اور مقدس افراد کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا، جو منصب نبوت سے سرفراز ہوئے۔ اس لیے کہ یہاں بحث نوع انسانی سے ہے۔ اس کے تدریجی ارتقا سے کہ حکمت الٰہیہ کس طرح اس کو اس مرحلے پر لے آئی جب اسے علم استقرائی سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ (علم استقرائی کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے ماحول پر غالب آسکے) اور رسالتِ محمدیہ کے ذریعے زندگی کی آخری اور دوامی اساس اس پر منکشف کی۔ اس امر کو قرآن پاک نے کس خوبی سے تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت سے تعبیر کیا ہے اور حقیقت میں یہ نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہم انسانوں پر اتنا بڑا احسان ہے جس کا حق قیامت تک بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ البتہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس آخری ہدایت کے ہوتے ہوئے بھی انسان چھوٹی چھوٹی اور وقتی ہدایتوں کا محتاج ہے یا یہ کہ وحی محمدی کے باوجود قانونِ حیات کی تکمیل ابھی باقی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ضرورتِ نبوت کے قائل ہیں تشریعی ہو یا غیر تشریعی اور وہ لوگ جو مغربی خیالات کے زیر اثر نظام شریعت کو اپنے لیے حجت نہیں سمجھتے، وہ دانستہ یا نادانستہ نبوت محمدیہ کے منکر ہیں۔ اس لیے کہ وہ انسان کو پھر اس دور کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جہاں سے اسلام ان کو آگے لے آیا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا مطلب نہیں سمجھتے اور انھیں تعلیماتِ قرآنی میں کوئی بصیرت حاصل نہیں۔

چوتھے یہ کہ اختتام وحی یا انقطاعِ نبوت سے یہ استدلال کرنا غلط ہے کہ اب عقل کو (نعوذ باللہ) وحی پر ترجیح حاصل ہے۔ لہٰذا اس سے مقصود تبعیتِ وحی کو ختم کر دینا ہے۔ یہ کہنا کہ آئندہ کے لیے نزولِ وحی کو روک دیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ کہاں مرتب ہوتا ہے کہ اب وحی کی پیروی ضروری نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں تنہا یا باہم اس درجہ مختلف ہیں کہ ان کو دنیا کی کوئی منطق ایک نہیں ٹھہرا سکتی۔ اس لیے ہمیں اپنی زندگی کے متعلق جو بصیرت حاصل ہوئی ہے، اس کا سرچشمہ بھی وحی ہے۔ یہ وحی الٰہی ہے جس کی بدولت انسان نے اپنے موجودہ دورارتقا میں قدم

رکھا۔ لہٰذا ان میں سے ایک کا انکار گویا دوسرے کا انکار ہوگا۔ یہ کیونکر ثابت ہوا کہ نبوت محمدیہ ﷺ نے ہمارے لیے جو راہ مقرر کی ہے، اس کا اختیار کرنا احکام نبوت کو رد کرتا ہے، اس سے تو خود بخود احکام نبوت کا اتباع لازم آتا ہے۔ اگر اسلام نے انسان کو علوم استقرائی سے روشناس کرایا اور اس کو بار بار عقل وفکر اور مشاہدے کی دعوت دی تو عقل وفکر اور مشاہدے کے ساتھ استقرائی علوم کا وجود کس دلیل کے ماتحت اسلام کا منافی ہے؟ اس سے اگر کوئی نتیجہ مرتب ہوسکتا ہے تو صرف یہ کہ اگر شعورِ ذات کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ انسان محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی اختیار نہ کرے۔ لہٰذا نبوتِ محمدیہ کی ختمیت ہی اس کی ابدیت پر دلالت کرتی ہے بلکہ اگر ہم چاہیں بھی تو احکامِ نبوت سے آزاد نہیں ہوسکتے کیونکہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوئے ہیں جن کو فطرتِ صحیحہ خود بخود قبول کرتی ہے۔ ان کا اتباع گویا تقاضائے فطرت کا اتباع ہے، اسی لیے اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے خود ہمارے فائدے کے لیے پسند کیا۔ یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ **وماجعل علیکم فی الدین من حرج (7)۔**

پانچویں یہ کہ نبوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ مخصوص حالات و واردات جن کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی تصوف میں نبوت کو روحانیت کا ایک مقام خاص (مقام بھی تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔) تصور کیا جاتا ہے، اور دوسرا سنتِ نبوی ﷺ جس سے ایک جدید اجتماعی اور سیاسی فضا کی تخلیق ہوتی ہے اور انبیا و مرسلین جماعتِ انسانی کے سامنے اخلاق واعمال کا ایک نیا تخیل پیش کرتے ہیں جس کے اقرار سے انسان کمالاتِ زندگی تک پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس جدید نظام میں شریک نہیں ہوتا، وہ کمالات ذات سے محروم رہتا ہے۔ اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں لفظ کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا رسالت کی تصدیق محض صاحب رسالت کے مرتبہ ومقام کا اعتراف نہیں بلکہ یہ عبارت ہے اس کی سنت کے اتباع اور جس اخلاقی فضا کی تخلیق اس کے وجود سے ہوئی تھی، اس میں پرورش حاصل کرنے سے۔ اگر کوئی شخص اس پابندی سے گریز کرتا ہے تو وہ بلاشک وشبہ کافر ہے۔ لہٰذا نبوت کا اطلاق اسی وقت ہوسکتا ہے جب کسی شخص میں دونوں اجزا موجود ہوں، بالفاظ دیگر ختم نبوت کے یہ معنی ہوں گے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کے بعد اب کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ ان اجزاء کا حامل ہے یعنی ایک طرف اسے روحانیت

کا وہ مقام حاصل ہے جو انبیا کے لیے مخصوص تھا اور دوسری جانب اس کی ذات ملت کے لیے حجت کہ اگر ہم اس کی جماعت میں داخل نہیں ہوتے تو گویا کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو شخص اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے وہ کاذب ہے اور شریعت اسلامی کی رو سے واجب القتل جیسا کہ مسیلمہ کذاب کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ اسے باوجود رسالت محمدیہ ﷺ کی تصدیق کے قتل کر دیا گیا۔ البتہ ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں کہ مکالمہ الٰہیہ، کشف والہام کا سلسلہ منقطع ہوگیا کیونکہ ہر سچے اور اخلاص مند مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کو بطور دین فطرت کے اپنی ذات پر منکشف کرے۔ یہ گویا اس کے پیش کردہ حقائق سے اتحاد و اتصال کی کوشش ہے، جس کو اصطلاحاً لفظ ''تصوف'' سے تعبیر کیا گیا ہے مگر اس طرح انسان کو جو مقام حاصل ہوتا ہے، اس کو ولایت سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد الہام کو کشف کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ وہ کسی شخص کے ذاتی واردات اور مشاہدات تو ضرور ہیں لیکن ان کی جماعتی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ امت کو اس کی تنقید و تحقیق، علیٰ ہذا تنقیص کا حق حاصل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ صاحبِ الہام ان کو اپنے لیے حجت سمجھے مگر یہ کہنا کہ وہ تمام عالم اسلام کے لیے بھی حجت ہو سکتے ہیں، غلط ہوگا کیونکہ اس طرح استقرار تنقید اور روایت و درایت غرضیکہ تاریخ اور علم وحکمت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی فتنہ تھا جس سے امت کو محفوظ رکھنے کے لیے ختم نبوت کی ضرورت پیش آئی تاکہ وحی محمدی کو قیامت تک حجت ٹھہرایا جا سکے گویا ختم نبوت سے مقصد مطلقاً بابِ نبوت بند کر دینا ہے۔ یعنی یہ کہ اب انسان کی تاریخ میں کسی جدید اخلاقی اور اجتماعی فضا کی تخلیق نہیں ہوگی۔ اس کو جس چیز کی ضرورت تھی مل گئی۔ انسان اس بات کا محتاج نہیں کہ وہ اپنی ہدایت و راہنمائی کے لیے نئے نئے انبیا کی آمد کا منتظر رہے۔ اس کی تکمیل ذات اور اعتماد علی النفس کے تمام مراحل پورے ہو چکے ہیں۔ خدا کا بھیجا ہوا قانون اور اس کا عملی نمونہ یعنی سنتِ نبوی ﷺ اس کے سامنے ہیں۔ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی سعی و کوشش سے اس راہ پر چلے اور اس طرح فیوض و برکاتِ الٰہیہ کا مستحق ہو لیکن یہ امر کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے جناب رسول مقبول ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے انسان کا اتباع اور پیروی ضروری ہے صحیح نہیں۔ اس کا مطلب ہوگا کہ نبوت محمدیہ ﷺ کے باوجود ابھی انسان کو مزید ہدایت اور راہنمائیوں کی ضرورت ہے حالانکہ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے ایمان ویقین کی تکمیل ہو چکی ہے اور اب انسان اپنی نجات

کے لیے کسی دوسرے انسان کا محتاج و منتظر نہیں۔ تاریخ انسانی کے ایک دور میں البتہ اس کی ضرورت تھی لیکن ظہور اسلام کے ساتھ اس دور کا، جس کے نفسیاتی خصائص میں انتظار اور بے اعتمادی شامل ہیں، لہٰذا اس کے لیے ''مجوسی ثقافت'' کی اصطلاح وضع کی گئی، خاتمہ ہو گیا کیونکہ تکمیلِ دین کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ انسان کو اور وحیوں اور ہدایتوں کا منتظر رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اسلام میں تشریعی اور غیر تشریعی نبوت اور ظل و بروزِ بعثت کے جو تصورات قائم ہیں، وہ سب مجوسی اندازِ خیال کا نتیجہ ہیں اور ختم نبوت میں حارج ہوتے ہیں۔ اسلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ جن احادیث و روایات کو ان کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے، ان کے باوجود تمام ائمہ و صوفیا اور سلف صالحین نے اس قسم کے کسی عقیدے کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ گویا مجوسی ثقافت کے حامی ان کی جو تاویل کرتے ہیں غلط ہے۔ شرعی لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن وسنت سے ان کی کوئی سند نہیں ملتی اور عقلی اعتبار سے وہ اعتمادِ ذات اور تکمیلِ شعور کی اس دولت کو چھین لیتے ہیں، جو بنی نوع انسان پر اسلام کا ایک زبردست اور نا قابلِ انکار احسان ہے۔

حواشی

1- مضمون کا عنوان ہے ''Qadianism & Orthodox Muslims'' یہ مضمون لطیف احمد......کی مرتبہ کتاب Speeches, Statements and Writings of Iqbal (لاہور 1977ء) میں شامل ہے۔

2- مصنف کا رسالہ ''طلوعِ اسلام'' جو اُن دنوں دہلی سے شائع ہوتا تھا۔

3- ''Light'' انگریزی ہفت روزہ جو قادیانیوں کا ترجمان تھا۔

4- Truth انگریزی ہفت روزہ جو قادیانیوں کی لاہوری جماعت کا ترجمان تھا۔

5- ''تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ'' ص 193۔

6- اس پیراگراف میں اقبال کے جن خیالات کو پیش کیا گیا، وہ تشکیلِ جدید میں صفحہ 93، 94 پر ملتے ہیں۔

7- سورۃ: الحج، آیت: 78 ترجمہ: اور اس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

سید عزیز اللہ شاہ ایڈووکیٹ

علامہ اقبالؒ اور عقیدہ ختم نبوت

نبوت کا تاریخ کائنات میں براہ راست واسطہ اور تعلق ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہوتا ہے کہ زمین پر انسان کے ظہور سے ہی نبوت کا آغاز ہوتا ہے۔ علامہ غلام رسول سعیدی ''تبیان القرآن'' میں نبی کریم ﷺ کی صفات لازمہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- ''نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس قوم کی طرف مبعوث ہو، وہ اس میں سب سے اشرف اور مکرم ہو اور وہ آزاد ہو کیونکہ غلامی ایک نقص ہے جو مقام نبوت کے لائق نہیں ہے اور مرد ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم (یوسف:109)

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے بھی (مختلف) بستیوں والوں میں سے مردوں ہی کو بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی فرماتے تھے''۔

اس آیت کی بنا پر جمہور اہل سنت کے نزدیک عورت کا نبی ہونا جائز نہیں ہے۔ نیز نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوی ہو، فہیم اور عالم ہو اور اس کے اخلاق عمدہ ہوں تاکہ لوگ سہولت کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکیں۔ انبیا (علیہم السلام) بخل، بزدلی، لغو اور بے فائدہ کاموں اور تمام رزائل سے مجتنب ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا کی حرص سے بھی منزہ ہوتے ہیں اور اپنی قوم میں ان کا نسب سب سے عمدہ اور اشرف ہوتا ہے''۔ (تبیان القرآن جلد 3، صفحہ 647)

جیسا کہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز!

(ضرب کلیم)

اقبال محکوم کے الہام کی بات کرتے ہوئے اللہ سے اس کی پناہ مانگتے ہیں کیونکہ وہ چنگیز کی طرح قوموں کا سرمایہ ایمان لوٹتا ہے اور انہیں برباد کر دیتا ہے۔ ملت کو مصلحت پسندی اور بے عملی کی طرف راغب کر کے قوم کے زوال کا کلیدی کردار ثابت ہوتا ہے۔

بلاشک وشبہ منصبِ نبوت تاریخ عالم کی تعمیر وتشکیل کے لیے بہت بڑی حیثیت رکھتا ہے گو کہ اپنی عظمت اور اس شان جو اللہ رب ذوالجلال نے عطا کی، اس میں یہ حد ادراک سے ماوراا ور لا متناہی ہے۔ مگر وہ نظم جس کے تحت اللہ کریم نے اس کا اجرا کیا، اس نظم میں اس کی ایک حد مقرر کر دی، ارواحِ انبیا (علیہم السلام) کی تعداد مختص ہو گئی۔ یعنی سلسلہ کی پہلی کڑی اور آخری کڑی کو معین کر دیا گیا۔

نبوت کا تعلق ہیت اجتماعیت انسانی سے ہے۔ فلسفیانہ بنیادوں پر مقام نبوت اور ضرورت نبوت کو اگر حیاتِ انسانی کے فوائد کے تناظر میں دیکھیں تو اس سے اجتماعی زندگی کے وہ اصول متعین ہو جاتے ہیں جو غیر نبوت انفرادی سطح پر طے کرنے میں مشکل و محال نظر آتے ہیں جبکہ اول الذکر کی موجودگی سے امورِ زندگی کے بارے فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

عہدِ حاضر میں فلسفہ نبوت کے انسانی زندگی میں کردارِ حقیقی کے فہم وادراک کے لیے فلسفہ اقبالؒ سے شناسائی نہایت اہمیت کی حامل ٹھہرتی ہے۔ لیکن کسی بھی شخصیت کے نظریات کی روشنی میں کچھ سمجھنے اور اس علمی شخصیت کے افکار ونظریات کے گلشن سے فہم وادراک کی خوشبو سے معطر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے ہر خوشے سے وابستہ اور پیوستہ تمام پہلوؤں کو اور اس کی فکر کی مرحلہ وار تغیر پذیری کو مدنظر رکھتے ہوئے سمجھا جائے اور پھر اس کی اجتماعی زندگی کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اس کی زندگی کے مطالعہ عمیق سے اس کے افکار کی روشنی میں مختلف چیزوں کا فہم کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

جب انسان کی عقل اپنی ترقی کے اعتبار سے مختلف منزل طے کرتے ہوئے جوان ہو رہی تھی تو انسانی زندگی کے لیے کوئی ایسے بنیادی ٹھوس اصول متعین نہ تھے جن پر عمل رہتی دنیا تک کے لیے ممکن ہوتا۔ انسانی فکر مجرد (Abstract) بنیادوں پر استوار تھی۔ اس کے ساتھ ہی معاشرتی رویوں میں ترقی ہوتی چلی گئی، انسانی تہذیب اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی تھی جس کے بارے میں اقبال اپنے خطبے ''مسلم ثقافت کی روح'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

"There is no doubt that the ancient world produced some great systems of philosophy at a time when man was comparatively primitive and governed more or less by suggestion. But we must not forget that this system-building in the ancient world was the work of abstract thought which cannot go beyond the systematization of vague religious beliefs and traditions and gives us no hold on the concrete situations of life.

(Reconstrcution of Religious Thought in Islam)

''اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے قدیم نے ایک وقت میں بعض بہت بڑے فلسفیانہ نظام پیش کیے، جبکہ انسان اپنی ابتدائی منازل پر تھا اور اس پر کم وبیش روایات کا غلبہ تھا مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پرانی دنیا میں یہ نظام بندی مجرد فکر کا نتیجہ تھی، جو مبہم مذہبی اعتقادات اور روایات کی ترتیب و تنظیم سے آگے نہیں جا سکتی اور اس سے ہمیں زندگی کے ٹھوس حقائق پر گرفت حاصل نہیں ہو سکتی''۔

سادہ فہم الفاظ میں انسانی عقل یہ تمام مدارج و مقام سے ہوتے ہوئے بتدریج اپنے اختتام و تکمیل کی طرف گامزن تھی۔ ساتھ ہی زمانے نے مختلف کروٹیں لیں اور تقاضائے حیات کو بھی بدل ڈالا جس کے لیے مختلف صورت حال کے پیش نظر مخصوص اوقات و مقصود کے لیے انبیا کرام (علیہم السلام) تشریف لاتے رہے جنہوں نے ''خیر'' کی دعوت دی اور ''شر'' سے روکا۔ حتیٰ کہ زمانے پر وہ وقت آن پہنچا جس مقررہ وقت کی بشارت و نوید اس متعین کردہ وقت میں تشریف لانے والے نبی سے پہلے آنے والے تمام انبیا کرام (علیہم السلام) اپنی قوموں کو دیتے رہے۔ جس کو علامہ اقبالؒ یوں بیان فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی بعثت ایسے وقت پر ہوئی جو زمان و مکاں کے اعتبار سے موزوں ترین ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بنی آدم پر یکے بعد دیگر گزرنے والے قرون میں سے سب سے بہتر قرن میں مجھے مبعوث کیا گیا اور سب سے بہتر قرن وہی ہے جس میں مجھے بھیجا گیا''۔ (تفسیر ابن کثیر، ج2، ص299)

حضرت علامہ اقبالؒ خطبہ میں فرماتے ہیں:

"Looking at the matter from this point of view, then, the Prophet of Islam seems to stand between the ancient

and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction."

''اس معاملے پر اس نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو ہمیں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ قدیم اور جدید دنیاؤں کے سنگم پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک آپ ﷺ کی وحی کے منابع کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کا تعلق قدیم دنیا سے ہے۔ جہاں تک اس وحی کی روح کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کا تعلق دنیائے جدید سے ہے۔ آپ میں زندگی نے علم کے کچھ دوسرے ذرائع کو دریافت کر لیا جو نئی سمتوں کے لیے موزوں تھے''۔

اسی بات کو اپنے فارسی کلام ''پیش کش بحضور ملت اسلامیہ'' میں یوں فرماتے ہیں:

اے ترا حق خاتم اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد

(رموزِ بیخودی)

''اے وہ امت جسے حق تعالیٰ نے خاتم اقوام بنایا ہے اور جس پر اپنی ہر ابتدا کی انتہا کر دی ہے''۔

یعنی ''اے ملت اسلامیہ! جس طرح تیرے رسول ﷺ خاتم الرسل اور اس دنیا کے آخری نبی تھے، اسی طرح تو قوموں کی خاتم ہے۔ یعنی تیرے بعد کوئی قوم پیدا نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں جو آغاز ہوا تھا، وہ تیری ذات پر انجام کو پہنچ گیا''۔

لہٰذا انبیا علیہم السلام کا پیغام ہدایت پہنچانے کا فریضہ اپنے حتمی انجام کو پہنچا اور خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا قدیم وجدید وقت کے درمیان میں تشریف لانا جن کے علم سرچشمہ وحی کا تعلق قدیم بنیادوں پر ہے لیکن جس کی روح ایسے افکار سے عبارت ہے جن کی روشنی میں جدید دنیا کے لیے حل نکالا جا سکتا ہے۔ انسان کے دنیا میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی انسانی عقل اپنے ترقی کے مختلف مدارج سے ہوتے ہوئے ایک خاص مقام پر آن پہنچی جس مقام انتہا کے لیے اس کی سعی تاریخ انسانی کے ساتھ شروع تھی اور نبوت کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اس

درمیانی عرصے میں انسانی عقل کامل ہوئی، تہذیب وتمدن کے بنیادی اصول متعین ہو گئے جو اپنی نوعیت میں ایسے غیر متزلزل ہیں جن کو بنیاد بنا کر عقل استقرائی سے ابدالآباد تک درپیش معاملات کو طے کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ یوں فرماتے ہیں کہ:

"The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition."

(Reconstruction of Religious Thought in Islam)

''اسلام کی آفرینش، عقل استقرائی کی آفرینش ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچی ہے کیونکہ اس نے اپنے ہی خاتمے کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے''۔

اسی لیے اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کا کلیسائیت کی طرح پاپائیت و مذہبی پیشوائیت تسلیم نہ کرنا، قرآن حکیم کا عقل اور تجربے پر بار بار زور دینا اور کائنات، فطرت اور تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرانا، یہ سب عقیدہ وتصور ختم نبوت کے مختلف پہلو ہیں۔ بقول اقبالؒ:

"The abolition of priesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Quran, and the emphasis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality."(ایضاً)

''اسلام میں پاپائیت اور موروثیت کا خاتمہ قرآن میں استدلال اور عقل پر مسلسل اصرار اور اس کا بار بار فطرت اور تاریخ کے مطالعے کو انسانی علم کا ذریعہ قرار دینا، ان سب کا تصور ختم نبوت کے مختلف پہلوؤں سے گہرا تعلق ہے''۔

ختم نبوت کے متعلق حضرت علامہ نے جن زوردار اور تاریخی الفاظ میں اپنی فکر کا نچوڑ پیش کیا ہے، اس سے یہ سمجھنے میں مشکل نہیں رہتی کہ انسان نے جو ارتقائی منازل طے کی ہیں، وہ اسے زندگی کے اس اعلیٰ مقام تک لے آئی ہیں جہاں یہ اپنی عقل سلیم، حواس اور مشاہدے کے ذرائع سے حاصل ہونے والے علوم اور اپنے اعلیٰ شعور کو بروئے کار لا کر اپنا سفر زیست با مقصد بنا سکتا ہے اور اپنے لیے اعلیٰ معیارات کا تعین کر سکتا ہے۔ وحی مکمل ہو چکی، پہلے صحائف منسوخ ہو چکے، پہلے ادیان عدم کی طرح ہو چکے، دین حق مکمل ہو چکا اور کل انبیا کی صفات نبوت خاتم الانبیا

کی نبوت میں جمع ہو گئیں اور خاتم الانبیا کل انبیا کی صفات کے جامع ہیں، اس لیے ہدایت کو حاصل کرنے کے لیے انسان کے پاس کل ذرائع جمع کر دیئے گئے۔ ہر انسان اپنی کاوش سے فیضان وحی سے اپنا حصہ پا سکتا ہے، انسان اب پاپائیت کی طرح کے کسی ادارے کا مستقلاً محتاج نہیں رہا۔ اس سطح پر پہنچ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہی وہ بنیادی عقیدہ ہے ختم نبوت کا جو اقبال کو یہ کہنے کی ''فورس'' فراہم کرتا ہے کہ اسلام کو عرب شہنشاہیت کی چھاپ سے آزاد کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام میں پاپائیت کی طرز کی ملائیت اور خلافت علیٰ منہاج النبوت کے بجائے ملوکیت وملوک پرستی ''عرب شہنشاہیت'' کی عطائیں ہیں وگرنہ نبوت کے سلسلہ کے ختم ہو جانے نے انسان کو اعلیٰ مدارج طے کرنے کے تمام اعلیٰ راستے واضح کر دیئے ہیں۔

جب ایک اخباری نمائندے نے علامہ اقبال سے اسی متعلق پوچھا تو آپؒ نے کہا:

"Questioned about the possibility of divine inspiration and the advent of inspired reformers after the Holy Prophet, Dr. Iqbal replied: (Speeches, Writings and Statements of Iqbal by Latif Ahmad Sherwani, Iqbal Academy, P#206)

جب ان سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کیا فیضان الٰہی کا امکان باقی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ فیضان الٰہی سے مملو مصلحین تشریف لائیں تو ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا:

"I had better answer this question by referring you to my Reconstruction of Religious Thought in Islam, in which I wrote on pp, 120-21".

''میرے لیے آپ کے اس سوال کا جواب دینا اس طرح مناسب ہوگا کہ میں آپ کی توجہ اپنے خطبات کی جانب مبذول کرادوں جن میں صفحہ 120 تا 121 پر میں نے لکھا''۔

جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

"The idea of finality, therefore, should not be taken to suggest that the ultimate fate of life is complete displacement of emotion by reason. Such a thing is neither possible nor desirable. The intellectual value of the idea is that it tends to create an independent critical attitude towards mystic experience by generating the belief that all personal authority, claiming a supernatural origin, has

come to an end in the history of man. This kind of belief is a psychological force which inhibits the growth of such authority. The function of the idea is to open up fresh vistas of knowledge in the domain of man's inner experience."

(Reconstruction of Religious Thought in Islam)

''تصورِ ختمِ نبوت کی عقلی اہمیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ صوفیانہ تجربے کے بارے میں ایک آزادانہ تنقیدی رویے کو پروان چڑھایا جائے کیونکہ انسانی فکر کی تاریخ میں اب ہر قسم کا شخصی تحکم جو کسی مافوق الفطرت سرچشمے کا دعویٰ کرتا ہے، ختم ہو چکا ہے۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک نفسیاتی قوت ہے جو ایسے تحکم کی نفی کرتی ہے۔ اس تصور کا وظیفہ انسان کے باطنی تجربے کی حدود میں تازہ مظاہر علم کا در کھولنا ہے''۔

اقبال کے مندرجہ بالا خطبات اور اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال شروع سے ہی عقیدہ ختمِ نبوت کے علم بردار و جانثار تھے جس کے لیے وہ بڑے واضح الفاظ میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں اور دوسرے مذہب میں ایک فرق عقیدہ ختمِ نبوت پر یقین ایک نمایاں پہلو ہے۔ اقبال کے نزدیک قبل از اسلام تمام مذاہب میں اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ اُن مخصوص مذاہب کے بعد بھی نبوت کا سلسلہ جاری رہے گا اور انبیا و رسل جلوہ گر ہوتے رہیں گے۔ لیکن اسلام اس خاص نقطہ میں ان سے بالکل جداگانہ حیثیت کا مالک ہے کیونکہ اس میں بڑی قطعیت کے ساتھ یہ واضح ہے کہ آقا کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ مثلاً حضرت علامہ اقبال کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"This idea of Finality is perhaps the most original idea in the cultural history of mankind: its true significance can be understood by only those who carefully study the history of pre-Islamic Magian culture in Western and Middle Asia. The concept of Magian culture, according to modern research, includes cultures associated with Zoroastrianism, Judaism, Jewish Christianity, Chaldean and Sabean religions. To these creed-communities the idea of the continuity of Prophethood was essential, and consequently they lived in a state of constant expectation". (Ibid, P#198)

''ختمِ نبوت کا نظریہ بنی نوع انسان کی ثقافتی تاریخ میں غالباً ''بے حد اصلی'' تصور

ہے۔اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مغرب اور وسطیٰ ایشیاء میں ماقبل اسلام مجوسی ثقافت کا بکمال احتیاط مطالعہ کرتے ہیں۔جدید تحقیق کی رو سے مجوسی ثقافت زرتشتی، یہودی، یہودیانہ عیسائیت، کلدانی اور سباہی مذاہب پر محیط ہے۔ان نظریاتی فرقوں کے لیے تسلسل رسالت کا نظریہ لازمی تھا۔نتیجتاً یہ لوگ بعدازاں مسلسل توقع کی زندگی بسر کرتے رہے“۔

اسی طرح ایک اور مقام پہ حضرت علامہ اسی بات کو ایک منفرد پیرائے میں آگے بڑھاتے ہوئے ارشادفرماتے ہیں کہ ان مذاہب کے تسلسل نبوت کے عقیدے کے برعکس اسلام نہ صرف ختم نبوت پہ اصرار کرتا ہے بلکہ مسلم وغیر مسلم میں فرق اس عقیدہ سے ظاہر ہوتا ہے:

"First, that Islam is essentially a religious community with perfectly defined boundaries belief in the Unity of God, belief in all the Prophets and belief in the finality of Muhammad's Prophethood. The last mentioned belief is really the factor which accurately draws the line of demarcation between Muslims and non-Muslims and enables one to decide whether a certain individual or group is a part of community or not."

(Speeches, Writings and P#210)

”اول،اسلام ناگزیرطور پرایک مذہبی کمیونٹی ہے جس کی حدود متعین ہیں۔توحیدالٰہی پر ایمان، جملہ رسولوں پر ایمان اور حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان۔ایمان کا آخر الذکر حصہ (یعنی عقیدہ ختم نبوت) دراصل وہ عنصر ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حد فاصل کا تعین کرتا ہے اور یہ فیصلہ کرنے کی استعداد بخشتا ہے کہ کوئی شخص اسلام کا حصہ ہے یا نہیں“۔

علامہ اقبال گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

”مثلاً براہموخدا کو مانتے ہیں۔وہ حضرت محمد ﷺ کو خدا کے پیغمبروں میں سے ایک سمجھتے ہیں۔انہیں مسلمانوں کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ قادیانیوں کی طرح رسولوں کے ذریعے سے تسلسل وحی کے نظریے پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت کے قائل نہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، اسلام کے کسی فرقے نے اس حد فاصل کو عبور نہیں کیا۔ فارس (اب ایران) کے بہائیوں نے علی الاعلان نظریہ خاتمیت کو مسترد کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ایک نیا فرقہ ہیں اور لفظ کے اعتبار سے وہ ”مسلمان“ نہیں ہیں۔ ہمارے

عقیدے کے مطابق بحیثیت ایک مذہب کے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو وحیاً نازل کیا لیکن ایک معاشرے یا ملت کے طور پر اسلام کا وجود کلیتاً رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کا رہین منت ہے۔ میری دانست میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہیں: یا صاف طریقے سے بہائیوں کی تقلید کریں یا اسلام میں نظریہ خاتمیت (ختم نبوت) کے بارے میں اپنی تعبیرات کو ترک کر دیں اور اس نظریے کو اس کے جملہ مضمرات سمیت قبول کر لیں۔ ان کی عیارانہ تعبیرات محض ان کی اسلام کے زمرے میں رہنے کی خواہش کا نتیجہ ہے تا کہ وہ بدیہی طور سے اس کے فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہیں"۔

حضرت علامہ نے کئی مقامات پہ اسی نقطہ نظر کے مطابق بہائی تحریک اور قادیانی تحریک کی مماثلت کو بیان کیا۔ لیکن اس مماثلت میں اقبال نے یہ واضح کیا کہ جہاں تک اسلام کے وجود کا تعلق ہے، اُسے بہائیوں سے وہ خطرہ نہیں جو قادیانی تحریک سے ہے۔ کیونکہ یہ تحریک فی الاصل غیر اسلامی ہے مگر لبادہ اسلام کا اوڑھے ہوئے ہے جس سے عام اور سادہ لوح مسلمان دھوکہ کھا کر اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے:

"Bahaism appears to me to be far more honest the Qadianism; for the former openly departs from Islam, whereas the latter apparently retains some of the more important externals of Islam with an inwardness wholly inimical to the spirit and aspirations of Islam". (Ibid, P#198)

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہائیت، قادیانیت کے مقابل کہیں زیادہ دیانت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اول الذکر علی الاعلان اسلام سے علیحدگی اختیار کرتی ہے جبکہ موخر الذکر اسلام کے بعض زیادہ اہم خارجی شواہد سے چمٹی رہتی ہے۔ درآنحالیکہ اس کا باطن اسلام کی روح اور اس کی تمناؤں کے سراسر خلاف اور دشمنی سے مملو ہے"۔

جاوید نامہ کے آخری حصہ "خطاب بہ جاوید" میں بھی اقبال نے ان دونوں تحاریک کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے:

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد
آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد

''ایک نام نہاد پیغمبر ایران سے تھا (بہاء اللہ) اور دوسرا ہندی نسل سے تھا (مرزا قادیانی)۔ پہلے نے حج منسوخ کیا اور دوسرے نے جہاد''۔

تا جہاد و حج نماند از واجبات
رفت جاں از پیکر صوم و صلوٰت

''جب جہاد اور حج (مسلمانوں کے لیے) واجب نہ رہے تو روزوں اور نمازوں کی روح بھی ختم ہوگئی۔

روح چوں رفت از صلوٰت و از صیام
فرد ناہموار و ملت بے نظام

(جاویدنامہ)

''جب نماز اور روزے سے روح جاتی رہی تو فرد بے لگام ہوگیا اور ملت میں کوئی تنظیم نہ رہی (منتشر ہوگئی)''۔

جس طرح بہائی شریعت میں حج کو منسوخ کیا گیا، اُسی طرح قادیانی شریعت میں رد جہاد پہ زور دیا گیا۔ جس پر اقبال یوں تجزیہ پیش کرتے ہیں کہ جہاد نہ صرف شان وشوکت کے مظاہر کا ثبوت ہے بلکہ ایک اس کے مقصود میں تحرک کا عمل بھی شروع ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اس عمل کے منسوخ کرنے والی نبوت مرد مسلمان سے قوت عمل چھین لینے والے کسی نشے سے کم نہیں۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

(ضرب کلیم)

1935ء میں اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں اپنی نظم ''جہاد'' میں قادیانیوں پر تنقید کی۔

فتویٰ ہے شیخ کا، یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

(ایضاً)

یہی وہ نظم ہے جس میں اقبال نے کھل کر یہ اعلان کیا کہ نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا اصل مقصود برطانوی سامراج کی کاسہ لیسی کرنا ہے اور ان کے مفادات کا تحفظ کرنا ہے۔ اس

لیے اقبال بانی تحریکِ قادیانیت کو ''شیخ کلیسا نواز'' کہ کر پکارتے ہیں:

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

(ایضاً)

ایک اور وہ چیز جس بنیاد پہ علامہ اقبال قادیانی تحریک سے شدید تحفظات رکھتے تھے، وہ اُن کی طرف سے غیر قادیانی تمام مسلمانوں کو کافر سمجھنا تھا اور رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ اقدس کے متعلق گستاخانہ رویہ و گستاخانہ الفاظ کا استعمال تھا۔ اقبال نے ان دونوں وجوہات کی بنا پر اس تحریک کے غیر اسلامی ہونے پہ استدلال کیا۔

ضرب کلیم کی نظم ''ہندی مسلمان'' میں بانی تحریک قادیانیت کو نشانہ تنقید بناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومن پارینہ ہے کافر

(ضربِ کلیم)

گستاخیٔ رسول ﷺ کے حوالہ سے قادیانی تحریک پہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس سے پہلے میرے ذہن کے کسی گوشہ میں ان کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا تو اب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات اسلام اور کفر کا فیصلہ کرتی ہے کہ جہاں اسلام ہو، وہاں رسالت مآب ﷺ کی ذات ستودہ صفات کے متعلق ایسا گمان پیدا ہی نہیں ہوسکتا:

Personally, I became suspicious of the movement when the claim of a new Prophethood, superior even to the Prophethood of the Founder of Islam, was definitely put forward, and the Muslim world' was declared Kafir. Later my suspicious developed into a positive revolt when I heard with my own ears an adherent of the movement mentioning the Holy Prophet of Islam in a most disparaging language. Not by their roots but by their fruits will you know them.

(Speeches, Writings and Statements, P#206)

''ذاتی طور پر میرے لیے تحریک اس وقت مشتبہ ہوگئی جب قطعی طور سے ایک نئی

رسالت کا دعویٰ کیا گیا جو بانی اسلام کی رسالت سے بھی اعلیٰ وارفع تھی اور باقی عالم اسلام کو کافر قرار دے دیا گیا۔ بعد ازاں جب میں نے اپنے کانوں سے تحریک کے ایک رکن کو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں گستاخانہ زبان استعمال کرتے سنا تو میرے شبہات بغاوت میں تبدیل ہوگئے۔ آپ انہیں ان کی جڑوں کے حوالے سے نہیں جانیں گے بلکہ انہیں ان کے ثمرات کے حوالے سے پہچانیں گے“۔

فکرِ عمیق کے بعد اقبالؒ نے ایک حتمی موقف اختیار کیا۔ قادیانیت و مرزائیت کے سیاق و سباق نے مختلف قباحتوں کو جنم دیا۔ اس بارے میں اقبال کا موقف قطعی الفاظ میں واضح ہوتا ہے کہ:

”وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا، لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں“۔

(اقبال کے فہم اسلام پر اعتراضات: ایک مطالعہ، ص 319)

سٹیٹس مین، کلکتہ میں 14 مئی 1935ء کو حکیم الامت نے کہا کہ مسلمانوں کی وحدت صرف دینی تصور پر استوار ہے جو مذہب بھی ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتا یا اسلام میں کسی ایسے عقیدہ کو واضح کرتا ہے جس کی اساس ایک نئی نبوت پر مبنی ہو اور اس نئی نبوت کی بنیاد پر وہ دیگر تمام مسلمانوں کی تکفیر کرے اور اپنے نام نہاد الہامی فرقے کے علاوہ تمام مسلمانوں کو کافر جانے، وہ نہ صرف اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ ہے بلکہ وہ غیر اسلامی ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ عقیدہ ختم نبوت ہی مسلم معاشرے کو اتحاد کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

"Any religious society, historically arising from the bosom of Islam, which claims a new prophethood for its basis, and declares all Muslims who do not recognize the truth of its alleged revelations as Kafirs, must, therefore, be regarded by every Muslim as a serious danger to the solidarity of Islam. This must necessarily be so, since the integrity of Muslim society is secured by the ideas of the Finality of Prophethood alone." (ایضاً)

”کوئی مذہبی معاشرہ جو تاریخی اعتبار سے اسلام کے بطن سے جنم لیتا ہے، جو اپنی بنا کے طور پر ایک نئی رسالت پیغمبری کا مدعی ہے اور ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتا ہے جو اس کی مبینہ وحیوں کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اسے اسلام کی یکجہتی کے لیے سنگین خطرہ تصور کرنا چاہیے۔ یہ لازماً اس لیے ہونا چاہیے چونکہ مسلم معاشرے کی سالمیت (اتحاد اسلامیہ) کا سارا تصور ختم رسالت کے نظریے سے اخذ کیا گیا ہے“۔

اس اقتباس کے آخری الفاظ سے بہت واضح ہے کہ ایسی فکر دین حق اسلام کے لیے، اس کی وحدت اور سالمیت کے لیے شدید ترین خطرہ ہے۔ اقبال تنبیہ فرماتے ہیں کہ مسلمان اس فتنے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

یہ تمام باتیں ذہن میں رکھ کر اقبال نے اپنی قوم کو ایک ”پالیسی ڈائریکشن“ دی اور اُس وقت کے انڈیا کے حکمرانوں کو تجویز دی کہ اگر وہ ہندوستان میں ایک مستقل فساد کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اُس کا حل یہ ہے کہ قادیانی تحریک کو اصلاً غیر اسلامی و غیر مسلم قرار دیا جائے۔ اقبال کے الفاظ ملاحظہ کریں:

The best course for the rulers of India is, in my opinion, to declare the Qadianis a separate community. This will be perfectly consistent with the policy of the Qadianis themselves and the Indian Muslim will tolerate them just as he tolerates the other religions".

(Speeches, Writings and Statements, P#203)

میری رائے میں ہند کے حکمرانوں کے لیے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی کمیونٹی قرار دے دیں۔ یہ قادیانیوں کی اپنی حکمت عملی سے بھی مطابقت رکھے گا اور ہندی مسلمان انہیں ایسے ہی گوارا کرلے گا جیسے وہ دیگر مذاہب کو برداشت کرتا ہے“۔

یعنی جس طرح مسلمانانِ ہند دیگر مذاہب (مثلاً: بدھ مت، ہندومت، سکھ دھرم، عیسائیت، پارسی و دیگر) کے لوگوں کے ساتھ پرامن انداز میں رہ رہے ہیں، وہ قادیانیوں کو بھی غیر مسلم کمیونٹی سمجھتے ہوئے پرامن رہ لیں گے۔ لیکن اگر اسے ایک اسلامی فرقہ سمجھنے پہ اصرار کیا گیا تو یہ اسلام اور مسلمانوں سے شدید ترین ظلم تو ہوگا ہی، ساتھ ہی ساتھ ایک مستقل اور خون آشام جھگڑے کا شاخسانہ بنا رہے گا۔ اس لیے آج ہم جب پلٹ کر پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو

آئین پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیتے دیکھتے ہیں تو یہ فی الاصل حضرت علامہ اقبالؒ ہی کی تحریک و تجویز اور پالیسی ڈائریکشن کا تسلسل نظر آتا ہے۔

اختتام سے قبل حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے ایمان افروز اشعار ملاحظہ ہوں:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ﷺ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

''خدا نے ہم پر شریعت ختم کر دی ہے جیسے ہمارے رسول ﷺ پر رسالت ختم کر دی ہے۔ محفل ایام (دنیا) کی رونق ہمارے وجہ سے ہے، حضور پاک ﷺ آخری رسول ہیں اور ہم آخری امت''۔

"لا نبی بعدی" ز احسان خداست
پردۂ ناموس دین مصطفٰے ﷺ است
قوم را سرمایہ قوت ازو
حفظِ سر وحدت ملت ازو

(رموز بیخودی)

''حضور ﷺ کے بعد کسی اور نبی کا نہ آنا اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ اس سے ناموس دین مصطفٰے ﷺ کا تحفظ ہے۔ یہی چیز ملت کے لیے سرمایۂ قوت اور وحدتِ ملت کے بھید کی حفاظت کرنے والی ہے''۔

محمد متین خالد

اقبالؒ کا تصورِ ختم نبوت

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کسی قسم کا کوئی تشریعی، غیر تشریعی، ظلی، بروزی یا نیا نبی نہیں آئے گا۔ آپ ﷺ کے بعد جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے، وہ مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ قرآن مجید کی ایک سو سے زائد آیات مبارکہ اور حضور نبی کریم ﷺ کی تقریباً دو سو دس احادیث مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور خاتم النبیین ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اس بات پر ایمان ''عقیدۂ ختمِ نبوت'' کہلاتا ہے۔

ختم نبوت اسلام کا متفقہ، اساسی اور اہم ترین بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو پوری امت مسلمہ کے اتحاد، یکجہتی، وحدت، استحکام اور سالمیت کا آئینہ دار ہے۔ دین اسلام کی پوری عمارت اس عقیدہ پر کھڑی ہے۔ یہ ایک ایسا حساس عقیدہ ہے کہ اگر اس میں شکوک وشبہات کا ذرا سی بھی رخنہ پیدا ہو جائے تو ایک مسلمان نہ صرف اپنی متاعِ ایمان کھو بیٹھتا ہے بلکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی امت سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔

پوری امت مسلمہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ سب سے اوّل نبی حضرت آدم علیہ السلام اور سب سے آخری حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ:

- **"دعویٰ النبوة بعد نبیّنا صلی اللّٰه علیه وسلم کفر بالاجماع."**

''یعنی ہمارے نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ باجماع امت کفر ہے۔''

(شرح فقہ اکبر صفحہ 202 از ملا علی قاریؒ)

حضور نبی کریم ﷺ پر ہر قسم کی نبوتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور آپ ﷺ خاتم الانبیا بمعنی آخر الانبیا ہیں۔ آپ ﷺ کو تمام انبیا سابقین علیہم السلام کے بعد آخری نبی ماننا ضروریات دین

اور عقائد اسلام میں سے ہے۔ آپ ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا کفر وضلالت ہے اور جو شخص آپ ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے، وہ مردود باجماع امت محمدیہ از روئے دلائل قطعیہ، دائرہ اسلام سے خارج اور دائمی جہنمی ہے۔

قرآن مجید ایک سراپا اعجاز کتاب ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ علم و حکمت کا خزینہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر دور کے ہر خطہ کے ہر انسان کی مکمل راہنمائی کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ دشمنانِ اسلام کی طرف سے اسلام کی بیخ و بنیاد کو ہلا دینے والے خطرناک طوفانوں میں بھی اس کے عظمت و وقار میں رتی بھر فرق نہ آیا، نہ قیامت تک آئے گا (ان شاء اللہ) کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہوا ہے۔ جس طرح قرآن مجید ہر مسئلہ میں انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے، اسی طرح وہ عقیدۂ ختم نبوت کو بھی بڑے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ قرآن مجید کی ایک سو سے زائد آیاتِ مبارکہ ختم نبوت کے ہر پہلو کو کھول کھول کر بیان کرتی ہیں اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر رہی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ قیامت تک اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں۔ صفحات کی قلت کی وجہ سے صرف چند اہم آیات مبارکہ اور ان کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ اس کی تشریح کے لیے قارئین کرام تفاسیر سے رجوع فرمائیں۔

(1) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا. (احزاب: 40)

ترجمہ: ''نہیں ہیں محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن آپ ﷺ اللہ کے رسول اور تمام انبیا کے ختم کرنے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

عرب کی ایک قدیم رسم یہ بھی تھی کہ وہ اپنے متبنّیٰ یعنی لے پالک بیٹے کو حقیقی اور نسبی بیٹا سمجھتے۔ یہ لے پالک بیٹا وراثت میں بھی برابر کا شریک ہوتا۔ مزید برآں جس طرح ایک حقیقی بیٹا مر جاتا اور اس کی بیوی باپ کے لیے حرام ہوتی، اسی طرح لے پالک بیٹا جب مر جاتا یا وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو وہ عورت لے پالک بیٹے کے باپ کے لیے حرام ہوتی۔ حضرت زید بن حارثہؓ، نبی کریم ﷺ کے لے پالک بیٹے تھے۔ تمام لوگ انھیں ''زید بن محمد'' کہہ کر پکارتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اس قبیح رسم کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت محمد ﷺ تمھارے مردوں

میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ آپ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔یعنی دنیا میں انبیا کے آنے کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے اور حضور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(2) اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا. (المائدہ:3)

ترجمہ: ''آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمھارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا ہے تمھارے لیے اسلام کو بطور دین۔''

یہ آیت حضور نبی رحمت ﷺ کے آخری حج میں عرفہ کے دن جمعہ کے روز نازل ہوئی۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ آخری آیت تھی جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی۔اس آیت کریمہ کی بہت بڑی فضیلت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک یہودی نے حضرت عمر فاروقؓ سے کہا تھا کہ اگر یہ آیت ہم پر اترتی تو ہم اس دن عید مناتے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ دین اسلام مکمل ہو چکا ہے۔اب قیامت تک اس میں ترمیم و اضافہ کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ اب یہ امت قیامت تک نہ کسی اور دین کی محتاج ہے، نہ کسی نبی کی، اور نہ کسی کتاب کی۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوا کہ دین اسلام قیامت تک رہنے والا ہے۔ یہ کبھی ختم نہ ہوگا (ان شاء اللہ)۔بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت آیات احکام میں سے آخری آیت ہے اور آئندہ کے لیے وحی و نبوت کے بند ہونے کی خبر دے رہی ہے۔

(3) وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ط (آل عمران:81)

ترجمہ: ''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیا سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمھیں اس کی جو دُوں میں تم کو کتاب اور حکمت سے۔ پھر تشریف لائے تمھارے پاس وہ رسول (یعنی محمد ﷺ) جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمھارے پاس ہیں تو تم ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی۔''

خلاصۂ تفسیر آیت کا یہ ہے کہ ازل میں جس وقت حق تعالیٰ نے تمام مخلوق کی ارواح پیدا فرما کر ان سے اپنے رب ہونے کا عہد و اقرار لیا، تمام انبیا علیہم السلام سے اس عہد عام کے علاوہ ایک عہد خاص بھی لیا گیا، جو ایک جملہ شرطیہ کی صورت میں تھا کہ اگر آپ میں سے کسی کی حیات

میں محمد ﷺ مبعوث ہو کر تشریف لے آئیں تو آپ ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔

اور اس جگہ ہمارا مطمحِ نظر ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ الخ کے الفاظ ہیں جن میں نبی کریم ﷺ کے تمام انبیا کے بعد تشریف لانے کو لفظ ثُمَّ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے جو لغتِ عرب میں تراخی یعنی مہلت کے لیے آتا ہے، جب کہا جاتا ہے جَاءَ نِیْ الْقَوْمُ ثُمَّ عُمَرُ تو لغت عرب میں اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ پہلے تمام قوم آ گئی اور پھر کچھ مہلت کے بعد سب سے آخر میں عمر آیا۔

اس لیے اَلنَّبِیّٖنَ کے بعد ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ کے یہ معنی ہوں گے کہ تمام انبیا علیہم السلام کے آنے کے بعد سب سے آخر میں حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائیں گے اور جبکہ اخذ میثاق میں سے کوئی نبی و رسول مستثنیٰ نہیں تو آپ ﷺ کا تمام انبیا علیہم السلام سے آخری نبی ہونا متعین ہو گیا، اور یہ واضح ہو گیا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی کسی قسم کا نبی پیدا نہ ہو گا، تشریعی و غیر تشریعی یا ظلی و بروزی کی خودساختہ قسموں میں سے کوئی بھی اب باقی نہیں ہے۔

(4) قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا. (اعراف:158)

ترجمہ: ”(اے محمد ﷺ) آپ فرمائیے۔ اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی رحمت ﷺ پوری دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رسول بن کر تشریف لائے خواہ وہ آپ کے زمانہ میں موجود ہوں یا آپ ﷺ کے بعد قیامت تک پیدا ہوں۔ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے: ”میں ان لوگوں کے لیے بھی رسول ہوں جن کو اپنی زندگی میں پاؤں اور ان کے لیے بھی جو میرے بعد پیدا ہوں گے۔ لہٰذا یہ آیت بھی حضور سرور کائنات ﷺ کے آخری نبی ہونے کی بین دلیل ہے۔

(5) وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ. (انبیاء:107)

ترجمہ: ”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔“

اس آیت سے واضح ہوا کہ حضور نبی رحمت ﷺ تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ صرف اس دنیا کے لیے نہیں بلکہ آپ کا وجود ہر عالم کے لیے سراپا رحمت ہے۔ پس آپ ﷺ پر ایمان لانا دنیوی و اخروی نجات کے لیے کافی ہے۔

(6) یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا o وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ

وَسِرَاجًا مُّنِيْرًاo (احزاب:46,45)

ترجمہ: ''اے نبی (مکرم) ہم نے بھیجا ہے آپ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے اور آفتاب روشن کردینے والا۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو ''سراجاً منیراً'' کے دلنواز لقب سے نوازا ہے۔ یعنی جس طرح دنیاوی سورج بذات خود روشنیوں کا منتہا اور دوسرے سیاروں کو خود روشنی بخشتا ہے۔ یعنی سب ستارے اپنی روشنی میں سورج کے محتاج ہیں، اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ صرف نبی ہی نہیں بلکہ ''نبی الانبیاء'' ہیں۔ سب انبیا آپ ﷺ ہی کے فیض سے نبی ہوئے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ آفتابِ نبوت ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت کی روشنی قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ وصف صرف اور صرف حضور نبی کریم ﷺ ہی کو حاصل ہے۔ اس لیے آپ ﷺ آخری نبی ہیں۔

قرآن مجید کی طرح احادیث مبارکہ میں بھی عقیدہ ختم نبوت نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ تقریباً دوسودس احادیث مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اب قیامت تک کسی بھی مسئلہ میں جس شخص نے بھی ہدایت وراہنمائی حاصل کرنا ہے، اسے حضور نبی کریم علیہ التحیہ والثناء کی غلامی اختیار کرنا ہوگی۔ ذیل میں عقیدہ ختم نبوت کے موضوع پر چند اہم احادیث مبارکہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

(1) ''حضرت ابو ہریرہؓ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال مجھ سے پہلے انبیا کے ساتھ ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اس کو بہت عمدہ اور آراستہ و پیراستہ بنایا، مگر اس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ تعمیر سے چھوڑ دی، پس لوگ اس کے دیکھنے کو جوق در جوق آتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی (تاکہ مکان کی تعمیر مکمل ہوجاتی) چنانچہ میں نے اس جگہ کو پُر کیا اور مجھ سے ہی قصرِ نبوت مکمل ہوا، اور میں ہی خاتم النبیین ہوں، (یا) مجھ پر تمام رسل ختم کردیے گئے۔'' (بخاری و مسلم شریف)

(2) ''حضرت جبیر بن مطعمؓ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور ماحی ہوں یعنی میرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، اور میں

حاشر ہوں، یعنی میرے بعد ہی قیامت آ جائے گی اور حشر برپا ہوگا (اور کوئی نبی میرے اور قیامت کے درمیان نہ آئے گا) اور میں عاقب ہوں اور عاقب اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے بعد اور کوئی نبی نہ ہو۔" (بخاری و مسلم شریف)

(3) "حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قریب ہے کہ میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔" (مسلم شریف)

(4) "حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیا پر چھ باتوں میں فضیلت دی گئی ہے۔ اوّل یہ کہ مجھے جوامع الکلم دیے گئے اور دوسرے یہ کہ رُعب سے میری مدد کی گئی (یعنی مخالفین پر میرا رُعب پڑ کر ان کو مغلوب کر دیتا ہے) تیسرے میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا (بخلاف انبیا سابقین کے کہ مالِ غنیمت ان کے لیے حلال نہ تھا، بلکہ آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی تھی جو تمام مالِ غنیمت کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی تھی، اور یہی جہاد کی مقبولیت کی علامت سمجھی جاتی تھی) اور چوتھے میرے لیے تمام زمین نماز پڑھنے کی جگہ بنا دی گئی (بخلاف امِم سابقہ کے کہ ان کی نماز صرف مسجدوں ہی میں ہوسکتی تھی) اور زمین کی مٹی میرے لیے پاک کرنے والی بنا دی گئی (یعنی بوقت ضرورت تیمّم جائز کیا گیا جو کہ پہلی امتوں کے لیے جائز نہ تھا) پانچویں میں تمام مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں (بخلاف انبیا سابقین کے کہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف کسی خاص اقلیم میں ایک محدود زمانہ تک کے لیے مبعوث ہوتے تھے) چھٹے یہ کہ مجھ پر انبیا ختم کر دیے گئے۔" (مسلم شریف)

(5) حضرت امی عائشہؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"میں خاتم الانبیا ہوں اور میری مسجد، مساجدِ انبیا کی خاتم اور آخر ہے۔" (کنز العمال)

(6) حضرت انس بن مالکؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"رسالت اور نبوت منقطع ہوچکی، پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ نبی۔"

(ترمذی شریف)

(7) حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطابؓ ہوتے۔(ترمذی شریف)

حضور خاتم النبیین ﷺ کے دور مبارک میں اسود عنسی نامی ایک بد بخت نے دعویٰ نبوت کیا تو آپ ﷺ کے حکم اور خواہش پر آپ ﷺ کے ایک صحابی حضرت فیروز دیلمیؓ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اسے جہنم واصل کیا۔ اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں مسیلمہ کذاب نامی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ بہت سارے لوگ اس کے پیروکار بن گئے۔ آقائے نامدار ﷺ کے وصال مبارک کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد کے لیے جید صحابہ کرامؓ پر مشتمل ایک لشکر بھیجا۔ یہ تحفظ ختم نبوت اور اس کے منکرین کے غیر مسلم ہونے پر صحابہ کرامؓ و تابعین کا پہلا اجماع تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''**لن تجتمع امتی علی الضلالۃ**'' میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہیں ہوسکتی۔ مسیلمہ کذاب اور اس کی جماعت کے خلاف وہی معاملہ کیا گیا جو کفار کے ساتھ کیا جاتا ہے حالانکہ مسیلمہ کذاب (قادیانیوں کی طرح) نماز، روزہ پر ایمان رکھتا تھا۔ وہ آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اپنی نبوت کا بھی مدعی تھا۔ یہاں تک کہ اس کی اذان میں برابر ''**اشھدان محمد رسول اللّٰہ**'' پکارا جاتا تھا اور وہ خود بھی اس کی تصدیق کرتا تھا۔ اس کے باوجود صحابہ کرامؓ نے بغیر مطالبہ معجزات متفقہ طور پر مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد کا اعلان کیا کیونکہ اس نے حضور خاتم النبیین ﷺ کے بعد نبوت کا اعلان کیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے لیے قطعی طور پر ناقابل برداشت تھا۔ صحابہ کرامؓ میں سے کسی ایک نے بھی مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد پر انکار نہ کیا اور نہ کسی نے یہ کہا کہ یہ لوگ اہل قبلہ ہیں، نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، حج اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، ان کو کیسے غیر مسلم سمجھ لیا (جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں قادیانیوں کو سمجھا جاتا ہے) بلکہ صحابہ کرامؓ نے بہ اجماع مسیلمہ کذاب اور اس کے پیروکاروں کو دعویٰ نبوت کی وجہ سے غیر مسلم سمجھا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دس ہزار صحابہ کرامؓ پر مشتمل ایک عظیم الشان لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں مسیلمہ کذاب اور اس کے پیروکاروں کے خلاف جہاد کے لیے یمامہ روانہ فرمایا۔ اس لشکر میں بعض بدری صحابہ کرامؓ بھی شریک ہوئے حالانکہ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے مگر تحفظِ ختم نبوت کی خاطر وہ اس عظیم جہاد میں شریک ہوئے۔ مسیلمہ کذاب کے خلاف

اس جہاد میں تقریباً بارہ سو صحابہ کرام شہید ہوئے جن میں تقریباً 8 سو کے قریب حفاظِ قرآن تھے۔ مسیلمہ کذاب کا لشکر چالیس ہزار مسلح جوانوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے 28 ہزار کے قریب ہلاک ہوئے۔ مسیلمہ کذاب کو حضرت وحشیؓ نے اپنے نیزے سے واصل جہنم کیا۔ مسیلمہ کی فوج کے باقی لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی کتنی بڑی جماعت جھوٹے مدعی نبوت سے مقابلہ کے لیے میدان میں آئی۔ صحابہ کرامؓ نے نہ وقت کی نزاکت کا خیال کیا، نہ مسلمانوں کی بے سروسامانی کا، اور نہ اس جماعت کے نماز، روزہ، حج، تلاوت یا دیگر احکام اسلامی کے ادا کرنے کا۔ انھوں نے محض اس بات پر جہاد کیا کہ حضور خاتم النبیین ﷺ کے بعد نبوت کا ہر مدعی کذاب، مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے اور اس کی سرکوبی ہر مسلمان کا اولین فریضہ ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد کسی بھی شخص کا دعویٰ نبوت خواہ کسی بھی تاویل سے ہو، اس کی کتنی ہی بڑی جماعت کیوں نہ ہو، وہ ظاہری شکل وصورت سے کتنے ہی اسلامی کیوں نہ ہوں، خواہ وہ زبان سے کلمہ پڑھتے ہوں، تمام اسلامی شعائر کی پابندی کرتے ہوں، وہ سب لوگ باتفاقِ قرآن وسنت واجماع صحابہ کرامؓ، دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

حضرت ملا علی قاریؒ کہتے ہیں:

- ''اور ہمارے نبی ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ بالا جماع کفر ہے۔''

(شرح فقہ اکبر صفحہ 202 از ملا علی قاریؒ)

سراج الامت حضرت امام اعظم نعمان بن ثابت ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور ایک شخص (الہلویؒ) نے کہا کہ میں جا کر اس سے کوئی نشانی اور معجزہ طلب کرتا ہوں تا کہ اس کا صدق وکذب عیاں ہو۔ اس پر حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا:

- **مَنْ طَلَبَ مِنْهُ عَلَامَةً فَقَدْ كَفَرَ لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ.**

ترجمہ: ''جو شخص اس سے علامت طلب کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان ہے کہ میرے بعد کسی کو نبوت نہیں مل سکتی۔''

(مناقب صدر الائمہ المکیؒ جلد اول صفحہ 161 طبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن)

الغرض ختم نبوت کا مسئلہ اس طرح واضح اور بے غبار ہے کہ اس میں کسی قدر تامل کرنا

بھی خالص کفر ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی موجودگی میں کسی نبی کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ یہ رشد وہدایت کے دوسر چشمے ہیں جو قیامت تک عالم اسلام کو سیراب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی مدعی نبوت کا آنا گمراہی ہے۔ عقیدۂ ختمِ نبوت ضروریاتِ دین میں داخل ہے۔ اس کا انکار یقیناً کفروارتداد ہے جس سے کوئی تاویل نہیں بچاسکتی۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ رہا ہے اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اس کے دعوے کو مانے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحب عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النبیین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سیاق وسباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی ﷺ نے خود فرمادی ہے، جس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے، اور جسے صحابہ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مدعی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان تسلیم کیا جاسکتا ہے، جنھوں نے باب نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے، بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب، حریم نبوت میں داخل بھی ہو گئے ہیں اور یہ لوگ ان کی نبوت پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں قابل غور ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے، جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر وایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجہ اولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف

اس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے اس کا کھلا کھلا اعلان کراتا اور حضور ﷺ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے، جب تک اپنی اُمت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاؑ آئیں گے اور تمھیں ان کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضور ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا، جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسول، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری امت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اب اگر بفرضِ محال نبوت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف و خطر اس کا انکار کر دیں گے۔ خطرہ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پرس ہی کا تو ہو سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسر عدالت لا کر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔ لیکن اگر نبوت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدعی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کون سا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیش ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے، کیا ایک عقل مند آدمی اس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے؟

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے، جو ہر اُس شخص میں پیدا ہو جایا کرے، جس نے عبادت اور عمل صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے، جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیا

پر انبیا نہیں بھیجے جاتے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آئی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں، جن میں انبیاؑ مبعوث ہوئے ہیں:

اوّل: یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم: یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہوگئی ہو، اور اس کے نقش قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم: یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعہ مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیاؑ کی ضرورت ہو۔

چہارم: یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی حضور نبی کریم ﷺ کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔ قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضور ﷺ کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپ ﷺ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاؑ آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپ ﷺ لائے تھے، اس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے دی، اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپ ﷺ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہوگئی۔

پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضور ﷺ کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا تکمیل دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضور ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہوگئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کون سی ہے، جس کے لیے آپ ﷺ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے، اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنت محمدیہ ﷺ کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیاؑ کی۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا، فوراً اس میں کفر وایمان کا سوال اُٹھ کھڑا ہوگا۔ جو اس کو مانیں گے، وہ ایک امت قرار پائیں گے اور جو اس کو نہ مانیں گے، وہ لامحالہ دوسری امت ہوں گے۔ ان دونوں امتوں کا اختلاف محض فروعی اختلاف نہ ہوگا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہوگا، جو انھیں اس وقت تک جمع نہ ہونے دے گا جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہوگا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔

ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختم نبوت اُمت مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے، جس کی بدولت ہی اُس اُمت کا ایک دائمی اور عالمگیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے، جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہو سکتا ہو، اب جو شخص بھی حضرت محمد ﷺ کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذ ہدایت کی طرف رجوع کرنے کا قائل

نہ ہو، وہ اس برادری کا فرد ہے اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہ وحدت اس امت کو کبھی نصیب نہ ہو سکتی تھی، اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے اور جب اس نبی کے ذریعہ سے دین کی تکمیل بھی کردی جائے، تو نبوت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے تاکہ اس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دنیا میں ہمیشہ کے لیے اہل ایمان کی ایک ہی امت بن سکے اور بلا ضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس امت میں بار بار تفرقہ نہ برپا ہوتا رہے۔ نبی خواہ "ظلی" ہو یا "بروزی" امتی ہو یا صاحب شریعت یا صاحب کتاب، بہرحال جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوگا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک امت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اس حالت میں تو ناگزیر ہے، جب کہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو۔ مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انھیں کبھی ایک امت نہ بننے دے، لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنت اور اجماع سے ثابت ہے، عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔"

(تفہیم القرآن جلد چہارم از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

قادیانی کہتے ہیں کہ نبوت بھی ایک نعمت ہے، امتِ محمدیہ اس سے کیوں محروم ہوگئی ہے؟

قادیانیوں کے اس بھونڈے سوال کا یہ جواب دینا چاہیے کہ کیا قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں۔ جب اس میں اضافہ و ترمیم نہیں ہو سکتا تو آپ کو نبوت کے بند ہونے پر کیوں اعتراض ہے۔ جس طرح سورج کے نکلنے سے کسی چراغ کی ضرورت نہیں، اسی طرح آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ اگر نبوت نعمت ہے اور یہ جاری رہنی چاہیے تو قادیانیوں سے پوچھنا چاہیے کہ مرزا قادیانی کے بعد کون نبی ہے؟ مرزا قادیانی کے بعد یہ نعمت کیوں بند ہوگئی؟ اور نبوت کا دروازہ چودھویں صدی میں صرف مرزا قادیانی پر کھل کر کیوں بند ہو گیا؟ مرزا قادیانی سے پہلے نہ کسی مدعی نبوت کا پتہ چلتا ہے اور نہ اس کے بعد قادیانی جماعت میں کوئی نبی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرزا قادیانی کی پیروی میں مولوی یار محمد قادیانی، احمد نور کابلی قادیانی،

عبدالطیف گناچور قادیانی، الٰہی بخش ملتانی قادیانی، محمد بخش قادیانی، چراغ دین جموی قادیانی، عبداللہ تیماپوری قادیانی، ناصر سلطانی قادیانی اور عبدالغفار جنبہ قادیانی وغیرہ نے نبوت کے دعوے کیے اور کہا کہ ہم بھی نبوت کی کھڑکی سے گزر کر آئے ہیں۔اس سے زیادہ منصب نبوت کی تذلیل اور کیا ہوگی؟ مرزا قادیانی نے اگرچہ چھوٹی بڑی 100 کے قریب کتب چھوڑی ہیں۔اگر وہ اس بات کا قائل نہ ہوتا کہ وہ آخری نبی ہے تو وہ اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دیتا اور اپنی اُمت کو اس کی نشانیاں بتاتا تاکہ وہ اسے پہچان سکے لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ قادیانی گروہ بھی کسی نئے نبی کا منتظر نہیں ہے اور مرزا قادیانی کو ہی آخری نبی سمجھتا ہے۔

قادیانیوں سے ایک سوال ہے کہ بتایا جائے کہ خاتم النبیین کون ہے؟ میرے خیال میں قادیانیوں سے نبوت ختم یا نبوت جاری کی بحث نہیں کرنی چاہیے کیونکہ مسلمان اور قادیانی دونوں ختم نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان حضور نبی کریم ﷺ کو خاتم النبیین مانتے ہیں جبکہ قادیانی مرزا قادیانی کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔مسلمانوں کے نزدیک آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں بن سکتا جبکہ قادیانیوں کے نزدیک آنجہانی مرزا قادیانی کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں۔فرق واضح ہوگیا کہ مسلمان نبی کریم ﷺ پر نبوت کو بند مانتے ہیں جبکہ قادیانی مرزا قادیانی پر۔عجیب بات ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد ساڑھے چودہ سو سال کے عرصہ میں اگر کوئی نبی آیا تو مرزا قادیانی آیا۔اور اس کے بعد اب کوئی نبی نہیں۔ یاد رہے کہ قادیانیوں نے قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ میں ختم نبوت کا انکار ثابت کرنے کے لیے جو تحریفات کی ہیں، ان کا مقصد صرف اور صرف مرزا قادیانی کی نبوت ثابت کرنا ہے۔ورنہ مرزا قادیانی کے بعد وہ بھی نبوت بند تسلیم کرتے ہیں۔

سچے نبیوں کا اقرار ضروری ہے
جھوٹے نبیوں کا انکار ضروری ہے
ختم نبوت کی نگری میں چور گھسے
نگری والے ہوں بیدار ضروری ہے

قادیانی قرآن وسنت کی روشنی میں غیر مسلم ہیں۔چنانچہ اس تناظر میں سابق وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں 7 ستمبر 1974ء کو پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر

قادیانیوں کے دونوں فرقوں (ربوی ولاہوری) کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا اور آئین پاکستان کی شق (2)160 اور (3)260 میں اس کا مستقل اندراج کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود قادیانی مسلسل شعائر اسلامی استعمال کرتے ہیں۔ وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود اپنی عبادت گاہ کو مسجد، مرزا قادیانی کو نبی اور رسول، مرزا قادیانی کی بیوی کو ام المومنین، مرزا قادیانی کے دوستوں کو صحابہ کرام، قادیان کو مکہ مکرمہ، ربوہ کو مدینہ، مرزا قادیانی کی باتوں کو احادیث، مرزا قادیانی پر اترنے والی نام نہاد وحی کو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ سے مراد مرزا قادیانی لیتے ہیں۔ چنانچہ 26 اپریل 1984ء کو حکومت نے امن وامان کی صورتحال کے پیش نظر امتناع قادیانیت آرڈیننس جاری کیا جس میں قادیانیوں کو شعائر اسلامی کے استعمال سے قانوناً روکا گیا۔ اس آرڈیننس کے نتیجہ میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298/B اور 298/C کے تحت کوئی قادیانی خود کو مسلمان نہیں کہلوا سکتا، اپنے مذہب کو اسلام نہیں کہہ سکتا، اپنے مذہب کی تبلیغ وتشہیر اور شعائر اسلامی وغیرہ استعمال نہیں کر سکتا۔ خلاف ورزی کی صورت میں وہ 3 سال قید اور جرمانہ کی سزا کا مستوجب ہوگا۔ قادیانیوں نے لندن میں بیٹھے اپنے خلیفہ کے حکم پر اس آرڈیننس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پورے ملک میں شعائر اسلامی کی توہین کی اور آرڈیننس کے خلاف ایک بھرپور مہم چلائی۔ جس کے نتیجہ میں پاکستان کے اکثر شہروں میں لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال پیدا ہوئی۔ قادیانی قیادت نے اس آرڈیننس کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا۔ عدالت نے اپنے فیصلہ میں قرار دیا کہ قادیانیوں پر پابندی بالکل درست ہے۔ اس کے بعد قادیانیوں نے چاروں صوبوں کی ہائی کورٹس میں چیلنج کیا، یہاں پر بھی عدالتوں نے دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد قرار دیا کہ آرڈیننس بالکل قانون کے مطابق ہے۔ قادیانیوں کو آئین میں دی گئی اپنی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے شعائر اسلامی استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ آخر میں قادیانیوں نے ان تمام فیصلوں کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ ہمیں آئین کے مطابق آزادی کا حق حاصل ہے، لیکن ہمیں شعائر اسلامی استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ لہٰذا عدالت تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298/B اور 298/C کو کالعدم قرار دے۔ سپریم کورٹ کے فل بنچ نے اس کیس کی مفصل سماعت کی۔ دونوں طرف سے دلائل دیے گئے۔ قادیانیوں کی اصل کتابوں سے متنازعہ ترین حوالہ جات پیش کیے گئے۔ اس کے بعد سپریم کورٹ نے اپنے تاریخی فیصلہ (ظہیر الدین بنام سرکار

1993 SCMR 1718) میں قرار دیا کہ کوئی قادیانی خود کو مسلمان نہیں کہلوا سکتا اور نہ ہی اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ خلاف ورزی کی صورت میں وہ سزا اور جرمانے کا مستوجب ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ جج صاحبان کسی دینی مدرسہ یا اسلامی دارالعلوم کے استاد نہیں تھے بلکہ انگریزی قانون پڑھے ہوئے تھے۔ ان کا کام آئین و قانون کے تحت انصاف مہیا کرنا ہوتا ہے۔ فاضل جج صاحبان کا یہ بھی کہنا تھا کہ قادیانی اسلام کے نام پر لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں جبکہ دھوکا دینا کسی کا بنیادی حق نہیں ہے اور نہ اس سے کسی کے حقوق یا آزادی ہی سلب ہوتی ہے۔

قادیانیوں نے امتناع قادیانیت آرڈیننس کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جہاں انکی رٹ درخواست خارج کرتے ہوئے جج صاحبان نے متفقہ طور پر اس آرڈیننس کو درست قرار دیا اور قادیانیوں کے بارے میں دو سو صفحات سے زائد اپنے تاریخی فیصلہ میں لکھا:

❑ ''قادیانی امت مسلمہ کا حصہ نہیں ہیں۔ اس بات کو خود ان کا اپنا طرز عمل خوب واضح کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تمام مسلمان کافر ہیں۔ وہ ایک الگ امت ہیں۔ یہ متناقض ہے کہ انھوں نے امت مسلمہ کی جگہ لے لی ہے اور مسلمانوں کو اس امت سے خارج قرار دیا ہے۔ مسلمان انھیں امت مسلمہ سے خارج قرار دیتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس امت سے خارج سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں ایک ہی امت میں سے نہیں ہو سکتے۔ یہ سوال کہ امت مسلمہ کے افراد کون ہیں؟ برطانوی ہندوستان میں کسی ادارے کے موجود نہ ہونے کی بنا پر حل نہ ہو سکا، لیکن اسلامی ریاست میں اس موضوع کو طے کرنے کے لیے ادارے موجود ہیں اور اس لیے اب کوئی مشکل درپیش نہیں ہے.......... قادیانیوں اور مسلمانوں کے مابین یہ کشمکش اور قطعی علیحدگی خود مرزا قادیانی اور اس کے جانشینوں کی تحریروں کا نتیجہ ہے.......... کلمۃ الفصل میں کہا گیا ہے:

❑ ''ہم تو دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعودؑ نے غیر احمدیوں کے ساتھ صرف وہی سلوک جائز رکھا ہے جو نبی کریمؐ نے عیسائیوں کے ساتھ کیا۔ غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں، ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا، ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا، اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں۔ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک دینی، دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلقات کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لیے حرام قرار دیئے گئے۔''

(کلمۃ الفصل صفحہ 169، 170 از مرزا بشیر احمد ایم اے ابن مرزا قادیانی)

آئینہ صداقت میں مرزا بشیر الدین محمود، مرزا قادیانی کی ایک مزعومہ وحی کا ذکر کرتا ہے کہ ''جو شخص مسیح موعود کے ایک لفظ کو بھی جھوٹا خیال کرے گا، وہ خدا کے دربار میں مردود ٹھہرے گا۔'' پھر وہ قادیانیوں پر زور دیتا ہے کہ ''وہ اپنے امتیازی نشانات کو نہ چھوڑیں کہ وہ ایک سچے نبی (مرزا قادیانی) کو مانتے ہیں اور ان کے مخالف اسے نہیں مانتے۔'' .... برطانوی سامراج اور استعمار کی حکومت سے مرزا صاحب کی محبت اور وفاداری ایک بدیہی امر ہے۔ انہوں نے تقریباً اپنی ہر کتاب میں کئی صفحات انگریز سرکار کی تعریف و توصیف کے لیے مخصوص کیے ہیں ان کے جانشینوں کا طرز عمل بھی یہی رہا ہے۔ ذیل میں ایسی تحریروں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

❑ ''بعض احمق اور نادان سوال کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے، یا نہیں؟ سو یاد رہے کہ یہ سوال ان کا نہایت حماقت کا ہے کیونکہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے، اس سے جہاد کیسا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے۔............ ''سو میرا مذہب جس کو میں باربار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں، دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو، جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں ہمیں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔''

(شہادت القرآن صفحہ 84، 85 مندرجہ روحانی خزائن جلد 6 صفحہ 380، 381 از مرزا قادیانی)

کتاب البریہ کے صفحہ 8 اور 9 روحانی خزائن جلد 13 صفحہ 8، 9 پر ان کتابوں کے نام، تاریخ طباعت اور صفحات کے نمبر درج کیے گئے ہیں، جن میں مرزا صاحب نے برطانوی حکومت کی مدح وستائش کی۔ انہوں نے اپنی 24 کتابوں اور رسالوں کا حوالہ دیا ہے جن میں سرکار برطانیہ کی تعریف و توصیف کے پل باندھے ہیں۔ ان کی وفات سے کم از کم گیارہ سال قبل ایسے صفحات کی تعداد کئی درجنوں تک پہنچتی ہے۔ مرزا قادیانی کا کہنا ہے:

❑ ''اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دِیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دِیں کا امام ہے
دِیں کے لیے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے

دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد''

(تحفہ گولڑویہ ضمیمہ صفحہ 42، مندرجہ روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 77، 78 ازمرزا قادیانی)

❑ ''میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔''

(کتاب البریہ صفحہ 11 مندرجہ روحانی خزائن جلد 13 صفحہ 347 ازمرزا قادیانی)

(PLD 1985 FSC 8)

سپریم کورٹ کے فل بنچ نے قادیانیوں کے خلاف وفاقی شرعی عدالت کے تاریخی فیصلہ پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا:

❑ ''اس ترمیم نے مرزا قادیانی کے پیروکاروں کو جو عموماً احمدیوں کے نام سے معروف ہیں' غیر مسلم قرار دے دیا تھا۔ یہ ترمیم جمہوری' پارلیمانی نیز عدالتی طریقے پر کی گئی تھی اور پورے ہاؤس پر مشتمل خاص کمیٹی کی طویل روئیداد کے دوران احمدیوں کے دونوں گروہوں کے مسلمہ لیڈروں کو بھی اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا پورا موقع فراہم کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کو پیش کی جانے والی قرارداد میں (جس کے محرکین میں دوسروں کے علاوہ وہ واحد رکن بھی شامل تھا' جس نے بعد میں واک آؤٹ کیا تھا) یہ تصریح بھی موجود تھی کہ: ''احمدی اندرونی اور بیرونی سطح پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔'' اور یہ کہ: ''اس وقت مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس نے جس میں دنیا بھر سے 140 وفود نے شرکت کی تھی' بالاتفاق قرار دیا تھا کہ ''قادیانیت اسلام اور عالم اسلام کے خلاف سرگرم عمل ایک تخریبی تحریک ہے جو دھوکے اور مکاری سے ایک اسلامی فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔''

(مباحثہ قومی اسمبلی پارلیمنٹ جلد 4' 1974ء)'' **(PLD 1988 SC 167)**

لاہور ہائی کورٹ کے جناب جسٹس خلیل الرحمٰن خان نے قادیانیوں کے صد سالہ جشن پر پابندی لگاتے ہوئے اپنے ایک مفصل فیصلہ میں لکھا:

❑ ''عام لوگ یعنی امتِ مسلمہ قادیانیوں کی سرگرمیوں اور ان کے مذہب کی تبلیغ کی مزاحمت ومخالفت کرتی ہے تاکہ ان کے مذہب کا اصل دھارا پاک صاف اور غلاظت سے محفوظ

رہے اور امت کی یکجہتی بھی برقرار رہے۔ایسا کرنے سے قادیانیوں کے اپنے مذہب کی پیروی اور اس پر عمل کرنے کے حق پر نہ کوئی زد پڑتی ہے' نہ اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے.................مرزا صاحب نے جس قسم کے مذہب کی تلقین و تبلیغ کی اور قادیانی جس مذہب کے پیروکار اور وفادار ہیں' رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر اب تک تمام ممالک کے مسلمان اسے اسلام کے اساسی نکات کے خلاف گستاخانہ توہین آمیز' اشتعال انگیز' گمراہ کن اور بے ادبی پر مبنی سمجھتے آئے ہیں۔وہ تمام مسلمان جو اسلام اور ختم نبوت کے مابین قائم رشتہ و تعلق میں کسی مداخلت کے روادار نہیں' مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے سخت برگشتہ ہیں اور اسے یکسر مسترد کرتے ہیں۔ قادیانیوں کے نزدیک غیر قادیانی یا غیر احمدی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔اس طرح انہوں نے اپنی علیحدہ امت بنالی ہے جو امت مسلمہ کا حصہ نہیں' یہ چیز خود ان کے طرز عمل اور عقائد سے ثابت ہے' وہ مسلمانوں کو اپنی ملت سے خارج گردانتے ہیں۔قادیانی حضرات حکومت برطانیہ کے زیر سایہ خود کو مسلمان ظاہر کر سکتے تھے، اب ایسا نہیں کر سکتے' کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک مرزا قادیانی امتِ مسلمہ میں انتشار و تفریق پیدا کر کے انگریزوں کے مفادات کے لیے کام کرتا رہا تھا............. یہ بات قابل غور ہے کہ اس قول کے نتائج کہ مرزا صاحب بذات خود محمد اور احمد تھے (یہ دونوں رسول اکرم ﷺ کے نام ہیں) خاصے دُور رس نکلتے ہیں۔مرزا صاحب کے خلفاءِ رسول اکرمؐ کے خلفاء بن گئے۔مسلمان جو کلمہ پڑھتے ہیں اس کے معنے ہیں۔''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور حضرت محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں۔'' مرزا صاحب کو محمد مان لیا جائے تو جب بھی اور جہاں بھی لفظ محمد پڑھا یا ادا کیا جائے گا' اس سے مراد مرزا صاحب ہی ہوں گے.............مرزا صاحب کے مخصوص دعویٰ کے پیش نظر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قادیانی حضرات مرزا صاحب کو حضرت محمد ﷺ کا بدل مانتے ہیں۔اس لیے جھنڈوں پر لکھے ہوئے اور بیجوں پر تحریر شدہ الفاظ ''محمد رسول اللہ'' کا استعمال ہر احمدی کی اپنی ذمہ داری ہے کیونکہ ایسا کرنا رسول اکرم ﷺ کے مقدس نام کی بے حرمتی کرنے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ ایسا فعل دفعہ 295۔سی ت پ کے دائرہ میں آتا ہے۔'' (PLD 1992 Lahore-1)

سپریم کورٹ آف پاکستان کے فل بنچ نے شعائر اسلامی استعمال کرنے پر قادیانیوں

کے خلاف اپنے ایک تاریخ ساز فیصلہ میں لکھا:

❑ ''پس یہ بات واضح ہے کہ دستور نے اسلامی احکام کو' جیسا کہ وہ قرآن وسنت میں ہیں' منضبط حقیقی اور موثر قانون کے طور پر اپنا لیا ہے معاملہ کی اس صورت میں اسلامی احکام ہی' جیسا کہ وہ قرآن وسنت میں درج ہیں' اب حقیقی قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ آرٹیکل 2-اے' نے اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو موثر اور واجب التعمیل بنا دیا ہے۔ اسی آرٹیکل کی بدولت قرارداد مقاصد میں درج قانونی احکام اور قانون کے اصول موثر اور آئین کا مستقل حصہ بن گئے ہیں۔ اس لیے انسان کا بنایا ہوا ہر قانون احکام اسلامی کے مطابق' جیسا کہ وہ قرآن وسنت میں مذکور ہیں' ہونا چاہیے اور آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق بھی اسلامی نظریات وتعلیمات کے منافی نہیں ہونے چاہئیں.................. امر واقعہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے باطنی طور پر اپنے بارے میں حقیقی مسلمان برادری ہونے کا اعلان کر رکھا ہے' انھوں نے خود کو اصل امت مسلمہ سے اس بنا پر الگ کر لیا ہے اور مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں کہ مسلمان' مرزا قادیانی' بانی جماعت احمدیہ' کو پیغمبر اور مسیح موعود کیوں نہیں مانتے' یہ عقیدہ خود مرزا قادیانی کی ہدایات کے تحت اپنایا گیا ہے' جو برملا کہتا تھا:

❑ ''میری ان کتابوں کو ہر مسلمان محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے معارف سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ مجھے قبول کرتا ہے اور میرے دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے مگر رنڈیوں (بدکار عورتوں) کی اولاد (یعنی مسلمان) جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے' وہ مجھے نہیں مانتے۔''

(آئینہ کمالات اسلام ص 547، 548 مندرجہ روحانی خزائن جلد 5، ص 547، 548)

ایک ''نبی'' نے جو زبان استعمال کی ہے اور مخاطبوں پر اس کا جو اثر ہو سکتا ہے' وہ قابل غور ہے۔ ایسی لغو اور بے ہودہ زبان کے استعمال کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں' لیکن ہم صرف ایک اور مثال دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

❑ ''دشمن ہمارے بیابانوں کے خنزیر ہو گئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئی ہیں۔''

(نجم الہدیٰ از مرزا قادیانی، صفحہ 10 مندرجہ روحانی خزائن جلد 14، صفحہ 53)

اسی طرح کی دیگر تحریریں ڈھیروں کی صورت میں موجود ہیں جو نہ صرف مرزا قادیانی کے اپنے قلم سے ہیں بلکہ اس کے نام نہاد خلفاء اور پیروکاروں نے بھی لکھی ہیں جو کسی شک وشبہ کے بغیر ثابت کرتی ہیں کہ وہ مذہبی لحاظ سے اور معاشرتی طور پر مسلمانوں سے ایک الگ اور مختلف

برادری ہیں۔ سر محمد ظفر اللہ خاں قادیانی نے پاکستان کا وزیر خارجہ ہوتے ہوئے بابائے قوم قائداعظم کی نماز جنازہ میں شامل ہونے اور انھیں آخری خراج عقیدت پیش کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اسے غیر مسلم ریاست کا مسلمان وزیر خارجہ یا مسلم ریاست کا غیر مسلم وزیر خارجہ سمجھ لیا جائے۔ (روزنامہ ''زمیندار'' لاہور' مورخہ **8** فروری **1950**ء)

مرزا قادیانی نے اپنے ماننے والوں کو غیر احمدیوں کے ساتھ اپنی بچیوں کے نکاح کرنے اور ان کے ساتھ نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کے بقول مسلمانوں کی بڑی جماعت کو زیادہ سے زیادہ عیسائیوں کی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

کلمہ ایک اقرار نامہ ہے جسے پڑھ کر غیر مسلم اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے' یہ عربی زبان میں ہے اور مسلمانوں کے لیے خاص ہے جو اسے نہ صرف اپنے عقیدہ کے اظہار کے لیے پڑھتے ہیں بلکہ روحانی ترقی کے لیے بھی اکثر اس کا ورد کرتے ہیں۔ کلمہ طیبہ کے معنی ہیں ''خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں'' اس کے برعکس قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ مرزا قادیانی (نعوذ باللہ) حضرت محمد ﷺ کا بروز ہے۔ مرزا قادیانی نے اپنی کتاب ''ایک غلطی کا ازالہ'' میں لکھا ہے:

''سورۂ الفتح کی آیت نمبر **29** کے نزول میں محمدؐ کو اللہ کا رسول کہا گیا ہے...... اللہ نے اس (مرزا قادیانی) کا نام محمد رکھا'' (مندرجہ روحانی خزائن جلد **18** صفحہ **207**)

روزنامہ ''بدر'' (قادیان) کی اشاعت **25** اکتوبر **1906**ء میں قاضی ظہور الدین اکمل قادیانی سابق ایڈیٹر ''**Review of Religions**'' کی ایک نظم شائع ہوئی تھی' جس کے ایک بند کا مفہوم اس طرح ہے ''محمدؐ پہلے سے زیادہ شان کے ساتھ میں دوبارہ آ گئے ہیں' جو کوئی محمدؐ کو ان کی مکمل شان کے ساتھ دیکھنے کا متمنی ہو' اسے چاہیے کہ وہ قادیان جائے۔''

- ''محمدؐ پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے بڑھ کر ہیں اپنی شان میں
محمدؐ دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں''

یہ نظم مرزا قادیانی کو سنائی گئی تو اس نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔

(روزنامہ ''الفضل'' قادیان، **22** اگست **1944**ء)

''اوپر جو کچھ کہا گیا اس کی روشنی میں مسلمانوں میں اس بات پر عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ جب کوئی احمدی کلمہ طیبہ پڑھتا ہے یا اس کا اظہار کرتا ہے تو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی ایسا نبی ہے' جس کی اطاعت واجب ہے اور جو ایسا نہیں کرتا' وہ بے دین ہے' بصورت دیگر وہ خود کو مسلمان کے طور پر پیش کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ یا تو وہ مسلمانوں کی تضحیک کرتے ہیں یا اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی تعلیمات' صورت حال کی راہنمائی کرتی ہیں۔ اس لیے جیسی بھی صورت حال ہو' ارتکاب جرم کو ایک نہ ایک طریقہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔''

مرزا قادیانی نے نہ صرف یہ کہ اپنی تحریروں میں رسول اکرم ﷺ کی عظمت وشان کو گھٹانے کی کوشش کی بلکہ بعض مواقع پر ان کا مذاق بھی اڑایا۔''

- ''پیغمبر اسلام اشاعت دین کو مکمل نہیں کر سکے' میں نے اس کی تکمیل کی۔''

(حاشیہ تحفہ گولڑویہ صفحہ 165 مندرجہ روحانی خزائن جلد 17، صفحہ 263)

ایک اور کتاب میں کہتا ہے:

- ''رسول اکرمؐ بعض نازل شدہ پیغامات کو نہیں سمجھ سکے اور ان سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں۔'' (دیکھیے ازالہ اوہام ص 346 مندرجہ روحانی خزائن جلد 3، صفحہ 472-473)

اس نے مزید دعویٰ کیا:

- ''رسول اکرم ﷺ تین ہزار معجزے رکھتے تھے۔''

(تحفہ گولڑویہ صفحہ 67' مندرجہ روحانی خزائن، جلد 17، صفحہ 153)

- ''جب کہ میرے پاس دس لاکھ نشانیاں ہیں''

(براہین احمدیہ جلد 5' صفحہ 72 روحانی خزائن جلد 21، ص 72)

- ''نشان' معجزہ' کرامت ایک چیز ہے۔''

(براہین احمدیہ جلد 5' صفحہ 63 روحانی خزائن جلد 21، صفحہ 63)

مزید یہ کہ:

- ''رسول اکرمؐ نصاریٰ کا تیار کردہ پنیر کھاتے تھے جس میں وہ سور کی چربی ملاتے تھے۔''

(روزنامہ ''الفضل'' قادیان، 22 فروری 1924ء)

اس طرح اور بہت سی تحریریں موجود ہیں لیکن ہم اس ریکارڈ کو مزید گراں بار نہیں کرنا چاہتے۔

''ہر مسلمان کا بنیادی عقیدہ ہے کہ وہ ہر نبی کو مانتا اور اس کا احترام کرتا ہے۔ اس لیے اگر کسی نبی کی شان کے خلاف کچھ کہا جائے تو اس سے مسلمان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی' جس سے وہ قانون شکنی پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار جذبات پر ہونے والے حملے کی سنگینی پر ہے۔ ہائی کورٹ کے فاضل جج (جسٹس خلیل الرحمٰن خان) نے مرزائیوں کی کتابوں سے بہت سے حوالے نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ مرزا قادیانی نے دوسرے انبیائے کرام خصوصاً حضرت عیسیٰؑ کی بھی بڑی توہین کی اور ان کی شان گھٹائی۔ (حضرت عیسیٰؑ کی جگہ وہ خود لینا چاہتا تھا۔ ہم اس سارے مواد کو نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے' صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ مرزا قادیانی ایک جگہ رقم طراز ہے:

❑ ''کمالات متفرقہ جو تمام دیگر انبیاء میں پائے جاتے تھے۔ وہ سب حضرت رسول کریم ﷺ میں ان سے بڑھ کر موجود تھے اور اب وہ سارے کمالات حضرت رسول کریم ﷺ سے ظلی طور پر ہم کو عطا کیے گئے اور اسی لیے ہمارا نام آدم، ابراہیم، موسیٰ، نوح، داؤد، یوسف، سلیمان، یحییٰ، عیسیٰ وغیرہ ہے۔'' (ملفوظات جلد دوم صفحہ 201 طبع جدید، از مرزا قادیانی)

مرزا قادیانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لکھتا ہے:

❑ ''حضرت مسیح کا خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر ہے۔ تین نانیاں اور دادیاں آپ کی زنا کار اور کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔''

(ضمیمہ انجام آتھم، حاشیہ 7، مندرجہ روحانی خزائن جلد 11، ص 291)

❑ ''اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب قرآن حکیم حضرت عیسیٰ' ان کی والدہ اور خاندان کی بڑائی بیان کرتی ہے۔ دیکھئے سورۂ آل عمران (3) کی آیات 33 تا 45,37 تا 47 سورۂ مریم (19) کی آیت 16 تا 32۔ کیا کوئی مسلمان قرآن کے خلاف کچھ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے اور جو ایسی حماقت کرے' کیا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ ایسی صورت میں مرزا قادیانی اور اس کے پیروکار کیسے مسلمان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا قادیانی پر اسی کی مذکورہ بالا تحریروں کی بنا پر توہین مذہب ایکٹ مجریہ 1679ء کے تحت عیسائیت کی توہین کے جرم میں کسی انگریز عدالت میں ملزم قرار دے کر سزا دی جا سکتی تھی' مگر

ایسا نہیں کیا گیا۔................ یہ بات قابل غور ہے کہ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے قوانین، ایسے الفاظ اور جملوں کے استعمال کا تحفظ کرتے ہیں، جن کا مخصوص مفہوم و معنی ہو اور اگر وہ دوسروں کے لیے استعمال کیے جائیں تو لوگوں کو دھوکا دینے اور گمراہ کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں، ان کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ پاکستان ایسی نظریاتی ریاست میں قادیانی جو کہ غیر مسلم ہیں، اپنے عقیدہ کو اسلام کے طور پر پیش کر کے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بات خوش آئند اور لائق تحسین ہے کہ دنیا کے اس خطے میں عقیدہ آج بھی ہر مسلمان کے لیے سب سے قیمتی متاع ہے، وہ ایسی حکومت کو ہرگز برداشت نہیں کرے گا جو اسے ایسی جعل سازیوں اور دسیسہ کاریوں سے تحفظ فراہم کرنے کو تیار نہ ہو۔ قادیانی اصرار کرتے ہیں کہ انہیں نہ صرف اپنے مذہب کو اسلام کے طور پر پیش کرنے کا لائسنس دیا جائے بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اسلام کی انتہائی محترم و مقدس شخصیات کے ساتھ استعمال ہونے والے القابات اور خطابات وغیرہ کو ان گستاخ غیر مسلموں (مرزا قادیانی اور اس کے خلیفوں) کے ناموں کے ساتھ چسپاں کیا جائے، جو مسلم شخصیات کی جوتی کے برابر بھی نہیں۔ حقیقتاً مسلمان اس اقدام کو اپنی عظیم ہستیوں کی بے حرمتی اور توہین و تنقیص پر محمول کرتے ہیں۔ پس قادیانیوں کی طرف سے ممنوعہ القابات اور شعائر اسلامی کے استعمال پر اصرار اس بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہنے دیتا کہ وہ قصداً ایسا کرنا چاہتے ہیں جو نہ صرف ان مقدس ہستیوں کی بے حرمتی کرنے بلکہ دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف بھی ہے۔ اگر کوئی مذہبی گروہ (قادیانیت) دھوکا دہی اور فریب کاری کو اپنا بنیادی حق سمجھ کر اس پر اصرار کرے اور اس سلسلے میں عدالتوں سے مدد کا طلبگار ہو تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔
اگر قادیانی دوسروں کو دھوکا دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تو وہ اپنے مذہب کے لیے نئے القابات وغیرہ کیوں وضع نہیں کر لیتے؟ کیا انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ دوسرے مذاہب کے شعائر، مخصوص نشانات، علامات اور اعمال پر انحصار کر کے وہ خود اپنے مذہب کی ریاکاری کا پردہ چاک کریں گے۔ اس صورت میں اس کے معانی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کا نیا مذہب، اپنی طاقت، میرٹ اور صلاحیت کے بل پر ترقی نہیں کر سکتا یا فروغ نہیں پا سکتا بلکہ اسے جعل سازی و فریب پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے؟ آخر کار دنیا میں اور بھی بہت سے مذاہب ہیں، انہوں نے مسلمانوں یا دوسروں لوگوں کے القابات وغیرہ پر کبھی غاصبانہ قبضہ نہیں کیا، بلکہ وہ اپنے عقائد کی پیروی اور اس کی تبلیغ بڑے فخر

سے کرتے ہیں۔........... ہر مسلمان کے لیے جس کا ایمان پختہ ہو، لازم ہے کہ رسول اکرمؐ کے ساتھ اپنے بچوں، خاندان، والدین اور دنیا کی ہر محبوب ترین شے سے بڑھ کر پیار کرے۔'' (''صحیح بخاری''، ''کتاب الایمان''، ''باب حب الرسول من الایمان'') کیا ایسی صورت میں کوئی کسی مسلمان کو موردالزام ٹھہرا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا دل آزار مواد جیسا کہ مرزا صاحب نے تخلیق کیا ہے سننے، پڑھنے یا دیکھنے کے بعد اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے؟''ہمیں اس پس منظر میں قادیانیوں کے صد سالہ جشن کی تقریبات کے موقع پر قادیانیوں کے اعلانیہ رویہ کا تصور کرنا چاہیے اور اس ردعمل کے بارے میں سوچنا چاہیے، جس کا اظہار مسلمانوں کی طرف سے ہوسکتا تھا۔ اس لیے اگر کسی قادیانی کو انتظامیہ کی طرف سے یا قانوناً شعائر اسلام کا اعلانیہ اظہار کرنے یا انہیں پڑھنے کی اجازت دے دی جائے تو یہ اقدام اس کی شکل میں ایک اور ''رشدی'' (یعنی رسوائے زمانہ گستاخ رسول ملعون سلمان رشدی جس نے شیطانی آیات نامی کتاب میں حضور ﷺ کی شان میں بے حد توہین کی) تخلیق کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیا اس صورت میں انتظامیہ اس کی جان، مال اور آزادی کے تحفظ کی ضمانت دے سکتی ہے اور اگر دے سکتی ہے تو کس قیمت پر؟ اگر قادیانیوں کو سرعام جلوس نکالنے یا جلسہ کرنے کی اجازت دی جائے تو یہ خانہ جنگی کی اجازت دینے کے برابر ہے۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں، حقیقتاً ماضی میں بارہا ایسا ہو چکا ہے اور بھاری جانی و مالی نقصان کے بعد اس پر قابو پایا گیا۔ ردعمل یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی قادیانی سرعام کسی پلے کارڈ، بیج یا پوسٹر پر کلمہ کی نمائش کرتا ہے یا دیوار یا نمائشی دروازوں یا جھنڈیوں پر لکھتا ہے یا دوسرے شعائر اسلامی کا استعمال کرتا یا انہیں پڑھتا ہے تو یہ اعلانیہ رسول اکرم ﷺ کے نام نامی کی بے حرمتی اور دوسرے انبیائے کرام کے اسمائے گرامی کی توہین کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کا مرتبہ اونچا کرنے کے مترادف ہے جس سے مسلمانوں کا مشتعل ہونا اور طیش میں آنا ایک فطری بات ہے اور یہ چیز نقض امن عامہ کا موجب بن سکتی ہے، جس کے نتیجہ میں قادیانیوں کے جان و مال کا نقصان ہوسکتا ہے

........ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ قادیانیوں کو اپنی شخصیات، مقامات اور معمولات کے لیے نئے خطاب، القاب یا نام وضع کرنے میں کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آخر کار ہندوؤں، عیسائیوں، سکھوں اور دیگر برادریوں نے بھی تو اپنے بزرگوں کے لیے القاب و خطاب بنا رکھے ہیں اور وہ اپنے تہوار امن و امان کا کوئی مسئلہ یا الجھن پیدا کیے بغیر پرُامن طور پر مناتے

ہیں.............بہر حال قادیانیوں پر لازم ہے کہ وہ آئین و قانون کا احترام کریں اور انہیں اسلام سمیت کسی دوسرے مذہب کی مقدس ہستیوں کی بے حرمتی یا توہین نہیں کرنی چاہیے نہ ہی ان کے مخصوص خطابات، القابات و اصطلاحات استعمال کرنے چاہیے۔ نیز مخصوص نام مثلاً مسجد اور مذہبی عمل مثلاً اذان وغیرہ کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے تا کہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اور لوگوں کو عقیدہ کے بارے میں گمراہ نہ کیا جائے یا دھوکا نہ دیا جائے۔''

جناب جسٹس عبدالقدیر چودھری

جناب جسٹس ولی محمد خاں

جناب جسٹس محمد افضل لون

جناب جسٹس سلیم اختر

(ظہیر الدین بنام سرکار 1993 SCMR 1718ء)

قادیانیت کے خلاف اعلیٰ عدالتوں کے تاریخی فیصلوں کے مندرجہ بالا اقتباسات سے ایک بات صاف عیاں ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کے نزدیک قانون امتناع قادیانیت نہ صرف آئین کے مطابق ہے بلکہ یہ ملک میں امن و امان کے تحفظ کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ اعلیٰ عدالتوں کے اتنے سارے فیصلوں کی موجودگی میں کسی ذی شعور کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ حکومت سے اس قانون کے خاتمہ کا مطالبہ کرے۔ ایسا مطالبہ کرنے کا مطلب قادیانیوں کو شعائر اسلامی کی بے حرمتی کی کھلی چھٹی دینا اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنا ہے جو ملک عزیز میں امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

ختم نبوت کا تحفظ بھی ہر مسلمان پر فرض اولین ہے۔ اس کی حفاظت میں کوتاہی بہت بڑا گناہ ہے۔ جس کی پاداش میں روز قیامت ہم سے سوال ہوگا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں جھوٹے مدعیان نبوت اور ان کے پیروکار ہمیشہ تاویلات اور جھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر دین اسلام میں تبدیلی و تحریف کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ منکرینِ ختم نبوت اپنی شپرہ چشمی کو آفتاب، کج فہمی کو دلیل، بکاین کو انگور، زہر کو امرت، ظلمت کو اُجالا اور پیتل کو زرِ خالص تسلیم کروانے پر مُصر رہے مگر امت مسلمہ نے دین اسلام میں ذرا سی بھی تبدیلی، تحریف یا کمی بیشی کو گوارا نہ کیا۔ بلکہ ہر قسم کے مشکل اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دل و جان سے عقیدۂ ختم نبوت کی حفاظت کی اور

منکرین ختم نبوت کے خلاف بھرپور جہاد کیا۔ منکرین ختم نبوت ٹانک وائن کی بدمستی میں ختم نبوت کا چراغ پھونکوں سے بجھانے کی ناپاک سازشیں کرتے رہے مگر نورِ ایمان کے حامل مجاہدینِ ختم نبوت نے جھوٹے مدعیان نبوت اور ان کے پیروکاروں کے خلاف ناقابل فراموش سرفروشی اور جانثاری کے ایسے ایمان پرور مناظر پیش کیے جس سے نہ صرف حق کا سر بلند ہوا بلکہ منکرین ختم نبوت کو ان کے مکروہ عزائم سمیت ملیامیٹ کر دیا۔

موجودہ دور میں منکرینِ ختم نبوت کا گروہ فتنۂ قادیانیت کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔
اس فتنہ کا بانی آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی تھا جس نے انگریزوں کے اشارے پر قادیان (گورداسپور، بھارت) میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ پھر سلطنت برطانیہ کی سرپرستی میں اپنی بھونڈی تاویلات اور تحریفات کے ذریعے امت محمدیہ کے مستحکم قلعہ میں شگاف ڈالنے اور ملت اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کی ناپاک سازشیں کیں۔ مرزا قادیانی اور اس کے پیروکاروں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ نبی کریم ﷺ اور شعائر اسلامی کی توہین بھی شروع کر دی۔ اسلام اور اس کی مقدس شخصیات کے خلاف قادیانیوں کی گستاخیوں اور ہرزہ سرائیوں کو اکٹھا کیا جائے تو کئی دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ قادیانیوں کی طرف سے شان رسالت ﷺ میں کی جانے والی بعض گستاخیاں ایسی ہیں جنھیں پڑھ کر کلیجا منہ کو آتا اور آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔

جھوٹا مدعی نبوت آنجہانی مرزا قادیانی برٹش حکومت کا خود کاشتہ پودا تھا۔ انگریز نے اپنے نظریہ ضرورت کے تحت قادیانی تحریک کو پروان چڑھایا۔ جناب مرتضٰی احمد میکش رقمطراز ہیں:

- ''قادیانیت، برطانیہ کی استعماری سیاست کا ایک خود کاشتہ پودا ہے یعنی ایک ایسی سیاسی تحریک ہے جو انگریزوں کے مقبوضہ ہندوستان میں ایک ایسی مذہبی جماعت پیدا کرنے کے لیے شروع کی گئی جو سرکار برطانیہ کی وفاداری کو اپنا جزو ایمان سمجھے، غیر اسلامی حکومت یا غیر مسلم حکمرانوں کے استیلا کو جائز قرار دے اور ایک ایسے ملک کو شرعی اصطلاح میں دارالحرب سمجھنے سے عقیدہ کا ابطلان کرے جس پر کوئی غیر مسلم قوم اپنی طاقت وقوت کے بل پر قابض ہوگئی ہو۔ انگریز حکمرانوں کی قہاریت اور جباریت کو مسلمان از روئے عقیدہ دینی، اپنے حق میں اللہ کا بھیجا ہوا عذاب سمجھتے تھے اور ان کی رضا کارانہ اطاعت کو گناہ متصور کرتے تھے۔ انگریز حکمران، مسلمانوں کے اس جذبے اور عقیدے سے پوری طرح آگاہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس سرزمین میں ایک ایسا

''پیغمبر'' کھڑا کر دیا جو انگریزوں کو **اولی الامر منکم** کے تحت میں لا کر ان کی اطاعت کو مذہباً فرض قرار دینے لگا اور ان کے پاس ہندوستان کو دارالحرب سمجھنے والے مسلمانوں کی مخبری کرنے لگا۔ جس طرح باغبان اپنے خود کاشتہ پودے کی حفاظت و آبیاری میں بڑے اہتمام سے کام لیتا ہے، اسی طرح سرکار انگریزی نے مرزائیت کو فروغ دینے کے لیے مرزائی جماعت کی پرورش کرنا اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے ضروری سمجھا اور اس فرقہ کے پیروؤں سے مخبری، جاسوسی اور حکومت کے ساتھ جذبہ وفاداری کی نشر واشاعت کا کام لیتی رہی۔'' (پاکستان میں مرزائیت از مرتضٰی خاں میکش)

مرزا قادیانی کا انگریزوں کا ٹاؤٹ ہونا اور جہاد کی مخالفت کرنا ایک نا قابل تردید حقیقت ہے۔ قادیانی مذہب میں انگریزوں کی اطاعت جزو ایمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فتنہ کی پرورش اور حفاظت، انگریز نے خود کی اور انہیں ہر طرح کی مراعات سے نوازا اور انہیں مسلمانوں کے غیظ و غضب سے بچایا۔ آج بھی اس مذہب کے ماننے والوں کی ہمدردیاں یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہیں اور ان کی ہمدردیاں قادیانیوں کے ساتھ ہیں۔ دونوں کا مقصد اسلامی تعلیم اور یک جہتی کو تار تار کرنا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور قادیانیوں کا باہمی گٹھ جوڑ ''**الکفر ملة واحدہ**'' کی بہترین مثال ہے۔

مرزا قادیانی اور اس کے جانشینوں کی مستند تحریروں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہیں امت مسلمہ کے ماضی سے کوئی عقیدت ہے نہ اس کے حال سے کوئی دلچسپی۔ مستقبل کی تو بات ہی نہ کیجیے۔ ہماری اور ان کی امنگوں میں کوئی یکسانیت ہے نہ یکجہتی۔ ملت اسلامیہ کے دشمنوں کو وہ اپنا مربی اور سرپرست سمجھتے رہے۔ جس انگریز نے برصغیر میں اسلامی اقتدار کا چراغ گل کیا، ہماری تہذیبی قدروں کو روندا' لاکھوں بے گناہ مسلمانوں اور علمائے کرام کو قتل کیا' کیا کسی مسلمان کے دل میں ان دشمنان اسلام کے لیے خیر سگالی کے جذبات پائے جا سکتے ہیں؟ لیکن افسوس ہے کہ مرزا قادیانی ان کے تملق' مدح سرائی' دعائیں' خیر سگالی کے جذبات اور ان کے پنجہ استبداد کو مضبوط کرنے کے لیے مسلسل تقریری اور تحریری کاوشیں کرتا رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

- **یایھا الذین امنوا لا تتخذوا الیھود والنصاری اولیاء بعضھم اولیاء بعض ط ومن یتولھم منکم فانه منھم ط ان اللّٰه لا یھدی القوم الظلمین o** (المائدہ:51)

ترجمہ: ’’اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔تم میں سے جو شخص انہیں اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

اس قرآنی تعلیم کے برعکس یہود ونصاریٰ سے دوستی، ان کی پر جوش حمایت اور جہاد کی ممانعت کے سلسلہ میں مرزا قادیانی کی بے شمار تحریروں میں سے صرف چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ وہ اسلام دشمنی میں کس طرح اپنے جذبات اور خدمات کے لیے ان کی ایک نگاہ التفات کے لیے بے تاب تھا۔

؎ حرم والوں سے کیا نسبت بھلا اس قادیانی کو
وہاں قرآن اترا ہے، یہاں انگریز اترے ہیں

❑ ’’سرکار دولتمدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے پکے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں، اس خود کاشتہ پودا کی نسبت نہایت حزم اور احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔ ہمارے خاندان نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنے خون بہانے اور جان دینے سے فرق نہیں کیا اور نہ اب فرق ہے۔ لہٰذا ہمارا حق ہے کہ ہم خدمات گذشتہ کے لحاظ سے سرکار دولتمدار کی پوری عنایات اور خصوصیت توجہ کی درخواست کریں تا ہر ایک شخص بے وجہ ہماری آبرو ریزی کے لیے دلیری نہ کر سکے۔‘‘

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 198 طبع جدید، از مرزا قادیانی)

؎ کھا رہا ہوں غم بے مہری آقائے فرنگ
سترہ سال سے یہ غم ہی مرا ناشتہ ہے
سوکھ جائے نہ کہیں میری نبوت کا درخت
یہ وہ پودا ہے جو سرکار کا خود کاشتہ ہے

❑ ’’میں صاحب مال اور صاحب املاک نہیں تھا بلکہ میں ان کی وفات کے بعد اللہ

جلشانہ کی طرف جھک گیا اور ان میں جا ملا جنھوں نے دنیا کا تعلق توڑ دیا اور میرے رب نے اپنی طرف مجھے کھینچ لیا اور مجھے نیک جگہ دی اور اپنی نعمتوں کو مجھ پر کامل کیا اور مجھے دنیا کی آلودگیوں اور مکروہات سے نکال کر اپنی مقدس جگہ میں لے آیا اور مجھے اس نے دیا جو کچھ دیا اور مجھے ملہموں اور محدثوں میں سے کر دیا۔ سو میرے پاس دنیا کا مال اور دنیا کے گھوڑے اور دنیا کے سوار تو نہیں تھے بجز اس کے کہ عمدہ گھوڑے قلموں کے مجھ کو عطا کیے گئے اور کلام کے جواہر مجھ کو دیے گئے اور وہ نور مجھ کو عطا ہوا جو مجھے لغزش سے بچاتا اور راست روی کے آثار مجھ پر ظاہر کرتا ہے۔ پس اس الٰہی اور آسمانی دولت نے مجھے غنی کر دیا اور میرے افلاس کا تدارک کیا اور مجھے روشن کیا اور میری رات کو منور کر دیا اور مجھے منعموں میں داخل کیا۔ سو میں نے چاہا کہ اس مال کے ساتھ گورنمنٹ برطانیہ کی مدد کروں۔ اگرچہ میرے پاس روپیہ اور گھوڑے اور خچریں تو نہیں اور نہ میں مالدار ہوں۔ سو میں اس کی مدد کے لیے اپنے قلم اور ہاتھ سے اُٹھا اور خدا میری مدد پر تھا اور میں نے اسی زمانہ سے خدا تعالیٰ سے یہ عہد کیا کہ کوئی مبسوط کتاب بغیر اس کے تالیف نہیں کروں گا جو اس میں احسانات قیصرہ ہند کا ذکر نہ ہو اور نیز اس کے ان تمام احسانوں کا ذکر ہو جن کا شکر مسلمانوں پر واجب ہے۔''

(نور الحق حصہ اوّل صفحہ 28، 29 مندرجہ روحانی خزائن جلد 8 صفحہ 38، 39 از مرزا قادیانی)

قادیانیت سے پوچھا کفر نے تو کون ہے؟
ہنس کے بولی آپ ہی کی دلربا سالی ہوں میں

❑ ''میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔''

(تریاق القلوب صفحہ 27، 28 مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 155، 156 از مرزا قادیانی)

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد ''انگریز'' بخشندہ

مرزا قادیانی کی تقریباً **100** کے قریب کتب ہیں جس میں اپنی ذات اوراپنے آباو اجداد کی تعریف میں تقریباً نصف سے زیادہ صفحات سیاہ کر دیے ہیں اور بقیہ **1/4** حصہ میں گورنمنٹ برطانیہ کی تعریف، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بازاری آوازے، توہین انبیائے کرام، شعائر اسلامی کی اہانت، بزرگان دین کے اقوال میں تحریف، مخالفین کو گالیاں، غیر مذاہب پر غیر شریفانہ جملے اوراپنی نام نہاد وحی والہامات پر خرچ کیے۔ مرزا قادیانی کی ان تمام تصانیف کے لیے ایک عام الماری کا **1/4** حصہ کافی ہے۔ مگر ''سلطان القلم'' کا دعویٰ ہے کہ اس نے انگریز کی اطاعت اور ممانعت جہاد کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اس سے **50** الماریاں بھر سکتی ہیں۔ ہمارا دنیا کے تمام قادیانیوں کو چیلنج ہے کہ وہ ہمیں مرزا قادیانی کی پچاس الماریوں پر مشتمل کتابوں کی فہرست فراہم کریں، ہم انہیں منہ بولا انعام دیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ قیامت تک کوئی قادیانی ہمارا یہ چیلنج قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ مرزا قادیانی کے اس جھوٹ کو ثابت کرنا کسی قادیانی کے بس میں نہیں۔ قادیانیوں کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے!

طوق استعمار مغرب خود کیا زیب گلو
اور گواہ اس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

❑ ''یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اُردو فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں۔ یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ اور بلاد شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا، اشاعت کر دی گئی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلط خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکا اور میں اس قدر خدمت کر کے جو بائیس برس تک کرتا رہا ہوں۔ اس محسن گورنمنٹ پر کچھ احسان نہیں کرتا کیونکہ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ اس بابرکت گورنمنٹ کے آنے سے ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے ایک لوہے کے جلتے ہوئے تنور سے

نجات پائی ہے۔اس لیے میں مع اپنے تمام عزیزوں کے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہوں کہ یاالٰہی !اس مبارکہ قیصرہ ہنددام ملکہ کو دیرگاہ تک ہمارے سروں پر سلامت رکھ۔اوراس کے ہرایک قدم کے ساتھ اپنی مدد کا سایہ شامل حال فرمااوراس کے اقبال کے دن بہت لمبے کر۔"

(ستارہ قیصرہ صفحہ 4 مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 114،ازمرزا قادیانی)

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت   ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

❑ "میں بیس برس تک یہی تعلیم اطاعت گورنمنٹ انگریزی کی دیتا رہا،اوراپنے مریدوں میں یہی ہدایتیں جاری کرتا رہا،تو کیونکر ممکن تھا کہ ان تمام ہدایتوں کے برخلاف کسی بغاوت کے منصوبے کی میں تعلیم کروں۔حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اورمیری جماعت کی پناہ اس سلطنت کو بنادیا ہے۔یہ امن جواس سلطنت کے زیرسایہ ہمیں حاصل ہے نہ یہ امن مکہ معظّمہ میں مل سکتا ہے،نہ مدینہ میں،اورنہ سلطانِ روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں۔"

(تریاق القلوب صفحہ 28،مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 156 ازمرزا قادیانی)

❑ "جنگ سے مراد تلوار،بندوق کا جنگ نہیں۔کیونکہ یہ تو سراسر نادانی اور خلاف ہدایت قرآن ہے جو دین کے پھیلانے کے لیے جنگ کیا جائے،اس جگہ جنگ سے ہماری مراد زبانی مباحثات ہیں جو نرمی اور انصاف اور معقولیت کی پابندی کے ساتھ کیے جائیں۔ورنہ ہم ان تمام مذہبی جنگوں کے سخت مخالف ہیں جو جہاد کے طور پر تلوار سے کیے جاتے ہیں۔"

(تریاق القلوب صفحہ 2،مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 130 ازمرزا قادیانی)

سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

❑ "میں زور سے کہتا ہوں اور میں دعویٰ سے گورنمنٹ کی خدمت میں اعلان دیتا ہوں کہ باعتبار مذہبی اصول کے مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے گورنمنٹ کا اوّل درجہ کا وفادار اور جان نثار یہی نیافرقہ ہے جس کے اصولوں میں سے کوئی اصول گورنمنٹ کے لیے خطرناک نہیں۔"

(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 193 طبع جدید،ازمرزا قادیانی)

❑ "تاج و تخت ہند قیصر کو مبارک ہو مدام
ان کی شاہی میں، میں پاتا ہوں رفاہِ روزگار"

(براہین احمدیہ جلد پنجم صفحہ 111 مندرجہ روحانی خزائن جلد 21 صفحہ 141 ازمرزا قادیانی)

حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے نزدیک ختم نبوت پر مکمل ایمان دراصل مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔انہوں نے 3 مئی 1935ء کو عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اور قادیانیت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''ہندوستان کی سرزمین پر بے شمار مذاہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے کیونکہ ان مذاہب کی بناء کچھ حد تک مذہبی ہے اور ایک حد تک نسلی، اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پر رکھتا ہے اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے اس لیے وہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان اُن تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے''۔

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 103)

حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے قادیانیوں کو امت مسلمہ کی سالمیت کے لیے خطرہ اور انتشار کے علمبردار قرار دیا تھا۔انہوں نے کہا تھا:

❑ ''اس (امت مسلمہ) کی سالمیت اور وحدت صرف عقیدۂ ختم نبوت کی رہین منت ہے۔''

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 104)

❑ ''ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ اس کے معنی بالکل سلیس ہیں۔ محمد ﷺ کے بعد جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیرِ انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے، آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطہ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ

کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیِ احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہوسکتا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہوسکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ حضرت محمد ﷺ آخری نبی نہیں، میں (یعنی مرزا قادیانی) آخری نبی ہوں۔ اس امر کے سمجھنے کے بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوعِ انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے، بانیِ احمدیت کا خیال ہے کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد ﷺ کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا، خود محمد ﷺ کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانیِ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہوجاتا ہے۔''

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ 19 جنوری 1936ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 127 تا 128)

❑ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے (جس کا ظہور آپ ﷺ کی تعلیمات کی بدولت ہوا۔ مترجم) بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے (جس کی آپ ﷺ نے راہنمائی کی۔ مترجم) لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ﷺ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے (یعنی جن کی زندگی کو راہنمائی کے لیے ضرورت تھی۔ مترجم) لہٰذا اسلام کا ظہور

جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا، استقرائی عقل کا ظہور ہے۔

اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ (جیسا کہ تعلیماتِ قرآنی کا مقصود بھی ہے۔ مترجم) یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے (کہ انسان اپنے وسائل سے کام لے، اس کے قوائے فکر و عمل بیدار ہوں اور وہ اپنے اعمال و افعال کا آپ جواب دہ ٹھہرے۔ مترجم) کیونکہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے، جو باعتبارِ نوعیت (ان معنوں میں کہ اس کا تعلق ادراک بالحواس سے نہیں۔ مترجم) انبیا کے احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے آفاق و انفس (3) دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے، اور اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہی کا ظہور محسوسات و مدرکات (محسوسات، یعنی ہماری وارداتِ شعور، ہمارے داخلی احوال اور تجربات اور مدرکات، یعنی ہمارے وہ مشاہدات جن کا تعلق عالم فطرت کے مطالعہ سے ہے۔ مترجم) میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے (لہٰذا اس کی تنقید لازم ٹھہری۔ مترجم) حاصل کلام یہ کہ تصورِ خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے، جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے، نہ ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں۔ اس لیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے

راستے کھل جائیں۔(اور ہم ان کا مطالعہ عقل وفکر اور تعلیمات نبوت کی روشنی میں کریں۔مترجم) بعینہٖ جس طرح اسلامی کلمہ (**لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ**۔مترجم) کے جزو اوّل نے انسان کے اندر یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات (بالفاظ دیگر مظاہر فطرت یا قوائے طبیعیہ۔مترجم) کا مطالعہ نگاہِ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے۔(یعنی ان کو دیوی دیوتا تصور نہ کرے۔مترجم) جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا دستور تھا۔لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ ان کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو، ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسے اپنی دوسری واردات اور اس لیے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں۔حضور نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ از حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ، ترجمہ از سیّد نذیر نیازی ص 193)

علامہ اقبالؒ قادیانیت کے بھیانک چہرے سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

❑ ’’اس سے قبل اسلامی موبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے، میرے نزدیک ان میں بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے۔لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔اس کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں، اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ، یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔‘‘

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 104)

قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا قادیانی نے اپنی جماعت کو تازہ دودھ اور ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا:

❑ ’’یہ جو ہم نے دوسرے مدعیان اسلام سے قطع تعلق کیا ہے، اول تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم سے تھا، نہ اپنی طرف سے اور دوسرے وہ لوگ جوریا پرستی اور طرح طرح کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور ان کو ان کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا ان سے تعلق رکھنا

ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دیں جو سڑ گیا ہے اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح ان سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور نہ ہمیں ایسے تعلق کی حاجت ہے۔" (مرزا قادیانی کا بیان مطبوعہ تشحیذ الاذہان جلد نمبر 6 شمارہ نمبر 8 اگست 1911 صفحہ 311)

قادیانی جماعت کے دوسرے سربراہ مرزا محمود نے بھی اسی طرح کا ایک بیان دیا:

❑ "اس زمانہ میں خدا کا ایک فرستادہ آیا جسے خدا تعالیٰ نے الہاموں میں یا نبی اللہ سے مخاطب فرمایا۔ خود مدعی (مرزا غلام احمد قادیانی) نے اپنے تئیں نبی کہا۔ پھر اس نے اپنے کافر کہنے والوں اور نہ ماننے والوں کو یکساں ٹھہرایا۔ اپنی جماعت کو خالص دودھ سے اور دوسرے مسلمانوں کی جماعت کو پھٹے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی اور بتایا کہ ان دونوں کے ملانے سے دونوں دودھ پھٹ جائیں گے۔" (تشحیذ الاذہان جلد نمبر 6 شمارہ نمبر 8 اگست 1911 صفحہ 309)

اس بیانات کے ردِعمل میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا:

❑ "ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے۔ اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)۔ مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں، جتنے سکھ، ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے۔"

(علامہ محمد اقبالؒ کا خط اسٹیٹسمین (دہلی) کے نام مطبوعہ 10 جون 1935ء،

حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 117، 118)

❑ "امسٹرڈم میں یہودیوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اسپائنوزا کو ایسی انتشار انگیز ہستی سمجھنے میں حق بجانب تھے جس سے ان کی جماعت بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح مسلمانانِ ہند یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ تحریکِ قادیانیت جو تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتی ہے اور اس سے معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے، مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملی کے لیے اسپائنوزا

کی اس مابعد الطبیعات سے زیادہ خطرناک ہے جو یہود کی حیاتِ ملی کے لیے تھی۔''

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ 19 جنوری 1936ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 122)

حضرت علامہ اقبالؒ، قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا قادیانی کو ایک مذہبی سٹے باز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

- ''ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبرؔ نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا، جب اس نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ''

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 106)

شروع میں جب مرزا قادیانی نے اپنے آپ کو عالم دین اور مناظر اسلام کے طور پر خود کو متعارف کروایا تو بہت سے لوگ وقتی طور پر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان میں حضرت علامہ اقبالؒ بھی شامل تھے۔ بعد میں جب مرزا قادیانی نے مجدد، امام مہدی، مسیح موعود، نبی، رسول حتیٰ کہ نعوذ باللہ محمد رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کیا تو حضرت علامہ اقبالؒ کا خون کھول اُٹھا اور اُس کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا:

- ''کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں (ربوی و لاہوری) کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے

کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''

(قادیانی ہفت روزہ ''سن رائز'' (Sun Rise) کے جواب میں،
مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی ایم اے صفحہ 112)

❑ ''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا حالانکہ طبری لکھتا ہے وہ رسالت مآب ﷺ کی نبوت کا مصدق تھا، اور اس کی اذان میں حضور رسالتماب ﷺ کی نبوت کی تصدیق تھی۔'' (باقیات انوار اقبالؒ از بشیر احمد ڈار صفحہ 45)

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ایک تاریخی خط میں حضرت علامہ اقبالؒ قادیانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

❑ ''میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان کے غدار ہیں۔''

(حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا خط بنام پنڈت جواہر لال نہرو بتاریخ 21 جون 1936ء،
مطبوعہ کلیات مکاتیب اقبالؒ مرتبہ سید مظفر حسین برنی جلد نمبر 4، صفحہ 328)

❑ ''مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے، صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے۔ راسخ عقائد کو موثر طریقہ پر مٹانے اور متذکرہ صدر سوالات میں جو دینیاتی نظریات مضمر ہیں، ان کی نئی تفسیر کرنے کے لیے جو سیاسی اعتبار سے موزوں ہو، ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی۔ اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کیا۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے، جو انھوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں گویا اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ مدعی نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے، اوّل درجہ کے کافر ہیں اور ان کا ٹھکانہ نارِ جہنم ہے''۔

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ
مطبوعہ حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی صفحہ 131، 132)

❑ ”احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے“۔

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی صفحہ 132،133)

❑ ”ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسولِ کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں، یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہوتا کہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں“۔

(علامہ محمد اقبالؒ کا خط اسٹیٹسمین (دہلی) کے نام مطبوعہ 10 جون 1935ء، حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 117)

علامہؒ نے 1936ء میں پنجاب مسلم لیگ کی کونسل میں قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کی تجویز بھی پاس کرائی اور صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے لیگی امیدواروں سے حلفیہ تحریری اقرار نامہ لکھوایا کہ وہ کامیاب ہو کر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کے لیے آئینی اداروں میں مہم چلائیں گے۔ افسوس کہ اس کاروائی کا ریکارڈ قادیانی نواز لوگوں نے علامہؒ کے انتقال کے بعد تلف کروا دیا۔

یہ اعزاز بھی حضرت علامہ اقبالؒ کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ چونکہ قادیانی مذہبی اور سیاسی طور پر مسلمانوں سے علیحدہ تشخص رکھتے ہیں، لہٰذا انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں:

❑ ”میں سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے، خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ

قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں اور مجھے اس احساس میں حکومت کے سکھوں کے متعلق رویہ سے اور بھی تقویت ملی۔ سکھ 1919ء تک آئینی طور پر علیحدہ سیاسی جماعت تصور نہیں کیے جاتے تھے لیکن اس کے بعد علیحدہ جماعت تسلیم کر لیے گئے، حالانکہ انھوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں''۔

(علامہ محمد اقبالؒ کا خط اسٹیٹسمین (دہلی) کے نام مطبوعہ 10 جون 1935ء، حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 116)

❑ ''ثالثاً اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو 56000 (چھپن ہزار) ہے، انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہوسکتی۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا علیحدہ لحاظ رکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔''

(اسٹیٹسمین کے جواب میں، مطبوعہ روزنامہ اسٹیٹسمین دہلی، 10 جون 1935ء حرفِ اقبال مرتبہ لطیف احمد خان شروانی ایم اے صفحہ 118)

❑ ''میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی

رواداری سے کام لے گا، جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔“

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) (ضمیمہ) مئی 1935ء

مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 109)

1937ء میں مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے حلف نامے میں یہ شق رکھی کہ:

- ”میں اقرارِ صالح کرتا ہوں اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہوکر کامیاب ہوگیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کے لیے انتہائی کوشش کروں گا۔(اقبال کے آخری دوسال از عاشق حسین بٹالوی ص 326)

حضرت علامہؒ نے بحیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ اس کی توثیق فرما کر قادیانیت کو سیاسی سطح پر ایک اور ضربِ کاری لگائی۔

- ”اگر قوم کی وحدت و سالمیت کو خطرہ لاحق ہو تو اس کے لیے صرف ایک ہی چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ وہ انتشار انگیز قوتوں کے خلاف اپنا دفاع کرے اور اپنے دفاع کے کیا طریقے ہیں؟ مدلل تحریریں اور ایسے شخص کے دعووں کا ابطال جو اپنی اصل جماعت کی نگاہوں میں ”مذہبی مہم جو“ ہو۔ تو کیا یہ مناسب ہے کہ جس اصل جماعت کی سالمیت خطرے میں ہو اسے برداشت کی تلقین کی جائے اور باغی گروہ کو تحفظ کے ساتھ اپنی تبلیغ جاری رکھنے کی اجازت دی جائے، خواہ یہ تبلیغ سخت جھوٹ اور گستاخانہ عبارات سے بھی لبریز ہو۔“

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء

مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 108)

عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے سلسلہ میں حضرت علامہ اقبالؒ نے شعر و سخن کے ذریعے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ اردو اور فارسی میں کئی نظمیں قادیانیت کی تردید و مذمت میں لکھیں۔ درج ذیل ایمان افروز اور ولولہ انگیز اشعار ان کے ایمان و عقیدہ کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں:

پس خُدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
اُو رُسل را ختم و ما اقوام را

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لَا نَبِیَّ بَعْدِیُ ز احسانِ خدا ست
پردہ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازُو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازُو
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا اَبد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیر اللہ مسلماں برکُند
نعرۂ لا قَوْمَ بَعْدِیُ می زَنَد

(مثنوی ''رموزِ بے خودی'' از مجموعہ اسرار و رموز)

ترجمہ: خدا تعالیٰ نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسول ﷺ پر رسالت ختم کر دی۔ ہمارے رسول ﷺ پر سلسلۂ انبیا اور ہم پر سلسلۂ اقوام تمام ہو چکا، اب بزمِ جہاں کی رونق ہم سے ہے۔ میخانۂ شرائع کا آخری جام ہمیں عطا فرمایا گیا، قیامت تک ساقی گری کی خدمت اب ہم ہی انجام دیں گے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کا یہ فرمان کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، احساناتِ خداوندی میں سے ایک بڑا احسان ہے۔ دینِ مصطفیٰ ﷺ کی عزت و ناموس کا محافظ بھی یہی ہے۔ مسلمانوں کا اصل سرمایہ قوت یہی عقیدۂ ختم نبوت ہے اور اسی میں وحدتِ ملت کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے۔ اللہ عزوجل نے حضور ﷺ کے بعد ہر دعویٔ نبوت کو باطل ٹھہرا کر اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے مجتمع کر دیا ہے۔ اسی عقیدہ کے باعث مسلمان ایک اللہ کے سوا سب سے تعلق توڑ لیتا اور اُمتِ مسلمہ کے بعد کوئی امت نہیں، کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

آپ ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت بہر نوع، بہر مفہوم اور بہر رنگ شرک (فی النبوّت) ہے اور آپ ﷺ ہی نے محفلِ ہستی کو معرفت کی شمع سے نورانی کر دیا۔

مرزا قادیانی کی نام نہاد نبوت اور انگریز پرستی کا پردہ چاک کرتے ہوئے حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

فتویٰ ہے شَیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دُنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر
عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآن بغیر از را ندید
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لا الٰہ
در حرم زاد و کلیسا را مرید
پردۂ ناموسِ ما را بر درید
دامنِ رو را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دلِ روشن تہی است

الحذر! از گرمئ گفتارِ او
الحذر! از حرفِ پہلو دارِ او
شیخ او لرد فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید
گفت دین را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقصہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

(مثنوی پس چہ باید کرد)

ترجمہ: میرے زمانے نے ایک نبی بھی پیدا کیا جس کو اپنے سوا قرآن میں کچھ نظر نہ آیا۔ خود پسند، عزت چاہنے والا، کوتاہ نظر اس کا دل لا الٰہ سے خالی ہے۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا اور عیسائیوں کا غلام بنا۔ اس نے ہماری ناموس کے پردے کو چاک کرایا۔ اس سے عقیدت رکھنا حماقت ہے۔ اس کا سینہ دل کی روشنی سے خالی ہے۔ اس کی چرب زبانی سے بچو۔ اس کی چالبازانہ باتوں سے بچو، اس کا پیر شیطان اور فرنگی کا غلام ہے۔ اگرچہ وہ کہتا ہے کہ میں بایزید کے مقام سے بول رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ غلامی میں ہی دین کی رونق ہے۔ اس کی زندگی خودی سے محروم ہے۔ غیروں کی دولت کو وہ رحمت جانتا ہے۔ اس نے گرجا کے گرد رقص کیا اور مر گیا۔

مضامینِ اقبالؒ

علامہ محمد اقبالؒ

اسلام اور احمدیت

° ماڈرن ریویو کلکتہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضامین شائع ہونے کے بعد مجھے اکثر مسلمانوں نے، جو مختلف مذہبی و سیاسی مسلک رکھتے ہیں، متعدد خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کی خواہش ہے کہ میں احمدیوں کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے طرزِ عمل کی مزید توضیح کروں اور اس طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کروں۔ بعض یہ دریافت کرتے ہیں کہ میں احمدیت میں کس مسئلہ کو تنقیح طلب سمجھتا ہوں۔ اس بیان میں مَیں ان مطالبات کو پورا کرنا چاہتا ہوں، جن کو میں بالکل جائز تصور کرتا ہوں اور اس کے بعد ان سوالات کا جواب دینا چاہتا ہوں جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اٹھائے ہیں۔ بہر حال مجھے اندیشہ ہے کہ اس بیان کا ایک حصہ پنڈت جی کے لیے دلچسپ نہ ہوگا۔ لہٰذا ان کا وقت بچانے کے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ ایسے حصوں کو نظر انداز کر دیں۔

یہ بیان کرنا میرے لیے ضروری نہیں کہ پنڈت جی کو مشرق کے، بلکہ ساری دنیا کے ایک عظیم الشان مسئلے سے جو دلچسپی ہے، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میری رائے میں یہ پہلے ہندوستانی قوم پرست قائد ہیں، جنھوں نے دنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس بے چینی کے مختلف پہلوؤں اور ممکن ردِّ عمل کے مدنظر ہندوستان کے ذی فکر سیاسی قائدین کو چاہیے کہ اس وقت قلبِ اسلام میں جو چیز ہیجان پیدا کر رہی ہے، اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

بہر حال میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں، میرا

ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ جن سوالات کو وہ سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ تاہم جس طریقے سے انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصول کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بناء پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے حقائق کو کچل ڈالا ہے، اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساس خودمختاری پیدا ہو۔ میری رائے میں ان کا یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے لیے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیے حالانکہ ان تہذیبوں کے باہمی عمل واثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائدار تہذیب کو نمو دے سکتا ہے۔ ان طریقوں سے جو تہذیب نمو پائے گی، اس کا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہوگا؟ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب ﷺ کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے، جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں، پنڈت جی کو یہ موقع دیتی ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔

بہرکیف میں پنڈت جی کے محرکات کی تحلیل کے ناگوار فرض کو جاری رکھنا نہیں چاہتا۔ جو لوگ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کے طرزِ عمل کی توضیح چاہتے ہیں، ان کے استفادہ کے لیے میں ڈیورنٹ (1) کی کتاب 'افسانہ فلسفہ' (2) کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جس سے قارئین کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ قادیانیت میں امرِ تنقیح طلب کیا ہے؟ ڈیورنٹ نے فلسفی اعظم اسپائنوزا (3) کے جماعت بدر کیے جانے سے متعلق یہودی نقطہ نظر کو اختصار کے ساتھ چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ قارئین یہ خیال نہ کریں کہ اس اقتباس کے پیش کرنے سے میرا مطلب

اسپائنوزا اور بانی احمدیت میں کسی قسم کا موازنہ کرنا ہے۔ عقل و سیرت کے لحاظ سے ان دونوں کے مابین بُعدِ عظیم ہے۔ 'خدامست' اسپائنوزا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی جدید تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائے، وہ یہودیت سے خارج ہے۔ اسپائنوزا کے جماعت بدر کیے جانے کے متعلق ڈیورنٹ کی عبارت یہودیوں کے طرزِ عمل پر اس قدر منطبق نہیں ہوتی جس قدر کہ قادیانیت کے متعلق مسلمانوں کے طرزِ عمل پر ہوتی ہے۔ یہ عبارت حسبِ ذیل ہے:

''علاوہ بریں اکابر یہود کا خیال تھا کہ امسٹرڈم (4) میں ان کی جو چھوٹی سی جماعت تھی ان کو انتشار سے بچانے کا واحد ذریعہ مذہبی وحدت ہے اور یہودیوں کی جماعت کو جو دنیا میں بکھری ہوئی ہے، برقرار رکھنے اور ان میں اتفاق پیدا کرنے کا آخری ذریعہ بھی یہی ہے۔ اگر ان کی اپنی کوئی سلطنت، کوئی ملکی قانون اور دنیاوی قوت و طاقت کے ادارے ہوتے جن کے ذریعہ وہ اندرونی استحکام اور بیرونی استحکام حاصل کر سکتے تو وہ زیادہ روادار ہوتے۔ لیکن ان کا مذہب ان کے لیے ایمان بھی تھا اور حُب الوطنی بھی۔ ان کا معبد ان کی عبادت کا اور مذہبی رسوم کے علاوہ ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بھی مرکز تھا۔ ان حالات کے ماتحت انھوں نے الحاد کو غداری اور رواداری کو خودکشی تصور کیا۔''

امسٹرڈم میں یہودیوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اسپائنوزا کو ایسی انتشار انگیز ہستی سمجھنے میں حق بجانب تھے جس سے ان کی جماعت بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح مسلمانانِ ہند یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ تحریکِ قادیانیت جو تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتی ہے اور اس سے معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے، مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملی کے لیے اسپائنوزا کی اس مابعد الطبیعات سے زیادہ خطرناک ہے جو یہود کی حیاتِ ملی کے لیے تھی۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانانِ ہند ان حالات کی مخصوص نوعیت کو جبلی طور پر محسوس کرتے ہیں جن میں کہ وہ ہندوستان میں گھرے ہوئے ہیں اور دوسرے ممالک کے مقابلہ میں انتشار انگیز قوتوں کا قدرتی طور پر زیادہ احساس رکھتے ہیں۔ ایک اوسط مسلمان کا یہ جبلی ادراک میری رائے میں بالکل صحیح ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس احساس کی بنیاد مسلمانانِ ہند کے ضمیر کی گہرائیوں میں ہے۔ اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں، وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ اس لفظ کو بالکل نہیں سمجھتے۔ گبن (5) کہتا ہے کہ ایک

رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ایک رواداری مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر وعمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے، کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر وعمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر کی جاتی ہے، برداشت کر لیتا ہے۔یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کی رواداری اخلاقی قدر سے معرا ہوتی ہے۔اس کے برعکس اس سے اُس شخص کے روحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے، جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے، دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔خود اس کا مذہب ائتلافی ہے، اس وجہ سے وہ بآسانی دوسرے مذاہب سے ہمدردی رکھ سکتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ہندوستان کے شاعر اعظم امیر خسرو نے ایک بت پرست کے قصہ میں اس قسم کی رواداری کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔اس کی بتوں سے بے اندازہ محبت کے تذکرہ کے بعد شاعر اپنے مسلمان قارئین کو یوں مخاطب کرتا ہے ؎

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندی بُری
ہم زوے آموز پرستش گری○○

خدا کا سچا پرستار ہی عبادت و پرستش کی قدر و قیمت کو محسوس کر سکتا ہے، خواہ اس پرستش کا تعلق ایسے ارباب سے ہو جن پر وہ اعتقاد نہیں رکھتا۔رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔اس طرزِ عمل کو وہ غلطی سے اخلاقی کمتری خیال کرتے ہیں۔وہ نہیں سمجھتے کہ (اس) طرزِ عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مضمر ہے۔جب کسی جماعت کے افراد جبلی طور پر یا کسی عقلی دلیل کی بناء پر یہ محسوس کرتے ہوں کہ اس جماعت کی اجتماعی زندگی خطرہ میں ہے، جس کے یہ رُکن ہیں تو ان کے مدافعانہ طرزِ عمل کو حیاتیاتی معیار پر جانچنا چاہیے۔اس سلسلہ میں ہر فکر وعمل کی تحقیق اس لحاظ سے

کرنی چاہیے کہ اس میں حیات افروزی کس قدر ہے؟ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ ایسے شخص کے متعلق جو مُلحد قرار دیا گیا ہو، کسی فرد یا جماعت کا رویہ اخلاقاً صائب ہے یا غیر صائب؟ سوال یہ ہے کہ یہ حیات افروز ہے یا حیات کُش؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ جو جماعت مذہبی اصولوں پر قائم ہوئی ہے، وہ محکمہ احتساب (6) کے قیام کو مستلزم ہے۔ تاریخِ مسیحیت کے متعلق یہ بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن تاریخِ اسلام پنڈت جی کی منطق کے خلاف یہ ثابت کرتی ہے کہ حیاتِ اسلامی کے گزشتہ تیرہ سو سال میں اسلامی ممالک محکمۂ احتساب سے بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ قرآن واضح طور پر ایسے ادارے کی ممانعت کرتا ہے ''دوسروں کی کمزوریوں کی تلاش نہ کرو اور بھائیوں کی چغلی نہ کھاؤ۔'' (7) پنڈت جی کو تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہودی اور عیسائی اپنے وطن کے مذہبی تشدد سے تنگ آ کر اسلامی ممالک میں پناہ لیتے تھے۔ جن دو قضایا پر اسلام کی تعقلی عمارت قائم ہے، وہ اس قدر سادہ ہیں کہ ان میں ایسا الحاد ناممکن ہے، جس سے مُلحد دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب کوئی شخص ایسے مُلحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظامِ اجتماعی خطرہ میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزادانہ اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔ لیکن ایسی صورت میں ریاست کا فعل سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوگا، نہ کہ خالص مذہبی اصولوں پر۔ میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ پنڈت جی ایسا شخص، جس کی پیدائش اور تربیت ایک ایسی جماعت میں ہوئی ہو جس کی سرحدیں متعین نہیں ہیں اور جس میں اندرونی استحکام بھی مفقود ہے، اس امر کا بمشکل اندازہ کرسکتا ہے کہ ایک مذہبی جماعت ایسے محکمۂ احتساب کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے، جو حکومت کی جانب سے عوام کے عقائد کی تحقیقات کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ یہ بات کارڈنل نیومن (8) کی اس عبارت سے بالکل واضح ہو جاتی ہے، جو پنڈت جی پیش کر کے حیرت کرتے ہیں کہ میں کارڈنل کے اصولوں کو کس حد تک اسلام پر قابلِ اطلاق سمجھتا ہوں؟ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی اندرونی ہیئتِ ترکیبی اور کیتھولک مسیحیت میں اختلافِ عظیم ہے۔ کیتھولک مسیحیت کی پیچیدگی اس کی فوق العقلی نوعیت اور حکمی عقائد کی کثرت نے، جیسا کہ تاریخِ مسیحیت سے ظاہر ہوتا ہے، مُلحدانہ تاویلات کے لیے راستہ کھول دیا ہے۔ اسلام کا سیدھا سادا مذہب دو قضایا پر مبنی ہے۔ خدا ایک ہے اور حضرت محمد ﷺ اس سلسلۂ انبیا کے آخری نبی ہیں جو وقتاً فوقتاً ہر ملک اور ہر زمانے میں اس غرض سے مبعوث

ہوئے تھے کہ نوعِ انسان کی راہنمائی صحیح طرزِ زندگی کی طرف کریں۔ جیسا کہ بعض عیسائی مصنفین خیال کرتے ہیں کہ کسی حکمی عقیدے کی تعریف اسی طرح کی جانی چاہیے کہ وہ ایک فوق العقلی قضیہ ہے اور اس کو مذہبی استحکام کی خاطر اور اس کا مابعدالطبیعی مفہوم سمجھے بغیر مان لینا چاہیے تو اس لحاظ سے اسلام کے ان دو سادہ قضایا کو حکمی عقیدے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان دونوں کی تائید نوعِ انسان کے تجربہ سے ہوتی ہے اور ان کی عقلی توجیہ بخوبی کی جا سکتی ہے۔ ایسے الحاد کا سوال جہاں یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اس کا مرتکب دائرہ مذہب میں ہے یا اس سے خارج ہے؟ ایسی مذہبی جماعت میں، جو ایسے سادہ قضایا پر مبنی ہو، اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ مُلحد ان قضایا میں سے کسی ایک یا دونوں سے انکار کر دے۔ تاریخِ اسلام میں ایسا واقعہ شاذ ہی وقوع پذیر ہوا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ جب اس قسم کی کوئی بغاوت پیدا ہوتی ہے تو ایک اوسط مسلمان کا احساس قدرتی طور پر شدید ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ایران کا احساس بہائیوں کے خلاف اس قدر تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس قدر شدید ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے فقہ اور دینیات کے فروعی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے اکثر و بیشتر، ایک دوسرے میں الحاد کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ 'دینیات، کے فروعی مسائل کے اختلاف میں اور نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں مُلحد کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان، جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں، ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کے بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ پروفیسر ہرگراؤنج (9) کہتے ہیں کہ ''جب ہم فقہ اسلامی کے نشو و نما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہر زمانے کے علما خفیف سے اشتعال کے باعث ایک دوسرے کی مذمت یہاں تک کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر کفر کا الزام عائد ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحادِ عمل کے ساتھ اپنے پیشرووں کے اختلاف رفع کرتے ہیں، اسلامی دینیات کا متعلم جانتا ہے کہ مسلم فقہا اس قسم کے الحاد کو اصطلاحی زبان میں کفر زیرِ کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایسا کفر جس میں

مرتکب جماعت سے خارج نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ملاؤں کے ذریعے جن کا عقلی تعطل دینیاتی تفکر کے ہر اختلاف کو قطعی سمجھتا ہے اور اختلاف میں اتحاد کو دیکھ نہیں سکتا، خفیف سا الحاد فتنہ عظیم کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ کا انسداد اس طرح ہو سکتا ہے کہ مدارسِ دینیات کے طلبا کے سامنے اسلام کی حقیقی روح کا واضح ترین تصور پیش کریں اور ان کو یہ بتلائیں کہ منطقی تضاد کے دینیاتی تفکر میں اصولِ حرکت کا کام کرتا ہے۔ یہ سوال کہ الحادِ کبیرہ کس کو کہتے ہیں؟ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ کسی مفکر یا مصلح کی تعلیم مذہبِ اسلام کی سرحدوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیم میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ تحریکِ احمدیت دو جماعتوں میں منقسم ہے، جو قادیانی اور لاہوری جماعتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اوّل الذکر جماعت بانی احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے، آخر الذکر نے اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کو کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ بہرحال یہ سوال کہ آیا بانی احمدیت ایک نبی تھا اور اس کی تعلیم سے انکار کرنا 'الحادِ کبیرہ' کو مستلزم ہے؟ ان دونوں جماعت میں متنازعہ فیہ ہے۔ احمدیوں کے ان گھریلو مناقشات کے محاسن کو جانچنا میرے پیش نظر مقصد کے لیے غیر ضروری ہے۔ میرا یقین ہے، جس کے وجوہ میں آگے چل کر بیان کروں گا، کہ ایسے نبی کا تصور جس کے انکار کرنے سے منکر خارج (از) اسلام ہو جاتا ہے، احمدیت کا ایک لازمی عنصر ہے اور لاہوری جماعت کے امام کے مقابلہ میں قادیانیوں کے موجودہ پیشوا تحریک احمدیت کی روح سے بالکل قریب ہیں۔

ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ (10) اس کے معنی بالکل سلیس ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیرِ انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے، آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطہ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیِ احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام

کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ حضرت محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ حضرت محمد ﷺ آخری نبی نہیں، میں آخری نبی ہوں۔ اس امر کے سمجھنے کے بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوعِ انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے، بانیِ احمدیت کا خیال ہے کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد ﷺ کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا، خود محمد ﷺ کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانیِ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔

اس کا دعویٰ ہے کہ میں پیغمبر اسلام کا ''بروز'' ہوں۔ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کا بروز ہونے کی حیثیت سے اس کا خاتم النبیین ہونا دراصل محمد ﷺ کا خاتم النبیین ہونا ہے۔ پس یہ نقطۂ نظر پیغمبر اسلام کی ختم نبوت کو مسترد نہیں کرتا۔ اپنی ختم نبوت کو پیغمبر اسلام کی ختم نبوت کے مماثل قرار دے کر بانیِ احمدیت نے ختم نبوت کے تصور کے زمانی مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہر حال یہ ایک بدیہی بات ہے کہ بروز کا لفظ مکمل مشابہت کے مفہوم میں بھی اس کی مدد نہیں کرتا کیونکہ بروز ہمیشہ اس شئے سے الگ ہوتا ہے جس کا یہ بروز ہوتا ہے۔ صرف اوتار کے معنوں میں بروز اور اس شئے میں عینیت پائی جاتی ہے۔ پس اگر ہم بروز سے، روحانی صفات کی مشابہت مراد لیں تو یہ دلیل بے اثر رہتی ہے۔ اگر اس کے برعکس اس لفظ کے آریائی مفہوم میں اصل شئے کا اَوتار مراد لیں تو یہ دلیل بظاہر قابل قبول ہوتی ہے۔ لیکن اس خیال کا موجد مجوسی بھیس میں نظر آتا ہے۔

ہسپانیہ کے برگزیدہ صوفی محی الدین ابن العربی کی سند پر یہ مزید دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان ولی کے لیے اپنے روحانی ارتقا کے دوران میں اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے جو شعورِ نبوت سے مختص ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی کا یہ خیال نفسیاتی نقطۂ نظر سے درست نہیں لیکن اگر اس کو صحیح فرض کر لیا جائے تو تب بھی قادیانی استدلال شیخ کے

موقف کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ ایسے تجربہ کو ذاتی کمال تصور کرتے ہیں، جس کی بناء پر کوئی ولی یہ اعلان نہیں کر سکتا کہ جو شخص اس پر (یعنی ولی پر) اعتقاد نہیں رکھتا، دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زمانہ اور ملک میں ایک سے زیادہ اولیاء موجود ہو سکتے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک ولی کا مشعورِ نبوت تک پہنچنا اگرچہ ممکن ہے، تاہم اس کا تجربہ اجتماعی اور سیاسی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اس کو کسی نئی تنظیم کا مرکز بناتا ہے اور یہ استحقاق عطا کرتا ہے کہ وہ اس نئی تنظیم کو پیروانِ محمد ﷺ کے ایمان یا کفر کا معیار قرار دے۔

اس صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کر کے فتوحات کی متعلقہ عبارتوں کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ عظیم الشان صوفی...... حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت پر اسی طرح مستحکم ایمان رکھتا ہے، جس طرح کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ اگر شیخ کو اپنے صوفیانہ کشف میں یہ نظر آ جاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنھیں تصوف کا شوق ہے، شیخ کی صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبرِ اسلام کی ختم نبوت سے انکار کر دیں گے تو یقیناً علمائے ہند سے پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غدارانِ اسلام سے متنبہ کر دیتے۔

اب احمدیت کی رُوح پر غور کرنا ہے۔ اس کے ماخذ اور اس امر کی بحث کہ قبلِ اسلام مجوسی تصورات نے اسلامی تصوف کے ذریعہ بانی احمدیت کے ذہن کو کس طرح متاثر کیا؟ مذہبِ متقابلہ کی نظر سے بے حد دلچسپ ہو گی لیکن میرے لیے اس بحث کو اٹھانا ممکن نہیں۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرونِ وسطیٰ کے تصوف اور دینیات کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ علمائے ہند نے اس کو محض ایک دینیاتی تحریک تصور کیا اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ طریقہ موزوں نہیں تھا۔ اس وجہ سے علما کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بانی احمدیت کے الہامات کی اگر دقیق النظری سے تحلیل کی جائے تو یہ ایک ایسا موثر طریقہ ہو گا جس کے ذریعہ سے ہم اس کی شخصیت اور اندرونی زندگی کا تجزیہ کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں مَیں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی منظور الٰہی نے بانیِ احمدیت کے الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں نفسیاتی تحقیق کے لیے متنوع اور مختلف مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیِ احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کنجی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ کسی دن نفسیاتِ جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے

گا۔ اگر وہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے (اور چند وجوہ سے اس کو ایسا کرنا ہی پڑے گا، جن کی تشریح یہاں نہیں کی جاسکتی) اور اپنے مطالعہ کو بانیِ احمدیت اور اس کے ہم عصر غیر مسلم صوفیاء جیسے رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے تو اس کو اس تجربہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہو گی، جس کی بناء پر بانی احمدیت نبوت کا دعویدار ہے۔

عام آدمی کے نقطہ نظر سے ایک اور موثر اور مفید طریقہ یہ ہے کہ 1799ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے، اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں 1799ء بے حد اہم ہے۔ اس سال ٹیپو کو شکست ہوئی۔ اس کی شکست کے ساتھ مسلمانوں کو ہندوستان میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کی جو امید تھی، اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اسی سال جنگِ نوارینو، وقوع پذیر ہوئی، جس میں ترکی کا بیڑہ تباہ ہو گیا۔ (11) جو لوگ سرنگا پٹم گئے ہیں، ان کو ٹیپو کے مقبرے پر یہ تاریخ وفات کندہ نظر آئی ہو گی۔

ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہوگئی۔

ان الفاظ کے مصنف نے پیش گوئی کی تھی، پس 1799ء میں ایشیا میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تھا لیکن جس طرح ژینا میں جرمنی کی شکست کے بعد جدید جرمن قوم کا نشو ونما ہوا، کہا جا سکتا ہے کہ اسی طرح 1799ء میں اسلام کی سیاسی شکست کے بعد جدید اسلام اور اس کے مسائل معرضِ ظہور میں آئے۔ اس امر پر میں آگے چل کر بحث کروں گا۔ فی الحال میں قارئین کی توجہ چند مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، جو ٹیپو کی شکست اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کی آمد کے بعد اسلامی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ مسلمانانِ ہند اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں، ترکی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت: خدا، رسول اور تم میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو (12) میں الفاظ، تم میں سے، کا کیا مفہوم ہے؟ احادیث سے آمدِ مہدی کی جو پیشین گوئی کی جاتی ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتہً صرف مسلمانانِ ہند سے تھا۔ اس کے علاوہ مغربی شہنشاہیت کو بھی جو اس وقت اسلامی دنیا میں سرعت کے ساتھ تسلط حاصل کر رہی تھی،

ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے، وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔ مسلمان اربابِ سیاست جن کی آنکھیں واقعات پر جمی ہوئی تھیں، علما کے ایک طبقہ کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ دینیاتی استدلال کا ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو صورتِ حال کے مناسب ہو۔ لیکن محض منطق سے ایسے عقائد پر فتح پانا آسان نہ تھا جو صدیوں سے مسلمانانِ ہند کے قلوب پر حکمران تھے۔ ایسے حالات میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بناء پر آگے بڑھ سکتی ہے یا قرآن و حدیث کی نئی تفسیر کے ذریعہ۔ ہر دو صورتوں میں استدلال عوام کو متاثر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے، صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے۔ راسخ عقائد کو موثر طریقہ پر مٹانے اور متذکرہ صدر سوالات میں جو دینیاتی نظریات مضمر ہیں، ان کی نئی تفسیر کرنے کے لیے جو سیاسی اعتبار سے موزوں ہو، ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی۔ اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کیا۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے، جو انھوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں گویا اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ مدعی نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے، اوّل درجہ کے کافر ہیں اور ان کا ٹھکانہ نارِ جہنم ہے۔ جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشاء کو سمجھا ہے، احمدیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح علیہ السلام کی موت ایک عام فانی انسان کی موت تھی اور رجعت مسیح علیہ السلام گویا ایسے شخص کی آمد ہے جو روحانی حیثیت سے اس کا مشابہ ہے۔ اس خیال سے اس تحریک پر ایک طرح کا عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے لیکن یہ ابتدائی مدارج ہیں۔ اس تصورِ نبوت کو جو ایسی تحریک کے اغراض کو پورا کرتا ہے جن کو جدید سیاسی قوتیں وجود میں لائی ہیں۔ ایسے ممالک میں جو ابھی تمدن کی ابتدائی منازل میں ہیں، منطق سے زیادہ سند کا اثر ہوتا ہے۔ اگر کافی جہالت اور زود اعتقادی موجود ہو اور کوئی شخص اس قدر بے باک ہو کہ حاملِ الہام ہونے کا دعویٰ کرے، جس سے انکار کرنے والا ہمیشہ کے لیے گرفتارِ لعنت ہو جاتا ہے تو ایک محکوم اسلامی ملک میں ایک سیاسی دینیات کو وجود میں لانا اور ایک ایسی جماعت کو تشکیل دینا آسان ہو جاتا ہے، جس کا مسلک سیاسی محکومیت ہو۔ پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا فرسودہ جال اس سادہ لوح دہقان کو

آسانی سے مسخر کر لیتا ہے، جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ متحد ہو جائیں اور اس چیز کی مزاحمت کریں، جس کو وہ ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طنز آمیز مشورہ اس بات کو فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے، احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بناء پر بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے شایانِ شان نہیں کہ وہ مسلمانانِ ہند پر رجعت پسند اور قدامت پسند ہونے کا الزام لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانانِ ہند کے اس رویہ کی ضرور تعریف و تحسین کرتے جو ایک ایسی مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے جو ہندوستان کے تمام آفات و مصائب کے لیے الہامی سند پیش کرتی ہے۔

پس قارئین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسلام کے رخساروں پر اس وقت احمدیت کی جو زردی نظر آ رہی ہے، وہ مسلمانانِ ہند کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں کوئی ناگہانی واقعہ نہیں ہے۔ وہ خیالات جو بالآخر اس تحریک میں رونما ہوئے ہیں، بانی احمدیت کی ولادت سے پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں رہ چکے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بانی احمدیت اور اس کے رفقا نے سوچ سمجھ کر اپنا پروگرام تیار کیا ہے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ بانی احمدیت نے ایک آواز سنی لیکن اس امر کا تصفیہ کہ یہ آواز اس خدا کی طرف سے تھی جس کے ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے، یا لوگوں کے روحانی افلاس سے پیدا ہوئی۔ اس تحریک کی نوعیت پر منحصر ہونا چاہیے جو اس آواز کی آفریدہ ہے اور ان افکار و جذبات پر بھی جو اس آواز نے اپنے سننے والوں میں پیدا کیے ہیں۔ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں استعارات استعمال کر رہا ہوں۔ اقوام کی تاریخِ حیات بتلاتی ہے کہ جب کسی قوم کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے اور اس قوم کے شعراء، فلاسفہ، اولیاء، مدبرین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور مبلغین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آ جاتی ہے، جس کا مقصد واحد یہ ہوتا ہے کہ منطق کی سحر آفرین قوتوں سے اس قوم کی زندگی کے ہر اس پہلو کی تعریف و تحسین کرے جو نہایت ذلیل و قبیح ہوتا ہے۔ یہ مبلغین غیر شعوری طور پر مایوسی کو امید کے

درخشاں لباس میں چھپا دیتے ہیں، کردار کے روایتی اقتدار کی بیخ کنی کرتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت کو مٹا دیتے ہیں جوان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی قوتِ ارادی پر ذرا غور کرو جنھیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اسی قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن اس میں نہ وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لیے ہندوستان میں پیدا کیے ہیں۔ روس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور بابیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لیے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بناء پر کیا یا وسعتِ نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لیے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اسلام کی اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، مجھے یقینِ کامل ہے کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لیے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک وصاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان کے حالات ایک نیا رُخ اختیار کر چکے ہیں۔ جمہوریت کی نئی روح جو ہندوستان میں پھیل رہی ہے، وہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی۔ انھیں یقین ہو جائے گا کہ ان کی دینیاتی ایجادات بالکل بے سود ہیں۔

اسلام قرونِ وسطیٰ کے اس تصوف کی تجدید کو بھی روا نہ رکھے گا، جس نے اپنے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مبہم تفکر کی طرف ان کا رُخ موڑ دیا۔ اس تصوف نے گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے اور سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ جدید اسلام اس تجربہ کو دُہرا نہیں سکتا اور نہ وہ پنجاب کے اس تجربے کے اعادے کو روا رکھ سکتا ہے، جس نے مسلمانوں کو نصف صدی تک ایسے دینیاتی مسائل میں الجھائے رکھا جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی یا پیغمبر اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔

اب میں پنڈت جواہر لال کے سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ پنڈت جی کے

مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام یا انیسویں صدی کے اسلام کی مذہبی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ انھوں نے شاید میری تحریرات کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے جن میں ان کے سوالات پر بحث کی گئی ہے۔ میرے لیے یہاں ان تمام خیالات کا اعادہ کرنا ممکن نہیں جن کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ انیسویں صدی کے مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کو پیش کرنا بھی یہاں ممکن نہیں، جس کے بغیر دنیائے اسلام کی موجودہ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہے۔ ترکی اور جدید اسلام کے متعلق سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں اس لٹریچر کے بیشتر حصہ کا مطالعہ کر چکا ہوں اور غالباً پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کا مطالعہ کر چکے ہوں گے۔ بہر حال میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان میں سے ایک مصنف نے بھی ان نتائج یا ان اسباب کی اصل ماہیت کو نہیں سمجھا جو ان نتائج کا باعث ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے تفکر کے خصوصی رجحانات کو جو انیسویں صدی کے ایشیا میں پائے جاتے ہیں، اجمالی طور پر بیان کر دینا ضروری ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ 1799ء میں اسلام کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ بہر حال اسلام کی اندرونی قوت کا اس واقعہ سے بڑھ کر کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ اس نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ دنیا میں اس کا کیا موقف ہے؟ انیسویں صدی میں سر سیّد احمد خان ہندوستان میں، سیّد جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ یہ حضرات غالباً محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے تھے، جن کی ولادت 1700ء میں بمقام نجد ہوئی تھی۔ اور جو اس نام نہاد وہابی تحریک کے بانی تھے جس کو صحیح طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سر سیّد احمد خان کا اثر بحیثیت مجموعی ہندوستان ہی تک محدود رہا۔ غالباً یہ عصرِ جدید کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی علوم اس دور کی خصوصیت ہے۔ انھوں نے نیز روس میں مفتی عالم جان نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سر سیّد احمد خان کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلافات کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے عصرِ جدید کے خلاف ردِ عمل کیا۔

مسلمانانِ ہند کی انتہائی قدامت پرستی جو زندگی کے حقائق سے دور ہو گئی تھی، سر سیّد احمد

خاں کے مذہبی نقطہ نظر کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکی۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جو ابھی تہذیب کی ابتدائی منزل میں ہے اور جہاں دیگر اقطاعِ ہند کے مقابلہ میں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے، سر سیّد کی تحریک کے خلاف احمدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں سامی اور آریائی تصوف کی عجیب و غریب آمیزش تھی اور اس میں کسی فرد کا روحانی احیاء قدیم اسلامی تصوف کے اصولوں کے مطابق نہیں ہوسکتا تھا بلکہ مسیحِ موعود کی آمد کو پیش کر کے عوام کی کیفیت کو تشفی انتظار دی جاتی تھی۔ اس مسیحِ موعود کا فرض یہ نہیں تھا کہ فرد کو موجودہ پستی سے نجات دلائے بلکہ اس کا کام یہ تعلیم دینا ہے کہ لوگ اپنی روح کو غلامانہ طور پر پستی اور انحطاط کے سپرد کر دیں۔ اس ردعمل ہی کے اندر ایک نازک تضاد مضمر ہے۔ یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوتِ ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

مولانا سیّد جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علما جیسے مفتی محمد عبدہ، اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد بن گئے، جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ انہی کے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقہ سے ان تمام لوگوں کو جنھیں ان کا قرب حاصل ہوا، چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انھوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلام میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انھوں نے کی تھی۔ ان کی روح اب بھی دنیائے اسلام میں سرگرم عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی؟

بہر حال اب یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی غایت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے دنیائے اسلام میں تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت کو مرتکز کر دیا۔

1-ملائیت

علما ہمیشہ اسلام کے لیے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کے لیے حوصلہ افروز تھی، درحقیقت ایک بغاوت تھی علما کے اس جمود کے خلاف، پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

2- تصوف

مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا، جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اسی نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی اس روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کے بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

3- ملوکیت

مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ اپنے ملک کو بیچنے میں پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ سیّد جمال الدین افغانی کا مقصدِ خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

مسلمانوں کے فکر و تاثر کی دنیا میں ان مصلحین نے جو انقلاب پیدا کیا ہے، اس کا تفصیلی بیان یہاں ممکن نہیں۔ بہر حال ایک چیز بہت واضح ہے۔ ان مصلحین نے زاغلول پاشا،

مصطفیٰ کمال اور رضا شاہ ایسی ہستیوں کی آمد کے لیے راستہ تیار کر دیا۔ ان مصلحین نے تعبیر وتفسیر، توجیہ وتوضیح کی، لیکن جو افراد ان کے بعد آئے اگر چہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے تاہم اپنے صحیح رجحانات پر اعتماد کر کے جرأت کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے اور زندگی کی نئی ضروریات کا جو تقاضا تھا اس کو جبر وقوت سے پورا کیا۔ ایسے لوگوں سے غلطیاں بھی ہوا کرتی ہیں لیکن تاریخِ اقوام بتلاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہیں۔ ان کے اندر منطق نہیں بلکہ زندگی ہیجان برپا کر دیتی ہے اور اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ سر سیّد احمد خان، سیّد جمال الدین افغانی اور ان کے سینکڑوں شاگرد جو اسلامی ممالک میں تھے، مغرب زدہ مسلمان نہیں تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے قدیم مکتب کے ملاؤں کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا اور اس عقلی وروحانی فضا میں سانس لیا تھا، جس کو وہ ازسرِنو تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ جدید خیالات کا اثر ضرور پڑا ہے لیکن جس تاریخ کا اجمالی طور پر اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں جو انقلاب ظہور پذیر ہوا اور جو جلد یا بدیر دوسرے اسلامی ممالک (میں) بھی ظہور پذیر ہونے والا ہے، بالکل اندرونی قوتوں کا آفریدہ تھا۔ جدید دنیائے اسلام کو جو شخص سطحی نظر سے دیکھتا ہے، وہی شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ دنیائے اسلام کا موجودہ انقلاب محض بیرونی قوتوں کا رہینِ منت ہے۔

کیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک خاص کر ترکی نے اسلام کو ترک کر دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ یہ سوال کہ آیا کوئی شخص یا جماعت اسلام سے خارج ہو گئی، مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ایک خالص فقہی سوال ہے اور اس کا فیصلہ اسلام کی ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے کرنا پڑے گا۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتا ہے یعنی توحید اور ختم نبوت، تو اس کو ایک راسخ العقیدہ ملا بھی اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں کر سکتا۔ خواہ فقہ اور آیاتِ قرآنی کی تاویلات میں وہ کتنی ہی غلطیاں کرے۔ غالباً پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں وہ مفروضہ یا حقیقی اصلاحات ہیں، جو اتاترک نے رائج کی ہیں۔ اب ہم تھوڑی دیر کے لیے ان کا جائزہ لیں گے۔ کیا ترکی میں ایک عام مادی نقطہ نظر کا نشوونما اسلام کے منافی ہے؟ مسلمانوں میں ترکِ دنیا کا بہت رواج رہ چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اب وقت آ گیا ہے کہ وہ

حقائق کی طرف متوجہ ہوں۔ مادیت، مذہب کے خلاف ایک بڑا حربہ ہے لیکن ملا اور صوفی کے پیشوں کے استیصال کے لیے ایک موثر حربہ ہے جو عمداً لوگوں کو اس غرض سے گرفتارِ حیرت کر دیتے ہیں کہ ان کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھائیں۔ اسلام کی روح مادہ کے قرب سے نہیں ڈرتی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمہارا دین میں جو حصہ ہے اس کو نہ بھولو، ایک غیر مسلم کے لیے اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں دنیائے اسلام کی جو تاریخ رہی ہے، اس کے لحاظ سے مادی نقطہ نظر کی ترقی مستحق ذات کی ایک صورت ہے۔ کیا لباس کی تبدیلی یا لاطینی رسم الخط کا رواج اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب کے کوئی وطن نہیں اور بحیثیت ایک معاشرت کے اس کی نہ کوئی مخصوص زبان ہے اور نہ کوئی مخصوص لباس، قرآن کا ترکی زبان میں پڑھا جانا تاریخ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی چند مثالیں موجود ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس کو فکر و نظر کی ایک سنگین غلطی سمجھتا ہوں کیونکہ عربی زبان و ادب کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے، تو وہ عربی ہے۔ بہر حال اب یہ اطلاعیں آ رہی ہیں کہ ترکوں نے ملکی زبان میں قرآن پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ تو کیا کثرتِ ازدواج کی ممانعت یا علما پر لائسنس حاصل کرنے کی قید منافی اسلام ہے؟ فقہ اسلام کی رُو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر مجاز ہے کہ شرعی اجازتوں کو منسوخ کر دے (13) بشرطیکہ اس کو یقین ہو جائے کہ یہ اجازتیں معاشرتی فساد پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔ رہا علما کا لائسنس حاصل کرنا، آج مجھے اختیار ہوتا تو یقیناً میں اسے اسلامی ہند میں نافذ کر دیتا۔ ایک اوسط مسلمان کی سادہ لوحی زیادہ تر افسانہ تراش ملا کی ایجادات کا نتیجہ ہے۔ قوم کی مذہبی زندگی سے ملاؤں کو الگ کر کے اتاترک نے وہ کام کیا جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا۔ رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث مشکوٰۃ میں درج ہے جس کی رُو سے وعظ کرنے کا حق صرف اسلامی ریاست کے امیر یا اس کے مقرر کردہ شخص یا اشخاص کو حاصل ہے۔ خبر نہیں اتاترک اس حدیث سے واقف ہیں یا نہیں؟ تاہم یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ اس کے اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم ترین معاملہ میں اس کے میدانِ عمل کو کس طرح منور کر دیا ہے۔ سوئز قانون (14) اور اس کے قواعدِ وراثت کو اختیار کر لینا ضرور ایک سنگین غلطی ہے، جو جوشِ اصلاح کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے اور ایک ایسی قوم میں جو سرعت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے، ایک حد تک قابلِ معافی ہے۔ پیشوایانِ مذہب کے پنجۂ استبداد

سے نجات حاصل کرنے کی مسرت ایک قوم کو بعض اوقات ایسی راہِ عمل کی طرف کھینچ لے جاتی ہے، جس کا اس قوم کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ ترکی اور نیز تمام دنیائے اسلام کو اسلامی قانونِ وراثت کے ان معاشی پہلوؤں کو ابھی منکشف کرنا ہے جن کو وان کریمر (15)، فقہ اسلام کی بے حد اچھی شاخ، سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا تنسیخِ خلافت یا مذہب وسلطنت کی علیحدگی منافیِ اسلام ہے؟ اسلام اپنی روح کے لحاظ سے شہنشاہیت نہیں ہے۔ اس خلافت کی تنسیخ جو بنو امیہ کے زمانے سے عملاً ایک سلطنت بن گئی تھی، اسلام کی رُوح اتاترک کے ذریعہ کارفرما رہی ہے۔ مسئلہ خلافت میں ترکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں ابن خلدون کی راہنمائی حاصل کرنا پڑے گی، جو اسلام کا ایک جلیل القدر فلسفی، مورخ اور تاریخِ جدید کا ابوالآبا گزرا ہے۔ میں اپنی کتاب ''اسلامی تفکر کی تشکیل جدید'' کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ابن خلدون اپنے مشہور ''مقدمۂ تاریخ'' میں عالمگیر اسلامی خلافت سے متعلق تین متمائز نقاطِ نظر پیش کرتا ہے۔ (1) عالمگیر خلافت ایک مذہبی ادارہ ہے، اسی لیے اس کا قیام ناگزیر ہے۔ (2) اس کا تعلق محض اقتضائے وقت سے ہے۔ (3) ایسے ادارے کی ضرورت ہی نہیں۔ آخرالذکر خیال کو خارجیوں نے اختیار کیا تھا جو اسلام کے ابتدائی جمہورین تھے۔ ترکی پہلے خیال کے مقابلہ میں دوسرے خیال کی طرف مائل ہے، یعنی معتزلہ کے اس خیال کی طرف کہ عالمگیر خلافت محض اقتضائے وقت سے تعلق رکھتی ہے۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہم کو اپنے سیاسی تفکر میں اپنے ماضی کے سیاسی تجربے سے مدد لینی چاہیے جو بلاشک وشبہ اس واقعہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ عالمگیر خلافت کا تفکر و تخیل عملی صورت اختیار کرنے سے قاصر رہا۔ یہ تخیل اس وقت قابلِ عمل تھا جب کہ اسلامی ریاست برقرار تھی۔ اس ریاست کے انتشار کے بعد کئی آزاد سلطنتیں وجود میں آ گئی ہیں۔ اب یہ تخیل بے اثر ہو گیا ہے اور اسلام کی تنظیمِ جدید میں ایک زندگی بخش عنصر کی حیثیت سے کارگر نہیں ہوسکتا۔

مذہب وسلطنت کی علیحدگی کا تصور بھی اسلام کے لیے غیر مانوس نہیں ہے۔ امام کی ''غیبتِ کبریٰ'' (16) کا نظریہ ایک مفہوم میں ایک عرصہ پہلے شیعی ایران میں اس علیحدگی کو رُوبہ عمل لا چکا ہے۔ ریاست کے مذہبی و سیاسی وظائف کی تقسیم کے اسلامی تصور کو کلیسا اور سلطنت کے مغربی تصور سے مخلوط نہ کرنا چاہیے۔ اوّل الذکر تو محض وظائف کی ایک قسم ہے جیسا کہ اسلامی

ریاست میں شیخ الاسلام اور وزراء کے عہدوں کے تدریجی قیام سے واضح ہو جاتا ہے لیکن آخر الذکر رُوح اور مادہ کی مابعد الطبعی ثنویت پر مبنی ہے۔ مسیحیت کا آغاز ایک نظامِ رُہبانیت سے ہوتا ہے جسے دنیوی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسلام ابتداء ہی سے ایک نظامِ معاشری رہا ہے، جس کے قوانین بالطبع معاشری ہیں۔ اگرچہ ان کا ماخذ الہامی ہے۔ مابعد الطبعی ثنویت نے جس پر مذہب وسلطنت کی علیحدگی کا مغربی تصور مبنی ہے، مغربی اقوام میں تلخ ثمرات پیدا کیے۔ کئی سال ہوئے امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا عنوان تھا، ''اگر مسیح شکاگو آئیں'' (17) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف کہتا ہے:

''مسٹر سٹیڈ'' (18) کی کتاب سے ہمیں جو سبق حاصل کرنا ہے، یہ ہے کہ اس وقت نوعِ انسان جن برائیوں میں مبتلا ہے، وہ ایسی برائیاں ہیں جن کا ازالہ صرف مذہبی تاثرات ہی کر سکتے ہیں۔ ان برائیوں کا ازالہ ایک بڑی حد تک ریاست کے سپرد کر دیا گیا تھا لیکن خود ریاست فساد انگیز سیاسی مشینوں میں دب گئی ہے۔ یہ مشین ان برائیوں کا ازالہ کرنے کے لیے نہ صرف تیار نہیں بلکہ وہ اس قابل نہیں ہے۔ پس کروڑہا انسانوں کو تباہی اور خود ریاست کو انحطاط سے بچانے کے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ شہریوں میں اپنے اجتماعی فرائض کا مذہبی احساس پیدا کیا جائے۔

مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب وسلطنت کی علیحدگی محض وظائف کی علیحدگی ہے، نہ کہ عقائد کی۔ اسلامی ممالک میں مذہب وسلطنت کی علیحدگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کی قانون سازی عوام کے ضمیر سے بے تعلق ہو جائے، جو صدیوں سے اسلامی روحانیت کے تحت پرورش ونمو پاتا رہا ہے۔ تجربہ خود بتلا دے گا کہ یہ تخیل جدید ترکی میں کس طرح عملی صورت اختیار کرتا ہے۔ ہم صرف یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ ان برائیوں کا باعث نہ ہوگا جو یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوگئی ہیں۔

متذکرۃ الصدر اصلاحات پر میں نے جو اجمالی بحث کی ہے، اس میں میرا رُوئے سخن پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھا۔ پنڈت نہرو نے جس اصلاح کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کر لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا نصب العین اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ترکوں اور ایرانیوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ تاریخ کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے

زمانے میں ہوا جب کہ وحدتِ انسانی کے قدیم اصول جیسے خونی رشتہ اور ملوکیت نا کام ثابت ہو رہے تھے۔ پس اسلام نے وحدتِ انسانی کا اصول گوشت اور پوست میں نہیں بلکہ رُوحِ انسانی میں دریافت کیا۔ نوعِ انسان کو اسلام کا اجتماعی پیغام یہ ہے کہ ''نسل کے قیود سے آزاد ہو جاؤ یا باہمی لڑائیوں سے ہلاک ہو جاؤ۔'' یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلام فطرت کی نسل سازی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعہ ایسا نقطہ نظر پیدا کر دیتا ہے جو فطرت کی نسل ساز قوتوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ انسانی برادری قائم کرنے کے سلسلہ میں اسلام نے جو اہم ترین کارنامے ایک ہزار سال میں انجام دیے، وہ مسیحیت اور بدھ مت نے دو ہزار سال میں بھی انجام نہیں دیے۔ یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مسلمان نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود مراکش پہنچ کر اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام نسل کا سرے سے مخالف ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشری اصلاح کو زیادہ تر اس امر پر مبنی رکھا کہ بتدریج نسلی عصبیت کو مٹایا جائے اور ایسا راستہ اختیار کیا جائے جہاں تصادم کا کم سے کم امکان ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے: ''ہم نے تم کو قبائل میں اس لیے پیدا کیا کہ تم پہچانے جا سکو لیکن تم میں سے وہی شخص خدا کی نظر میں بہترین ہے جس کی زندگی پاک ہے''۔ (19) اگر اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ مسئلہ نسل کس قدر زبردست ہے اور نوعِ انسان سے نسلی امتیازات مٹانے کے لیے کس قدر وقت درکار ہے؟ تو مسئلہ نسل کے متعلق صرف اسلام ہی کا نقطہ نظر (یعنی خود ایک نسل ساز عنصر بنے بغیر نسلی امتیازات پر فتح پانا) معقول اور قابلِ عمل نظر آئے گا۔ سر آرتھر کیتھ (20) کی چھوٹی سی کتاب ''مسئلہ نسل'' میں ایک دلچسپ عبارت ہے جس کا اقتباس یہاں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

''اب انسان میں اس قسم کا شعور پیدا ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی نسل سازی جدید معاشی دنیا کی ضروریات کے منافی ہے اور وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا نسل سازی کو ختم کر کے جس پر فطرت اب تک عمل پیرا تھی، دائمی امن حاصل کیا جائے یا فطرت کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی قدیم راہِ عمل اختیار کرے، جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے؟ انسان کو کوئی ایک راہِ عمل اختیار کرنا پڑے گی، کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں۔''

لہٰذا اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر اتاترک اتحادِ تورانیت سے متاثر ہے تو وہ روحِ

اسلام کے خلاف اس قدر نہیں جا رہا جس قدر کہ روحِ عصر کے خلاف۔ اگر وہ نسلوں کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے تو اس کو عصر جدید کی رُوح شکست دے دے گی کیونکہ عصرِ جدید کی رُوحِ بالکل رُوحِ اسلام کے مطابق ہے۔ بہرحال ذاتی طور پر میں خیال کرتا ہوں کہ اتاترک اتحادِ تورانیت سے متاثر نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس کا اتحادِ تورانیت ایک سیاسی جواب ہے اتحادِ سلاف یا اتحاد المانویت یا اتحادِ اینگلوسیکن کا۔

اگر مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو قومی نصب العین سے متعلق اسلام کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔ اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموسِ وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں قومیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے اور یہاں کی اقلیتیں جیسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی اسلامی قانون کی رُو سے یا تو اہل کتاب ہیں یا اہل کتاب سے مشابہ ہیں، جن سے معاشی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے بالکل جائز ہے۔ قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہو کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں (وہاں)...... مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خودمختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی۔ دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔

سطورِ بالا میں دنیائے اسلام کی صحیح صورتِ حال کو اجمالی طور پر پیش کر دیا گیا ہے، اگر اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ وحدتِ اسلامی کے بنیادی اصولوں کو کوئی بیرونی یا اندرونی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ وحدتِ اسلامی، جیسا کہ میں نے پہلے توضیح کی ہے، مشتمل ہے اسلام کے دو بنیادی عقائد پر جن میں پانچ مشہور ارکانِ شریعت کا اضافہ کر لینا

چاہیے۔ وحدتِ اسلامی کے یہ اساسی عناصر ہیں جو رسولِ کریم ﷺ کے زمانے سے اب تک قائم ہیں۔ گو حال میں بہائیوں نے ایران اور قادیانیوں نے ہندوستان میں ان عناصر میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وحدت دنیائے اسلام میں یکساں روحانی فضا پیدا کرنے کی ضامن ہے، یہی وحدت اسلامی ریاستوں میں سیاسی اتحاد قائم کرنے میں سہولت پیدا کرتی ہے، خواہ یہ اتحاد عالمگیر ریاست (مثالی) کی صورت اختیار کرے یا اسلامی ریاستوں کی جمعیت کی ایک صورت یا متعدد آزاد ریاستوں کی صورت جن کے معاہدات اور میثاقات خالص معاشی و سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوں گے۔ اس طرح اس سیدھے سادھے مذہب کی تعقلی ہیئت ترکیبی رفتارِ زمانہ سے ایک تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلق کی گہرائی قرآن کی چند آیتوں کی روشنی میں سمجھ میں آ سکتی ہے، جن کی تشریح پیشِ نظر مقصد سے ہٹے بغیر یہاں ممکن نہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے وحدتِ اسلامی صرف اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب کہ اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب کہ مسلمان بنیادی عقائد یا ارکانِ شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔ اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس وقت اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ وہ سیاسی وحدت کی ایک صورت سے کسی دوسری صورت کی طرف جو ابھی متعین نہیں ہوئی ہے، اقدام کر رہا ہے۔ دنیائے جدید میں حالات اس سرعت کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ مستقبل کے متعلق پیشین گوئی تقریباً ناممکن ہے۔ اگر دنیائے اسلام سیاسی وحدت حاصل کرے (اگر ایسا ممکن ہو) تو غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف تاریخ ہی دے سکتی ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جغرافیائی حیثیت سے یورپ اور ایشیا کے درمیان واقع ہونے کے لحاظ سے اور زندگی کے مشرقی و مغربی نصب العین کے ایک امتزاج کی حیثیت سے اسلام کو مشرق و مغرب کے مابین ایک طرح کا نقطہ اتصال بننا چاہیے لیکن اگر یورپ کی نادانیاں اسلام کو ناقابلِ مفاہمت بنا دیں تو کیا ہوگا؟ یورپ کے روزمرہ کے حالات جو صورت اختیار کر رہے ہیں، ان کا اقتضا یہ ہے کہ یورپ اپنے طرزِ عمل کو کلیتہً بدل دے جو اس نے اسلام کے متعلق اختیار کیا ہے۔ ہم صرف یہ توقع کر سکتے ہیں کہ سیاسی

بصیرت پر معاشی لوٹ اور شہنشاہی ہوس کا پردہ نہیں پڑے گا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے۔

ہز ہائینس آغا خاں کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خاں پر کیوں حملے کیے؟ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زُمرے میں شامل ہیں۔ وہ اس بات سے بداہتہً بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسلِ امامت کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک امام حاملِ وحی نہیں ہوتا ہے، وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ہز ہائینس آغا خاں نے اپنے پیروؤں کو حسبِ ذیل الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔ (دیکھو اسٹار، الہ آباد، 12 مارچ 1934ء)

''گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں، قرآن اللہ کی کتاب ہے، کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو، مسلمانوں سے السلام علیکم کہہ کر ملو، اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو، مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو، پابندی سے روزے رکھو۔ اسلامی قانونِ نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو۔ تمام مسلمانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو۔''

اب پنڈت جواہر لال نہرو کو اس امر کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ آیا آغا خاں اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں (مرتب) یا نہیں؟ (21)

حواشی

(اس باب کے تمام حواشی محترم نعیم آسی مرحوم کے قلم سے ہیں)

o حضرت علامہؒ کے بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' کا شائع ہونا تھا کہ ایوانِ قادیانیت میں ایک زلزلہ برپا ہو گیا، گویا کسی نے بم پھینک دیا ہو۔ وہ سب لوگ جو اپنے مفاد کی خاطر قادیانیوں سے ہمدردی رکھتے تھے، لنگر لنگوٹ کس کر حضرت علامہؒ کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے باوجود نہایت ناگوار لب و لہجہ میں 'ماڈرن ریویو،

کلکتہ میں تین مضمون گھسیٹ ڈالے، ان کا مفاد کیا تھا؟ اور تب قادیانی جماعت نے لاہور ریلوے سٹیشن پر ان کا پُرجوش، استقبال کیوں کیا؟ یہ بات اپنی جگہ ہے مگر حضرت علامہؒ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پنڈت جی کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیتے۔ انھوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود مندرجہ بالا طویل بیان جاری کیا، جو (تخمیناً) 19 جنوری 1936ء کو طبع ہوا، حالانکہ انھیں آرام کی ضرورت تھی اور اطباء نے دماغی محنت سے احتراز کی ہدایت کر رکھی تھی، (مکتوباتِ اقبال، ص 313-14 مرتبہ سیّد نذیر نیازی) علامہ مرحوم کو اس بیان اور اس کی اشاعت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ احباب کو خط لکھ لکھ کر دریافت فرماتے رہے کہ ان تک پہنچا یا نہیں؟ (ایضاً ص 317) یورپ تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے اپنے اس مضمون کا ایک الگ ایڈیشن شائع کیا۔ (ایضاً)

1- Durant۔ 2- Story of Philosophy۔

3- Spinoza۔ 4- Amsterdam۔

5- Gibbon۔

oo اے ہندیوں کی بت پرستی پہ طعن کرنے والے، تو ان سے پرستش کا طریقہ سیکھ۔

6- قرونِ وسطیٰ میں Inquisition کے نام سے ایک محکمہ قائم ہوا تھا، جو لوگوں کے عقائدِ مذہبی کی تحقیق و تفتیش کرتا تھا۔ برونو وغیرہ ایسے علمائے سائنس کو اس محکمہ نے نذرِ آتش کیا۔ (حرفِ اقبال)

7- وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ (الحجرات:12)

8- Cardinal Newman۔ 9- Hurgroung۔

10- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کا صفحہ نمبر 467۔

11- جنگِ نوارینو، 1799ء میں نہیں، 1827ء میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ حضرت علامہؒ نے سیّد نذیر نیازی کے نام اپنے ایک خط میں اس کی تصحیح بھی فرما دی تھی اور سیّد صاحب موصوف کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان کے مضمون Islam and Ahmadism کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے اس غلطی کو درست کر دیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مکتوباتِ اقبال ص 322۔

12- اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (النساء:59)

13- یہاں حضرت علامہؒ کو سہو ہو گیا ہے۔ اجازت تنسیخ کی نہیں، التواء کی ہے۔ اس کا اندازہ سیّد سلیمان ندویؒ کے نام ان کے ایک خط سے بھی ہوتا ہے، جس میں حضرت علامہؒ سیّد موصوف کو ان کے ایک خط کی عبارت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ایک خط میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو منسوخ کر دے عارضی طور پر یا مستقل طور پر، بلکہ بعض فرائض کو بھی منسوخ کر سکتا ہے۔ اس وقت آپ

کا خط میرے سامنے نہیں ہے۔ حافظے سے لکھ رہا ہوں، کیا یہ بات صحیح ہے؟...... اسی خط کے حاشیہ میں سیّد سلیمان ندویؒ کے یہ الفاظ درج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے حافظہ نے غلطی کی ہے۔ ملتوی کی جگہ منسوخ لکھ گئے ہیں، ملاحظہ ہو "مکاتیب اقبال" ج 1 ص 182 مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ایم۔ اے۔

-14 مراد ہے سوئٹزرلینڈ کا ضابطۂ قانون۔ -15 Von Kremer۔

-16 یہ اشارہ ہے اس عقیدے کی طرف کہ امام مہدی امام آخرالزماں ہیں۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت ہوئی کہ وہ سامرا کے ایک غار میں رُوپوش ہو گئے۔ وہ زندہ ہیں گو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ مکتوباتِ اقبالؒ ص 317 مرتبہ سیّد نذیر نیازی۔

-17 If Christ Came to Chicago -18 Mr Stead

-19 يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّ اُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ط اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ ط (الحجرات:13)

-20 Sir Arther Keith۔

-21 "حرفِ اقبالؒ" ص 129 تا 161 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے۔

علامہ محمد اقبالؒ

قادیانی اور جمہور مسلمان ○

قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے نہایت اہم سوال پیدا کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حال ہی میں اس کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ انگریز قوم کو ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ اس مسئلہ کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کروں۔ لیکن افسوس کہ صحت نے ساتھ نہ دیا۔ البتہ ایک ایسے معاملہ کے متعلق جو تمام ہندی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی سے وابستہ ہے، میں نہایت مسرت سے کچھ عرض کروں گا۔ لیکن میں آغاز ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں قادیانی تحریک کے بانی (1) کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لیے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔

ہندوستان کی سرزمین پر بے شمار مذاہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے کیونکہ ان مذاہب کی بناء کچھ حد تک مذہبی ہے اور ایک حد تک نسلی۔ اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پر رکھتا ہے اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے اس لیے وہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان اُن تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں غالباً ختم نبوت کا تخیل سب سے انوکھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے موبدانہ تمدن کی تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ موبدانہ تمدن میں زرتشتی،

یہودی، نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔ ان تمام مذاہب میں نبوت کے اجزاء کا تخیل نہایت لازم تھا، چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی کیفیت رہتی تھی۔ غالباً یہ حالتِ انتظار نفسیاتی حظ کا باعث تھی۔

عہدِ جدید کا انسان روحانی طور پر موبد سے بہت زیادہ آزاد منش ہے۔ موبدانہ رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پرانی جماعتیں ختم ہوتیں اور ان کی جگہ مذہبی عیار نئی جماعتیں لا کھڑی کرتے۔ اسلام کی جدید دنیا میں جاہل اور جوشیلے مُلّا نے پریس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قبل اسلامی نظریات کو بیسویں صدی میں رائج کرنا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام، جو تمام جماعتوں کو ایک رسی میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے، ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لیے مزید افتراق کا باعث بنے۔

اس سے قبل اسلامی موبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے، میرے نزدیک ان میں بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے۔ (2) لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں، اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ، یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ روحِ مسیح کا تسلسل یہودی باطنیت کا جزو ہے۔ یولی مسیح بال شیم (Beal Shem) کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بوبر (Buber) کہتا ہے کہ مسیح کی رُوح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے واسطے سے زمین پر اُتری، اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے ماتحت مُلحدانہ تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے بروز، حلول اور ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کے اس تصور کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلم قلوب کو ناگوار نہ گزریں، حتیٰ کہ مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں، بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اسی موبدانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔ اس حیرت انگیز واقعہ کو پروفیسر ونسنک (Wensinck) نے اپنی کتاب موسومہ ''احادیث میں ربط'' میں نمایاں کیا ہے۔ یہ کتاب احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین اوّلین تاریخی شواہد پر حاوی ہے اور یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلاف نے اس اصطلاح

کو کیوں استعمال نہیں کیا؟ یہ اصطلاح انھیں غالباً اس لیے ناگوار تھی کہ اس سے تاریخی عمل کا غلط نظریہ قائم ہوتا تھا۔ خاکی ذہن وقت کو مدور حرکت تصور کرتا تھا۔ صحیح تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی سعادت عظیم مسلمان مفکر اور مورخ یعنی ابن خلدون کے حصہ میں تھی۔

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدتِ احساس کا ثبوت دیا ہے، وہ جدید اجتماعیات کے طالب علم پر واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے دن 'سول اینڈ ملٹری گزٹ، میں ایک صاحب نے ''مُلا زدہ'' کا خطاب دیا تھا، اس تحریک کے مقابلہ میں حفظِ نفس کا ثبوت دے رہا ہے، اگرچہ اسے ختم نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے انھیں حفظِ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔ بعض ایسے ہی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے۔ اگر سر ہربرٹ ایمرسن (3) مسلمانوں کو رواداری کا مشورہ دیں تو میں انھیں معذور سمجھتا ہوں کیونکہ موجودہ زمانے کے فرنگی کے لیے جس نے بالکل مختلف تمدن میں پرورش پائی ہو، اس کے لیے اتنی گہری نظر پیدا کرنی دشوار ہے کہ وہ ایک مختلف تمدن رکھنے والی جماعت کے اہم مسائل کو سمجھ سکے۔

ہندوستان میں حالات بہت غیر معمولی ہیں۔ اس ملک کی بے شمار مذہبی جماعتوں کی بقاء اپنے استحکام کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ جو مغربی قوم یہاں حکمران ہے، اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت سے کام لے۔ اس پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بدقسمتی سے بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے جتنا حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت تھا۔ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبرؔ نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا، جب اس نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

میں قدامت پسند ہندوؤں کے اس مطالبہ کے لیے پوری ہمدردی رکھتا ہوں جو انھوں نے نئے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف پیش کیا ہے۔(4) یقیناً یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پہلے پیش ہونا چاہیے تھا، جو ہندوؤں کے برعکس اپنے اجتماعی نظام میں نسلی تخیل کو دخل نہیں دیتے۔

حکومت کو موجودہ صورتِ حال پر غور کرنا چاہیے اور اس معاملہ میں جو قومی وحدت کے لیے اشد اہم ہے، عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف مدافعت کرے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو **تَلَعُّبْ بِالدِّیْن** کرتے پائے، اس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ جھٹلایا جائے۔ پھر کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو، اگر چہ وہ تبلیغ اور دُشنام سے لبریز ہو۔(5)

اگر کوئی گروہ، جو اصل جماعت کے نقطہ نظر سے باغی ہے، حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوسکتی لیکن یہ توقع رکھنی بیکار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کردے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔ اس مقام پر یہ دُہرانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے بیشمار فرقوں کے مذہبی تنازعوں کا ان بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا جن مسائل پر سب فرقے متفق ہیں۔ اگر چہ وہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہوں۔

ایک اور چیز بھی حکومت کی خاص توجہ کی محتاج ہے۔ ہندوستان میں مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مذہب کے اہم عنصر کو اپنی زندگی سے علیحدہ کردیتے ہیں۔ ہندوستانی دماغ ایسی صورت میں مذہب کی جگہ کوئی اور بدل پیدا کرے گا، جس کی شکل روس کی دُہری مادیت سے ملتی جلتی ہو گی لیکن پنجابی مسلمانوں کی پریشانی کا باعث محض مذہبی سوال نہیں ہے، کچھ جھگڑے سیاسی بھی ہیں، جن کی طرف سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ یہ اگر چہ خالص سیاسی جھگڑے ہیں لیکن ان کی اہمیت بھی مذہبی سوال سے کسی طرح کم نہیں۔ جہاں مجھے حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اسے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کا

احساس ہے، وہاں میں حکومت کو احتسابِ خویش کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ جس کی بدولت مسلمان جماعت دوگروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور دیہاتی حصہ خود بہت سے گروہوں میں بٹ گیا ہے، جو ہر دم آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں؟

سر ہربرٹ ایمرسن پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں۔ اے کاش! وہ سمجھ سکتے کہ حکومت کی اس شہری دیہاتی تمیز نے، جسے وہ خودغرض سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعہ برقرار رکھتی ہے، جماعت کو ناقابل بنادیا ہے کہ وہ صحیح رہنما پیدا کرسکے۔ میرے خیال میں اس حربہ کا استعمال ہی اس غرض سے کیا گیا ہے تاکہ کوئی صحیح رہنما پیدا نہ ہوسکے۔ سر ہربرٹ ایمرسن صحیح رہنما کی عدم موجودگی کا رونا روتے ہیں اور میں اس نظام کا رونا روتا ہوں، جس نے ایسے رہنما کی پیدائش کو ناممکن بنادیا ہے۔(6)

ضمیمہ ○○

مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں اور یہ خیال کیا جارہا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ دقیق مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بہ جبر انسداد کردے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہ تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت کردی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کی موجودہ حکمران قوم اختیار کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں۔ البتہ مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے فوائد کے خلاف ہے، اگرچہ اس سے بچنے کی راہ کوئی نہیں۔ جنھیں خطرہ محسوس ہو، انھیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی۔

میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرلے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا، جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔(7)

حواشی

○ حضرت علامہ نے یہ بیان مئی 1935ء میں جاری کیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفاء کے بعد یہ بیان حضرت علامہ کی طرف سے قادیانیت کے خلاف کھلا ہوا اعلانِ جنگ تھا۔ یہی وہ بیان ہے جس

نے ایوانِ قادیانیت کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا اور قادیانی جتھّے پر پورے پنجاب میں بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ اس بیان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے تقریباً تمام قابلِ ذکر انگریزی، اردو اخبارات نے اسے شائع کیا اور اکثر و بیشتر نے اس پر آرٹیکل لکھے (مکتوباتِ اقبال،ص 313 مرتبہ سیّد نذیر نیازی) خود حضرت علامہؒ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں (یہ بیان) قریباً تمام انگریزی اخباروں میں شائع ہوا۔ ایسٹرن ٹائمز، لاہور ٹربیون، (لاہور) سٹیٹسمین (دہلی) سٹار آف انڈیا، کلکتہ، علاوہ اس کے اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔(مکتوباتِ اقبال،ص 272 مرتبہ سیّد نذیر نیازی شائع کردہ اقبال اکادمی، کراچی۔

-1 مرزا غلام احمد قادیانی (1908ء۔40-1839ء)

-2 ایسا صرف اس لیے ہے کہ شکر چڑھا زہر (Sugar Coated Pills) مسلمان آسانی کے ساتھ نگل سکیں۔ یہ بالکل وہی تکنیک ہے جو بقول حضرت علامہ، موبدانہ اثر کی بدولت ایران میں پیدا ہونے والی مُلحدانہ تحریکوں نے اختیار کی۔ انھوں نے بھی یہودیوں کے عقیدۂ تناسخ کو مشرف باسلام کرنے کے لیے اس کو بروز، حلول اور ظل وغیرہ کا نام دیا اور ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلم قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔

-3 تب گورنر پنجاب۔

-4 ہندوؤں کو بھی اپنی وحدت کی بقاء کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا۔

-5 قرائن سے معلوم ہوتا ہے اس مقام پر حضرت علامہ ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں جو اس وقت کی انگریزی حکومت نے قادیانیوں کی مخالفت کرنے پر مولانا ظفر علی خان، ان کے اخبار 'زمیندار، اور جماعتِ احرار پر عائد کر دی تھیں۔

-6 'حرفِ اقبال،ص 19-113 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

oo جب حضرت علامہؒ کا بیان 'قادیانی اور جمہور مسلمان، اخبارات میں شائع ہوا تو بعض لوگ اس سے یہ سمجھے کہ شاید حضرت علامہ نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی جماعت کو بہ جبر ختم کر دے، اس پر علامہ مرحوم نے مذکورہ وضاحت فرمائی۔

-7 'حرفِ اقبال،ص 119، مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

علامہ محمد اقبالؒ

سٹیٹسمین کے جواب میں ○

میرے بیان مطبوعہ 14 مئی پر آپ نے تنقیدی اداریہ لکھا، اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ جو سوال آپ نے اپنے مضمون میں اٹھایا ہے، وہ فی الواقعہ بہت اہم ہے اور مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اس سوال کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اسے نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے، خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں اور مجھے اس احساس میں حکومت کے سکھوں کے متعلق رویہ سے اور بھی تقویت ملی۔ سکھ 1919ء تک آئینی طور پر علیحدہ سیاسی جماعت تصور نہیں کیے جاتے تھے لیکن اس کے بعد علیحدہ جماعت تسلیم کر لیے گئے، حالانکہ انھوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں۔

اب چونکہ آپ نے یہ سوال پیدا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس مسئلہ کے متعلق، جو برطانوی اور مسلم دونوں زاویہ نگاہ سے نہایت اہم ہے، چند معروضات پیش کروں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کروں کہ حکومت جب کسی جماعت کے مذہبی اختلافات کو تسلیم کرتی ہے تو میں اسے کس حد تک گوارا کر سکتا ہوں۔ سو عرض ہے کہ:

اوّلاً اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیا پر ایمان اور رسولِ کریم ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے، جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل

ہے یا نہیں؟ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، لیکن انھیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیا کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ (1) جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسولِ کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں، یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہوتا کہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے۔ اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)۔ مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں، جتنے سکھ، ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے۔

ثالثاً اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو 56,000 (چھپن ہزار) ہے، انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ

قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہوسکتی۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا علیحدہ لحاظ رکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔

حکومت نے 1919ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا، اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کے لیے کیوں انتظار کر رہی ہے؟ (2)

حواشی

o اخبار سٹیٹسمین، (دہلی) نے اپنی 14 مئی 1935ء کی اشاعت میں حضرت علامہ کا بیان، 'قادیانی اور جمہور مسلمان' شائع کیا اور ساتھ ہی اس پر ایک تنقیدی اداریہ بھی لکھا۔ مذکورہ مضمون دراصل اسی اداریہ کا جواب ہے، جو 10 جون 1935ء کو اخبار مذکور میں طبع ہوا۔

1- قادیانی یہ استدلال کرتے ہیں کہ ہم تو حضور ﷺ کو خاتم الانبیا مانتے ہیں۔ ہم منکر، اور 'دائرہ اسلام سے خارج' کیسے ہوئے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ جب کسی نے حضور نبی کریم ﷺ کو خاتم الانبیا مان کر آپ ﷺ کے بعد کسی اور نئے نبی کی نبوت کو تسلیم کر لیا تو اس کا خاتم الانبیاء کا اقرار باطل ہو گیا۔ گویا دائرہ اسلام سے نکلنے کے لیے حضور ﷺ کا انکار ضروری نہیں۔ کسی نئے نبی کا اقرار بھی آدمی کو اسلام کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے۔

2- 'حرفِ اقبال' ص 126 تا 129 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے۔

علامہ محمد اقبالؒ

رومن حکومت کے تحت یہودی سالمیت ○

پندرہ روزہ اسلام کے نمائندہ خصوصی نے ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ سے دریافت کیا کہ کیا قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود نے حالیہ خطبہ جمعہ کے دوران ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی جسے ایک قادیانی جریدہ ''سن رائز'' نے اس طرح شائع کیا۔

''اُنہیں (ڈاکٹر محمد اقبالؒ کو) حکومت کے خلاف ایک شکایت ہے، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انگریز اتنے دانشمند بھی نہیں جتنے یسوع مسیح کے زمانے میں رومن تھے کیونکہ آخر کار رومنوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ رومنوں کی کارروائی کی منظوری دی جا رہی ہے کہ انہوں نے اپنی حاکمیت کو بالائے طاق رکھ کر یسوع مسیح کو یہودیوں کے حوالے کر دیا تھا، موخر الذکر کے جنونی شور شرابے سے متاثر ہونے کے بعد''۔

نمائندہ خصوصی نے کہا کہ میں آپ کی خصوصی توجہ متذکرہ بالا عبارت میں رومنوں کی کارروائی کی منظوری دی جا رہی ہے' کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ''کیا پیغمبر اسلام کی خاتمیت کے بارے میں آپ کا بیان کچھ عرصہ قبل انڈین اور اینگلو انڈین پریس میں شائع ہوا'' سر محمد اقبالؒ نے کہا:

❑ ''یہ غلط ترجمانی کے قادیانی فن کی ایک مثال ہے کہ مرزا محمود نے میرے بیان میں ایک جملہ پڑھ لیا جس کا وہ حوالہ نہیں دیتا اور جسے میں اس بیان میں تلاش نہ کر سکا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ہی میرے جملے کا روپ دے دیتے ہیں۔ بدیہی بات یہ ہے کہ چونکہ ان کے پاس میرے بیان کے مرکزی خیال کے خلاف کچھ کہنے کو نہ تھا، اس لیے اپنے غریب مقلدوں کو فریب میں مبتلا کرنے کے لیے یہ بات کہہ دی اور شاید حکومت کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ چونکہ میں یہ باور کرتا ہوں کہ یہودیوں کو رومن حکومت کے تحت اس سے زیادہ بہتر تحفظ حاصل

تھا جتنا کہ ہندی مسلمانوں کو انگریزوں کے تحت حاصل ہے۔ لہٰذا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں یہ تصور کرتا ہوں یہودی مذہبی فیصلے کو رومن گورنر نے منظوری عطا کی اور وہ اسے ایک نیک عمل سمجھتا تھا۔ اس سے بڑی غلط ترجمانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں رومنوں کے بارے میں کوئی اخلاقی فیصلہ صادر کروں۔ میرے بیان میں صورت حال پر خالصتاً سیاسی لحاظ سے نظر ڈالی گئی' اخلاقی نقطہ نگاہ سے نہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ رومن یہ سمجھتے تھے کہ وہ آئینی اعتبار سے یہودی دینی مجلس کے فیصلوں کو منظور کرنے کے پابند ہیں۔ ان امور میں جنہیں یہودی صحیح یا غلط اپنے معاشرے کے لیے خطرناک تصور کرتے ہوں۔ یسوع مسیح علیہ السلام کے خلاف مقدمے کی اس خصوصی مثال میں بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ رومن ریاست کو یہودیوں کے صومعے یا مذہبی مجلس کے اس شخص کے بارے میں فیصلہ کو تسلیم کرنا پڑا جو ہمارے عقیدے کے مطابق حقیقتاً رسول تھے۔ اگر یہ کسی مذہبی طالع آزما کا معاملہ ہوتا تو کوئی بھی اخلاقی طور پر رومنوں پر الزام نہ دھرتا کہ انہوں نے یہودیوں یا انکی مذہبی مجلس کے اس فیصلے کو کیوں منظوری عطا کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ ذاتی طور سے میں اس آئینی تحفظ کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کر سکتا جو رومنوں نے یہودیوں کو دے رکھا تھا، اگرچہ میں اس تحفظ کی اخلاقی قدر کے بارے میں مختلف رائے رکھتا ہوں۔ یہ عین اغلب ہے کہ کسی دن خود قادیانیوں کو اپنے باغی رسولوں کے خلاف تحفظ کی ضرورت پیش آ جائے جن کے بارے میں انھوں نے اسلام کے دینی تصورات کو عامیانہ رنگ دے رکھا ہے جس کی بنا پر وہ پھل پھول رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی وقت اتنی قوت فراہم کر سکتا ہے کہ وہ اس فرقے کی موجودہ تنظیم کے لیے خطرہ بن جائے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک فرقہ جس نے اپنی ولادت اور نشوونما کا تمام تر انحصار ایک جدید ریاست کی آزادروی پر کیا، مذہبی طالع آزماؤں کے خلاف اسلام کے تحفظ کے مطالبے پر خفا ہو۔

قادیانی منطق ایک بار پھر میرے بیان میں یہ تجویز دیکھتی ہے کہ برطانوی حکومت کو چاہیے کہ قادیانی تحریک کو بزورِ قوت کچل دے۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بات صاف طریقے سے واضح کی ہے کہ ہند میں مذہبی امور میں عدم مداخلت کی حکمت عملی ناگزیر ہے جو مذہبی فرقوں کا مسکن ہے۔ میں آزادروی کا مداح نہیں ہوں اور اسے ایسے تخیلات کا مجموعہ سمجھتا ہوں جو انسان کو وہ کچھ بنا دیتے ہیں جو اسے نہیں ہونا چاہیے، تاہم میں اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ جدید دنیا

میں ایک طاقتور قوت ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو مرزا محمود ''ناگزیر'' کا مطلب نہیں جانتے یا اسے آسانی سے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

رومنوں کو چاہیے یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کو ایک نئے فرقے کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے۔لیکن یہودی معاشرے کو تحفظ دینے کی یہ راہ اس وقت ان کے سامنے کھلی نہ تھی کیونکہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عدالت میں لایا گیا تو اس وقت عملاً ان کے کوئی مقلد نہ تھے۔تاہم ہند میں برطانیہ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ انتظامی اعتبار سے قادیانیوں کو ایک علیحدہ فرقہ تسلیم کرے۔میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ امن کی منزل کی طرف یہی راہ جاتی ہے۔نہ ہی قادیانیوں کو ایسے فرقے کا جزو رہنے پر بے قرار ہونا چاہیے جسے وہ فرقہ کفار قرار دیتے ہیں۔(1)

حواشی

○ حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا یہ بیان انجمن خدام الدین کے ترجمان پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''اسلام'' کے دوسرے شمارے (بابت 22 جون 1935ء) میں شائع ہوا۔

(1) تقریریں، تحریریں، اور بیانات از علامہ محمد اقبال مترجم اقبال احمد صدیقی صفحہ نمبر 240

توضیحات

علامہ محمد اقبالؒ

''لائٹ'' کے جواب میں (1)

''لائٹ'' نے اپنے الزام کی بنیاد میرے اس شعر پر رکھی ہے ؎

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

یہ سلیس اردو ہے، جس کا مطلب محض یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میں ہم کلامی سے آگے بھی ایک منزل ہے لیکن شعر کو وحی کے دینی معانی سے کچھ تعلق نہیں۔ اس سلسلہ میں ''لائٹ'' کی توجہ اپنی کتاب ''تشکیلِ نو'' کی طرف مبذول کراؤں گا، جہاں صفحہ 21 پر میں نے لکھا ہے کہ:

''احساس اور تخیل کے فطری رشتہ سے وحی کے متعلق اس اختلاف پر روشنی پڑتی ہے، جس نے مسلم مفکرین کو کافی پریشان کیا تھا۔ غیر واضح احساس اپنے منتہا کو تخیل کے اندر پاتا ہے اور خود تخیل لباسِ مجاز میں آنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ محض استعارہ نہیں ہے کہ تخیل اور لفظ دونوں بیک وقت بطنِ احساس سے پیدا ہوتے ہیں، اگرچہ ادراک انھیں وجود میں لا کر خود اپنے لیے یہ دشواری پیدا کرتا ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے مختلف قرار دے اور ایک معنی میں لفظ بھی الہام ہوتا ہے۔'' (2)

(2)

''مدیر (3) ''لائٹ'' نے ایک ایسی حدیث کا حوالہ دیا ہے جو تاریخی عمل کی نہایت حسابی تصویر پیش کرتی ہے۔ میں اگرچہ انسان کے روحانی امکانات اور روحانی آدمیوں کی پیدائش کا قائل ہوں، تاہم مجھے یقین نہیں کہ اس تاریخی عمل کا حساب ویسے ہی لگایا جا سکتا ہے جیسے ''لائٹ'' کا خیال ہے۔ ہم بآسانی اعتراف کر سکتے ہیں کہ تاریخی عمل کا شعور ہماری ذہنی سطح سے

بہت بلند ہے۔ میں منفی رنگ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس طرح مقرر اور حسابی نہیں ہے جیسے ''لائٹ'' نے سمجھا ہے۔ میں ابن خلدون کی رائے سے بہت حد تک متفق ہوں، جہاں وہ تاریخی عمل کو ایک آزاد تخلیقی تحریک تصور کرتا ہے، نہ کہ ایسا عمل جو پہلے سے متعین کیا جا چکا ہو۔ موجودہ دور میں برگساں نے اسی نظریہ کو زیادہ صحت اور عمدہ مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''لائٹ'' نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ غالباً جلال الدین سیوطی نے مشہور کی تھی اور اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ بخاری و مسلم میں اس حدیث کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس میں چند بزرگوں کے تاریخی عمل کے نظریہ کی جھلک ہو تو ہو، لیکن افراد کے ایسے رؤیا کوئی دلیل نہیں بن سکتے۔ تمام محدثین نے اسی اصول کی پیروی کی ہے۔''(4)

سن رائز کے جواب میں (5)

''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے، جو مسلمانوں میں کافی سر برآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ براہین احمدیہ، میں انھوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں، پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی

ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔" (6)

(2)

"اس سوال (7) کا جواب "تشکیلِ نو" کے حوالہ سے بہتر دیا جا سکے گا، جہاں صفحہ 121،120 پر میں نے لکھا ہے:

"ختم نبوت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کی انتہا بس یہ ہو کہ عقل، جذبات کی قائم مقام ہو جائے۔ یہ چیز نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ اس عقیدہ کی عقلی افادیت اتنی ہے کہ اس سے باطنی واردات کو آزاد تنقیدی رنگ ملتا ہے کیونکہ اس یقین سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی تاریخ میں فوق الفطرت سرچشمہ کا منصب ختم ہو چکا۔ یہ یقین ایک نفسیاتی قوت ہے، جو ایسے منصب کی پیدائش کو روکتا ہے اور اس خیال سے انسان کے اندرونی تجربات میں علم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے لا الٰہ، فطرت کی تمام قوتوں سے الوہیت کا لباس اتارتا ہے اور انسان کے بیرونی تجربات میں تنقیدی مشاہدہ کی رُوح پیدا کرتا ہے۔ باطنی واردات خواہ وہ کتنی غیر فطری اور غیر معمولی ہو، مسلمان کے لیے بالکل فطری تجربہ ہے جو دوسرے تجربات کی طرح تنقید کی زَد میں آتا ہے اور یہ چیز رسول کریم ﷺ کے رویہ سے اور بھی روشن ہو جاتی ہے جو انھوں نے ابن صیاد (8) کی نفسیاتی واردات کے لیے اختیار فرمایا۔ اسلام میں تصوف کا مقصد انہی باطنی واردات کو منظّم کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابن خلدون ہی ایک ایسا شخص گزرا ہے، جس نے اسے اصولی طریقے پر جانچا۔

پہلے فقرہ سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی معانی میں اولیاء یا ان جیسی صفات کے لوگ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ مرزا صاحب بھی اس زُمرہ میں شامل ہیں یا نہیں؟ جب تک عالم انسانیت کی روحانی اہلیتیں برداشت کر سکتی ہیں، ایسے لوگ تمام قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوں گے تا کہ وہ انسانی زندگی کی بہتر اقدار کا پتہ دے سکیں۔ اس کے خلاف قیاس کرنا تو انسانی تجربہ کو جھٹلانا ہوگا۔ فرق محض اس قدر ہے کہ اب ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان باطنی واردات پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ اور باتوں کے علاوہ ختم نبوت کا مطلب

یہ ہے کہ روحانی زندگی میں جس کے انکار کی سزا جہنم ہے، ذاتی سند ختم ہو چکی ہے۔'' (9)

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام (10)

''مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت کا۔ نظریۂ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالاباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولنا ہے۔ بظاہر نظریۂ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی انکارِ خاتمیت الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے، جس کی توضیح اس وقت ہو سکے گی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مورخ ہندی مسلمانوں اور بالخصوص ان کے بعض بظاہر مستعد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا۔'' (11)

دین شا کے جواب میں (12)

''مجھے اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا ہے، سوائے اس کے کہ مجھے ان کے مرکزی خیال سے پورا اتفاق ہے۔ یعنی اسلام کی ظاہری اور باطنی تاریخ میں ایرانی عنصر کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ یہ ایرانی اثر اس قدر غالب رہا ہے کہ سپنگلر Spengler نے اسلام پر موبدانہ رنگ دیکھ کر اسلام کو ہی ایک موبد مذہب سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب ''تشکیل نو'' میں کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے اس موبدانہ خول کو دُور کر دوں اور مجھے امید ہے کہ اسی سلسلے میں، میں اپنی کتاب ''قرآنی تعلیم کا مقدمہ'' میں مزید کام کر سکوں گا۔ موبدانہ تخیل اور مذہبی تجربہ مسلمانوں کی دینیات، فلسفہ، اور تصوف کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ بہت سا مواد ایسا موجود ہے جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ تصوف کے چند سکولوں نے جو اسلامی سمجھے جاتے ہیں، اس موبدانہ حالات و واردات کو ہی زندہ کیا ہے۔ میں موبد تمدن کو انسانی تمدن کے بے شمار مظاہرات میں سے ایک مظاہر سمجھتا ہوں۔ میں نے اس لفظ کو برے معنی میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے

پاس بھی حکومت کا تصور تھا، فلسفیانہ مباحث تھے، حقائق بھی تھے اور غلطیاں بھی۔ لیکن جب تمدن پر زوال آتا ہے تو اس کے فلسفیانہ مباحث، تصورات اور دینی واردات کی اشکال میں انجماد اور سکون آ جاتا ہے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو موبد تمدن پر یہی حالت طاری تھی اور تمدنی تاریخ کو جس طرح میں سمجھتا ہوں، اسلام نے اس تمدن کے خلاف احتجاج کیا۔ خود قرآن کے اندر شہادت موجود ہے کہ اسلام نہ محض ذہنی بلکہ مذہبی واردات کے لیے بھی نئی راہ پیدا کرنی چاہتا تھا لیکن ہماری مغانہ وراثت نے اسلام کی زندگی کو کچل ڈالا اور اس کی اصل رُوح اور مقاصد کو ابھرنے کا موقع نہ دیا۔'' (13)

حواشی

-1 حضرت علامہؒ کے بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' پر تنقید کرتے ہوئے ایک قادیانی ہفتگی ''لائٹ'' Light لاہور نے لکھا کہ ''اور بہت سے بڑے مفکروں کے مانند ڈاکٹر اقبال بھی الہام پر یقین نہیں رکھتے، اس اتہام کے متعلق جب ایک پریس کے نمائندہ نے حضرت علامہؒ سے سوال کیا تو آپ نے مذکورہ وضاحت فرمائی۔ (حرفِ اقبالؒ ص 120)

-2 ''حرفِ اقبالؒ '' ص 120 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

-3 جب حضرت علامہؒ سے اس حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا جس کا ''لائٹ'' نے حوالہ دیا تھا اور جس میں ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد کے آنے کی خبر دی گئی ہے تو آپ نے مندرجہ بالا جواب ارشاد فرمایا۔

-4 ''حرفِ اقبال'' ص 121 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

-5 جب حضرت علامہؒ کی توجہ ایک دوسرے قادیانی ہفت نامے ''سن رائز'' Sun Rise لاہور کے ایک خط کی طرف مبذول کرائی گئی جس میں علامہ مرحوم کی ایک 1910-11ء کی تقریر کا حوالہ دے کر ان پر ''تناقضِ خود'' (Inconsistency) کا الزام لگایا گیا تھا، تو آپ نے مذکورہ توضیح وتصریح فرمائی۔ (حرف اقبالؒ ص 122)

-6 حرفِ اقبالؒ ص 122 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

-7 سوال یہ تھا: الہام اور مصلحین کے آنے کے امکانات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

-8 حرفِ اقبالؒ میں ابن سیّد ترجمہ کیا گیا ہے، جو صحیح نہیں۔

-9 حرفِ اقبالؒ ص 123 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

-10 حضرت علامہؒ کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کے اور مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے مابین

اسلام اور وطنیت کے موضوع پر ایک غلط فہمی کے باعث زبردست بحث چھڑ گئی تھی، جس کا اختتام حضرت علامہؒ کے اس خط پر ہوا جو انھوں نے ایڈیٹر، احسان لاہور کو لکھا۔ یہ خط اس بحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس بحث کے دوران حضرت علامہؒ کا ایک طویل جوابی مضمون روزنامہ ''احسان'' لاہور میں شائع ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام، اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے۔

11- حرفِ اقبال ص 40-239 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

12- جب ایک پارسی مسٹر دین شا کے ایک خط کے متعلق جو ''سٹیٹسمین'' دہلی میں شائع ہوا، حضرت علامہؒ سے پوچھا گیا تو آپ نے مذکورہ جواب دیا۔

13- حرفِ اقبال ص 124 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

خطوط

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط

21 جون 1936ء°

ڈیئر پنڈت جواہر لال!

کل آپ کا مرسلہ خط ملا، جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں نے جب آپ کے تحریر کردہ مضامین کا جواب لکھا تو میرا گمان تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویہ کا علم نہیں۔ میرے ان جوابات کے لکھنے کی بنیادی وجہ فی الحقیقت اس بات کو ظاہر کرنا اور خاص طور سے آپ پر یہ واضح کرنا تھا کہ مسلمانوں کے اندر جذباتِ وفاداری کیسے پیدا ہوئے اور یہ کہ احمدیت نے ان کے لیے الہامی بنیاد کس طرح فراہم کی؟ ان مضامین کی اشاعت کے بعد میرے لیے یہ انکشاف انتہائی حیران کن تھا کہ خود مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی ان تاریخی وجوہات سے ناواقف ہے، جنھوں نے احمدی تعلیمات کو تشکیل کیا۔ علاوہ ازیں پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بسنے والے آپ کے ساتھی بھی آپ کے ان مضامین کے باعث بے چینی محسوس کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں آپ کی ہمدردیاں احمدیہ تحریک کے ساتھ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کے ان مضامین سے احمدی ازحد خوشی محسوس کرتے تھے (اور) احمدی پریس خاص طور پر آپ کے خلاف اس غلط فہمی کو پھیلانے کا موجب تھا۔ بہر حال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری آپ کے متعلق رائے غلط تھی۔ میں بذاتِ خود مذہبی معاملات میں نہیں الجھتا مگر احمدیوں سے خود اُنہی کے میدان میں مقابلہ کرنے کی خاطر مجھے اس بحث میں حصہ لینا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان مضامین کو لکھتے وقت ہندوستان اور اسلام کی بہتری میرے پیش نظر تھی اور میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔ (1)

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے لاہور میں آپ سے ملنے کا موقع گنوا دیا۔ (2) میں ان دنوں اتنا بیمار تھا کہ اپنے کمرہ سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ میں اپنی بیماری کے باعث تقریباً

ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔ آئندہ آپ جب لاہور آئیں تو مجھے اپنی آمد سے ضرور مطلع کریں۔ کیا آپ کو میرا شہری آزادی کے متعلق خط مل گیا ہے؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کے ملنے کی اطلاع نہیں دی، اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ وہ خط آپ تک پہنچ نہیں پایا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (3)

حواشی

(اس باب کے تمام حواشی محترم نعیم آسی مرحوم کے قلم سے ہیں)

o یہ تاریخی خط جیسا کہ اس کی تاریخ سے ظاہر ہے، 21 جون 1936ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کے نام لکھا گیا۔ اس خط میں حضرت علامہؒ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے پنڈت جی کے جواب میں لکھے گئے اپنے ایک مضمون کے مقاصدِ تحریر کو واضح کیا ہے۔ اصل خط حضرت علامہؒ نے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔

-1 حضرت علامہؒ کا اصل خط چونکہ انگریزی میں ہے اس لیے ہم اس مقام پر ان کی انگریزی عبارت بھی نقل کیے دیتے ہیں تا کہ قارئین حضرت علامہؒ کے مافی الضمیر کا صحیح صحیح اندازہ کر سکیں۔

"I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India."

(Thoughts and Reflections of Iqbal, Page 306. By Syed Abdul Vahid)

-2 حضرت علامہؒ ان دنوں سخت بیمار تھے اور اسی سبب سے پنڈت جی سے ملاقات نہ کر سکے تھے، جو ان دنوں اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ یہ وہی موقع ہے جب قادیانیوں نے لاہور ریلوے سٹیشن پر پنڈت جواہر لال نہرو کا شاندار استقبال کیا اور ''جواہر لال زندہ باد''، ''محبوبِ قوم خوش آمدید'' کے نعرے لگائے۔ (بحوالہ الفضل، قادیان مورخہ 31 مئی 1936ء)

-3 کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی جلد 4، صفحہ 328، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال از شیخ عطاءاللہ صفحہ 567 طبع دوم، (یک جلدی 2012ء)

مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے نام خطوط

(1)

لاہور

20اپریل1922ء

مخدومی السلام علیکم!

ایک عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا۔ دو باتیں دریافت طلب ہیں۔

1- متکلمین میں سے بعض نے علم مناظر و مرایا کے رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رویت ممکن ہے۔ یہ بحث کہاں ملے گی؟ میں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

2- مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے ؎

ہر کُجا ہنگامۂ عالم بود   رحمۃ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ (1) اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخِ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے، ان کے اس عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی؟ (2) میں نقرس کی وجہ سے دو ماہ کے قریب صاحبِ فراش رہا۔ اب کچھ افاقہ ہوا ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ (3)

والسلام

مخلص

محمد اقبال

حواشی

1- اس معنی کا ایک اثر بھی تفسیروں میں مروی ہے جو اثر ابن عباسؓ کے نام سے ہے۔ اس اثر کی تاویل و تشریح میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا رسالہ ''تحذیر الناس من انکار اثر ابن عباسؓ'' اور مولانا

عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا ایک مضمون ہے جو اس بحث میں دیکھنے کے قابل ہے۔(ندوی)

2- یہ وجہ نہیں۔شیخِ اشراق ایرانی فلسفہ سے متاثر تھے اور وہاں سے یہ خیال ان تک پہنچا تھا، دیکھئے شرح کلمۃ الاشراق، مقالہ خامسہ۔

3- مکاتیبِ اقبال، ج1 ص116 مرتبہ شیخ عطاءاللہ ایم۔اے۔

(2)

بھوپال شیش محل

یکم اگست 1935ء

مخدوم مکرم جناب مولانا!

السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں، ان کے جواب سے بھی ممنون فرمائیے۔(1)

1- تکملہ مجمع البحار، صفحہ 85 میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ حضور رسالت مآب ﷺ کو خاتم النبیین کہو، لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوگا۔(2)

مہربانی کرکے کتاب دیکھ کر یہ فرمائیے کہ آیا اس قول کے اسناد درج ہیں اور اگر ہیں تو آپ کے نزدیک ان اسناد کی حقیقت کیا ہے؟

ایسا ہی قول ''درمنثور'' جلد پنجم صفحہ 204 میں ہے، اس کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے۔(3) میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتب تلاش کیں، افسوس اب تک نہیں ملیں۔

2- ''حجج الکرامہ'' صفحہ 427-431 حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے۔ **مَنْ قَالَ بِسَبَبِ نُبُوَّتِہٖ کَفَرَ حَقًّا** اس قول کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے؟(4)

3- **لَوْعَاشَ اِبْرَاهِیْمُ لَکَانَ نَبِیًّا** اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ نووی اسے معتبر نہیں جانتا۔ ملا علی قاری کے نزدیک معتبر ہے۔ کیا اس کے اسناد درست ہیں؟(5)

4- بخاری کی حدیث **وَاِمَامُکُمْ مِنْکُمْ** میں واو حالیہ ہے کیا؟ (6) اگر حالیہ ہو تو اس

حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں کیونکہ جس وقت وہ آئیں گے، مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں میں سے ہوگا۔

-5 ختم نبوت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے۔ زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام

مخلص

محمد اقبال (7)

حواشی

-1 اس وقت وہ (علامہ مرحوم) ردِّ قادیانی پر اپنا مضمون تیار کر رہے تھے۔ (ندوی)

-2 جی ہاں! اس کتاب میں یہ روایت ہے، جو مصنف ابن ابی شیبہ سے لی گئی ہے لیکن اس کی سند مذکور نہیں جو روایت کی صحت وصنف کا پتہ لگایا جائے اور اگر صحیح ہو بھی تو یہ حضرت عائشہؓ کی محض رائے ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بار بار خود فرمایا ہے لا نبی بعدی میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے خیال میں اس لیے ایسا کہنے سے منع کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں۔ بہرحال یہ ان کا خیال ہے جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور ﷺ کے قول کے خلاف ہو۔ (ندوی)

-3 جی ہاں وہی روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے اور اس کی نسبت پہلے لکھ چکا ہوں۔ (ندوی)

-4 حجج الکرامہ فی آثار القیامہ، نواب صدیق حسن خاں کی کتاب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی بصفت نبوت ہوگی یا بلا صفت نبوت۔ اس باب میں علما کا اختلاف ہے۔ نواب صاحب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بصفت نبوت ہوگی۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی آمد ثانی میں ان کی صفت نبوت کا انکار کرتے ہیں، وہ مرتکب کلمہ کفر ہیں۔ بہرحال یہ رائے ہے۔ (ندوی)

-5 یہ ابن ماجہ کی روایت ہے۔ اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرضاً ہے واقعہ نہیں کیونکہ لَوْ فرض اور عدم وقوع کے لیے آتا ہے، اسی سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس لیے ابراہیم بن محمد کو بچپن ہی میں اٹھا لیا گیا۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں یہی مذکور ہے۔ چنانچہ خود ابن ماجہ میں اور بخاری میں ہے۔ **وَلَوْ قَضٰی اَنْ یَّکُوْنَ بَعْدَ مُحَمَّدٍ نَبِیٌّ لَعَاشَ اِبْنُهٗ وَلٰکِنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ** (ابن ماجہ، جنائز، بخاری، انبیا) یعنی

یہ کہ اگر فیصلہ الٰہی یہ ہوتا کہ محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کے صاحبزادہ زندہ رہتے لیکن یہ فیصلہ الٰہی ہو چکا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ ملا علی قاری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے، اس کو معتبر نہیں کہا ہے، ضعیف کہا ہے۔ اس میں ابو شیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہے، بلکہ وہ متروک الحدیث، منکر الحدیث، باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بشرطِ صحت ملا نے اس کی تاویل کی ہے۔ بہرحال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے۔ **لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیًّا لَكَانَ عُمَرُ** (مسند احمد، ترمذی) یعنی یہ کہ اگر میرے بعد نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمر بن خطاب نبی ہوتے لیکن چونکہ ممکن نہیں اس لیے نہ وہ اور نہ کوئی اور نبی ہو سکتا ہے۔ (ندوی)

6- صحیح یہی ہے کہ واو حالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ عیسائیوں پر حجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے۔ مسلمانوں کا امام الگ ہوگا، حضرت عیسیٰؑ نہ ہوں گے۔ (ندوی)

7- مکاتیب اقبالؒ ج 1 ص 191 تا 194 مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ایم۔ اے۔

(3)

بھوپال

23 اگست 1933ء°

مخدوم مکرم جناب مولانا!

السلام علیکم!

ایک عریضہ لکھ چکا ہوں، امید کہ پہنچ کر ملاحظہ عالی سے گزرا ہوگا۔ ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی جواَب عرض کرتا ہوں۔

کیا علمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو حیات ونزولِ مسیح ابن مریمؑ کے منکر ہوں؟ یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا مذہب ہے؟ (1) امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ میں 28 اگست کی شام کو رخصت ہو جاؤں گا۔ علاج کا کورس اس روز صبح ختم ہو جائے گا۔ اس خط کا جواب لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیے۔

والسلام

مخلص/محمد اقبال (2)

حواشی

o کتاب میں سنہ یونہی درج ہے۔ مگر خطوط کی سن وار ترتیب کو دیکھتے ہوئے یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، صحیح سن 35 ہے جسے کاتب نے غلطی سے 33ء کر دیا۔

1- مجھے جہاں تک علم ہے نزولِ مسیحؑ کا انکار کسی نے نہیں کیا۔ معتزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں جو حال معلوم ہو۔ (ندوی)

2- مکاتیبِ اقبالؒ ج 1 ص 196 مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ایم۔ اے۔

(4)

لاہور

7اگست1936ء

مخدومی السلام علیکم!

والا نامہ ابھی ملا ہے۔آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ وسلامت رکھے۔میری صحت کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہے۔گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ان شاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا،جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔بدورالبازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔اس کتاب میں زیادہ تر قوانینِ اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی ضرورت ہے۔(1)اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں،مہربانی کر کے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمائیے اور یہ بھی فرمائیے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی؟

الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں۔(2)مگر حال کے روشن خیال علما کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔اگر آپ کی صحت اجازت دے تو آپ بھی اس پر ایک جامع ونافع بیان شائع فرمائیے۔(3)میں بھی تیسرا بیان ان شاء اللہ جلد لکھوں گا،اس کا موضوع ہوگا ''بروز''۔لفظ بروز کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتہ دیجیے۔(4)نہایت شکرگزار ہوں گا۔(5)

والسلام

مخلص/محمد اقبال(6)

حواشی

1- افسوس حضرت علامہؒ کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کتاب عدم سے وجود میں نہ آسکی۔

2- مولانا ابوالکلام آزادؒ کے یہ بیانات تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے کہیں نہیں مل سکے ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہوں تو وہ مطلع فرمائیں۔ مرتب ان کا شکر گزار ہوگا۔

3- اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت علامہؒ کو فتنہ قادیانیت کے استیصال سے کس قدر گہری دلچسپی تھی۔

4- علامہ ندویؒ نے جواب میں لکھا، لفظ بروز کے معنی نو ظہور کے ہیں مگر اس کے اصطلاحی معنی ملاحدۂ عجم کی پیداوار ہیں۔ ملاحظہ ہو، مکاتیبِ اقبال، ج 1 حاشیہ ص 199۔

5- حضرت علامہؒ اپنی بیماری کے سبب، اپنے اس ارادے کو بھی عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے۔ بہر حال اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے پیش نظر قادیانی فتنے کے سبھی چہرے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایک کر کے ان تمام سے نقاب اُلٹ دی جائے۔

6- مکاتیبِ اقبال، ج 1 ص 200-199 مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ایم۔ اے۔

سیّد محمد الیاس برنیؒ

(ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

کے نام

°(1)

لاہور

6 جون 1936ء

مخدومی جناب پروفیسر صاحب!

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ کتاب ''قادیانی مذہب'' اس سے بہت پہلے موصول ہو گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بے شمار لوگوں کے لیے چراغِ ہدایت کا کام دے گی اور جو لوگ قادیانی مذہب پر مزید لکھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے تو یہ ضخیم کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے، جس سے ان کی محنت و زحمت بہت کم ہوگئی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں مفصل خط لکھتا مگر دو سال سے بیمار ہوں اور بہت کم خط و کتابت کرتا ہوں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

حضور نظام (1) کا خط میری نظر سے گزرا تھا لیکن میں نے سنا ہے کہ جو روپیہ ان کی گورنمنٹ کی طرف سے پنجاب میں آتا ہے وہ یا تو پارٹی پالیٹکس پر صَرف ہوتا ہے یا ان اخباروں پر جو قادیانیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے؟ میں نے یہ بات آپ کو بصیغہ راز لکھ دی ہے۔

والسلام

مخلص/محمد اقبال (2)

حواشی

o جن دنوں حضرت علامہؒ قادیانیت کی بیخ کنی میں مصروف تھے، انہی دنوں میں پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم نے قادیانی مذہب کے نام سے قادیانی معتقدات کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ وہ بالکل ننگا ہو کر

سامنے آ گئے۔اس کتاب کا ایک نسخہ مرحوم نے حضرت علامہؒ کی خدمت میں بھی بھیجا اور شاید اس پر حضرت علامہؒ کی رائے چاہی۔جواب میں آپ نے مذکورہ خط لکھا۔

1- نظام حیدر آباد دکن۔

2- مکاتیب اقبال، ج1 ص 411 مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ایم۔اے۔

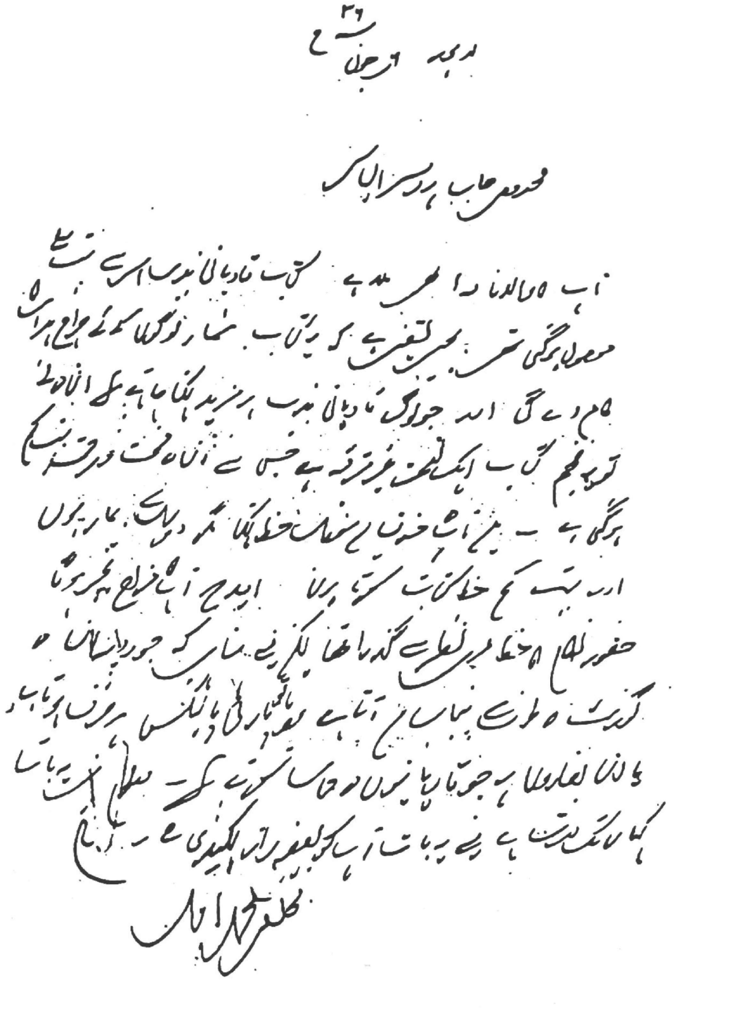

لاہور ۸ جون ۳۶ء

مخدومی جناب ...

مخلص محمد اقبال

(2)

جاوید منزل

27 مئی 1937ء

جناب پروفیسر صاحب!

السلام علیکم!

آپ کی کتاب ''قادیانی مذہب'' کی نئی ایڈیشن جو آپ نے بکمالِ عنایت ارسال فرمائی ہے، مجھے مل گئی ہے، جس کے لیے بے انتہا شکر گزار ہوں۔ میں نے سیّد نذیر نیازی ایڈیٹر ''طلوعِ اسلام'' سے سنا ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کی محنت قابلِ داد ہے کہ اس سے عامۃ المسلمین کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے اور آئندہ پہنچتا رہے گا۔ اب ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے جو کہ آپ کے ذاتی افکار کا نتیجہ ہو۔ آپ کے قلم سے مسلمان ایسی توقع رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ قادیانی تحریک یا یوں کہیے کہ بانی تحریک کا دعویٰ مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ مذکور کی تحقیق تاریخی لحاظ سے از بس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ میری رائے ناقص میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

والسلام

محمد اقبال(1)

حاشیہ

1- مکاتیب اقبال، ج1 ص 20-419 مرتبہ شیخ، عطاء اللہ، ایم۔اے۔

لاہور، جاوید منزل

۲۷ مئی ۱۹۳۷ء

جناب پروفیسر صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کی کتاب "قادیانی مذہب" کا تیسرا ایڈیشن جو آپ نے کمال عنایت سے ارسال فرمایا ہے۔ مجھے مل گیا ہے۔ جس کے لیے بے انتہا شکر گزار ہوں۔ میں نے سید نذیر نیازی سے اول سے آخر تک پڑھوا کے سنا ہے۔ مگر یہ کتاب بہت مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کی محنت قابل داد ہے۔ اس سے عامۃ المسلمین کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے۔ اور آئندہ پہنچتا رہے گا۔

اب ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ جو آپ کے ذاتی افکار کا نتیجہ ہو۔ آپ کے قلم سے مسلمان ایسی توقع رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ قادیانی تحریک کا دعوے مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ بروز کی تحقیق تاریخی نگاہ سے از بس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا مسئلہ اس سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ میری رائے ناقص میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہو گی۔

والسلام

محمد اقبال

سیّد راس مسعود

کے نام

لاہور

10 جون 1937ء

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا، جواَب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے۔ یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں:

1- شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہے۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

2- چودھری محمد حسین ایم۔اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

3- شیخ اعجاز احمد بی۔اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

4- عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر (3) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے، نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ

رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہوسکتا ہے یا نہیں۔اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہوگیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے، دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال(1)

حاشیہ

(1) کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی جلد 4، صفحہ 487، 488، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال از شیخ عطاالله صفحہ 289،290 طبع دوم، (یک جلدی 2012ء)

لاہور
۱۰ جون ۱۹۳۴ء

ڈیر مسعود۔ پرسوں تمہیں ایک خط لکھا تھا۔
اسے پڑھ کر حیران ہوگے۔ اس خط میں آپ نے بہت لکھنا مشکل ہے۔ جواب لکھتا ہوں۔
[illegible] [illegible]
[illegible] ۔ [illegible] [illegible]
[illegible]۔ تمام اشخاص حسب ذیل ہیں۔

(۱) الشیخ المراغی۔ یہ پہلے گورنر ہیں۔ [illegible]
[illegible]۔ (۲) [illegible]
[illegible]۔ [illegible]
(۳) شیخ [illegible]۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]۔ (۴) شیخ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

والسلام

محمد اقبال

(۲۲۹) —— (۲۴)

لاہور

خط نمبر ۱

جولائی ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians بذریعہ وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہرالدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی بہنوئی

عبدالغنی بہنوئی کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں اس کی جگہ کل صاحب میاں امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا آ پڑا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔ والسلام

محمد اقبال

(۲۲۹) —— (۲۴)

لاہور

خط نمبر ۲

جولائی ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians بذریعہ وصیت مقرر کئے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہرالدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی ہمارے

عبدالغنی بہنوئی کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے

والسلام

محمد اقبال

اقبال، تحریکِ آزادیِ کشمیر اور قادیانیت

علامہ محمد اقبالؒ

کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفا٭

''کشمیر کمیٹی'' میں میری صدارت محض عارضی تھی۔ یاد رہے کہ کمیٹی کی تشکیل کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رونما ہونے پر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوئی تھی اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا تھا اور صدر کو آمرانہ اختیارات دے دیے گئے تھے۔

یہ خیال کہ کشمیر کمیٹی کی ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے ضرورت نہ ہوگی، ریاست میں پیدا ہونے والے واقعات نے غلط ثابت کر دیا۔ بہت سے ممبران نے اس لیے یہ سوچا کہ کمیٹی کا ایک باقاعدہ نظام ہونا چاہیے اور عہدیداروں کا نیا انتخاب ہونا چاہیے۔ کمیٹی کے ارکان اور اس کے طریقِ کار کے متعلق کچھ لوگوں کے اختلاف نے جس کے اسباب کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا اس خیال کی مزید تائید کی۔ چنانچہ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں کمیٹی کے صدر (1) نے اپنا استعفا پیش کیا اور وہ منظور ہو گیا۔

پچھلے ہفتہ کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا۔ اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسودہ پیش کیا گیا، جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو لیکن کچھ ممبران نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ بعد کے بحث و مباحثہ اور گفتگو سے مجھے یہ پتہ لگا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتحاد صرف برائے نام ہی ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنا استعفا پیش کرنے سے پہلے ممبران کو اپنی اس رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔

بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلا میں سے ایک صاحب نے، جو

میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے ہیں، حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا، وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔

میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا، ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو، اسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔

جہاں تک مجھے علم ہے کشمیر کمیٹی کی عام پالیسی کے متعلق ممبران میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ پالیسی سے اختلاف کی بناء پر کسی نئی پارٹی کی تشکیل پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا لیکن جہاں تک میں نے حالات کا جائزہ لیا ہے، کشمیر کمیٹی کے چند ارکان کو جو اختلافات ہیں، وہ بالکل بے تکے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانانِ کشمیر کی راہنمائی اور مدد کے لیے برطانوی ہند میں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیے۔ اس لیے اگر برطانوی ہند کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجاز ہیں کہ ایک کھلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کر لیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے صرف یہی ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اپنے ان احساسات کو آپ کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کر دیا ہے، جنھوں نے مجھے استعفا دینے پر مجبور کیا۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ صاف گوئی کسی شخص کو ناگوار نہ گزرے گی کیونکہ میرا مقصد نہ کسی کی برائی کرنا ہے اور نہ کسی پر انگلی اٹھانا۔(2)

حواشی

o یہ بیان 20 جون 1933ء کے اخبارات میں شائع ہوا، تب حضرت علامہؒ کشمیر کمیٹی کے عارضی صدر تھے۔ (حرفِ اقبال ص 201 مرتبہ لطیف احمد شروانی)

1- قادیانی جماعت کا دوسرا خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود ابن مرزا غلام احمد قادیانی۔

2- حرفِ اقبال ص 201 تا 204 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے۔

علامہ محمد اقبالؒ

تحریکِ کشمیر کی صدارت کی پیشکش کا استرداد٭

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا صدر ہوتے ہوئے میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ میں کمیٹی کے ممبران کو اس پر رائے زنی کا موقع دیے بغیر اس خط کا جواب دے دوں جس میں مجھے صدارت پیش کی گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو بھی اس امر سے مطلع کر دیا تھا۔ میرے خط سے اخبارات کے بعض اہلِ قلم اصحاب نے جو غالباً قادیانی ہیں، یہ غلط مطلب اخذ کیا ہے کہ اصولی طور پر مجھے پیش کردہ صدارت کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لہٰذا میں جلد از جلد یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصولی اختلاف نہیں بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں اور میرے اس رویہ کی وجوہات وہی ہیں جن کی بناء پر میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی نئی تشکیل ہونی چاہیے۔

یہ پیشکش جو مجھے کی گئی ہے، یقیناً ایک فریب ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو اس امر کے متعلق یقین دلانا ہے کہ سابقہ کشمیر کمیٹی حقیقت میں ختم نہیں ہوئی بلکہ نئی کمیٹی کے پہلو بہ پہلو ایک جماعت کی حیثیت سے موجود ہے اور یہ کہ وہ لوگ جنھیں نئی کمیٹی سے نکال دیا گیا ہے، وہ اب اس شخص کی راہنمائی میں کام کرنے کے لیے تیار ہیں جو کمیٹی کی نئی تشکیل کا سب سے بڑا محرک تھا۔ لیکن ان کی یہ چال کہ وہ اسباب جن کی بناء پر میں نے کشمیر کمیٹی کی از سرِ نو تشکیل کرائی، اب ختم ہو گئے ہیں، نہ تو مجھے قائل کر سکتی ہے اور نہ مسلم عوام کو۔

قادیانی ہیڈ کوارٹرز سے ابھی اس مقصد کا کوئی واضح بیان شائع نہیں ہوا کہ قادیانیوں کے کسی مسلم ادارہ میں شریک ہونے کی صورت میں ان کی اطاعت دو طرفہ نہ ہو گی بلکہ واقعات سے تو یہ امر بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ ادارہ جس کو قادیانی اخبارات تحریکِ کشمیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس میں بقول قادیانی اخبار ''الفضل''، مسلمانوں کو صرف رسمی طور پر شرکت

کی اجازت دی گئی تھی، اغراض و مقاصد کے لحاظ سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے بالکل مختلف ہے۔ قادیانی جماعت کے امیر کی جانب سے کئی چٹھیاں جو انھوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کے نام لکھی ہیں (غیر قادیانی کشمیری ہونے کی وجہ سے انھیں مسلمان کے بجائے بھائی کہا گیا ہے) اس قادیانی تحریک کشمیر کے چند پوشیدہ اغراض کا انکشاف کرتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہوسکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ واری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔(1)

حواشی

o یہ بیان 2 اکتوبر 1933ء کو دیا گیا۔(حرفِ اقبال ص 204 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے)

1- حرفِ اقبال ص 204 مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

عبداللہ

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید و تشکیل

لاہور 3 جولائی آج رات کے نو بجے باغ بیرون دہلی دروازہ میں مسلمانانِ لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ زیرِ صدارت میاں عبدالعزیز صاحب صدر بلدیہ لاہور منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد ابتدا میں پانچ ہزار کے قریب اور اختتام کے وقت آٹھ ہزار سے متجاوز تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اور علامہ سر محمد اقبال کی تشریف آوری پر حاضرینِ جلسہ نے اللہ اکبر کے پُرجوش نعرے بلند کیے۔ مولوی محمد یعقوب نے قرآن حکیم کے ایک رکوع کی تلاوت کی اور مولوی احمد یار خاں نے علامہ اقبال کی ایک نظم گا کر سنائی۔ صاحبِ صدر کی درخواست پر علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کے متعلق تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

علامہ اقبال کی تقریر

''علامہ اقبال نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونے کے اسباب و علل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں ایک بیان اخبارات میں شائع کرا چکا ہوں اور بعض اخبارات نے میرے اس بیان پر تنقید کی ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود کی طرف سے بھی میرے اس بیان کا جواب دیا گیا ہے۔ جواب الجواب کے لیے میں اخبار کے صفحات کے بجائے اس جلسہ کو ترجیح دیتا ہوں جو میرے مشورہ کے مطابق مسلمانانِ لاہور نے منعقد کیا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا کہ مسلمانوں میں ابھی سیاسی زندگی کا آغاز ہے اس لیے ضروری ہے، جمہور اسلام ہر معاملہ پر اچھی طرح غور کریں اور ان کے سامنے تمام مسائل پر پوری روشنی ڈالی جائے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذاتی اختلافات مٹا کر ایک ہو جائیں اور سیاساتِ حاضرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے لیے مفید راہ تلاش کریں۔

آپ نے کہا کہ پچیس تیس سال ہوئے جب لاہور میں آل انڈیا کشمیر کانفرنس کی بنیاد

رکھی گئی تھی اوراس کانفرنس میں صرف اہل خطہ حضرات اور کشمیری قومیت رکھنے والے شامل ہوسکتے تھے۔ میں نے اس وقت بھی اس امر سے اختلاف کا اظہار کیا تھا اور میری رائے تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی جائے جس میں ہندوستان کے وہ تمام افراد شامل ہوسکیں جو اہلِ کشمیر سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ چنانچہ میں اس کانفرنس میں شامل نہیں ہوا۔اس کانفرنس نے کشمیر کے مسلمان لڑکوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ریاست میں ملازمتیں نہ ملیں۔ چنانچہ وہاں اضطراب پیدا ہوا اور زبردست تحریک شروع ہوگئی۔اس تحریک کے جاری کرنے کا الزام میرے اور سر محمد شفیع مرحوم کے سر تھوپا گیا۔ان دنوں میں شملہ میں تھا۔ وہاں پر ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ چونکہ عام طور پر خیال یہ تھا کہ اس کمیٹی کی ضرورت چند روز کے لیے عارضی طور پر ہوگی، اس لیے اس کا کوئی آئین یا ضابطہ نہ بنایا گیا اور اس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر ہوئے۔ کشمیر کے اندرونی حالات کے تغیر کے طول پکڑ جانے کے باعث اس کمیٹی کے کام کو جاری رکھنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تین چار سال تک یہ حالات درست نہ ہوسکیں گے اور کشمیر کمیٹی کو زندہ رکھنے کی ضرورت باقی رہے گی۔

قادیانیوں کی ضرورت

شملہ میں قائم ہونے والی عارضی کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود تھے جن سے کمیٹی کے بعض ارکان کو اختلاف پیدا ہوا اور تجویز کی گئی کہ نئے انتخاب عمل میں لائے جائیں۔ مرزا صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور کمیٹی نے عارضی طور پر مجھے صدر اور ملک برکت علی کو سیکرٹری مقرر کر دیا تھا کہ کمیٹی کے ضوابط مرتب کرکے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔اس کے بعد محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں کمیٹی کے ضوابط کا آئین پیش کیا گیا۔

اس موقع پر علامہ سر اقبال نے اس جلسہ کی داستان سنائی اور حاضرین کو بتایا کہ اس جلسہ میں قادیانی ممبروں نے اس قسم کی ترمیمیں پیش کرنی شروع کر دیں جن کا مقصد میں یہ سمجھا کہ یہ لوگ کمیٹی کے اندر قادیانی حلقہ کی ایک اور کمیٹی بنانا چاہتے ہیں، جس سے کام خوش اسلوبی سے نہیں ہوسکے گا۔ چنانچہ میں نے جلسہ کا رنگ دیکھ کر اپنی رائے ظاہر کر دی اور زبانی طور پر استعفیٰ پیش کر دیا۔ دو دن کے بعد میں نے اخبارات کو بیان دیا اور عامۃ المسلمین سے اپیل کی کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے لیے عام جلسہ منعقد کریں۔

علامہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے سیاسی انجمنوں میں قادیانیوں کی شمولیت پر مذہبی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں، اگر چہ میں ان کے عقائد کو غلط سمجھتا ہوں لیکن کشمیر کمیٹی کے واقعات نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ قادیانی کسی غیر قادیانی انجمن میں پوری وفاداری کے ساتھ کام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہر جگہ اس ذہن کے ساتھ جاتے ہیں کہ ان پر اپنے امام کی اطاعت، جسے وہ نبوت کے سلسلہ سے تعبیر کرتے ہیں، ہر شے پر مقدم ہے۔ مرزا صاحب کی طرف سے میرے اس اعتراض پر جو جواب شائع ہوا ہے، اس میں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا گیا، صرف یہ کہا گیا ہے کہ بعض دوسری اسلامی انجمنوں میں بعض قادیانی کام کر رہے ہیں لیکن میرا جواب یہ ہے کہ ان انجمنوں میں ابھی تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، جس سے قادیانیوں کی وفاداری کا امتحان ہو سکتا۔ علامہ سر محمد اقبال نے مرزا بشیر الدین محمود کے اس بیان کی تکذیب کی کہ مسلم کانفرنس میں ان کے برابر کسی نے چندہ نہیں دیا، جس کی تعداد تین ہزار روپیہ تھی۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ (میں) آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں اعلان کر سکتا ہوں کہ بعض مخیّر مسلمانوں نے بیک وقت آٹھ آٹھ ہزار روپیہ کی رقمیں مسلم کانفرنس کو دی ہیں۔ قادیانیوں کا دعویٰ غلط ہے۔

کمیٹی کی تشکیل کا مسئلہ

علامہ اقبال نے کہا کہ اب یہ معاملہ محمڈن ہال سے نکل کر آپ کے سامنے آ گیا ہے اور سوال یہ ہے کہ آیا کشمیر کمیٹی کی ہیئتِ ترکیبی وہی رہے جو پہلے تھی یا اسے بدل دیا جائے (آوازیں: کشمیر کمیٹی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر ہے تو وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں)

علامہ اقبال نے اپنی تقریر کے آخری حصہ میں مولانا غلام بھیک نیرنگ کی تجویز سے حاضرین کو آگاہ کیا کہ کشمیر کمیٹی کی جگہ ایک آل انڈیا مسلم سٹیٹ ڈیفنس کمیٹی بنائی جائے جو تمام ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لے۔

صاحب صدر کا تبصرہ

ازاں بعد صاحبِ صدر نے حاضرین سے کہا کہ علامہ سر اقبال نے تمام حالات آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ ان کا یہ مقصد نہیں کہ کسی کو اس کے مذہبی عقائد کی بنا پر کمیٹی سے نکالا جائے بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد صحیح اصول پر قائم کی جائے تا کہ کمیٹی کشمیر کے مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو (ایک آواز۔ مگر کمیٹی میں مرزائی نہ رکھے جائیں کیونکہ انھوں

نے اسے تبلیغ کا میدان بنالیا ہے)

ملک برکت علی کی تقریر

ملک برکت علی نے اس مختصر مگر پُر زور تقریر کے بعد حسب ذیل قرارداد پیش کی۔

''اہلِ لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی اس تجویز کو صمیم قلب سے تسلیم کرتا ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو ایسے طریق پر تشکیل دیا جائے جس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کی آراء کی پورے طور پر نمائندگی ہو تا کہ نہایت موثر طریق سے مسلمانان کشمیر کے جائز حقوق کے حصول کے لیے ایجی ٹیشن اور پروپیگنڈا ہو سکے تا کہ وہ اپنے ملک کی خدمت میں ذمہ دار طور پر شریک ہوں۔ یہ عظیم الشان اجتماع ڈاکٹر سر محمد اقبال پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے انھیں اس بات کا پورا حق دیتا ہے کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیادی انجمن کے ارکان نامزد کریں اور یہ مجلس کمیٹی کا آئین تیار کرے اور جیسا مناسب ہو، کمیٹی کے نام تبدیل کرے، عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لائے اور دیگر امور کا تصفیہ کرے جو کمیٹی کے کاروبار کے لیے ضروری ہوں اور یہ مسلمانانِ ہند کی اس بہترین آرگنائزیشن کے شایان شان ہو۔''

حاجی شمس الدین نے اس قرارداد کی تائید کی اور قرارداد منظور ہو گئی۔ صرف دو قادیانیوں نے اختلاف کا اظہار کیا۔

نئی کمیٹی کی تشکیل

ازاں بعد صاحب صدر نے علامہ اقبال سے درخواست کی کہ وہ نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ارکان کے نام نامزد کریں۔ حضرت علامہ نے اٹھ کر کہا کہ بعض حضرات نے مجھے نئی کمیٹی کے لیے اسماء کی ایک فہرست دی ہے۔ میں وہ فہرست اس جلسہ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جلسہ بااختیار ہے کہ جسے چاہے ممبر رہنے دے اور جسے چاہے نکال دے۔ ملک برکت علی نے نام پڑھ کر سنائے اور حاضرین منظور کے نعرے بلند کرتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب نام پڑھ کر سنائے گئے۔ حاضرین نے قادیانیوں اور لاہوری مرزائیوں کے علاوہ مولانا سیّد حبیب آف سیاست اور مولانا غلام رسول مُہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا اسمٰعیل غزنوی اور وغیرہ کے نام مسترد کر دیے اور ان کی جگہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی مظہر علی اظہر، مولانا داؤد غزنوی، غازی عبدالرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن کے نام شامل کیے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر

ازاں بعد حضرت مولانا ظفر علی خاں نے دوسری قرارداد پیش کی جو شیخ محمد عبداللہ اور دیگر اسیرانِ سیاسی کی رہائی اور مقدمات کی واپسی کے مطالبہ پر مشتمل تھی۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص اور دلفریب انداز میں فرمایا کہ ''آج میری طبیعت خوشی سے باغ باغ ہے۔ آج میں اپنی سالہا سال کی جدوجہد کے آثار اس جلسہ کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ اس وقت کونے کی اینٹ کون ہے۔ مرزا بشیر محمود کا وہ مقولہ سنا ہوگا کہ ہم کونے کی اینٹ ہیں، جس پر یہ اینٹ گرے گی، وہ سر پاش پاش ہو جائے گا اور جو کھوپڑی اس اینٹ سے ٹکرائے گی، وہ ٹوٹ جائے گی۔ آج یہ مقولہ اس اجتماع کے حق میں تبدیل ہو گیا اور آپ حضرات نے ثابت کر دیا کہ کونے کی اینٹ کون ہے۔

حضرت مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ میرے کشمیر سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میرے والد محترم اپنی عمر کا ایک حصہ کشمیر میں بسر کر چکے ہیں اور میں بھی اُن کے ساتھ کشمیر کے چپے چپے پر پھر چکا ہوں۔ آج میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں کیونکہ آپ نے مجھے اس کمیٹی کا رکن بنایا ہے اور اب یہ کمیٹی آپ کی تشکیل کردہ جماعت بن گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم ان واقعات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ کشمیر میں ایک پتلا دبلا ڈوگرہ ایک موٹے تازے مسلمان کو بید سے مارتا تھا اور مسلمان اس کے سامنے بچے کی طرح بلبلا کر روتا تھا۔ میں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن اب مظالم سے تنگ آ کر وہاں کے مسلمانوں نے ایجی ٹیشن کی اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے وہ اپنے حقوق اور جائز مطالبات کے لیے سر بکف میدان میں نکل آئے ہیں۔ آپ نے مسلمانانِ کشمیر کے اندرونی اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان اختلافات کی وجہ یہی قادیانی تبلیغ ہے۔ بعض مسلمانوں نے غلطی کی کہ اس کام میں قادیانیوں کو ساتھ ملایا۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آج ہم علامہ اقبال کو پھر اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں چاہیے کہ حکومتِ کشمیر سے اپیل کریں کہ وہ کھونٹا جس کے بل بوتے پر یہ فسادات رونما ہوئے تھے، اکھاڑ دیا گیا ہے۔ یعنی قادیانیوں کی مفسد جماعت کو کمیٹی سے باہر نکال دیا گیا ہے اور اب یہ خالص مسلمانوں کی جماعت بن گئی ہے لہٰذا حکومتِ کشمیر کو چاہیے کہ اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو کر اپنے ہاں امن قائم کرے۔

کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کے ہاتھ میں دینے کے نتائج آپ نے دیکھ لیے۔ اہلِ کشمیر اور ان کے لیڈر مجبور تھے کہ قادیانیوں کو اپنے ہاں رسوخ بڑھانے دیں۔ شیخ محمد عبداللہ مجبور تھا کہ قادیان سے تعلق رکھے۔ اب وہ لوگ مسلمانوں سے رشتے استوار کریں گے اور شیخ عبداللہ کو قادیانی تصفیہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

دوسری قرارداد

مولانا ظفر علی خاں نے حسب ذیل قرارداد پیش کی جس کی تائید مولوی محمد الدین فوق نے کی اور قرارداد منظور ہوگئی۔

''مسلمانان لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ کشمیر کے افسوس ناک حالات حاضرہ کو بہ نگاہِ اضطراب دیکھتا ہے جس کی بنا پر بلا امتیاز کشمیر کے لیڈروں اور ان کے رفقا کو اس بنا پر گرفتار کرلیا گیا ہے کہ اس طریقِ عمل سے مختلف اسلامی طبقوں میں صلح وآشتی پیدا ہوگی۔ اس جلسہ کی پختہ رائے یہ ہے کہ موجود قابلِ افسوس حالات کو روبراہ لانے کے لیے شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقا کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے اور ریاست بھر میں جس قدر مقدمات گزشتہ فسادات کشمیر کے زیر سماعت ہیں، ان کو واپس لے لیا جائے۔''

تیسری قرارداد

(تیسری قرارداد کرسی صدارت کی طرف سے پیش کی گئی اور منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ مسلمانانِ ہند کشمیری مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کریں اور اپنے اندرونی اختلافات مٹا کر متحد ہو جائیں۔ (ملخص از جعفر)

آخر میں مولانا ظفر علی خاں نے نئی کشمیر کمیٹی کی مالی امداد کے لیے اپیل کی اور بہ نفس نفیس مبلغ سو روپیہ دینے کا اعلان فرمایا اور مولانا محمد بخش مسلم نے عید میلاد النبی ﷺ کے جلوس کا اعلان کیا۔ جلسہ رات کے بارہ بجے برخاست ہوا اور دعا مانگی گئی۔

(زمیندار 10 جولائی 1931ء ص 14)

حافظ عبید الرحمٰن

مسئلہ کشمیر اور قادیانی سازشیں

مہاراجہ پرتاب سنگھ بے اولاد تھا۔ اس نے اپنی جانشینی کے لیے اپنی برادری کا ایک لڑکا متبنّٰی بنا رکھا تھا۔ راجہ امر سنگھ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کیونکر وہ اپنے بیٹے ہری سنگھ کو ریاست کا حکمران بنانا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے ریاست جموں کشمیر میں سازشوں کا جال بچھا دیا۔ اس ساز باز میں اسے قادیانی مقتداؤں سے بڑی مدد ملی۔ آخر کار مہاراجہ ہری سنگھ 1925ء میں گدی نشین ہو گیا۔ ہری سنگھ انتہائی بد کردار، بداخلاق، آوارہ اور بد معاش شخص تھا۔ یہ اپنے لہو ولعب اور عیش ونشاط کی مستیوں میں ایسا غرق ہوا کہ ریاست کے چھوٹے بڑے ڈوگرہ ہندو ملازمین کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ مسلمانوں کی آبادی ایک صدی سے زیادہ سکھوں اور ڈوگروں کی غلامی میں ہر طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اب ان کے مصائب میں کئی گنا مزید اضافہ ہو گیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا زیادہ وقت کلکتہ، بمبئی، لندن اور پیرس کے عشرت خانوں میں گزرتا تھا۔ میدان صاف پا کر ریاست کے ہندو اہلکاروں کی چیرہ دستیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اب وہ مسلمان رعایا کے مال ودولت اور عزت وناموس کے علاوہ ان کے دین اور ایمان پر بھی ہاتھ ڈالنے لگے۔ 1931ء میں پہلے ریاسی میں ایک مسجد شہید کر دی گئی۔ پھر کوٹلی میں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ جموں میں ایک ہندو کانسٹیبل نے جان بوجھ کر قرآن کی سخت بے حرمتی کی۔ ان واقعات نے ریاست بھر کے مسلمانوں میں شدید غم وغصہ کی آگ بھڑکا دی۔ جگہ جگہ جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ خاص طور پر سری نگر میں عبدالقدیر نامی ایک شعلہ بیان مقرر نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر کے مہاراجہ کی حکومت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اسے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔ (1)

13 جولائی 1931ء کو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جیل کا محاصرہ کر کے مطالبہ کیا

کہ انھیں عبدالقدیر کے زیر سماعت مقدمہ کی کارروائی سننے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دینے سے انکار کر کے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلا دی۔ 27 افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے۔ تین روز بعد پھر سری نگر میں فائرنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کا دوبارہ خون بہا۔ آزادی کے نام پر کشمیر کی سرزمین پر خون کی یہ پہلی قربانی تھی۔ (2) چنانچہ اسی جدوجہد نے تحریکِ آزادی کشمیر کی صورت اختیار کر لی۔

دبا سکو تو صدا دبا دو، بجھا سکو تو دیا بجھا دو
صدا دبے گی تو حشر ہو گا دیا بجھے گا تو سحر ہو گی

جب ہری سنگھ کو اپنے پاؤں تلے سے اقتدار کی زمین سِرکتے محسوس ہوئی تو یہ شیطانی صفت، عیار، مکار، مہاراجہ اپنے سیاسی باوا فرنگی کے درِ اختیار پر پیشانی گھسانے لگا۔ اس طرح انگریزی دربار میں دو کافروں کی عقلیں اکٹھی ہو گئیں اور اس مسئلے کا حل سوچنے لگیں۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کا جہاد کے لیے ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کی سرحدات کو منتخب کرنا اور والی خراساں کو اس معرکہ میں شمولیت کی دعوت دینا بہت دُوررس منصوبوں کا حامل پروگرام تھا، جسے انگریز جیسی شاطر قوت کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی، پھر شیخ الہندؒ کا اپنی تحریکِ انقلاب کا مرکز اس علاقہ کو بنانا یہ بھی نہایت اہم مسئلہ تھا جسے انگریز معمولی واقعہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ انگریز نے یہ ضروری سمجھا کہ کشمیر کے علاقے میں ایسی گہری سیاسی تبدیلیاں عمل میں لانی چاہئیں، جس کے بعد کشمیر میں اور اس کے اطراف میں کسی جمعیت کو موقع نہ مل سکے۔ چنانچہ جہاد کو ختم کرنے کے لیے انگریز دوبارہ اپنے خود کاشتہ پودے کی طرف متوجہ ہوا تو قادیانی خلیفہ دوم مرزا بشیر الدین محمود کو ہاتھ باندھے تیار پایا۔ (3) مرزا بشیر الدین محمود قادیانی تحریک کے تمام افراد سے زیادہ سیاسی بصیرت رکھتا تھا۔ اس نے اوائلِ خلافت میں کئی بار کشمیر کا دورہ کیا۔ وہاں کے حالات کا بچشم خود جائزہ لیا اور قادیانی تحریک کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کشمیر کے ناپختہ ذہن اور نئی ابھرنے والی قیادت کو اپنے ساتھ ملا کر اسے اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ قادیانی مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون ہو اور ان کے لیے کارآمد ہو سکے۔ اس کے ساتھ عام مسلمانوں میں بھی قادیانیت کا سلسلہ تبلیغ شروع کیا جائے۔ چنانچہ مرزا بشیر الدین کشمیر پر نگاہ جمائے مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ ادھر انگریز نے مہاراجہ ہری سنگھ سے بات چیت

ختم کر کے منکرِ جہاد مرزا بشیر الدین لعین کی طرف کشمیر میں سے جہاد اور شروع ہونے والی تحریک کو ختم کرنے کے لیے وحی بھیجی۔ وحی پاتے ہی بشیر الدین نے اپنی تمام مشینری کو متحرک کر دیا اور اپنوں کا لبادہ اوڑھ کر مکروہ عزائم کو بغل میں دبائے ہوئے میدانِ عمل میں کود پڑا۔ 1931ء میں قادیانیوں نے کشمیر میں گوناگوں سازشیں کیں۔ کشمیر پر تو ان کی قدیم نظر تھی ہی اور اسے قادیانی سٹیٹ بنانے کی زبردست خواہش ان کے دلوں میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ مرزا بشیر الدین محمود نے برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے کشمیر کے طول وعرض میں قادیانی فتنوں کا جال بچھا دیا۔ کشمیری مسلمانوں کی سادہ فطرت کہ وہ قادیانیوں کی مذہبی چالوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔

یہ قادیانی امت کا نہایت ہی خطرناک وار ہوتا ہے جب وہ کسی مسلمان کو اپنی مذہبی چالوں میں الجھا کر اس کا متاعِ ایمان لوٹتے ہیں۔ جب تک ایک مسلمان قادیانیوں کے مذہبی عقائد سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہو، قادیانی اس کے ایمان پر ڈاکا ڈالتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ بھی جو قادیانی عقائد سے آگاہی نہیں رکھتا، وہ قادیانیوں کی مذہبی چالوں میں ایسا الجھتا ہے کہ وہ خاتم النبیین ﷺ کی اُمت پر کم اور مرزا قادیانی کی امت باطلہ پر زیادہ اعتماد کر بیٹھتا ہے اور لاعلمی میں ایسی بات کر بیٹھتا ہے جو اسے اپنے حقیقی مذہب سے بہت دور ضلالت و گمراہی کے ان عمیق گڑھوں میں پھینک دیتی ہے، جہاں سے نکلنا اس کے لیے نہ صرف مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔

کشمیر کمیٹی کا قیام

مرزا بشیر الدین محمود نے قادیانی امت کو برطانوی خواہشوں کے محور و مرکز پر مستحکم کیا اور اسے سیاسی تحریک بنا دیا، جو برطانوی استعمار کی خدمت گزار اور اپنے اقتدار کی طلب گزار ہو گئی۔ قادیانی فتنہ نے اپنے سو برس میں مسلمانوں کے کسی ابتلا، کسی تحریک، کسی افتاد اور کسی مصیبت میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں سے الگ تھلگ اور انگریزوں کی مرضی کے تابع رہے۔ انگریزوں میں یہودی اقوام کی اکثریت ہے اور یہودی مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جس پر قرآن گواہ ہے............

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ. (المائدہ:82)

ترجمہ: ’’تو سب لوگوں میں زیادہ دشمنی مسلمانوں سے، یہود میں پائے گا۔‘‘

لٰہذا مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن انگریز کا فرمانبردار فتنہ مسلمانوں کے لیے کب دوست ہوسکتا ہے؟ لیکن ریاست کشمیر کے مسلمانوں کی ہمدردی کے نام پر انھوں نے کشمیر کمیٹی کا کھڑاک رچایا، جس کی ڈھولکی گلی گلی، کوچہ کوچہ، قریہ قریہ پیٹتے رہے کہ ہم نے کشمیر کی آزادی کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔

بادۂ عصیاں سے دامن تر بہ تر ہے شیخ کا
اس پہ دعویٰ ہے کہ اصلاحِ دو عالم ہم سے ہے

کشمیر میں ڈوگرہ حکومت کے مظالم نے مسلمانانِ کشمیر کی زندگی اجیرن کررکھی تھی۔ وہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں انتہائی صبر کے ساتھ حیاتِ مستعار کے دن گزار رہے تھے لیکن جب قرآن کی بے حرمتی اور مسجد کی شہادت کے واقعات رونما ہوئے تو ریاست کشمیر میں مسلمانوں کے دلوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور مسلمان سراپا احتجاج بن گئے۔ ریاست جلسوں اور جلوسوں سے گونج اٹھی۔ زبردست ہڑتالیں ہوئیں، بیسیوں مسلمان جامِ شہادت نوش کر گئے۔ سینکڑوں زخمی ہوئے اور ہزاروں پسِ دیوارِ زنداں چلے گئے۔ سفاک ڈوگرہ فوج نے سینکڑوں مسلمانوں کے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کو گرفتار کرلیا۔ چنانچہ ایسے نازک حالات میں **25** جولائی **1931**ء کو شملہ میں نواب سر ذوالفقار کی فیئر ویونام کی دو منزلہ کوٹھی میں کشمیر کی سیاسی صورتِ حال پر غور وخوض کے لیے ایک میٹنگ ہوئی جس میں علامہ اقبال نے بھی شرکت کی۔ بدقسمتی سے صدارت مرزا بشیر الدین نے کرڈالی اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر بھی وہی بن بیٹھے۔ اس اجلاس میں کمیٹی کے منتخب ہونے والے سیکرٹری جنرل بھی قادیانی جماعت کے مبلغ اور کارکن عبدالرحیم درد تھے۔ آغاز میں اس کمیٹی میں تیرہ اصحاب نے شرکت کی۔ (4)

کشمیر کمیٹی قادیانی جماعت کی گھناؤنی چال

مرزائیوں نے کشمیر کو **1921**ء سے اپنی سیاسی و مذہبی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ آج کوئی سا موقع ہو، قادیانی کشمیر میں مسلمانوں کی ہمدردی کی محبت کے نام پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جبکہ مرزائی مسلمانوں کے دیگر قومی وملکی مسائل میں مسلمانوں کی حمایت تک نہیں کرتے بلکہ مسلمان دشمن قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ذہنوں میں سوال اٹھتا ہے کہ وہ گروہ جنھوں نے جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچا کر ملتِ اسلامیہ کے سامنے اپنا ایک خودساختہ

نبی کھڑا کیا اور انگریز کے اقتدار کو طول دینے کے لیے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی ناپاک جسارت کی، وہ طائفہ جس نے خلافتِ عثمانیہ کی تباہی پر جشنِ چراغاں کیا تھا، وہ جماعت جس کے سربراہ اور کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین نے شاتم الرسول راجپال کے قتل پر مسلمانوں کے زخمی سینے پر مرچیں چھڑکتے ہوئے کہا تھا:

- ❑ ''وہ نبی بھی کیسا نبی ہے جس کی عزت کو بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں۔''

(خطبہ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد 16 نمبر 82 صفحہ 8-7 مورخہ 19 اپریل 1929ء)

وہ جتھہ جس کے بنیادی عقیدے کے مطابق تمام مسلمانانِ عالم کافر، خنزیر، حرام زادے اور کنجریوں کی اولاد ہیں، وہ جماعت کشمیر کے مسلمانوں کی محبت میں کیوں تڑپنے لگی؟ وہ جماعت کیوں کشمیری مسلمانوں کے مقدمات کے پیروی کے لیے اپنے وکلا کشمیر بھیجنے لگی؟ اس جماعت کو کشمیری مسلمانوں کی ہمدردی کا خیال کیسے آ گیا؟ یہ محبت یہ ہمدردی سب کچھ کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کی خواہش کروا رہی تھی۔ 25 جولائی کو کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ٹھیک سترہ دن بعد 12 جون 1931ء کے اخبار ''الفضل'' قادیان نے لکھا:

''حضرت امام جماعت احمدیہ جو پہلے ہی مناسب موقع کے انتظار میں تھے، یکا یک میدانِ عمل میں آ گئے۔''

قادیانیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کشمیری مسلمانوں کو ان کی مظلومانہ بے کسی کی زندگی سے نجات دلانے کے لیے کشمیر کمیٹی کی صورت میں آگے بڑھے تھے، یہ بھی کشمیر سے غداری کا ایک انداز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اپنی انگریز دوستی کی بنا پر اس بات کے خواہش مند تھے کہ جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی سے گلاب سنگھ نے کشمیر خرید لیا تھا۔ ہم (مرزائی) کشمیر میں ہمدردی کا روپ دھار کر داخل ہوں گے۔ انگریز ہماری وفاداری کے عوض کچھ ترامیم کرے گا اور پھر وہ وقت بھی آ جائے گا کہ ہماری اس محنت کے صلہ میں کشمیری ہمیں (مرزائیوں کو) محبت اور شفقت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور یوں پورے کشمیر میں ایک ہمہ گیری پیدا کر کے انگریز سامراج سے اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لیے سودا بازی کر کے گلاب سنگھ کو زیادہ رقم دے کر کشمیر کو خرید لیں گے، جس طرح پنجاب میں ربوہ خرید ا گیا۔ (5)

کشمیر کمیٹی کا قیام اور تحریک آزادیٔ کشمیر میں قادیانیوں کی شمولیت کا ایک پس منظر یہ

بھی تھا کہ اس زمانے میں ایشیا، انگلستان اور روس کی باہمی جنگ وجدل کا میدان بنا ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے روس نے توسیع پسندی کی جس پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا تھا، اس نے برطانوی اقتدار کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی تھی کہ اب روس، افغانستان اور کشمیر کے راستے ہندوستان میں داخل ہو جائے گا۔ اس کا تذکرہ جوزف بل کی کتاب (Danger of Kashmir) میں موجود ہے۔ برطانوی حکومت نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے ضروری سمجھا کہ وہ شمال مغربی ہند کے اُن تمام علاقوں کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لے جہاں اشترا کی سرگرمیاں جاری تھیں، اور جہاں سے روس کے لیے مداخلت کے راستے موجود تھے اور ان سرحدی علاقوں میں ایسی وفادار جماعتوں کو پالا جائے جو ایک طرف آزادی کی تحریک کو سبوتاژ کر سکیں اور دوسری طرف برطانوی حکومت کے لیے مخبری کے فرائض انجام دیں۔ ان علاقوں کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لینے کی راہ میں معاہدۂ امرتسر رکاوٹ تھا، جس کے تحت مہاراجہ کی رضامندی ضروری تھی لیکن مہاراجہ اپنی ریاست کے ایک انچ حصے سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس کی نگاہ قادیانی جماعت پر پڑی جو اس کی اپنی خود کاشتہ تھی اور جس کی وفاداریوں کو انگریز بارہا آزما چکا تھا۔ چنانچہ قادیانی جماعت جس نے پہلے کسی بھی تحریک میں حصہ نہ لیا تھا جو انگریز کی وفادار ترین جماعت تھی، اس کا اس تحریک میں حصہ لینا اس بات کی پختہ علامت تھی کہ وہ اپنے آقا فرنگی کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ انھیں کشمیر کے مفادات اور مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے کوئی دلچسپی نہیں، حالانکہ اس سے پہلے عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا، ہندوستان کے مسلمان تڑپ اٹھے، تحریک خلافت کا آغاز ہوا، اس موقع پر قادیانی نہ صرف اس تحریک سے علیحدہ رہے بلکہ جب ترکی کو شکست ہوئی اور بغداد برطانوی قبضہ میں چلا گیا تو قادیان میں جشنِ فتح منایا گیا۔ 27 نومبر کو انجمن احمدیہ برائے امداد جنگ کے زیر اہتمام حسب ہدایت مرزا بشیر الدین محمود گورنمنٹ برطانیہ کی شاندار اور قابل یادگار فتح کا جشن منایا گیا۔ نماز مغرب کے بعد اندرون قصبہ میں روشنی اور چراغاں کیا گیا۔ خاندانِ مسیح موعود کے مکانات پر بھی چراغ روشن کیے گئے۔ (6) جن قادیانیوں کا یہ کردار اور جن کی انگریز سے وفاداریاں اس عروج کو پہنچی ہوئی تھیں اور جنھوں نے مسلمانوں کی ہر تحریک کی مخالفت کی تھی انھوں نے آزادی کشمیر کی تحریک میں محض برطانوی مفادات کے حصول کے لیے شرکت کی۔ کشمیر کمیٹی کے قائم ہوتے ہی مرزا بشیر الدین نے ہر عام و خاص کو یہ تاثر دیا کہ ان کی صدارت میں اس کمیٹی کو قائم کر کے ہندوستان بھر کے سر کردہ مسلمان اکابرین نے ان کے والد مرزا غلام احمد قادیانی کے مسلک پر مہرِ

تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس شر انگیز پروپیگنڈے کے جلو میں قادیانیوں نے انتہائی عجلت کے ساتھ اپنے مبلغین کو جموں کشمیر کے طول وعرض میں پھیلانا شروع کر دیا تا کہ وہ ریاست کشمیر کے سادہ لوح عوام کو ورغلا کر انھیں اپنے خود ساختہ نبی کا پیروکار بنانا شروع کر دیں۔ یہ مہم کافی کامیاب رہی۔ کشمیر کے کئی دوسرے مقامات کے علاوہ شوپیاں میں مسلمانوں کی خاصی تعداد قادیانی بن گئی۔ پونچھ شہر میں بھی مسلمانوں کی اکثریت نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا۔ (7) تحریکِ آزادی کے مبلغین کی امداد کے لیے قادیانیوں نے اکثر رقوم شیخ محمد عبداللہ کی معرفت دیں۔ (8) شیخ صاحب اپنے دور میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے۔ وہ کبھی ڈوگرہ حکومت کے مرہون منت رہے اور کبھی قادیانی انھیں انگلیوں پر نچاتے رہے۔ یہی وجہ تھی جس کی بنا پر پنجاب میں شیخ عبداللہ کے قادیانی ہونے کے چرچے ہونے لگے۔ آزادئ کشمیر کے نام پر سب سے پہلی قربانی جو 27 افراد نے دی تھی، ان مجاہدین میں ایک مجاہد ایسا بھی تھا جس نے اپنے آخری سانسوں میں شیخ عبداللہ کو مخاطب کر کے کہا تھا، شیخ صاحب! ہم نے اپنا کام کر دیا۔ آپ اپنا فرض ادا کریں۔ (9) لیکن تاریخ شاہد ہے شیخ صاحب نے کشمیر کی آزادی میں کیا کردار ادا کیا۔ بہر حال جب قادیانیوں کی سرگرمیوں کا امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو علم ہوا تو وہ فوراً پونچھ شہر پہنچے اور اپنی خطیبانہ آتش بیانی سے قادیانیت کے ڈھول کا پول کھولا کہ پورا شہر جس کی آبادی مرزائی بن چکی تھی، ساری کی ساری تائب ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئی۔ (10)

علامہ اقبال اور کشمیر کمیٹی

کشمیر کمیٹی اب تک دستور کی تدوین کے بغیر کام کر رہی تھی۔ جب یہ کمیٹی قائم ہوئی تو خیال یہ تھا کہ یہ ایک عارضی کمیٹی ہو گی، اس لیے اس کا دستور مدون نہ کیا گیا اور صدر کو غیر معمولی اختیار دیے گئے تھے۔ لاہور میں جب آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا تو اس میں مجلسِ احرار کے بعض راہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں جب یہ مطالبہ کیا گیا کہ کمیٹی کا کوئی باقاعدہ دستور مرتب کیا جائے تو قادیانی جماعت نے اس کی پُرزور مخالفت کی۔ کمیٹی کے آئین کے مطالبے سے قادیانی سمجھ گئے کہ اس سے انھیں اور ان کے امام کو بے دخل کرنا مقصود ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے جب کام بنتا نہ دیکھا تو بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا اور علامہ اقبال کمیٹی کے نئے صدر منتخب ہو گئے۔ قادیانی ہی کشمیر کمیٹی کے روح رواں تھے۔ وہ کشمیر کمیٹی سے زیادہ اپنے امام کے مطیع تھے۔ اس لیے مرزا بشیر الدین کے استعفیٰ کے بعد انھوں نے کمیٹی میں دل چسپی لینا ترک

کردی اور عملاً بائیکاٹ کر دیا۔ قادیانی وکلا جو ریاست کشمیر میں مسلمانوں کے مقدمات لڑ رہے تھے ان مقدمات کو ادھورا چھوڑ کر واپس آ گئے، جن میں سر ظفر اللہ (قادیانی) بھی شامل تھے۔ اس کے بعد قادیانیوں نے کشمیر کمیٹی کے راستے میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے۔ (11) ان حالات سے مجبور ہو کر علامہ اقبال نے بھی کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور کمیٹی توڑ دی۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی سے اپنی صدارت کے استعفیٰ پر لکھا۔

❑ ''بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلا میں سے ایک صاحب نے، جو میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے ہیں، حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا، وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔'' (12)

کشمیر کمیٹی کے خاتمہ کے بعد بھی عیار قادیانی جماعت نے اپنی عیاری اور مکاری کو برقرار رکھنا چاہا۔ انھوں نے تحریکِ کشمیر کے نام سے الگ ادارہ قائم کر لیا اور اس کی صدارت کا عہدہ علامہ اقبال کو دینا چاہا۔ علامہ اقبال اب قادیانی امت کے سخت مخالف بن چکے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ تحریک کشمیر کے نام پر قادیانی اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس آفر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان واقعات کے بعد علامہ اقبال نے قادیانی تحریک کی سختی سے مخالفت کی۔ اسے ایک گمراہ کن فتنہ قرار دیا اور مسلمانوں کو اس سے باخبر رہنے کا فرمایا۔ پھر پنڈت نہرو کے سوالات کے جواب میں قادیانی تحریک کی مذہبی اور سیاسی غرض و غایت اور اس کے گھناؤنے کردار پر مقالات تصنیف کیے۔ اپنے ان بیانات اور طرزِ عمل سے علامہ اقبال نے قادیانی فتنہ پر ایسی ضربِ کاری لگائی کہ قادیانی سازشوں کا مقصد کھل کر لوگوں کے سامنے آ گیا۔

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تُو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

اس کے بعد 1936ء میں قادیانیوں نے کانگریس سے حالات استوار کرنے شروع

کر دیے اور 1940ء میں قراردادِ پاکستان کے بعد اپنی سازشیں تیز کر دیں۔

کشمیر کمیٹی میں مرزا بشیر الدین محمود کی صدارت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قادیانی کارکن آسانی سے خفیہ راز انگریز تک پہنچاتے رہے کیونکہ جب علامہ اقبال اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے کشمیر کمیٹی کو یہ لکھا کہ آئندہ کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہوا کرے گا تو اس سے قادیانیوں کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ علامہ اختر فتح پوری لکھتے ہیں کہ مرزا بشیر الدین کے خاندان کے ایک انتہائی قریبی عزیز نے میرے پاس بیان کیا کہ:

''حضور (مرزا بشیر الدین محمود) تمام کارگزاری کی رپورٹ باقاعدہ طور پر انگریزی حکومت کو بھجوایا کرتے تھے۔ ایک رات پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دو آدمی علامہ اقبالؒ کے مکان پر آئے۔ انھوں نے علی بخش سے پوچھا۔ علامہ صاحب کہاں ہیں؟ ہم ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ علی بخش نے کہا، وہ سو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انھیں فوراً جگا دیں۔ ہمیں ان سے ایک ضروری کام ہے اور اسی وقت ہم نے واپس بھی جانا ہے۔ علامہ قریب ہی سوئے ہوئے تھے۔ ان کی آواز سن کر بیدار ہو گئے تو انھوں نے علامہ اقبالؒ کے سامنے وہ تمام ریکارڈ رکھ دیا جو مرزا بشیر الدین نے گورنمنٹ کو بھیجا تھا۔ نیز انھوں نے کہا کہ اگر ہمارے متعلق یہ پتہ چل جائے کہ ہم یہ فائلیں اٹھا کر یہاں آئے ہیں تو ہماری سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ آپ نے ایک ایسے آدمی کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنایا ہوا ہے جو گورنمنٹ جاسوس ہے۔'' (13)

حواشی

1- شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب ص 359۔
2- شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب ص 359۔
3- مسئلہ کشمیر اور مرزائی از جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال
4- اقبال اور کشمیر۔
5- کشمیر اور مرزائی از جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال
6- قادیانی آزادیٔ کشمیر کے دشمن از مولانا گلزار احمد مظاہری ص 8۔
7- شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب ص 370۔
8- کچھ پریشان یادیں کچھ پریشان تذکرے ص 130۔
9- روزنامہ جنگ 11 جولائی 1992ء۔
10- شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب ص 370۔
11- مسئلہ کشمیر از ممتاز احمد ص 18۔
12- اقبال اور سیاست ملی ص 303۔
13- قادیانی تحریک کا سیاسی پس منظر ص 30-31۔

''اقبال دشمنی'' کے جواب میں

خالد نظیر صوفی

خاندانِ اقبالؒ میں قادیانیوں کی واحد نقب اور اس کا ردِ عمل

یہاں میرے پیش نظر یہ بحث بالکل نہیں کہ قادیانیت کن عوامل کے تحت معرض وجود میں آئی یا لائی گئی اور اس کا اصل منتہائے نظر کیا تھا...... یا اس کے پس منظر اور پیش منظر میں کون کون اپنے اپنے فوائد کے لیے مصروفِ عمل رہا۔...... اس پر اب تلک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی اسی شدومد کے ساتھ لکھا جاتا رہے گا۔ مجھے تو یہاں صرف اور صرف اس سے سروکار ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کب ''منکرِ ختم نبوت'' ہونے کا اعلان کیا اور اپنے اس باطل دعویٰ نبوت سے قبل وہ کس حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے رہے۔

اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ مرزا قادیانی نے اپنے قیامِ سیالکوٹ میں، جو اُن کے اپنے بیان کے مطابق تقریباً سات برس (1) پر محیط رہا، مناظروں کا بازار خوب گرم رکھا۔ اہالیانِ سیالکوٹ کو جو اُن دنوں آریہ سماجی تحریکوں اور مسیحی پادریوں کی یلغار سے بے حد پریشان تھے اور کسی طور ان سے مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے، بے حد متاثر کر لیا اور ایک طرح سے اس وقت ایک دینی سکالر کی حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ اس دور کے ماحول کے مطابق سیالکوٹ اور خاص طور پر کشمیری محلّہ جس کے کوچہ حسام الدین میں مرزا صاحب کا قیام رہا، کا شاید ہی کوئی گھرانا ایسا بچا ہو جو مرزا قادیانی کی اسلام دوستی سے متاثر نہ ہوا۔ اس وقت تک مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ ایک شریف انسان کی حد تک مذہب میں دخیل تھے اور ممکن ہے کہ وہ ان موافق حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی قسم کے پیری مریدی کے عمل میں بھی ملوث رہے ہوں اور سادہ لوح مسلمانوں سے بیعت تک لیتے رہے ہوں۔ چنانچہ اس وقت کے آثار آج تک یہاں موجود ہیں اور بے شمار نا کردہ گناہ اس الزام سے خود کو بری الذمہ قرار نہیں دلوا سکے کہ وہ مرزا قادیانی کے پیروکار ہیں یا کبھی تھے۔

یہاں اصل حقیقت کو فراموش کر کے مرزا قادیانی کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق کو

مرزائیت یا قادیانیت پر منتج کر دیا جاتا ہے حالانکہ جو افراد مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے قبل ان کے کسی طور دوست یا ساتھی رہے، وہ کسی طرح بھی اس زمرے میں نہیں آتے کہ انھیں منکرینِ ختم نبوت کی صف میں شامل کیا جائے۔ ہاں جنھوں نے دعویٰ نبوت کے بعد بھی ان سے تعلقِ خاطر منقطع نہیں کیا یا جنھوں نے ان کے اس دعویٰ باطل کے بعد ان کی بیعت کی، وہ یقیناً اس زمرے میں آئیں گے۔ اور ان کو ہی ماضی قریب میں غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے اور وہ اب ایک علیحدہ اقلیت کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ''خاندانِ اقبال'' کے کن افراد نے مرزا قادیانی کے ساتھ ان کے دعویٰ نبوت کے بعد تعلق رکھا۔ مرزا صاحب کے 1864ء سے 1868ء تک کے قیام سیالکوٹ میں یقیناً ان کا تعلق خاندانِ اقبال کے ساتھ تھا کیونکہ ایک تو وہ اسی علاقے میں رہائش پذیر رہے، دوسرے والدِ اقبال شیخ نور محمد صاحب چونکہ اہلِ تصوف میں ان دنوں ایک مقامِ خاص کے حامل تھے اور سلسلہ قادریہ میں سائیں عبداللہ قادریؒ سے بیعت (2) تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ سیالکوٹ کے مذہبی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت تھے۔ جب مرزا غلام احمد نے اپنے قیامِ سیالکوٹ کے دوران دفاعِ اسلام کا کام شروع کیا اور مناظروں کا بازار خوب گرم کر دیا تو یہاں کے مذہبی حلقوں میں ان کا خوب چرچا ہوا اور وہ ہر مسلمان کی آنکھ کا تارا بنے۔ سیالکوٹ کے بیشتر گھرانے ان دنوں اس جہاد میں برابر کے شریک تھے اور ان کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔

مرزا صاحب کی زندگی کے تین ادوار نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ اوّل وہ امتِ مسلمہ کے ایک سرگرم مبلغ کی حیثیت میں اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ ان دنوں وہ زیادہ سے زیادہ کشف کا دعویٰ کرتے تھے۔ 1892ء میں انھوں نے ''مسیحِ موعود'' ہونے کا دعویٰ کیا اور پھر 1901ء میں وہ مستقل نبوت کا اعلان فرماتے ہیں جس پر وہ اپنی وفات یعنی 1908ء تک قائم رہے۔ اگر مرزا صاحب کے اس دور کے بیانات و ''الہامات'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے عقلی معیار پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ عجیب و غریب تضادات کا شکار رہے۔ کبھی وہ مشرق کی ہانکتے ہیں تو کبھی مغرب کی۔ ان کو شاید خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دراصل کیا کہنا یا کیا بننا چاہ رہے ہیں۔ یا پھر وہ بڑے چالاک واقع ہوئے تھے کہ لوگوں کو عجیب گومگو کا شکار بنا کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے

تھے اوراس میں شاید وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ درحقیقت وہ ایک گم کردہ راہ مرید کے مترادف تھے جو تصوف کی بھول بھلیوں میں اس مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں اگر صحیح راہنمائی میسر نہ آئے تو گمراہ ہوجانا لازم ٹھہرتا ہے...... یہ وہ مقام ہے جہاں ہر طالب راہِ سلوک اپنے آپ کو ہر چیز، ہر ہستی کا مثیل سمجھنے لگتا ہے اور ''انا الحق'' تک کا دعویٰ کر دیتا ہے...... جو اس مقام پر پھنس گیا، اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یقیناً مرزا قادیانی بھی اس مقام پر پھنس کر رہ گئے تھے کیونکہ وہ اپنی ولایت اور الہامات کا دعویٰ تو پہلے ہی فرما رہے تھے۔ اگر وہ اس مقام کو درست طریق سے عبور کر جاتے تو یقیناً ایک ولی ہوتے مگر جب وہ اس پر ہی پھنس گئے تو پھر وہ ''سب کچھ'' تھے۔ اسی لیے کبھی وہ دعویٰ نبوت کرتے ہیں اور کبھی دعویٰ رسالت، کبھی وہ اِدھر بھاگتے ہیں اور کبھی اُدھر۔ کیونکہ ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ آخر ہیں کیا؟ یہاں تک کہ وہ ہندوؤں کے اوتار کرشن اور حضرت عیسیٰ کی ماں مریم تک بننے کو تیار ہیں۔ ان کے اس مقامِ گمراہی سے سب سے زیادہ فائدہ ان کے خلیفہ اوّل حکیم نورالدین نے اٹھایا اور ان کو کبھی بھی اس گمراہی سے نکلنے کا موقع نہ دیا۔

آمدم برسر مطلب دیکھنا یہ ہے کہ مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت یعنی **1901**ء کے بعد خاندان اقبال میں سے کون ان کے ساتھ منسلک رہا یا اس کے بعد ان پر ''اظہار ایمان'' کیا یا ''بیعت'' وغیرہ کا مرتکب ہوا۔ والدِ اقبال شیخ نور محمد مرحوم کے متعلق خود مرزا غلام احمد کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد نے اپنی کتاب ''سیرت المھدی جلد سوم'' کے صفحہ **249** (سیرت المھدی جلد اوّل حصہ سوم ص **764** طبع جدید) پر تحریر کیا ہے کہ انھوں نے **1893**ء سے قبل ہی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی یعنی مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے بہت پہلے وہ ان سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے جو تعلق بھی تھا، وہ صرف اور صرف تصوف کی وجہ سے تھا۔ یعنی مطلب صاف ہے کہ خاندانِ اقبال کے جن افراد نے مرزا صاحب کا شاید ایک مبلغ اسلام کی حیثیت میں ساتھ دیا، ان کے دعویٰ نبوت سے بہت پہلے ہی ان سے وہ تعلق بھی ختم کر چکے تھے۔ اس لیے کسی قسم کی بہتان تراشی درست نہیں۔ چنانچہ خاندانِ اقبال کے تمام افراد اس سے بری الذمہ ثابت ہو جاتے ہیں کہ وہ کبھی بھی منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل رہے۔ البتہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ خاندان کے صرف ایک فرد کو **1931**ء (3) میں جماعت قادیانی کا ممبر بننے اور آخر دم تک اس سے منسلک رہنے اور غیر مسلم قرار دیے جانے کی ''سعادت'' نصیب ہوئی۔ اس

لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خاندانِ اقبال میں جو واحد نقب قادیانیوں نے لگائی، وہ صرف شیخ اعجاز احمد صاحب کے ذریعے ممکن ہو سکی۔ افرادِ خاندان میں سے کسی نے نہ تو ان سے قبل اور نہ ہی ان کے بعد مرزا قادیانی کی نبوت کا ساتھ دیا اور نہ کبھی ان شاء اللہ دیں گے۔ اسی پر بس نہیں کہ خاندان میں سے کوئی ان کا ساتھی نہیں بنا بلکہ ان کے اپنے اہل وعیال نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ممانی چاند مرحومہ (بیگم شیخ اعجاز احمد صاحب) تو قادیانی جماعت کے انتہائی درجہ کے مخالفین میں شامل تھیں اور کبھی کبھی غصے میں آ کر ان کے اندرونِ خانہ حالات و واقعات پر بڑی سیر حاصل روشنی ڈالا کرتی تھیں۔ انھیں بڑے عجیب وغریب حقائق کا علم تھا اور وہ اکثر اوقات بڑے ذو معنی انکشافات اس سلسلے میں فرمایا کرتی تھیں۔ شاید کچھ اور وجوہات بھی رہی ہوں مگر سب سے اہم وجہ بیگم اعجاز صاحب تھیں جو سدِّ راہ بنیں اور کسی بچے کو باپ کی پیروی نہیں کرنے دی۔ ان کا رویہ اس سلسلے میں اس قدر سخت اور واضح تھا کہ انھوں نے تمام بچوں کی شادیاں بھی غیر قادیانیوں میں ہی کروائیں۔

یہاں اس حقیقت سے شاید مفر نہیں کہ متذکرہ بالا نقب جو خاندانِ اقبال میں لگائی گئی، غلبۂ مادیت کی بنا پر بصیرت سے محرومی اور خواہشِ منصب و جاہ کی وجہ سے ہوش وحواس سے تہی دستی کے بعد ہی ممکن ہوئی۔

ع از چنیں مرداں چہ امید بہی؟

خاندان کے بزرگوں کا ردِّ عمل

والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی مرحوم ومغفور اس کے راوی ہیں کہ میرے بڑے ماموں شیخ اعجاز احمد صاحب نے جب 1931ء میں جماعتِ قادیانی میں باضابطہ شمولیت اختیار کی تو ایک اخبار کے صفحہ اوّل پر بڑے نمایاں طور پر یہ خبر شائع کی گئی اور سب سے اوپر بڑے جلی حروف میں حکیم الامت شاعرِ مشرق کا نام نامی پورے القابات کے ساتھ لکھا گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ حضرت علامہؒ نے ہی بیعت کر لی ہے مگر نیچے دوسری سطر میں بہت خفی قلم سے شیخ اعجاز احمد کے بیعت کرنے کی خبر تھی۔ اس کی وجہ سے کافی غلط فہمی پیدا ہوئی اور ہر طرف اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔

والدِ مرحوم بیان کرتے ہیں کہ...... ''اس واقعہ کے چند روز بعد کی بات ہے، میں بھی

اس وقت وہیں بازار میں موجود تھا۔ ابا جان (شیخ عطا محمد مرحوم) اقبال منزل کے بازار کی جانب والی سیڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے، جب کسی نے ایک اخبار ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس اخبار میں ایک تو متذکرہ بالا خبر چھپی ہوئی تھی اور دوسرے مرزا بشیر الدین محمود کا ایک بیان تھا جس میں انھوں نے خاص طور پر علامہ صاحب کو مشورہ دیا ہوا تھا کہ انھیں اپنے قابل بھتیجے کی ''پاکیزہ جوانی'' سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ وغیرہ۔ اخبار شیخ صاحب کے ہاتھ میں دے کر وہ شخص خاص طور پر ان دونوں خبروں کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کرنے کا خواہش مند ہوا۔ وہ یقیناً جماعتِ قادیانی کا فرستادہ تھا اور شیخ صاحب کو جان بوجھ کر زچ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔''

میرے والد گرامی بتاتے ہیں کہ...... ''بڑے شیخ صاحب اس پر بڑے سیخ پا ہوئے اور انھوں نے سب سے پہلے تو اس تماش بین کی خبر لی اور حسبِ عادت اس پر خوب برسے۔ پھر مرزا غلام احمد، مرزا بشیر الدین محمود، اپنے خلفِ اکبر اور جماعت قادیانی کی ''شان'' میں خوب خوب زہر افشانی فرمائی اور اپنے بڑے صاحبزادے شیخ اعجاز احمد کو ''ناخلف'' تک کہہ ڈالا۔ اس وقت ان کا چہرہ شدتِ جذبات اور غم کے زیرِ اثر بالکل زرد پڑ گیا تھا اور وہ غصے میں بری طرح کانپ رہے تھے کہ تشویش پیدا ہوگئی کہ کہیں کوئی تکلیف لاحق نہ ہو جائے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انھیں اقبال منزل میں اوپر لے جایا گیا مگر ان کا غصہ کسی طور فرو نہ ہو سکا۔''

اسی ضمن میں، میں اپنی والدہ محترمہ وسیمہ مبارک کے بیان کردہ چند واقعات بھی یہاں درج کرنا چاہوں گا۔ یہ تمام واقعات میرے علم میں بہت پہلے سے تھے مگر ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں اس لیے شامل نہ کیے گئے کہ ان کا ذکر خاندانِ اقبال کے لیے یقیناً کوئی ایسا باعثِ فخر نہیں تھا۔ شاید یہ تمام واقعات اور حقائق کبھی بھی منظرِ عام پر نہ لائے جاتے اگر شیخ اعجاز احمد صاحب اپنے بزرگوں کو خواہ مخواہ قادیانی ثابت کرنے پر مُصر نہ ہوتے۔

میری والدہ بتاتی ہیں کہ...... ''جس روز اعجاز بھائی جان کی قادیانی بیعت کی خبر اخبار میں شائع ہوئی اور کسی نے شرارتاً ابا جان کو بازار میں وہ اخبار تھما کر طنز کیا، تو یوں سمجھیے کہ اقبال منزل پر قیامت گزر گئی...... ابا جان کو جب بڑی مشکل سے بازار میں سے اوپر لایا گیا تو وہ سیدھے اندر زنان خانے میں تشریف لے آئے اور تختوں والی نشست گاہ میں آ کر اس قدر بلند آواز میں گرجے برسے کہ پوری اقبال منزل متزلزل ہو اٹھی۔ ہم سب تو اندر کمروں میں دبکے

ہوئے رہے۔ ابا جی کے پاس ماموں غلام نبی صاحب اور پھوپھی کریم بی بی صاحبہ تھیں۔ ابا جی کا غصہ اس روز ساتویں آسمان کی خبر لا رہا تھا اور بار بار ان کا روئے سخن بیچاری بھابھی جی (والدہ صاحبہ) کی طرف ہو ہو جاتا تھا اور وہ بھائی جان اعجاز کا سارا غصہ ان پر ہی نکال دینا چاہتے تھے۔ ماموں غلام نبی صاحب اور پھوپھی کریم بی بی صاحبہ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے مگر یہ کسی طور ممکن نہ ہوسکا......جس بات کا انھیں سب سے زیادہ رنج تھا، وہ مرزا بشیر الدین کا وہ بیان تھا جس میں چچا جان (علامہ صاحب) کو اپنے پاکباز بھتیجے سے سبق حاصل کرنے اور اس کی پیروی میں اپنی عاقبت سنوارنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔''

والدہ مزید بتاتی ہیں کہ......''میں نے ابا جان کا غصہ بہت دیکھا تھا مگر اس روز ان کی حالت بے حد عجیب ہو رہی تھی اور وہ کسی طرح سنبھل ہی نہیں رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ بھائی جان اعجاز کو اس کی سزا کس طرح دیں۔ اخبار کی وہ کاپی جس میں یہ خبر چھپی ہوئی تھی، ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے پٹخ پٹخ کر سارا غصہ اسی پر نکال رہے تھے اور بار بار اس میں چھپی ہوئی متذکرہ خبریں ماموں جان اور پھوپھی جان کو دکھاتے تھے اور پھر گرجنا اور برسنا شروع کر دیتے تھے۔ اس روز ان کا سارا غصہ اعجاز بھائی کے لیے تھا اور ساتھ میں مرزا غلام احمد قادیانی، مرزا بشیر الدین محمود قادیانی، ظفر اللہ خان، چوہدری بشیر، بٹ صاحب اور اعجاز بھائی کے کئی اور دوستوں کے نام لے لے کر انھیں کوستے تھے، جن کے متعلق انھیں پورا یقین تھا کہ اعجاز بھائی کو ورغلانے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ ساتھ ساتھ وہ چچا جان (علامہ صاحب) کا ذکر بھی بار بار کر رہے تھے کہ ''اعجاز نا ہنجار کی اس حرکت سے اسے (علامہ صاحب کو) کس قدر تکلیف اور کوفت ہوگی۔ خدا خدا کر کے ابا جی کا غصہ قدرے کم ہوا تو وہ حسبِ عادت خط لکھنے بیٹھ گئے......ان کی یہ عادت بہت پرانی تھی کہ کوئی معاملہ ہوتا، فوراً خط لکھ کر سپردِ ڈاک کر دیتے اور اپنے خیالات اور مشوروں کا اظہار پوری سچائی کے ساتھ اپنے خطوط میں کر دیا کرتے تھے، خواہ بعد میں اس کے لیے پریشان اور پشیمان ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ میں نے ابا جی کی یہ عادت کئی دفعہ دیکھی ہے کہ جس وقت غصے میں ہوتے تو ایک دم اپنا فیصلہ صادر کر دیتے اور خوب گرجتے برستے مگر بعد میں جب غلطی کا احساس ہوتا تو اپنے سے چھوٹوں سے بھی معافی مانگنے میں عار نہ سمجھتے۔ کئی دفعہ ان کی زندگی میں اور اب اُن کی وفات کے بعد بھی ان کی اس قسم کی تحریریں جو خطوط کی شکل میں لوگوں کے پاس

ہیں، ان کے خلاف استعمال ہوتی رہی ہیں بلکہ اب تک ہو رہی ہیں مگر وہ اپنی اس فطرتِ ثانیہ سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے...... چنانچہ اپنی اسی عادت کے زیر اثر انھوں نے اپنا غصہ اس روز بھی خطوط کے ذریعے نکالا اور اعجاز بھائی صاحب کے ساتھ ساتھ دس بارہ دوسرے افراد کو بھی کارڈ تحریر کر کے سپردِ ڈاک کر دیے۔ میرے خیال میں اعجاز بھائی کے ان دوستوں، جن کے متعلق انھیں یقین تھا کہ انھوں نے ہی بھائی صاحب کو گمراہ کیا ہے، کو انھوں نے ضرور خطوط روانہ کیے ہوں گے۔ جن میں خاص طور پر ظفر اللہ خان، ڈاکٹر بشیر احمد، بٹ صاحب وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ مرزا بشیر الدین محمود کو بھی لازماً ایک خط گیا ہوگا۔ چچا جان (علامہ صاحب) کو تو وہ تقریباً ہر روز خط لکھتے تھے، اس لیے اس واقعہ کی تفصیل بلاشبہ انھیں بھی روانہ کی ہوگی...... ان خطوط میں کیا کچھ لکھا گیا، اس کی تفصیل سوائے ابا جی کے شاید ہی کوئی دوسرا جان سکا ہو کیونکہ کس کی اتنی جرأت تھی کہ ان سے اس سلسلے میں دریافت کر سکتا یا ان کے خطوط یا کسی دوسرے کاغذ کو ہاتھ بھی لگا سکتا۔ ہمیں تو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ ابا جی نے سب کو بڑے سخت خطوط لکھے ہیں اور اب باقی کارروائی جوابات آنے کے بعد ہوگی۔''

میری والدہ خلد آشیانی اپنی پھوپھی زینب بی بی صاحبہ کے حوالے سے بتایا کرتی تھیں کہ...... ''اعجاز احمد کے قادیانی مذہب اختیار کر لینے سے دونوں بھائی صاحبان (شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال) کو ناقابلِ برداشت صدمہ ہوا تھا۔ خاص طور پر اقبال بھائی صاحب نے تو اس کو دل پر لگا لیا اور اکثر و بیشتر اس پر غم و غصے کا اظہار فرمایا کرتے۔ میرے خیال میں ان کی بیماری میں بھی اس کی وجہ سے خاصا اضافہ ہوا کیونکہ ان دنوں وہ پہلے ہی کافی علیل رہنے لگے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ سردار بھابھی کی وفات کے علاوہ اعجاز احمد کا یہ فعل ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف کا باعث بنا تھا۔ میرے سامنے انھوں نے کئی بار اس پر دکھ اور رنج کا اظہار کیا اور بڑے بھائی صاحب کو بھی اس سلسلے میں کئی ایک خطوط لکھے اور بالمشافہ بھی تبادلہ خیالات کرتے ہوئے دیکھا جس میں وہ بار بار نبی اکرم ﷺ اور خداوند تعالیٰ کے حضور اس سلسلے میں بازپرس کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے بڑے بھائی صاحب سے یہاں تک کہا کہ...... ''اس سلسلے میں ہم دونوں ہی جواب دہ ہوں گے کہ یقیناً ہم سے ہی اعجاز کی تربیت میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے کہ اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ ہم سب کے لیے، روزِ حساب باعثِ ندامت ثابت ہوگا......''

والدہ محترمہ مزید بتاتی ہیں کہ...... ''پھوپھی زینب اپنا ایک چشم دید واقعہ یوں بیان کرتی تھیں کہ...... ''ایک روز میں نے دونوں بھائی صاحبان کو دیکھا کہ اقبال منزل میں بڑے بھائی صاحب کے کمرے میں بیٹھے زار و قطار روتے چلے جا رہے ہیں۔ میں سمجھی کہ شاید بے جی اور میاں جی کو یاد کر رہے ہیں مگر جب قریب جا کر بیٹھی تو پتہ چلا کہ اعجاز احمد کا قادیانی ہو جانا زیر بحث تھا۔ اقبال بھائی صاحب ہمیشہ سے بڑے رقیق القلب تھے اور آخری عمر میں تو اس میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ خاص طور پر رسولِ مقبول ﷺ کا نام نامی ہی کسی کی زبان پر آ جاتا تو ان کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اعجاز کے مرتد ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بڑے بھائی صاحب کو بھی اس روز میں نے اس سلسلے میں ان کے ساتھ مل کر زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑے سخت مزاج تھے مگر بڑھاپے نے بالکل بے بس کر دیا تھا اور وہ اعجاز احمد سے اس سلسلے میں باز پرس کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ میرا دل بھی اس صورتِ حال پر بھر آیا اور میں بھی ان کے ساتھ مل کر رونے لگی کہ اولاد، انسان کو کس طرح بے بس کر دیتی ہے۔ میرے دونوں بھائی، جن میں سے ایک وہ (شیخ عطا محمد) جس کے رعب اور دبدبے کا یہ عالم ہوا کرتا تھا کہ انسان تو انسان در و دیوار تک کانپتے تھے، کسی کی کیا مجال تھی کہ ان کے حکم سے سرتابی کا خیال بھی دل میں لا سکے اور دوسرے وہ (علامہ اقبال) جن کو سارا زمانہ پوجتا تھا اور جو عشقِ رسول ﷺ کی زندہ مثال تھے۔ دونوں کو اپنے ہی خون نے بے دست و پا کر دیا تھا اور ان کے پاس سوائے دل و جگر جلانے کے اور کچھ حل اس مسئلہ کا نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے دونوں بھائی اسی جانکاہ حادثہ کی نذر ہوئے اور بہت قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ درحقیقت بارگاہِ خداوندی اور حضورِ رسالت مآب ﷺ میں باز پرس کا خوف ہی ان دونوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اعجاز احمد نے دنیاوی فوائد کے حصول کے لیے اپنے باپ اور چچا دونوں کو روزِ محشر بڑی مشکل اور پُر از ندامت صورتِ حال میں گرفتار کر دیا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ انسان اپنے بچوں کو کتنی محنت سے پالتا ہے، پوستا ہے، پڑھاتا ہے، لکھاتا ہے تاکہ اس کے بڑھاپے کا سہارا بنیں مگر ہم لوگوں کا سارا زور صرف اور صرف دنیا کے لیے ہی ہوتا ہے۔ بہت کم عاقبت کا خیال رکھتے ہیں اور ایسی اولاد کی تمنا کرتے ہیں جو روزِ محشر باعثِ ندامت ثابت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔''

علاوہ ازیں میرے والدِ گرامی کے بیان کے مطابق......''جب ابا جان (شیخ عطا محمد) کا آخری وقت قریب تھا تو ان کے تینوں صاحبزادگان میں سے کوئی بھی سیالکوٹ میں موجود نہیں تھا چنانچہ مجھے اپنے خسرِ محترم کا مرض الموت میں ہر طرح خیال رکھنا پڑا اور ان کی تیمار داری کا شرف حاصل ہوا۔ ان دنوں میں کئی بار ابا جی (شیخ عطا محمد) نے مجھ سے یہ ذکر کیا کہ ان کا قادیانی جماعت سے بالکل کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان دنوں بھائی اعجاز صاحب کا جو بھی خط آتا تھا، اس میں وہ اپنے والد کو بیعتِ قادیان کی ترغیب دیتے تھے کہ آپ حضرت صاحب کو خط لکھ دیں۔ ہر خط پڑھ کر ابا جی غصے میں لال پیلے ہو جاتے تھے اور مرزا قادیان، اس کے خلفا اور ساتھ میں اعجاز صاحب کو بے نقط سناتے تھے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔''

والدِ گرامی مزید بتاتے ہیں کہ ''انہی دنوں جب اعجاز بھائی کا ایک خط آیا تو......ابا جی (شیخ عطا محمد مرحوم) نے بڑے دکھ کے ساتھ مجھے بتایا کہ......''پہلے تو مجھے رغبت ہی دیا کرتا تھا مگر آج تو اس ناہنجار نے انتہا ہی کر دی ہے اور لکھا ہے کہ ''میں (اعجاز احمد) نے آپ کی جانب سے جماعت کو آگاہ کر دیا ہے کہ آپ پوری طرح بیعت کے لیے آمادہ ہیں اور بہت جلد اس سلسلے میں خط روانہ کر دیں گے۔'' اس روز ابا جی کی حالت دیدنی تھی۔ بیماری کی وجہ سے وہ پہلے ہی بڑے لاچار ہو رہے تھے۔ اوپر سے یہ اندوہناک اطلاع......مجھے یہ سب بتاتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ گھر کے تمام افراد ان کے گرد جمع ہو گئے۔ بھابھی جی (بیگم شیخ عطا محمد) نے مجھ سے پوچھا...... ''نظیر احمد کیا ہوا؟'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی ابا جی چیخ اٹھے......''یہ اعجاز کیوں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ یہ کیوں میری عاقبت برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے؟'' بھابھی جی حیران و پریشان کھڑی میری جانب سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھیں، چنانچہ میں نے انھیں اعجاز بھائی کے خط کے متعلق بتایا تو وہ مزید پریشان ہو گئیں مگر سوائے بے بسی کے ان کے بس میں بھی کچھ نہیں تھا۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد ابا جی نے اس روز دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور تفصیلاً بتایا کہ......''مرزا غلام احمد قادیانی نے جب تک نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، وہ اچھا کام کر رہا تھا اور یہاں سبھی اس کے ساتھ تھے کیونکہ وہ ہندوؤں اور عیسائیوں سے اسلام کے حق میں بڑی اچھی طرح چومکھی لڑ رہا تھا اور ہم سب اس کو مبلغِ اسلام سمجھا اور کہا کرتے تھے مگر جب اس نے ختم نبوت کا انکار کیا تو تقریباً سب نے اس سے قطع تعلق کر لیا کیونکہ کوئی سچا مسلمان ختم نبوت کا منکر نہیں ہو سکتا۔ میاں جی نے تو بہت

پہلے ان کو خط بھی لکھ دیا کہ ہمارا آپ سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر اس اعجاز نے دنیاوی فائدے کی خاطر چوہدری ظفر اللہ، ڈاکٹر بشیر اور اپنے اسی قسم کے قادیانی دوستوں کے بہکاوے میں آ کر بیعت کر لی اور ہم سب کے لیے باعثِ ندامت بنا۔ اس کا چچا (علامہ صاحب) بھی اس کی اسی حرکت کی وجہ سے بے حد غمگین اور سوگوار اس دنیا سے رخصت ہوا اور اس نے مجھ سے شکایت بھی کی کہ اعجاز نے خاندان کی ناک کٹوا دی۔ وہ بیچارہ تو میدانِ حشر میں رسوائی کے ڈر سے بے حد پریشان تھا اور اب یہ ناہنجار میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں آخر کیوں اور کس طرح اس کی بات مان لوں، میں تو پہلے ہی روزِ حساب پُرسشِ احوال سے لرزاں ہوں۔'' اس کے بعد حسبِ عادت انھوں نے دو خطوط لکھ کر حوالہ ڈاک کر دیے۔ ایک اعجاز بھائی کو اور دوسرا قادیانی جماعت کو جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، اس لیے مجھ سے کوئی امید وابستہ نہ کی جائے۔''

میاں جی شیخ نور محمد مرحوم و مغفور کے جس خط کا ذکر نانا جان قبلہ شیخ عطا محمد مرحوم نے کیا اس کی تفصیل یہاں بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ اس کا ذکر کئی ایک کتابوں میں پہلے آ چکا ہے مگر ایک بار پھر اسے تازہ کر لینے سے کئی ایک شکوک کا ازالہ ہو سکے گا۔ میاں جی کے خط کا متن شاید کسی کے علم میں نہیں مگر اس کا تذکرہ مرزا بشیر احمد نے اپنی کتاب ''سیرت المہدی'' میں اس طرح کیا ہے:

''ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً 1891ء یا 1892ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سیّد حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیحِ موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ اُن دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا، اس لیے ان دنوں میں انھوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیحِ موعود کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیحِ موعود کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ...... آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام لکھا گیا جس میں لکھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں

بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں......ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے، اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈہ تھا۔'' (4)

حضرت علامہ اقبالؒ نے 1893ء میں میٹرک پاس کیا اور کالج میں داخل ہوئے۔ چنانچہ میاں جی نے متذکرہ بالا خط زیادہ سے زیادہ 1895ء میں لکھا ہوگا۔ جب کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے 1901ء میں دعویٰ نبوت کیا۔ یعنی مرزا صاحب کے انکار ختم نبوت سے بہت پہلے خاندان اقبال ان سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ شیخ اعجاز احمد صاحب کی پیدائش 1899ء کی ہے یعنی ان کی پیدائش سے کافی عرصہ قبل یہ تعلق ختم ہو چکا تھا اس لیے ان کا یہ فرمانا کہ......''بے جی نے ابا جان سے حضرت صاحب کو دعا کے لیے خط لکھوایا۔'' (5) حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور ان کی لاعلمی کا مظہر ہے یا وہ جان بوجھ کر اپنی ولادت کو ''حضرت صاحب'' کی دعا کا نتیجہ ظاہر کر کے تاریخی حیثیت حاصل کرنا چاہ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں شاید وقت کا حساب بھی ان سے صحیح نہیں ہو سکا کہ میاں جی کی قادیانی جماعت سے علیحدگی کو تسلیم کر لینے کے باوجود 1902ء (6) تک یہ تعلق قائم ہونے کا بھی دعویٰ کر رہے ہیں، جب کہ یہ رابطہ 1895ء تک منقطع ہو چکا تھا۔

پیشتر اس کے کہ اس سلسلے میں کچھ مزید حقائق بیان کیے جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب شیخ اعجاز احمد کی تضاد بیانی کا تھوڑا اور ذکر کر لیا جائے۔ موصوف اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''1929ء کے غالباً دو ایک سال بعد کی بات ہوگی کہ میں نے بیعت کر لی...... میرے بیعت کر لینے کے بعد شاید دوسرے سال ابا جان نے میرے ہاتھ اپنی بیعت کا خط جماعت احمدیہ کے امام کے نام بھیجا تھا اور حضور نے بیعت منظور کر لی تھی۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ دو ایک سال بعد میرے ہمراہ قادیان گئے اور میرے مواجہہ میں دستی بیعت بھی کی۔ اس کی خبر روزنامہ الفضل کی 10 اپریل 1934ء کی اشاعت میں درج ہے۔'' (7)

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہوتے ہیں:

''ابا جان جماعت احمدیہ میں ابتدائی شامل ہونے والوں میں سے تھے۔ وہ ان 313 دوستوں میں سے ہیں جن کے نام بانی سلسلہ نے اپنی کتاب ضمیمہ انجام آتھم میں درج کیے ہیں۔

اس فہرست میں ان کا نام نمبر 224 پر ہے۔‘‘(8)

پھر اسی جگہ تھوڑا آگے چل کر 1929ء میں لکھے گئے ایک خط کے حوالے سے بھی یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش فرمائی کہ 1929ء(9) تک شیخ عطا محمد صاحب قادیانیت پر قائم تھے۔ ان کے یہ متضاد بیانات عجب صورتِ حال پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں کہ پہلے تو بڑے شیخ صاحب کو سابقون میں شامل فرماتے ہیں، پھر 1929ء تک کی سند پیش کرتے ہیں۔ حیرت کی بات کہ انھیں اپنی بیعت کی تاریخ بھی یاد نہیں، ان کے بیان کے مطابق انھوں نے غالباً 1931ء میں قادیانی بیعت کی۔ دوسرے سال یعنی 1932ء میں اپنے والد صاحب کا نامۂ بیعت اپنے امام صاحب کو پیش کیا۔ پھر دو ایک برس بعد یعنی 1934ء میں ان کے والد گرامی نے ان کے مواجہہ میں دستی بیعت بھی کی اور اس کے متعلق خبر بھی قادیانی روزنامہ ’’الفضل‘‘ کی 10 اپریل 1934ء کی اشاعت میں درج ہوئی۔ یعنی 1931ء سے 1934ء تک تمام امور تکمیل پا گئے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں اگر شیخ اعجاز صاحب کے قریبی دوست اور مشہور قادیانی چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب کا بیان دیکھا جائے تو سارا معاملہ ہی گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

’’شیخ اعجاز احمد صاحب نے غالباً 1936ء میں حضور کی بیعت کی تھی۔‘‘(10)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب 1931ء میں اعجاز صاحب نے بیعت کی، تو شیخ عطا محمد مرحوم نے بڑے شدید ردعمل کا اظہار فرمایا جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے اور ان کی اس حرکت پر دونوں بھائی (شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال) بے دست و پا گریہ کناں ہوئے۔ اگر شیخ عطا محمد مرحوم خود قادیانی جماعت کے ممبر تھے اور ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے تو پھر اتنے شدید ردعمل کا اظہار چہ معنی دارد؟ صرف شیخ اعجاز احمد صاحب کے کہہ دینے سے یہ نہیں مانا جا سکتا کہ خاندان کے تمام بزرگ غلط بیانی سے کام لے رہے تھے۔ آخر کیوں؟ اگر شیخ عطا محمد صاحب قادیانی عقائد رکھتے تھے تو انھیں کسی سے چھپانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی اور اگر ایسا تھا تو حضرت علامہؒ کو ان سے اعجاز صاحب کی شکایت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

اسی طرح غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اعجاز صاحب نے شیخ عطا محمد مرحوم کے جنازے کے متعلق بھی ’’مظلوم اقبال‘‘ میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب ان (اعجاز صاحب) سے

اجازت مانگی گئی تو انھوں نے بخوشی اجازت ہی نہیں دی بلکہ غیر قادیانیوں کو پہلے جنازہ پڑھنے کی دعوت بھی دے دی۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی اور چالاکی سے اس بات کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ درحقیقت جب شیخ عطا محمد مرحوم کا انتقال ہوا تو شیخ اعجاز صاحب نے ان کا جنازہ علیحدہ پڑھنے کی کوشش ضرور فرمائی مگر بری طرح ناکام رہے۔ اس سلسلے میں میرے والد محترم بتایا کرتے تھے کہ...... ''جب ابا جی (شیخ عطا محمد صاحب) کا جنازہ مولانا سکندر خاں مرحوم نے پڑھوا دیا تو اعجاز بھائی صاحب اس میں شامل نہیں ہوئے...... بعد میں اپنے قادیانی ساتھیوں کے ساتھ الگ نماز جنازہ پڑھنے کی جب کوشش کی تو صرف ایک آدمی ان کے ساتھ کھڑا ہوا، جب اعجاز صاحب نے دیکھا کہ کوئی دوسرا ان کے ساتھ شمولیت کے لیے آگے نہیں آ رہا، کیونکہ باقی سب حاضرین تو پہلے ہی نماز جنازہ ادا کر چکے تھے، تو ان کا چہرہ بالکل فق ہو گیا...... چنانچہ ان کے ایک دوست سے شاید ان کی وہ حالت دیکھی نہ گئی اور حالانکہ وہ صاحب پہلے ایک دفعہ سب کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر چکے تھے، دوبارہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور اس طرح کل تین افراد نے دوبارہ نمازِ جنازہ ادا کی۔

علاوہ ازیں جب 1959ء (11) میں شیخ عطا محمد مرحوم کی بیگم صاحبہ محترم مہتاب بی بی صاحبہ خلد آشیانی یعنی شیخ اعجاز احمد صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو اعجاز صاحب نے تمام مسلمانوں کے ساتھ ان کی نماز جنازہ ادا کی، کیونکہ اپنے والد محترم کے جنازے پر ان کو بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا اور وہ یقیناً اس کا اعادہ نہیں چاہتے تھے۔ یہ راقم الحروف کے سامنے کی بات ہے کہ اعجاز ماموں نے راستے میں ہی اپنے چند جماعتی احباب سے جو جنازہ کے ساتھ موجود تھے، کہہ دیا تھا کہ...... ''میں اپنی ماں کا جنازہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا، اس لیے اگر آپ کو سب کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنا گوارا ہو تو ساتھ چلیں ورنہ یہیں سے واپس ہو جائیں کیونکہ میں سب کے ساتھ نمازِ جنازہ ادا کروں گا۔'' چنانچہ ان کے قادیانی دوست و احباب وہیں سے پلٹ گئے اور اعجاز ماموں نے سب مسلمانوں کے ساتھ انہی مولانا سکندر خان مرحوم جنھوں نے شیخ عطا محمد مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی تھی اور جو اقبال منزل کے بالمقابل جہانگیری مسجد کے پیش امام اور حنفی العقیدہ مسلمان تھے، کی اقتدا میں نمازِ جنازہ ادا کی۔

اسی طرح مجھے یہاں ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے کہ کس طرح اعجاز ماموں نے اپنے خسر

محترم کی نمازِ جنازہ میں شرکت فرمائی تھی۔ یہ راقم الحروف کے سامنے کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھا۔ ایک روز اطلاع ملی کہ اعجاز ماموں کے خسر وفات پا گئے ہیں۔ چنانچہ خالہ عنایت کے ہمراہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ ماموں اعجاز صاحب بھی کراچی سے تشریف لا رہے تھے۔ وہ بزرگوار ان دنوں اپنے صاحبزادے کے پاس گلبرگ کالونی کے پی بلاک میں مقیم تھے۔ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اعجاز ماموں بھی کراچی سے تشریف لے آئے اور جنازہ گلبرگ کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ جب سب لوگ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوئے تو اعجاز ماموں الگ تھلگ ایک طرف کھڑے رہے۔ اب جن لوگوں کو ان کے عقائد کے بارے میں علم نہیں تھا، وہ بار بار ان کو اشارے کر رہے ہیں کہ آیئے نمازِ جنازہ میں شریک ہو جایئے مگر وہ لاتعلق منہ دوسری طرف موڑے کھڑے ہیں اور کبھی ادھر اور کبھی اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ان کے سسرالی عزیزوں کو تو یقیناً معلوم ہوگا مگر انھیں بھی شاید اس کا یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایک اچھا بھلا سمجھدار انسان جو خاص طور پر کراچی سے لاہور پہنچا ہے تاکہ اپنے خسر کے جنازے میں شرکت کر سکے، وہ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے سے گریزاں ہے۔ اوّل تو انھیں اس طرح کراچی سے آنا ہی نہیں چاہیے تھا یا پھر گھر پر ہی ٹھہر جاتے مگر وہ تو اپنی لاتعلقی کا برسرِ عام اعلان کرنے ہی کے لیے شاید اتنی دور سے آئے تھے...... آخر جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو مجبوراً مجھے ہی یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا اور میں نے نماز جنازہ میں ان کے شریک نہ ہونے کی وجہ لوگوں کے گوش گزار کر دی۔ سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے کیونکہ شاید ان سب کے لیے وہ پہلا تجربہ تھا کہ قادیانی حضرات کس طرح اپنے عقائد پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ چنانچہ نمازِ جنازہ اعجاز ماموں کے بغیر ادا کی گئی اور انھوں نے اپنے خسرِ محترم کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی نہ سب کے ساتھ اور نہ ہی علیحدہ، کیونکہ ان کے خسر قادیانی عقائد نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کے حساب میں ''کافروں'' میں شامل تھے۔ میرے خیال میں قادیانی عقائد رکھنے والے جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو یہ احساس دلا سکیں کہ وہ ایک علیحدہ حیثیت کے مالک اور ایک الگ مذہب کے پیروکار ہیں۔ مگر اب جب انھیں ایک علیحدہ حیثیت مستقل طور پر مل گئی ہے اور انھیں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا ہے تو ان کو برا محسوس ہوا ہے اور اب وہ مسلمانوں میں ہی شامل رہنے پر مُصر ہیں۔ اصل میں یہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کو یہ کافر بھی

قرار دیتے رہیں اوران میں شامل بھی رہیں۔ یا پھران کا خیال یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو ''کافر'' قرار دے کر ''اقلیت'' بنا دیا جائے اوران کی جماعت کو ''اصل مسلمان'' تسلیم کر لیا جائے۔ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں توان کی کم عقلی پر ماتم کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب، جن دنوں مرزا غلام احمد قادیانی یہاں سیالکوٹ میں ملازمت کر رہے تھے اور کوچہ حسام الدین میں ان کا قیام تھا تو کافی لوگ ان کی اس تحریک میں شامل تھے جو وہ دفاعِ اسلام کے طور پر کر رہے تھے۔ اگر اس دور پر طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو سیالکوٹ کے کافی گھرانوں میں ان کے ساتھی مل جائیں گے۔ خاص طور پر محلّہ کشمیریاں میں تو ان کا اثر زیادہ ہی نمایاں رہا۔ عام لوگوں کے علاوہ سیّدزادوں تک ان کے پیروکاروں میں شامل تھے۔ دراصل مرزا صاحب نے اپنے کام کا آغاز گزشتہ صدی کے وسط میں آریہ سماجیوں کی مخالفت اور مناظروں سے کیا۔ پھر انھوں نے اپنا رخ عیسائی پادریوں کی طرف پھیرا اور خوب خوب مناظرے اُن سے کیے۔ چنانچہ عام طور پر مسلمان ابتداء میں انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان دنوں سیالکوٹ میں عیسائی مشنریوں کا بہت زور تھا۔ شہر کا سب سے اچھا سکول عیسائی مشنری ہی چلا رہے تھے اور اپنا زہریلا پراپیگنڈہ ہر طرف پھیلا رہے تھے۔ فوج کی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے کئی ایک گرجا گھر بھی یہاں تعمیر ہو چکے تھے اور مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو مرزا غلام احمد کی صورت میں ایک بڑا اچھا مقرر مل گیا تھا۔ چنانچہ اس دور کے دینی ماحول میں سب لوگ روزانہ شام کو جمع ہوتے اور دینی امور پر سیر حاصل بحث و تمحیص ہوتی اور مرزا صاحب کو ان کے مناظروں پر داد دی جاتی اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیا جاتا۔ اُن دنوں سیالکوٹ کے باسی انھیں ایک شعلہ بیان مقرر کے طور پر جانتے اور مانتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد مرزا صاحب نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو محدث اور مجدد کہلوانا شروع کر دیا اور اپنے عجیب و غریب کشف بیان فرمانے لگے اور کسی حد تک پیری مریدی کا در پردہ سلسلہ بھی قائم کر لیا۔ اُس دور میں یہ بڑا عام سا رواج تھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی پیر صاحب کی بیعت ضرور کر لیتا تھا۔ خاص طور پر کشمیری خاندان تو پیری مریدی کے بے حد قائل تھے اور ان کے پیر صاحبان تو کشمیر سے بھی آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد تک کشمیر سے یہ پیر صاحبان تشریف لایا کرتے تھے اور مختلف گھرانوں

میں قیام کیا کرتے تھے اوران کی بڑی آ ؤ بھگت ہوا کرتی تھی۔اس ماحول میں مرزا صاحب کی پیری مریدی چلنے کے امکانات خاصے روشن تھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا سیالکوٹ میں قیام زیادہ سے زیادہ 1870ء تک رہا۔قادیان واپس جا کر وہ مختلف مقدمات میں مشغول رہے۔کتابیں لکھتے اور چھپواتے رہے۔1886ء سے انھوں نے عجیب وغریب الہامات شائع فرمانے شروع کیے اور لوگوں کو حیران و پریشان کر دیا۔ 1891ء میں ''المسیح الموعوذ'' اور ''المہدی المسعو دٗ'' ہونے کے دعوے داغ دیے۔اس کی وجہ سے یہاں سیالکوٹ میں لوگ ان سے متنفر ہونا شروع ہو گئے۔چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کا رابطہ انگریز حکمرانوں سے بڑا پرانا تھا،اس لیے انھوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مرزا مسلمانوں پر خاصے اثر انداز ہو سکتے ہیں ان کو مسلمان اور اسلام کے خلاف استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور مرزا صاحب نے اپنی خاندانی روایات کے عین مطابق فوراً صاد کر دیا اور سرکارِ انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا بننا منظور کر لیا اور اسی منصوبہ کے زیراثر 1901ء میں انکارِ ختم نبوت کرتے ہوئے دعویٰ نبوت کر دیا اور جہاد کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جیسے ہی 1901ء میں دعویٰ نبوت کیا، ہر طرف ایک شور اٹھا اور صحیح العقیدہ مسلمانوں نے فوراً قطع تعلق کر لیا اور کسی صورت اُن کی سازش میں شریک نہیں ہوئے۔جہاں تک خاندانِ اقبال کا تعلق ہے، میاں جی (شیخ نور محمد مرحوم) بہت پہلے لاتعلقی کا اظہار کر چکے تھے جس کا ثبوت ان کی (قادیانی جماعت) کی کتابوں میں موجود ہے اور گزشتہ صفحات میں اس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔انگریز حکومت کے ساتھ مل کر اس جماعت نے لوگوں کو مختلف لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور بہت سے کمزور ایمان والے جلبِ منفعت کے لیے ان کے چکر میں آ گئے۔اکثر نے خوب دُنیا کمائی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔انہی میں شیخ اعجاز احمد صاحب بھی شامل تھے۔دنیا میں انھوں نے خوب ترقی کی اور سر ظفر اللہ خان، جو ان کے بڑے قریبی دوست تھے، نے انھیں خوب خوب فائدہ پہنچایا۔

مندرجہ بالا تمام حقائق اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے انکارِ ختم نبوت کے بعد خاندانِ اقبال میں سے صرف شیخ اعجاز احمد صاحب نے ان کی بیعت کی اور 1931ء میں ان کی بیعت کے وقت شیخ عطا محمد مرحوم نے جس طرح غم و غصے کا اظہار فرمایا اور

چھوٹے بھائی (علامہ صاحب) کے ساتھ مل کر جس طرح اس سانحہ پر ماتم کناں ہوئے اور مرض الموت میں جس طرح جماعتِ قادیانی کو اپنے ''صاحبزادے'' شیخ اعجاز احمد کی طرف سے لکھے گئے خط کے سلسلے میں وضاحتی خط ارسال کیا اور پھر اپنے جنازے کے متعلق میرے والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی مرحوم کو آخری وصیت فرمائی...... یہ تمام حقائق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ شیخ عطا محمد صاحب کبھی بھی منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل نہیں رہے کیونکہ اگر وہ مرزا قادیانی کے متعلق ذرا سا بھی نرم گوشہ رکھتے تو کبھی بھی اس طرح کا ردعمل ظاہر نہ فرماتے کیونکہ انھیں کس کا ڈر تھا کہ وہ اپنا یہ فعل پوشیدہ رکھتے۔ اگر وہ مرزا قادیان کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا چاہتے تو کوئی ان کو منع کرنے والا نہیں تھا کیونکہ وہ اس وقت خاندان میں سب سے بڑے تھے۔ چنانچہ یہ کہنا پڑے گا کہ شیخ اعجاز صاحب نے جان بوجھ کر ان پر بہتان لگایا ہے تا کہ خاندان کا کم از کم ایک فرد تو ان کے ساتھ شامل ہو اور ان پر خاندانِ اقبال کا ''اکلوتا قادیانی'' ہونے کا جو لیبل چسپاں ہو گیا ہے، وہ کسی طور ختم ہو سکے اور وہ دعویٰ کر سکیں کہ انھوں نے اپنے والد کی پیروی میں یہ قدم اٹھایا۔ مگر حقیقت کو تبدیل کرنا کبھی کسی کے بس میں نہیں رہا اور سچائی ہمیشہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اب اگر کسی طرف سے کوئی اس قسم کے ''خانہ ساز'' ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تو انھیں جھٹلانا اتنا مشکل نہیں ہو گا۔

اس لیے اب یہ بھی بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت اور تسلیم شدہ ہے کہ خاندانِ اقبال میں سے صرف اور صرف ایک فرد منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل ہوا اور اس نے بھی 1931ء میں اس میں شمولیت اختیار کی۔ اس سے پہلے کوئی اس گروہ میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی خاندانِ اقبال کا کوئی دوسرا فرد اس کے بعد اس گروہ میں شامل ہوا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جو تھوڑا بہت تعلق مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ تھا، وہ بھی صرف ان کے مبلغِ اسلام ہونے کے ناطے سے تھا اور ان سے کوئی تعلق کسی اور حوالے سے کسی دور میں نہیں رکھا گیا۔ اگر حضرت علامہ نے اس وقت ان کی حمایت میں چند اشعار لکھے تو وہ صرف اس لیے کہ اس وقت مرزا صاحب کی حیثیت اسلام کے ایک پُر زور مبلغ کی تھی، نہ کہ اسلام کے خلاف دعویٰ نبوت کر کے خود کو ایک نئے فتنہ ارتداد کا بانی ثابت کرنا اور منکرینِ ختم نبوت کا ایک ایسا گروہ تشکیل دینا جس نے آگے چل کر ایک انتہائی متنازع فیہ شکل اختیار کرنی تھی اور جس نے کھلم کھلا فرنگیوں کی حمایت کرتے ہوئے

اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانا تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے دل میں چھپے اس چور کو اس وقت کوئی بھی نہ پہچان سکا کہ دلوں کے بھید صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں۔ اس لیے سادہ لوح لوگ جن کے دلوں میں اسلام کی سربلندی کی تڑپ تھی، مرزا قادیانی کے اس ہم رنگِ زمین جال کی اصلیت کو نہ جان سکے اور اندھی عقیدت کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ان کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب ''ختم نبوت'' جو ہر سچے مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہے، کا انکار کیا گیا۔ انکارِ ختم نبوت کا یہ اعلان فدایانِ رسالت ﷺ کے لیے تازیانے کا حکم ثابت ہوا اور انھوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مرزا قادیانی کے ساتھ ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا۔ خاندانِ اقبال تو اس سے بہت پہلے اس گروہ سے کنارہ کش ہو چکا تھا جس کی تائید خود مرزا بشیر احمد ''سیرت المہدی'' میں فرما چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ خاندانِ اقبال کا کوئی دوسرا فرد اس گروہ میں شامل نہیں رہا اور انھوں نے ہمیشہ دنیا پر دین کو ترجیح دی۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا!

(بالِ جبریل)

آخری حسرت

''مظلوم اقبال'' میں ''آخری ملاقات'' کے عنوان کے تحت جناب شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنے عظیم چچا جان سے آخری ملاقات کا بڑا عجیب و غریب احوال بیان فرمایا ہے...... ذرا ان کے الفاظ ملاحظہ کریں:

''میں نے عرض کیا، میری رخصت آج ختم ہو رہی ہے لہٰذا میں رات کی گاڑی سے دہلی جا رہا ہوں...... انھوں نے گاؤ تکیہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے مصافحہ کیا تو نحیف آواز میں ''خدا حافظ'' کے الفاظ سنائی دیے۔ یہ سب باتیں ان کے معمول کے بالکل خلاف تھیں...... ان کے ہاں قیام کے بعد جب کبھی رخصت ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پنجابی میں صرف اتنا فرماتے...... ''اچھا چلیاں اے'' (اچھا جا رہے ہو) وہ نہ تو کبھی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے نہ ہی خدا حافظ کہتے...... رخصت کا یہ خلافِ معمول انداز مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔''(12)

اگر آپ کے پاس ایک دردمند دل اور اس میں ہلکی سی تڑپ موجود ہے تو تھوڑا سا یکسو ہونے سے حضرت علامہ کے اس غیر معمولی طرزِ عمل کا جواز کسی حد تک سمجھ میں آ جاتا ہے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب نے بھی طرزِ عمل میں غیر معمولی بات محسوس ضرور کی مگر اس پیغام تک رسائی نصیب نہ ہوئی جو ان کو عمِ محترم دینا چاہ رہے تھے۔ یقیناً وہ اس پیغام کی گہرائی تک نہیں پہنچ پائے کہ آخر کیوں یہ عظیم شخصیت جو ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ اس قدر قوی رہی، جس نے اپنی پوری زندگی کفر و الحاد کی قوتوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا اور جو اپنی قوم اور ملت کے لیے باطل کے سامنے ہمیشہ سینہ سپر رہی، جس نے اپنا سب کچھ ملک و قوم کی بھلائی کے لیے ہمیشہ داؤ پر لگائے رکھا اور جس نے کبھی بھی اپنے بڑے سے بڑے فائدے کو سوادِ اعظم پر فوقیت نہیں دی، وہ آخر آج اس قدر کمزور کیوں پڑ گئی......اس کی گرفت اتنی بے جان کیوں ہو رہی ہے اور آج اس نے مجھے یہ شرف کیوں بخشا ہے کہ وقتِ رخصت مردہ سا ہی سہی، مگر ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہا......

کاش! اعجاز صاحب اپنے عمِ محترم کی اس وقت کی دلی کیفیت جان سکتے اور ان کی آخری وقت کی وہ خواہش جو انھوں نے اپنے اس بھتیجے سے کی تھی جو خود کو ان کا بڑا مزاج آشنا سمجھا کرتا تھا اور جس سے انھوں نے اور ان کے برادرِ بزرگ نے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ مگر نہیں، شیخ اعجاز احمد صاحب کی قسمت میں وہ اعزاز شاید نہیں تھا، جو حضرت علامہؒ نے اس وقت انھیں حاصل کر لینے کا اشارہ دیا۔

تھوڑا سا اس غیر معمولی طرزِ عمل کی گہرائی میں جانے کی کوشش کیجیے۔ ذرا ایک حساس دل سے اس صورتِ حال کا موازنہ کریں کہ کس طرح ایک کمزور بلکہ مردہ سا ہاتھ اعجاز صاحب کے ہاتھ میں دے کر حضرت علامہؒ ان سے کیا کہنا چاہ رہے تھے...... یقیناً اس وقت تک حضرت علامہ کو اپنے وقت آخرت کے بالکل قریب ہونے کا پورا پورا ادراک ہو چکا تھا اور انھیں یہ بھی احساس تھا کہ اعجاز کے ساتھ یہ ان کی آخری ملاقات ہے......انھوں نے کسی دوسرے سے کیوں اس طرح مصافحہ نہیں کیا اور نہ ہی خدا حافظ کہا؟ حالانکہ دمِ واپسیں تک لوگ ان کے قریب موجود تھے۔

کیا اس وقت اپنے غیر معمولی طرزِ عمل سے حضرت علامہؒ نے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ اچھا اب میرا دم واپسیں ہے، شاید دوبارہ ملاقات ممکن نہ ہو......خدا حافظ میرے بیٹے! میرے حال پر رحم کھاؤ اور مجھے اس ندامت سے بچا لو جس کے قابل میں خود کو نہیں پا رہا......

میرا دل اس وقت کے خوف سے بیٹھا جا رہا ہے، جب مجھ سے تمھارے بارے میں باز پرس ہوگی، وہاں میں کیا جواب دوں گا...... یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے اور میرے ہاتھوں پیروں سے ابھی سے ہی جان نکل رہی ہے۔ خدا جانے وہاں میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے اور یہ سب کچھ تمہاری اور صرف تمہاری وجہ سے ہوگا، صرف تم ہی مجھے اس گرداب سے نکال سکتے ہو کہ تم نے جو داغ میرے ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کے نصیب پر لگایا ہے، خدارا اسے ختم کر دو کیونکہ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے کہ روزِ محشر میں کس منہ کے ساتھ اس عظیم ہستی کا سامنا کروں گا کہ جس کے ساتھ تم نے، میرے اپنے خون نے، بے وفائی کی......؟

میرے بیٹے! میں نے ساری زندگی جس کی عظمت کے گن گائے اور جس کی محبت میرا سب سے عزیز سرمایۂ حیات ہے اور جس کی شفاعت پر میں تکیہ کیے بیٹھا ہوں اور میدانِ حشر میں ''دارد امیدِ شفاعت ز محمد اقبال'' مگر تم نے یہ کیا کر دیا، اسی کے سامنے میری رسوائی کا سامنا کر دیا...... میں اب کس طرح وہاں شفاعت کے لیے دست سوال دراز کر سکوں گا...... میری نگاہ تو یہاں نہیں اٹھ رہی، وہاں کیا بنے گا......؟

مگر حضرت علامہؒ نے جو پُر حسرت نگاہیں اعجاز صاحب پر ڈالی تھیں اور بے جان سا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر خدا کی پناہ کے لیے سوالی بنے تھے، اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور اعجاز صاحب بغیر کوئی خاص اثر قبول کیے وہاں سے رخصت ہو گئے......اور صرف چند گھنٹوں بعد یعنی 21 اپریل 1938ء صبح صادق کے وقت اس عظیم شخصیت نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی اور اس عظیم روح کو اپنی اس آخری حسرت کو شرمندۂ تعبیر دیکھنا نصیب نہ ہو سکا کہ وہ اپنے خون کو منکرینِ ختم نبوت کے گروہ سے الگ دیکھ کر سرخرو اور سر بلند اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب کوچ کرتی......کاش!

مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں شاعر مشرق نے اپنے بچپن کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے والدِ بزرگوار کی زبانی جو نصیحت بیان فرمائی ہے، اس کا ایک حصہ مندرجہ بالا صورتِ حال پر بھی بڑی اچھی طرح منطبق ہوتا ہے۔ حضرت علامہؒ فرماتے ہیں ۔

اے صراطت مشکل از بے مرکبی
من چہ گویم چوں مرا پرسد نبی ﷺ

”حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نشد
یعنی آں انبارِ گل آدم نشد“
در ملامت نرم گفتار آں کریم
من رہینِ خجلت و امید و بیم
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر
اجتماع امت خیر البشرﷺ
باز ایں ریشِ سفید من نگر
لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیش مولا بندہ را رسوا مکن

حضرت علامہؒ نے جس دردناک انداز میں اپنے والدِ گرامی کی طرف سے یہ کہا ہے کہ جب روزِ محشر نبی کریم ﷺ مجھ سے باز پرس فرمائیں گے کہ...... ”ہم نے ایک مسلمان تمھارے سپرد کیا تھا کہ اسے صحیح طور پر انسان بناؤ مگر یہ آسان کام بھی تم سے مکمل نہ ہوسکا اور مٹی کے اس ڈھیر کو تم انسان نہ بنا سکے؟“ میرے خیال میں اب یہی صورتِ حال علامہؒ کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے اور ان سے بھی اسی قسم کے سوالات شیخ اعجاز صاحب کے بارے میں پوچھے جائیں گے اور یقیناً وہ اسی وجہ سے لرزاں اور ترساں تھے اور وقت آخر زبانِ حال سے یہی استدعا کر رہے تھے کہ میرے بیٹے! مجھے اس سے بچالے اور میرے ان سفید بالوں پر ترس کھاؤ اور مجھے میرے مولا کے حضور رسوا نہ کرو...... کیونکہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!

حواشی

1- ”رئیسِ قادیان“ از ابوالقاسم مولانا رفیق دلاوری۔ صفحہ 50۔

2- ”حیات و پیامِ علامہ اقبال“ از ڈاکٹر نظیر صوفی۔ صفحہ 50۔

-3 1931ء یہاں اندازاً لکھا گیا کیونکہ شاید شیخ اعجاز صاحب کو خود بھی درست تاریخ کا علم نہیں کیونکہ اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' کے صفحہ 188 پر لکھتے ہیں کہ ''1929ء کے غالباً دو ایک سال بعد کی بات ہو گی کہ میں نے بیعت کر لی۔'' البتہ یہاں یہ بات خاص طور پر ذکر کر دینے کی ہے کہ اعجاز صاحب کو اپنے دادا جان شیخ نور محمد مرحوم کی حیات میں اس کی جرأت نہ ہو سکی چنانچہ 17 اگست 1930ء کو ان کی وفات کے بعد ہی اپنے ''ارتداد'' کا اعلان فرمایا۔

-4 سیرت المہدی جلد سوم از مرزا بشیر احمد ایم۔اے۔صفحہ 249 طبع اوّل اپریل 1939ء (جلد اوّل حصہ سوم صفحہ 764 طبع جدید فروری 2008ء)

-5 مظلوم اقبال از اعجاز احمد۔صفحہ 186۔

-6 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔صفحہ 186۔

-7 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 188۔

-8-9 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد ص 187۔

-10 ماہنامہ ''انصار اللہ'' ربوہ۔چوہدری ظفر اللہ خاں نمبر۔نومبر دسمبر 1985ء صفحہ 19۔

-11 بروز جمعہ 13 فروری 1959ء بمطابق 4 شعبان 1378ھ۔سیالکوٹ۔

-12 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صاحب صفحہ:165۔(یہ 20 اپریل 1938ء کا ذکر ہے)

خالد نظیر صوفی

مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کی گل افشانیوں کے جواب میں

مصنف ''مظلوم اقبال'' نے کتاب کے آخر میں ایک علیحدہ باب ''شکوۂ جور و جفا'' کے عنوان کے تحت شامل کیا ہے جس میں حضرت علامہؒ پر اپنوں اور بیگانوں کی جانب سے روا رکھے گئے مظالم کی تاریخ بیان فرمائی ہے اور بڑی ''صاف گوئی'' سے کام لیتے ہوئے اس فہرست میں اپنی طرف سے بھی ایک ''ناکردہ ظلم'' کو اس میں یوں شامل کیا ہے:

''راقم الحروف کے لیے ابھی تک یہ احساسِ ندامت سوہانِ روح ہے کہ اس کے لیے انھیں شادی لال ایسے شخص سے ''مومیائی'' مانگنا پڑی۔ راقم الحروف کو بھی علامہ پر ظلم کرنے والوں کی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے۔''(1)

مقام حیرت ہے کہ نادانستہ ظلم تو یاد رہ گیا مگر دانستہ جو ظلم عظیم سرزد ہوا، اسے فراموش کر دیا۔ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کو یقیناً اس کا احساس رہا ہوگا کہ **1931**ء میں ان کے منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل ہو جانے کے بعد حضرت علامہؒ کو کس قدر دکھ اور تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس کے متعلق حقائق گزشتہ صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کسی طور بے جا نہ ہوگا کہ سب سے بڑا ظلم تو خود انھوں نے ہی اپنے عم محترم پر روا رکھا۔ اس میں یقیناً کچھ مبالغہ آرائی نہیں کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا کیونکہ یہ کسی طور ممکن نہیں کہ جب مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شمولیت اختیار کی تو انھیں یہ ادراک نہیں تھا کہ حضرت علامہؒ اس سلسلے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت انجام دیا گیا اور لازماً یہ اپنے عظیم چچا کے خلاف اس گھناؤنی سازش میں برابر کے شریک تھے۔ یہ بات کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ یہ سب کچھ لاعلمی میں ہوا یا انھوں نے قادیانیت سے متاثر ہو کر یہ انتہائی قدم اٹھایا، بلکہ یہ ایک بین الاقوامی سازش کا حصہ تھا جس میں ان کو محض استعمال نہیں کیا گیا بلکہ انھوں نے خود اپنے آپ کو

رضا کارانہ طور پر پیش کیا۔ دنیاوی منفعت کے لیے انھوں نے اپنے دین کا سودا کیا اور جب ایک انسان اپنا ایمان ہی بیچ ڈالے تو پھر بزرگوں اور عزیزوں کی کیا حیثیت؟ چنانچہ حضرت علامہؒ پر سب سے بڑا ظلم تو خود مصنف ''مظلوم اقبال'' نے کیا اور آج دوسروں کے مظالم کی فہرست ترتیب فرما رہے ہیں یعنی دوسروں کی آنکھوں کے تنکے چن رہے ہیں مگر اپنی آنکھ کے شہتیر کی خبر نہیں......؟

اس عظیمِ ظلم کے علاوہ جو مصنف ''مظلوم اقبال'' نے حضرت علامہؒ کی حیات میں ہی ان پر مسلط فرمایا، اب اپنی متذکرہ کتاب میں بھی کئی ایک مزید مظالم کا اضافہ فرمایا ہے جن کے ردعمل میں یہ تحریر قلم بند کی جا رہی ہے۔ یہاں عمل اور ردعمل کی تاریخ بیان کرنا منتہائے نظر نہیں البتہ اس حقیقت سے بھی مفر نہیں کہ ردعمل صرف اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب کسی عملِ بد سے واسطہ پڑتا ہے۔ اعمالِ صالح کبھی کسی ردعمل کو دعوت نہیں دیتے مگر کوئی ظلم روا رکھا جائے، ردعملِ فوراً ظاہر ہوگا کیونکہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے۔

مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے سب سے پہلے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اپنے عم محترم کو ''کانوں کے کچے'' تک ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علامہؒ ہر کس و ناکس کی بات کا یقین بلا تحقیق کر لیا کرتے تھے اور پھر ایسی باتوں کو بلا سوچے سمجھے آگے پھیلا دیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں چند بے سر و پا باتوں کا تذکرہ فرما کر یہ تاثر پیدا کرنے کی سعیِ لاحاصل فرمائی ہے کہ علامہ صاحب افواہ سازی میں مصروف رہتے تھے اور ان کے احباب ان کو غلط سلط جو بتاتے تھے، وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کرتے چلے جاتے تھے۔(2)

سب جانتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی تلاوت علامہ صاحب کا روز کا معمول تھا اور وہ ہمیشہ قرآنِ پاک کی تلاوت اس طرح کرتے تھے جیسے ان پر ہی اس کا نزول ہو رہا ہو، اس لیے یہ گمان کرنا کہ وہ عظیم شخصیت جو قرآن مجید فرقانِ حمید کی تلاوت اس قدر سمجھ کر فرماتی تھی، اس میں درج ان احکامات سے بالکل بے بہرہ رہی جو بڑی وضاحت کے ساتھ اس میں بیان ہوئے ہیں۔ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر 6 سے کون واقف نہیں جس میں افواہوں اور بلا تحقیق باتوں پر یقین کرنے کی صاف الفاظ میں ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اگر لے آئے تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر

لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی گروہ کو لاعلمی میں پھر تم اپنے کیے پر نادم ہو۔'' (الحجرات:6)

مندرجہ بالا واضح حکم کی موجودگی میں ایک ایسی شخصیت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی پوری زندگی اس حکم کے خلاف عمل پیرا رہی اور کبھی بھی اس سلسلے میں تحقیق نہ فرمائی کہ آیا جو بات بیان کی گئی ہے اور جسے میں دوسروں کو بتانے جا رہا ہوں، درست بھی ہے یا نہیں، میرے خیال میں اس عظیم شخصیت پر بہتانِ عظیم کے مترادف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت علامہؒ کی پوری حیاتِ مستعار بس تحقیق کے لیے ہی وقف رہی۔ ان کا تو ہر سانس اور ہر ہر قدم نئ سے نئ تحقیق پر مبنی ہے...... ان کا تو شاید پورا علم ہی اس لفظ پر مرکوز رہا کہ انھوں نے ہر بات کی مکمل تحقیق فرمائی اور اپنے وقت کے عظیم محققین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جس شخص کا اوڑھنا بچھونا ہی تحقیق رہا ہو، کیا وہ کوئی بھی بات خواہ اس کا راوی کوئی بھی رہا ہو، بلا تحقیق قبول کر سکتا ہے؟

مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے یہاں تک لکھا ہے کہ 1935ء تک چچا جان کا رویہ قادیانی جماعت کے ساتھ بڑا دوستانہ تھا اور وہ اسے اسلام کی ایک جماعت تصور فرماتے تھے مگر پھر ایک دم ان کے خیالات تبدیل ہو گئے، جب مجلسِ احرار نے ان کے کان بھرے اور علامہ صاحب چونکہ کانوں کے بڑے کچے تھے اور بلا سوچے سمجھے اور بلا تحقیق ہر کس و ناکس کا یقین کر لیا کرتے تھے، اس لیے خواہ مخواہ قادیانی جماعت کے خلاف ہو گئے۔ اس کے علاوہ چونکہ علامہ صاحب ان ہی دنوں ایک ذاتی محرومی کا شکار بھی ہوئے، اس لیے بھی انھیں قادیانی جماعت پر غصہ تھا۔ ''مظلوم اقبال'' کے اقتباسات اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں:

- ''اِن دنوں تعصب کا دور دورہ ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت تو بقول علامہ اقبالؒ اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ تھی، 1935ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ کی رائے میں دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہو گئی۔ ایسی تحقیق کے نتیجے میں انھیں معلوم ہوگا کہ احمدیت کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی جس کے لیے شاید قلبِ ماہیت کا لفظ زیادہ موزوں ہو، کی وجہ کانگریسی احرار سازش کے تحت، احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انہی دنوں ایک ذاتی معاملہ میں علامہ کا احساسِ محرومی بھی شامل ہو گیا جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی در آئی جو عام طور پر ان کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔'' (3)

''احساسِ محرومی'' کی تفصیل یوں بیان کی گئی:

❑ ''سلسلہ احمدیہ کے خلاف 1935ء کے بیانات میں اتنی شدت اور تلخی شاید نہ ہوتی اگر ایک ذاتی سلسلہ میں ان کا احساسِ محرومی کارفرما نہ ہوتا اور اس مرتبہ تو ان کے احساسِ ناکامی کے شدید ہونے کی وجہ بھی تھی کیونکہ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا والا معاملہ ہوا تھا۔ 1932ء میں سر فضل حسین، وائسرائے ہند کونسل کے رکن، چار ماہ کی رخصت پر گئے۔ ان کی جگہ علامہ کے تقرر کا ذکر اخبارات میں آیا لیکن وزیر ہند نے چوہدری ظفر اللہ خان کو مقرر کر دیا۔ سر فضل حسین کی تقرری کی میعاد اپریل 1935ء میں ختم ہونے والی تھی، ان کی جگہ کون لے گا...... اس ضمن میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا، لیکن چونکہ چوہدری ظفر اللہ خان عارضی طور پر چار ماہ کام کر چکے تھے، اس لیے ان کا نام بھی مستقل تقرری کے سلسلے میں لیا جا رہا تھا...... ممکن ہے احراریوں اور ''زمیندار'' کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر لارڈ ولنگڈن نے وزیر ہند سے علامہ کے تقرر کی سفارش کی ہو اور انھیں اپنی سفارش کے منظور ہو جانے کا یقین بھی رہا ہو لیکن شاید وزیر ہند نے اتفاق نہ کیا ہو۔ آخر کار اکتوبر 1934ء میں چوہدری ظفر اللہ خان کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور مئی 1935ء میں انھوں نے چارج بھی لے لیا۔ پھر کیا تھا، احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کو علامہ کو بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چوہدری ظفر اللہ خان کا تقرر وزیر ہند نے کیا۔ اس میں جماعتِ احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن نزلہ عضوِ ضعیف پر گرا۔'' (4)

مندرجہ بالا اقتباسات کے علاوہ بھی مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے متعدد مقامات پر حضرت علامہؒ پر کئی ایک بڑے عامیانہ قسم کے الزامات اور اعتراضات بھی کیے ہیں اور محسن کشی کے بڑے بھرپور انداز میں مرتکب ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں خاندان کے بزرگوں خاص طور پر اپنے دادا شیخ نور محمد مرحوم و مغفور اور اپنے والد محترم شیخ عطا محمد مرحوم کو قادیانی مذہب کو ماننے والے تک ثابت کرنے کی پُرزور کوشش فرمائی ہے...... میں ان الزامات کا علیحدہ علیحدہ ذکر اور ان پر مزید بحث کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کر رہا کیونکہ کتاب زیرِ نظر کے گزشتہ صفحات میں ان کے شافی جوابات عرض کیے جا چکے ہیں۔ البتہ انہی کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی ''زندہ رود'' میں بڑی مدلل بحث فرمائی ہے۔ اس لیے یہاں ''زندہ رود'' سے چند اقتباسات دینا دلچسپی کا باعث ہوگا۔

''زندہ رود'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کی طرف سے اس الزام کا

جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ حضرت علامہؒ نے کبھی قادیانی بیعت نہیں کی تھی:

❑ ''اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد، احمدی تھے۔''(5)

اسی طرح ڈاکٹر جاوید اقبال، وصیت نامہ میں شیخ اعجاز احمد کے تقرر کے متعلق یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

❑ ''اقبال نے وصیت نامہ میں ان کا نام برادر زادہ ہونے کی حیثیت سے اور ان کی صالحیت کی بنا پر اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ یہ وصیت نامہ انھوں نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان دینے کے پانچ ماہ بعد لکھا لیکن تقریباً دو سال بعد وہ شیخ اعجاز احمد کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین نامزد کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ ان کے خط مورخہ 10 جون 1937ء بنام سر راس مسعود سے ظاہر ہے۔ دیگر اولیاء کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

''نمبر 3 شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں؟''(6)

آگے چل کر جاوید اقبال صاحب، شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کے متعلق لکھتے ہیں:

❑ ''شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے آج تک کسی پر اپنا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی لہٰذا ان کی اولاد، جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے، میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں، بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا موقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا موقف ہے۔''(7)

قصہ مختصر یہ کہ جاوید ماموں نے بڑی تفصیل سے اعجاز ماموں کے اس نوٹ (8) کا جواب ''زندہ رود'' میں دیا ہے لیکن امید نہیں کہ ان کی پوری طرح تسلی اس سلسلے میں ہوئی ہو کیونکہ 1994ء میں اپنی وفات سے قبل انھوں نے ''زندہ رود'' کو پوری تفصیل سے پڑھا ضرور ہے، جس کا برملا اظہار انھوں نے ''مظلوم اقبال'' میں ایک علیحدہ باب ''زندہ رود...... علامہ اقبال کے

سوانح حیات'' کے عنوان کے تحت کیا ہے مگر اس کے بعد اپنی متذکرہ کتاب ''مظلوم اقبال'' میں ان تمام بہتانوں اور الزامات کا اعادہ بھی فرمایا ہے یعنی وہ میں نہ مانوں کے مصداق اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور انھوں نے کسی بات کا کوئی اثر قبول نہیں کیا یعنی وہ بضد ہیں کہ جو وہ فرما رہے ہیں، وہی صحیح ہے۔ ان کا اس طرح غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں سے کام لینا اور کھلم کھلا افترا پردازیوں اور سراسر جھوٹ کا سہارا لینا قابلِ صد مذمت ہے۔

سب سے پہلے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں قبلہ نانا جان (شیخ عطا محمد مرحوم) کے متعلق اس مفروضے کا جواب دیا گیا تھا کہ وہ کبھی قادیانیت سے وابستہ رہے اور ان کے حنفی العقیدہ مسلمان ہونے کے متعلق ثبوت کے طور پر ان کے جنازے کے متعلق یوں حقیقت بیان کی گئی تھی:

❑ ''یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ علامہ صاحب کے والدِ گرامی اور بڑے بھائی کبھی بھی ختمِ نبوت کے منکرین میں شامل نہیں رہے۔ وہ ہمیشہ ختم نبوت کے ماننے والے اور پکے حنفی المذہب مسلمان تھے۔ شیخ عطا محمد صاحب کا جنازہ ان کی وصیت کے مطابق، جو انھوں نے میرے والد گرامی کو کی تھی، اقبال منزل (سیالکوٹ) کے بالمقابل واقع مسجد کے امام مولوی سکندر خان صاحب نے، جو حنفی المذہب تھے، پڑھایا تھا۔ اس کے علاوہ بیگم شیخ عطا محمد صاحب کا جنازہ بھی مولوی صاحب مذکور نے ہی پڑھایا تھا۔'' (9)

''زندہ رود'' میں مندرجہ بالا حقائق کی مزید تائید ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے ان الفاظ میں فرمائی:

❑ ''شیخ عطا محمد، اقبال کی وفات کے تقریباً دو سال بعد 22 دسمبر 1940ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انھیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔ نماز جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔ البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔ شیخ عطا محمد کی اولاد میں صرف شیخ اعجاز احمد احمدی عقیدہ رکھتے ہیں۔'' (10)

مگر ''مظلوم اقبال'' میں شیخ اعجاز احمد صاحب نے جاوید اقبال صاحب کے متذکرہ بیان کو یہ کہہ کر مسترد فرما دیا کہ ''جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا، اس لیے انھیں یاد

نہیں رہا۔‘‘ تفصیل ملاحظہ ہو:

’’اس سلسلے میں ’’زندہ رود‘‘ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابا جان (شیخ عطا محمد) کی نمازِ جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی، جس میں مصنف (جاوید اقبال) بھی شامل تھے۔ اگر چہ یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ میں (شیخ اعجاز احمد) نے اور احمدی احباب نے بقولِ مصنف (جاوید اقبال) غالباً شیخ عطا محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ یہ درست ہے کہ ابا جان کے جنازہ کے ساتھ ہماری برادری کے کئی اشخاص اور ابا جان کے کئی ذاتی دوست تھے۔ جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا، اس لیے انھوں نے یہ بات نوٹ نہ کی ہو یا انھیں یاد نہ رہی ہو کہ میرے چھوٹے بھائی امتیاز مرحوم نے مجھے کہا کہ یہ لوگ ابا جان کا جنازہ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے امام کے پیچھے۔ کیا اس میں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی اور میں نے بہ خوشی اجازت دی بلکہ کہا کہ وہ لوگ پہلے جنازہ پڑھ لیں، بعد میں ہم پڑھ لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔‘‘ (11)

یہاں سب سے پہلے اعجاز صاحب کا یہ بیان قابل غور ہے کہ ’’جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا، اس لیے انھوں نے یہ بات نوٹ نہ کی ہو یا انھیں یاد نہ رہی ہو۔‘‘ ڈاکٹر جاوید اقبال 5 اکتوبر 1924ء کو پیدا ہوئے اور دسمبر 1940ء میں ان کی عمر سولہ برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور میٹرک پاس کر کے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ یعنی اتنے بچے بھی نہیں تھے کہ اپنے سامنے ہونے والے واقعات کو فراموش کر دیں۔ حالانکہ شیخ اعجاز صاحب کا ہی اصرار ہے کہ ان کے عم محترم یعنی حضرت علامہؒ کی پہلی شادی سولہ برس سے بھی کم عمر میں ہو چکی تھی۔ ’’مظلوم اقبال‘‘ میں آپ فرماتے ہیں:

’’ان کی (علامہ اقبالؒ) پہلی شادی 1893ء میں ہوئی جب ان کی عمر ابھی پورے سولہ برس بھی نہ تھی۔ انھوں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا ہوا تھا۔‘‘ (12)

حیران کن بات ہے کہ سولہ برس سے بھی کم عمر میں باپ (علامہ اقبالؒ) کی تو شادی خانہ آبادی بھی ہو چکی تھی مگر سولہ برس سے زیادہ عمر میں انہی کا بیٹا (جاوید اقبال) بقول شیخ اعجاز احمد صاحب ابھی ’’بچہ‘‘ تھا، اس لیے اس کی گواہی قابل قبول نہیں...... ایں چہ بوالعجبی است؟

ویسے دیکھا جائے تو شیخ اعجاز احمد صاحب نے یہ قاعدہ کلیہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے ہی مستعار لیا ہے کہ ہمیشہ عمر میں جو بڑے ہوتے ہیں، وہی درست اور سچ فرماتے ہیں اور کم

عمر ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاوید ماموں کو یہاں یاد دہانی کروادوں کہ انھوں نے میرے والدگرامی ڈاکٹر نظیر احمد صوفی مرحوم و مغفور کے بیانات (13) اسی بنا پر مسترد فرمائے تھے کہ وہ چونکہ شیخ اعجاز احمد صاحب اور شیخ مختار صاحب سے کم عمر ہیں، اس لیے ان کی بیان کردہ روایات (14) قابل قبول نہیں۔ اب جب کہ جاوید صاحب کو اس کا ذاتی تجربہ ہو چکا ہے کہ شیخ اعجاز صاحب نے بھی کم عمری ہی کی بنیاد پر ان کی روایات مسترد فرما دی ہیں تو یقیناً اب ان کے لیے درست فیصلہ فرمانا زیادہ آسان ہو جائے گا کہ کیا واقعی کم عمر ہمیشہ غلط بیانی ہی کیا کرتے ہیں؟

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ اعجاز صاحب نے ''ان لوگوں'' کو پہلے نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے خود بعد میں ادائیگی کا کیا خوب جواز پیدا فرمایا ہے۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہوگی مگر جن کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہو، ان کے لیے اس قسم کے چھوٹے موٹے جھوٹ سچ کی کیا حیثیت...... یعنی تمام بزرگ اور دوسرے لوگ جن میں شیخ عطا محمد صاحب کے برادرِ نسبتی یعنی ان کی چھوٹی ہمشیرہ زینب بی بی کے خاوند شیخ غلام رسول صاحب، شیخ عطا محمد صاحب کے برادرِ نسبتی یعنی ان کی بیگم کے بھائی بابو غلام نبی صاحب، بابو غلام نبی صاحب کے صاحبزادے عبدالغنی راٹھور صاحب، شیخ عطا محمد صاحب کے چھوٹے داماد ڈاکٹر نظیر احمد صوفی (جن کو شیخ صاحب نے آخری وصیت فرمائی تھی کہ ان کا جنازہ حنفی العقیدہ طریق پر پڑھایا جائے) اور ڈاکٹر جاوید اقبال شامل تھے۔ اس کے علاوہ خاندان کے دوسرے بزرگ اور افراد، ہمسائے، محلّہ دار، دوست احباب اور شہر کے دوسرے اکابرین سب ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتے رہے اور صرف ایک فرد یعنی شیخ اعجاز احمد صاحب سچ کہہ رہے ہیں کیونکہ جس طرح بھی ہوا، انھوں نے اپنے مرحوم باپ کے خلاف سازش تیار کی اور انھیں 313 (15) کی فہرست میں شامل فرما دیا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ جس شخصیت کو اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے 313 (16) دوستوں کی فہرست میں 224 ویں (17) نمبر پر تھے، کو بہشتی مقبرہ (قادیان) میں دفن ہونے کے لیے کوئی خصوصی جگہ عطا نہیں کی گئی...... حالانکہ اصولاً بانی سلسلہ قادیانی کو اپنی زندگی میں ہی اپنے اتنے قریبی ساتھی کے لیے یہ اہتمام کر دینا چاہیے تھا۔ دوسرے جب شیخ اعجاز احمد صاحب نے مسلمانوں سے علیحدہ اپنے والد مرحوم کی نماز جنازہ ادا کر دی تو اس کے بعد بھی وہاں پر موجود مسلمانوں میں سے کسی نے شیخ عطا محمد صاحب کے سنی مسلمانوں کے قبرستان میں

دفن کیے جانے پر کیوں اعتراض نہ کیا؟ اس زمانے میں تو اس بات پر اتنا سخت ردِعمل ہوا کرتا تھا کہ اگر غلطی سے کوئی قادیانی کسی طرح مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا تو بعد میں اس کی قبر کو اکھاڑ دیتے تھے۔ مگر یہاں تو معاملہ بالکل ہی برعکس تھا کہ شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی میں ہی اپنے لیے پختہ قبر تعمیر کروا رکھی تھی اور سنی مسلمانوں نے پورے احترام سے ان کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد ان کو پہلے سے تعمیر شدہ قبر میں دفن بھی کیا اور آج تک وہ وہیں موجود ہیں۔ کبھی کسی کو ان کے خلاف کوئی ایسا انتہائی اقدام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس سے کیا حقیقت سامنے آتی ہے، یہی کہ وہ بفضلِ تعالیٰ حنفی العقیدہ مسلمان تھے اور ان کا منکرینِ ختم نبوت کے گروہ سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے خیال میں اگر شیخ اعجاز صاحب کا بس چلتا تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے والد صاحب کو قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کرنے سے کبھی باز نہ رہتے مگر یہ تو جبھی ممکن ہوتا کہ ان کی جماعت بھی اس سے متفق ہوتی اور اس اتفاق کے لیے بے حد ضروری تھا کہ شیخ عطا محمد مرحوم کا تعلق قادیانی جماعت سے ثابت ہو۔ میرے والد گرامی کا بیان ہے کہ شیخ عطا محمد صاحب کے جنازے کے لیے شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی جماعت کی سیالکوٹ شاخ کے ممبران کو اطلاع (18) بھی بھجوائی کہ فلاں وقت جنازے میں شمولیت فرمائیں، مگر سوائے چند ایک ان (شیخ اعجاز) کے قریبی دوستوں کے کوئی نہ آیا اور جب شیخ اعجاز صاحب علیحدہ نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے تو کوئی بھی ان کے ساتھ موجود نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ بھی شاید راستے ہی سے غائب ہو گئے تھے یا انھوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ہی جنازہ پڑھ لیا تھا۔ امام کے پیچھے جب شیخ اعجاز صاحب اکیلے کھڑے ہوئے تو ان کے ایک دوست جو پہلے جنازہ پڑھ چکے تھے، جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے تاکہ جماعت مکمل ہو جائے۔ یہاں یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ شیخ عطا محمد نے دوبارا اپنے لیے قبرستان امام صاحب میں پختہ قبر تعمیر کروائی......

پہلی دفعہ جب اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پختہ کروائی تو اس کے ساتھ دو مزید قبریں تعمیر کروائیں۔ ایک اپنے والد شیخ نور محمد صاحب کے لیے اور دوسری اپنے لیے۔ حضرت علامہؒ کی بڑی صاحبزادی معراج خالہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے تایا جان سے یہ آخری خواہش ظاہر کی کہ انھیں دادی اماں اور دادا ابو کے پہلو میں اس جگہ آسودۂ خاک کیا جائے جو جگہ آپ نے اپنے لیے مخصوص کی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کی آخری خواہش کے احترام میں ایسا ہی کیا گیا اور شیخ عطا محمد صاحب نے

اپنے والدین کے ساتھ اپنی بھتیجی۔(19) کو دفن کر دیا۔اس کے بعد انھوں نے اپنے اور اپنی زوجہ محترمہ کے لیے دوبارہ پختہ قبریں تعمیر کروائیں اور خود 1940ء میں وہاں دفن ہوئے اور 1958ء میں بھابھی جی کو اس مخصوص جگہ دفن کیا گیا۔کہیں سے کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ شیخ عطا محمد اور ان کی زوجہ محترمہ دونوں پکے حنفی العقیدہ مسلمان تھے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ شیخ عطا محمد مرحوم ''سابقون''(20) میں سے تھے اور 313 دوستوں میں ان کا نمبر 224 تھا تو کیا انھیں خود ہی قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن ہونے کے انتظامات نہیں کرنا چاہیے تھے۔آخر وہ کیوں بار بار اپنے لیے یہاں سیالکوٹ میں اور وہ بھی کٹر سنی مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کا اہتمام فرمارہے تھے۔کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھیں کسی طور اپنا تعلق قادیانی جماعت سے ثابت ہونا قبول نہیں تھا؟ اور ان کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر انھوں نے اس کی پیش بندی نہ کی تو ان کی وفات کے بعد جب وہ بے بس ہو جائیں گے تو ان کے صاحبزادے شیخ اعجاز کے ذریعہ قادیانی جماعت اپنی سی کوشش ضرور کرے گی تا کہ حضرت علامہؒ کو پریشان کیا جا سکے۔اس سلسلے میں گزشتہ صفحات میں یہ ذکر تفصیلاً ہو چکا ہے کہ کس طرح شیخ اعجاز صاحب نے اپنے والد مرحوم کو آخری وقت میں قادیانی مذہب قبول کر لینے پر مجبور کیا تھا اور کس طرح شیخ عطا محمد صاحب نے ثابت قدمی دکھائی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی میں یہ بالکل درست اقدام کیا کیونکہ قادیانی بیٹے کے ذریعہ قادیانی جماعت کے شر سے محفوظ رہنے کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ یقیناً نہیں تھا۔اب شیخ اعجاز یا قادیانی جماعت جو ان کے جی میں آئے کہتی رہے، ان کی کوئی بات کسی طور قابل قبول نہیں کیونکہ شیخ نور محمد مرحوم و مغفور اور شیخ عطا محمد مرحوم و مغفور اپنے عمل سے یہ ثابت کر گئے ہیں کہ وہ پکے حنفی العقیدہ مسلمان تھے اور ان کا قادیانی جماعت یا سلسلۂ احمدیت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ کبھی بھی منکرین ختم نبوت کے گروہ میں شامل نہیں رہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے کہ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کو یقیناً اپنی جماعت کی طرف سے یہ حکم ملا ہوگا کہ ایک ایسی کتاب ترتیب دیں جو خاندانِ اقبال یعنی اپنے ہی خاندان اور اپنے ہی بزرگوں کا مقام (image) اس قدر برباد کر دے کہ پھر کوئی راہ ان کے لیے باقی نہ رہے کہ کوئی اس جال سے باہر نکال سکے...... چنانچہ انھوں نے اس حکم حاکم پر لبیک کہنا عین ''سعادتِ دارین''

جانتے ہوئے اس کو عملی شکل دے ڈالی، حالانکہ اس سے پیشتر ان کا کسی قسم کی کوئی کتاب وغیرہ لکھنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ میرے پاس ان کی تحریر موجود ہے جس میں انھوں نے مجھے، جب میں نے ’اقبال درونِ خانہ‘‘ (حصہ اوّل) کے سلسلے میں کچھ مواد فراہم کرنے کے لیے لکھا تو انھوں نے صاف صاف جواب دیا کہ...... ’’میرے پاس اب کچھ باقی نہیں ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا، میں فقیر وحید الدین کو دے چکا ہوں اور انھوں نے ’’روزگارِ فقیر‘‘ میں شامل کر دیا ہے۔‘‘ یہ اواخر 1967ء کی بات ہے۔ گو انھوں نے اس وقت غلط بیانی سے ہی کام لیا کیونکہ ان کے پاس کم از کم 103 خطوط تو ضرور موجود تھے جواب ’’مظلوم اقبال‘‘ میں شامل ہیں۔ اعجاز ماموں کے متذکرہ بالا خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

کراچی 23 نومبر 1967ء

عزیزم خالد!

بعد دعا واضح ہو تمہارا 15 نومبر کا لکھا خط ملا۔ چچا جان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کتابوں میں اور اخبارات اور رسالوں میں۔ بعض کتابیں اور مضامین تو بڑے فاضلانہ اور معلوماتی ہیں بعض رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق اگر کسی نے کچھ مزید لکھنا ہو بالخصوص گھریلو زندگی کے متعلق تو اسی صورت میں لکھنا چاہیے جب کوئی نئی بات کہنے کو ہو۔ ورنہ پہلے سے بیان کردہ باتوں کو دوسرے پیرایہ میں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے جو کچھ چچا جان کے متعلق یا اپنے خاندان کے متعلق معلوم تھا، وہ میں نے فقیر وحید الدین صاحب کو لکھ کر دے دیا تھا۔ ان کی کتاب روزگارِ فقیر کے دونوں حصوں میں وہ معلومات درج ہیں اور کوئی نئی بات مجھے یاد نہیں۔ تم اس کتاب کے دونوں حصے پڑھ لو، اور بھی جو کچھ ان کے متعلق لکھا گیا ہے اس کو دیکھ لو، اس کے بعد جو کتاب تم ترتیب دے رہے ہو، اس کو دیکھ لو کہ اس میں گھریلو زندگی کے متعلق کوئی نئی بات بیان کی گئی ہے۔ اگر نئی باتیں ہیں تو ضرور کتاب کو شائع کرو۔ مسودہ پہلے مجھے بھیجو گے تو میں پڑھ کر رائے دے سکوں گا۔

یہاں سب طرح خیریت ہے۔ اپنے والد اور والدہ کو سب کی طرف سے سلام کہہ دینا۔

خیر طلب

اعجاز احمد

علاوہ ازیں جب 1967ء میں ہی ''علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی'' اشاعت پذیر ہوئی تو میں نے انھیں لکھا کہ اس کا جواب لکھا جانا چاہیے مگر ان کا جواب آیا کہ ''نہیں یہ مناسب نہ ہوگا...... ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے......'' مگر اب ایک دم انھیں عمر کے آخری حصے میں کتاب لکھنے اور پھر خود ہی اسے شائع فرمانے کا خیال کیوں آیا اور وہ بھی اس طرح کہ جس میں انھوں نے ''مخصوص'' سمتوں میں کام کیا۔

حضرت علامہؒ اپنے برادرِ بزرگ جناب عطا محمد مرحوم و مغفور کا ہمیشہ بے حد احترام فرماتے تھے اور اکثر و بیشتر اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے بڑے بھائی صاحب نے ان کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ ''بانگ درا'' کی ایک مشہور نظم ''التجائے مسافر'' میں جس محبت اور عزت سے ان کا ذکر فرمایا ہے، پڑھ کر رشک آتا ہے:

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

چنانچہ یورپ سے مراجعت کے بعد انھوں نے اپنے بڑے بھائی کی مقدور بھر خدمت کی۔ بڑے بھائی کے بچوں کی تعلیم میں ہر طرح مدد کی اور خاص طور پر شیخ اعجاز احمد جو شیخ عطا محمد مرحوم کے سب سے بڑے فرزند تھے، کی ہر طرح راہنمائی فرمائی اور انھیں ہر اونچ نیچ سمجھا کر قانون کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا، جو آئندہ زندگی میں قدم قدم پر ان کے کام آئی۔ وہ ''مظلوم اقبال'' میں یوں اعتراف کرتے ہیں۔

''یہاں مجھے ان کی اصابتِ رائے کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے جو فوائد انھوں نے بیان فرمائے، وہ سب صحیح ثابت ہوئے۔ میرے کیریئر کے ہر مرحلہ پر قانون کی ڈگری جو میں نے لا کالج میں داخل ہو کر حاصل کر لی، بڑے کام آئی۔'' (21)

اس طرح شیخ اعجاز احمد صاحب کی درست سمت میں راہنمائی کے بعد پھر ان کے لیے

اپنی فطرت کے خلاف سفارش تک کی اور انھیں ملازمت دلوائی جس کی وجہ سے بعد میں بہت بڑا نقصان بھی برداشت کیا۔ اس کے بعد حضرت علامہؒ نے اپنی وصیت میں ان کو اپنے نابالغ بچوں کا سرپرست مقرر فرمایا، لیکن ان کے لیے اتنا کچھ کرنے کے باوجود جب 1931ء میں اعجاز صاحب دنیاوی منفعت کی خاطر اپنے اس عظیم چچا کو جو قدم قدم پر ان کے مدو معاون ثابت ہوئے، چھوڑ کر منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل ہو گئے تو حضرت علامہؒ کو دلی دکھ اور رنج ہوا۔ درحقیقت قادیانی جماعت ایک طویل عرصہ سے حضرت علامہؒ کو نیچا دکھانے کے لیے کوشاں تھی کہ ان کے خاندان کے کسی فرد کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خان کے ذریعے شیخ اعجاز احمد صاحب کو شکار کیا گیا۔ ان کے اس عمل نے علامہ صاحب کو ان سے بے حد بددل کر دیا اور وہ شیخ اعجاز سے بہت مایوس ہو گئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اپنے عزیز دوست سر راس مسعود کو خط میں لکھا کہ وہ اعجاز کے قادیانی ہو جانے سے بڑے پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی وصیت میں اس کی جگہ سر راس مسعود کو نامزد کر دیں۔

حال ہی میں آنٹی ڈورس (مسز ڈورس احمد) نے بھی اپنی کتاب **"Iqbal As I Knew Him"** میں اس سلسلے میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ حضرت علامہؒ شیخ اعجاز احمد کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے اپنے بچوں کے سرپرست کی حیثیت سے اپنی وصیت میں شامل کر لینے پر پریشان تھے اور ان کی جگہ کسی دوسرے کو نامزد کرنا چاہتے تھے۔ ان کی کتاب سے اقتباس ملاحظہ ہو:

ترجمہ: ''شیخ اعجاز احمد، شیخ عطا محمد کے بڑے صاحبزادے تھے اور بڑے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا ان کے بارے میں بہت اچھا نظریہ تھا۔ اس لیے انھوں نے انھیں اپنے نابالغ بچوں کا سرپرست مقرر کیا اور اپنے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد پر انھیں ترجیح دی۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے مجھے کئی بار کہا کہ میری خواہش ہے کہ کوئی اور فرد شیخ اعجاز احمد کی جگہ بچوں کا گارڈین (سرپرست) مقرر ہوتا کیونکہ وہ (شیخ اعجاز احمد) قادیانی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب (علامہ صاحب) نے اپنی اس رائے کا کئی بار مجھ سے اظہار کیا۔'' **(22)**

مندرجہ بالا اظہارِ حقیقت کے بعد یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ اعجاز کے قادیانی جماعت میں شامل ہو جانے سے علامہ صاحب کس قدر رنجیدہ تھے۔ اس طرح شیخ صاحب نے

دنیا تو بہت کمائی مگر وہ ''محسن کشی'' کے مرتکب بھی ہوئے اور محسن بھی کون وہ عم محترم جس نے قدم قدم پر راہنمائی اور دستگیری کا حق ادا کر دیا۔ اپنی زندگی میں جو کامیابیاں انھیں حاصل ہوئیں اور جس جس طرح انھوں نے فوائد حاصل کیے، ان کی بنیاد اسی عظیم چچا نے تو رکھی تھی وگرنہ وہ خود تو صرف ایم۔اے (23) کر کے زیادہ سے زیادہ کسی کالج کے پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہونا چاہتے تھے مگر حضرت علامہؒ نے انھیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا اور ہر قدم پر ان کے لیے اپنی فطرت کے خلاف سفارشوں اور رعایتوں کے پُل باندھے، تب کہیں وہ (شیخ اعجاز) اس قابل ہوئے کہ اس عظیم ہستی پر بے بنیاد بہتان تراشیں اور ان کی تکذیب کے مرتکب ہوں۔

چوں قلم در دستِ غدارے بود
لا جرم منصور بر دارے بود

(اقبالؒ)

بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت علامہؒ کے کسی دوست نے انھیں بتایا کہ فلاں فلاں شخص آپ کو ہر محفل میں برا بھلا کہتا ہے اور آپ کے ہر کام میں کیڑے نکالتا ہے۔ حضرت علامہؒ بڑے حیران ہوئے اور فرمایا...... ''یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے۔ میں نے تو کبھی اس سے کوئی فیض نہیں کیا؟'' یعنی یہ اس جہان کی ریت ہے کہ آپ جس سے فیض کریں گے، وہی آپ کے خلاف ہو جائے گا...... کہتے ہیں کہ فیض اور بے فیضی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں ''فیض'' ہوگا ''بے فیضی'' کا وہاں ہونا لازم ہے۔ یہاں مجھے حضرت علیؓ کا ایک مشہور قول یاد آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ: ''جس پر احسان کرو، اس سے محتاط رہو''

حضرت علامہؒ سے یہیں احتیاط نہیں ہوئی اور انھوں نے جس جس کے ساتھ احسان کیا، اسی نے احسان فراموشی دکھائی۔ جس کے ساتھ فیض کیا بدلے میں ''بے فیضی'' ملی۔ ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ اس جہانِ فانی سے رخصت سے پہلے ہی یہ ان کا قرض اتار گئے، ورنہ بعد میں کون اس چکر میں پڑتا۔

مرا کُشتی و تکبیرے نہ گفتی
عجب سنگیں دلے، اللہ اکبر!

حواشی

1- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 226۔

2- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 208 اور 209۔

3- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 199۔

4- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 206 اور 207۔

5- ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 912۔

6- ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 912 اور 913۔

7- ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 913۔

8- ''مظلوم اقبال'' تب تک شائع نہیں ہوئی تھی اس لیے اعجاز صاحب نے ایک نوٹ جاوید صاحب کے استفسارات کے جواب میں انھیں بھجوایا تھا، جس کا ذکر ''زندہ رود'' میں جا بجا ملتا ہے۔

9- ''اقبال درونِ خانہ'' (جلد اوّل) صفحہ 17 (حاشیہ)۔

10- ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 912۔

11- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 189۔

12- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 98۔

13-14- ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں لکھتے ہیں...... ''نظیر صوفی کے بیان میں قطعیت ہے حالانکہ وہ عمر میں شیخ اعجاز احمد اور شیخ مختار احمد سے چھوٹے تھے۔'' (زندہ رود صفحہ 74)

15-16-17- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 187۔

18- اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ شیخ عطا محمد صاحب قادیانی جماعت کے ممبر نہیں تھے اس لیے کوئی بھی نمازِ جنازہ کے لیے نہیں آیا کیونکہ وہ کسی غیر قادیانی کا جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔

19- معراج بیگم۔

20- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 58۔

21- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 140-141۔

22- ''اقبال اور مشاہیر کشمیر، از کلیم اختر۔ صفحات 234 اور 235۔

23- ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 139۔

خالد نظیر صوفی

علامہ اقبالؒ کے برادرِ بزرگ پر قادیانی بہتان

''جھوٹے نبی کی جھوٹی باتیں'' لکھتے لکھتے آپ نے (شورش کاشمیری نے) جن اُمور پر روشنی ڈالنے کے لیے مجھے مخاطب کیا ہے، انھیں تحریر کرنے کی شاید کبھی نوبت نہ آتی۔ لیکن اب کہ قادیانی کذب تراشوں کے غلط پروپیگنڈے کو جھٹلانا عین فرض ہے، حقائق سپرد قلم ہیں۔

آپ کا یہ خیال کہ علامہؒ کے والدِ گرامی اور برادرِ بزرگ کو قادیانی کہنا محض تلبیسی روایت ہے، بالکل درست ہے۔ صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ کے دعویٰ کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ دونوں بزرگوں کے مزار حضرت امام صاحبؒ کے قبرستان میں ہیں، نہ کہ قادیان کے ''بہشتی مقبرہ'' میں۔ اگر علامہؒ کے والد اور برادرِ بزرگ مرزائی ہوتے تو علامہؒ کی سبکی کے لیے مرزائی انھیں ہر قیمت پر قادیان کے ''بہشتی مقبرہ'' میں دفناتے۔

والدِ علامہؒ 17 اگست 1930ء کو 95 سال کی عمر میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ علامہؒ اور ان کے برادرِ بزرگ مسلمانوں کے جمِ غفیر کے ساتھ ان کے جنازہ کو کندھا دیتے ہوئے حضرت امام صاحبؒ کی جنازگاہ تک لے گئے۔ نمازِ جنازہ حنفی العقیدہ میاں فضل احمد مرحوم امام مسجد نائیاں، گلی چُوڑی گراں نے پڑھائی۔ کسی مرزائی کو شریکِ جنازہ ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔

علامہؒ کے برادرِ بزرگ 12 دسمبر 1940ء کو فوت ہوئے۔ ان کا جنازہ حسبِ وصیت سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ یہ وصیت انھوں نے دورانِ بیماری مجھے کی تھی۔ میرے برادرانِ نسبتی ملازمت کے سلسلہ میں سیالکوٹ سے باہر تھے۔ وہ ان کے آخری دموں ہی پر پہنچے۔ ان کی نمازِ جنازہ بھی حنفی العقیدہ مولوی سکندر خاں مرحوم، امام مسجد جہانگیری نے پڑھائی اور وہ حضرت امام صاحبؒ سے ملحقہ قبرستان میں سالوں پہلے خود بنوائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔

علامہؒ کی بھاوجہ اہلیۂ شیخ عطا محمد مرحوم 13 فروری 1959ء کو فوت ہوئیں۔ ان کا جنازہ

بھی سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ البتہ شیخ اعجاز احمد صاحب کے ساتھ ساتھ دو چار مرزائی بھی چل رہے تھے۔ جب جنازہ سنہری مسجد کے قریب پہنچا تو میں نے خود سنا کہ شیخ صاحب اپنے مرزائی ساتھیوں سے کہہ رہے تھے کہ میں تو اپنی والدہ کی نمازِ جنازہ مسلمانوں میں شامل ہو کر پڑھ لوں گا، اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو جنازے کا ساتھ یہیں سے چھوڑ دو۔ اس پر وہ سب کترا کر چلے گئے۔ علامہؒ کے اس ''اکلوتے'' قادیانی بھتیجے نے حنفی العقیدہ مولوی سکندر خاں مرحوم کے پیچھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی والدہ کا جنازہ پڑھا۔ وہ اپنے والد مرحوم و مغفور کے جنازہ پر مسلمانوں سے علیحدہ کھڑے رہنے کا تلخ تجربہ کر چکے تھے۔ اس لیے قادیانی مسلک کو دُہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کی والدہ کو بڑے شیخ صاحب کے پہلو میں پہلے سے بنی ہوئی پختہ قبر میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔

علامہؒ کے برادرِ بزرگ پر مرزائی ہونے کی تہمت تراشنے والوں میں اگر ذرا سی سوجھ بوجھ ہوتی تو سوچتے کہ اگر وہ مرزائی ہوتے تو جیتے جی اپنی اور اپنی اہلیہ کی قبر مسلمانوں کے قبرستان میں ہرگز نہ بنواتے اور نہ ہی مسلمان انھیں بنوانے دیتے۔ بلکہ ان کا قادیانی ''اکلوتا'' بیٹا انھیں قادیان کے ''بہشتی مقبرہ'' میں دفن کرانے کا اہتمام کرتا۔

یہ کہنا کہ علامہؒ کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی، سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہؒ کے والد، والدہ، چچا، چچی، بہنیں اور بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں۔ سوائے ایک بھتیجا کے جو کہ جی میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے ''اکلوتا'' قادیانی بن گیا۔

علامہ کے والدِ گرامی مرزا قادیانی کے مرید کیا ہوتے وہ تو خود قیام سیالکوٹ کے دوران علامہؒ کے والدؒ کے زیر تربیت رہا۔ 1864ء میں 24 سالہ مرزا قادیانی جب ملازمت کے لیے سیالکوٹ میں وارد ہوا تو میاں جی اس وقت قادریہ طریق میں رشد و ہدایت کے مقام پر فائز المرام تھے۔ طالبانِ حق اور محلّہ کے سر برآوردہ لوگوں کی مجلس ان کے ہاں ہر روز لگتی تھی۔ اتفاق سے مرزا قادیانی بھی محلّہ کشمیریاں کی ایک گلی میں رہائش پذیر ہوا۔ محلّہ داروں کے ساتھ وہ بھی حاضرِ مجلس ہونے لگا۔ تسبیح بدست تو رہتا ہی تھا۔ میاں جی نے قادریہ طریق پر اس کی تربیت شروع کر دی۔ ابھی وہ اس کا ظرف ہی جانچ رہے تھے کہ انانیت کی بھول بھلیوں سے نکلنے سے پہلے ہی مختار پٹوار کے امتحان میں بار بار فیل ہو جانے سے دل برداشتہ ہو کر قادیان پدھارا، چند دن اور ٹھہر کر اگر وہ

قادری طریق سے نفسِ امارہ پر قابو پالیتا تو میاں جی اپنے مرشد سائیں عبداللہ قادریؒ سے سفارش کر کے اس کی چشمِ باطن کھلوا دیتے۔ لیکن افسوس کہ مرزا کی قسمت میں تمام عمر آتشیں دریائے انانیت معلم الملکوتی کے دسوسی بھنوروں ہی میں چکر کھاتے رہنا تھا۔ قادیان میں راہِ طریقت میں راہنمائی کے لیے کوئی دوست نہ ملا، اس لیے بھٹک گیا۔

ظلماتِ انانیت میں اگر کسی خضرِ راہ کی راہنمائی حاصل نہ ہو تو ناری تجلیات کی گرمی سے سالکِ راہ کے سر پر تمام اولیاء سے بڑا ہونے کا خبط ہی سوار نہیں ہو جاتا، بعض اوقات وہ نبی بلکہ میں ہی میں ہوں کی واردات میں اپنے آپ کو خدا بھی سمجھنے لگتا ہے۔ مرزا جی پر یہی افتاد پڑی۔ اس کے غیر اسلامی عقائد کی وجہ سے جب میاں جی نے توجہ ہٹا لی، تو وہ بے مرشد انانیت کے آتشیں دریائے ذخار کے قعر وسواس میں ایسا ڈوبا کہ پھر زندگی بھر اُبھر نہ سکا۔

آپ خیال کریں کہ جس شخص نے ''احمدیت علامہ اقبالؒ کی نظر میں'' لکھتے ہوئے پہلی چھ سطروں ہی میں پانچ جھوٹ کترے ہیں، اس نے باقی مضمون میں کونسی سچی باتیں لکھی ہوں گی؟ علامہؒ کے خویش و اقارب میں سے صرف ایک بھتیجا اکلوتا قادیانی ہے۔ جن دنوں علامہ نے حکومتِ ہند سے مرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا، مرزا محمود قادیانی نے ان کے خلاف ایک جمعہ میں وعظ کرتے ہوئے کہا کہ انھیں اپنے برادر زادہ شیخ اعجاز احمد کی ''پاکیزہ جوانی'' سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گلی حکیم حسام الدین کے مرزائیوں نے سمجھا کہ بیٹے کی تعریف سن کر بڑے شیخ صاحب خوش ہوں گے، انھیں الفضل پڑھانے کے لیے آئے۔ شیخ صاحب اقبال منزل کے باہر بازار کی طرف سیڑھیوں کے آگے کھڑے تھے۔ مرزائیوں نے انھیں مرزا محمود کے الفاظ سنائے تو اخبار دیکھنے دکھانے سے پہلے ہی شیخ صاحب نے قادیانی خلیفے اور اس کے ساتھیوں کو بہت برا بھلا کہا اور فرمایا کہ مرزا محمود کو گزا اقبالؒ خود پھیر لے گا۔ البتہ میرے بیٹے میں اگر بصیرت ہوتی تو قادیانی خلیفے کی سیالکوٹ میں گزاری ہوئی ''پاکیزہ زندگی'' کے پیشِ نظر سیّد احمد شاہ بن سیّد حامد شاہ قادیانی کی طرح قادیانی خلیفے اور اس کے مذہب پر دو حرف بھیجتا۔

علامہؒ کے والد شیخ نور محمد مرحوم سلسلۂ قادریہ میں منسلک تھے۔ ان کے مرشد سائیں عبداللہ قادریؒ اپنے وقت کے سیف زبان صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ وہ خواجہ عمر بخش قادریؒ گوجرانوالوی کے خلیفۂ اوّل تھے۔ ان کا مزار دارہ سائیں عبداللہ قادریؒ (نزد لیڈی اینڈرسن ہائی

سکول سیالکوٹ) میں ہے۔ صحیح روایت ہے کہ علامہؒ جس وقت قریباً چار برس کے تھے تو خواجہ عمر بخشؒ اپنے خلیفہ اور دوست سائیں عبداللہ قادریؒ کو ملنے کے لیے سیالکوٹ تشریف لائے۔ میاں جی نے اپنے دادا پیر کی دعوت کی اور علامہؒ کو مرشد کے توسط سے بسم اللہ کے لیے دادا پیر کی گود میں بٹھایا۔ سائیں عبداللہؒ نے میاں جی کی استدعا مرشد سے عرض کی تو انھوں نے مسکرا کر اپنا لبِ دہن علامہؒ کے منہ میں لگا کر بسم اللہ پڑھوائی۔ ان ہر دو بزرگوں کی تقدیر ساز توجہ اور اپنے والدِ گرامی کی دعاؤں ہی سے علامہؒ حکیم الامت بنے۔

ڈاکٹر وحید عشرت

''مظلوم اقبال''

''مظلوم اقبال'' کتاب کی طرف فوری طور پر متوجہ ہونے کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو اس کا نام ہے کہ قاری اسے پڑھتے ہی چونک جاتا ہے اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کتاب میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے حوالے سے متعدد ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہوگی جس سے علامہ کی شخصیت کو گھٹانے، مسخ کرنے یا ان کے بارے میں غلط بیانیوں پر مبنی باتیں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ تاہم کتاب کو دیکھ کر خاصی مایوسی ہوتی ہے کہ بہت معمولی قسم کی واقعاتی اور تاریخی باتوں میں اختلاف کے سوا فاضل مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کتاب کے نام کا جواز پیدا کیا جاسکے۔ اس کتاب کے اس نام کی شانِ نزول جو انھوں نے بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی صاحب قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے تھے تو علامہ نے اس پر فرمایا کہ ایک زمانے میں حسینؓ مظلوم تھے، ان دنوں قرآن مظلوم ہے کہ جو اٹھتا ہے اس کی تفسیر لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔

اقبال کی مظلومیت کے لیے شیخ اعجاز کے بیانات کی حقیقت

شیخ صاحب نے مظلوم اقبال کے جواز میں دوسری روایت فیض احمد فیض کی بیان کی ہے۔ کہتے ہیں، روزنامہ جنگ کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک مذاکرے میں فیض احمد فیض نے کہا کہ ''آج کل کے دور میں اگر شعراء میں سب سے مظلوم کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ ہر نقاد اور مبصر اقبال کو اپنے نظریات اور خیالات اور عقائد کی اقلیم میں کھینچ تان کر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے حضرات علامہ اقبال کا کوئی نہ کوئی مصرعہ یا شعر اپنے خیالات کی تائید کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔''

مظلوم اقبال نام رکھنے کے لیے شیخ صاحب نے ان دو واقعات سے استدلال فرمایا ہے کہ ان الفاظ میں اقبال بھی مظلوم ہے کہ ان پر ہر کہ و مہ لکھ رہا ہے اور عجیب عجیب فرضی روایات ان سے منسوب کر رہا ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اس کتاب میں بالخصوص مولانا عبدالمجید

سالک، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، خالد نظیر صوفی اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتابوں کو مختلف حوالوں سے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود کو حرفِ آخر اور مستند کتاب قرار دینے کے باوجود محض اس لیے نشانۂ تنقید بنایا ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے خاندان، ماں، باپ، بھائی اور دوسرے عزیز و اقارب کے قادیانی ہونے کی مستند اور مدلل حوالوں سے تردید کی گئی ہے۔ دوسروں کی روایت کو سنی سنائی اور ساقط الاعتبار قرار دیتے ہوئے وہ خود جن روایات کو بیان کرتے ہیں، وہ سنی سنائی اور قادیانی جماعت کے تشہیری بیانات پر مشتمل ہیں۔ اکثر جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ خود کوئی مستند حوالہ دینے کے بجائے اپنی روایت کی ہوئی بات کو بلا دلیل مستند سمجھتے ہوئے دوسروں کے دلائل کو رد کرتے ہیں۔ متعدد جگہ خود انھوں نے بالخصوص قادیانیت کے حوالے سے جو گھپلا کیا ہے، اس سے ان کی دوسری روایتوں کی صحت کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ جو شیخ صاحب نے اس کتاب کے ضمن میں فیض احمد فیض کے حوالے سے بیان کی ہے، وہ بھی کوئی لائقِ اعتنا نہیں۔ اقبال ایسی قد آور شخصیت پر جو اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی علامت ہے اور عصرِ حاضر میں مسلمانوں کے عمرانی، سیاسی، فکری اور الٰہیاتی مسائل کے بارے میں روشنی دینے والی بصیرت ہے۔ اقبال کا نام دنیا میں اسلامی قوتوں کے لیے سرچشمۂ طاقت ہے جس نے برصغیر کی سیاسی بساط کے تمام مہروں کو مات دی اور انگریز اور ہندو کی شاطرانہ سیاست کی چالیں الٹ دیں۔ انھوں نے انگریز اور ہندوؤں کی چالوں سے متذبذب مسلمانوں کو دو قومی نظریہ اور علیحدہ وطن کا نصب العین دیا۔ ان پر جس قدر لکھا جائے کم ہے، پھر ابھی اقبال پر مواد جمع ہونے کا مرحلہ ہے۔ ایک وقت پھر ایسا آئے گا، جب اس مواد کو جانچا اور پرکھا جائے گا۔ ایسے میں اقبال کی اس ہمہ گیر اور جادو اثر شخصیت پر بہت سی مستند کتب کے ساتھ ساتھ بہت سی غیر مستند کتب بھی شائع ہوئی ہیں تو اس سے اقبال کو مظلوم نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا جادو ہے جس نے پوری دنیا کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ فکرِ اقبال کو سب سے زیادہ بگاڑنے کی کوششیں فیض نہیں تو اس کے نظریاتی بھائی بندوں نے زیادہ سرانجام دی ہیں تو مضائقہ نہیں، اس لیے کہ کمیونسٹ پارٹی کا یہ واضح اشارہ ہے کہ اگر تم کسی فکر اور نظریے کو رد نہیں کر سکتے تو اس کو مختلف تعبیرات اور توجیہات کے ذریعے اتنا الجھا دو کہ وہ اپنی ہیئت کھو دے۔ اقبال کو اشترا کیانے کی مختلف جہات سے کوششیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ان سب باتوں

کے باوجود اقبال کا اپنا ایک تشخص ہے اور اپنی الگ شناخت ہے جوان پر طوائف کو قتل کرنے، شراب نوشی اور رندی و سرمستی کے بہتانوں اور اتہامات کے باوجود کبھی کم نہیں ہوا۔ لہٰذا اقبال کو مظلوم بنانے یا ثابت کرنے کا شغل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کتاب کا عنوان نہایت کچا اور بودا ہے۔ سستی جذباتیت کے ذریعے کچھ مقاصد کے لیے ہمدردی حاصل کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے۔ تاہم لوگوں کو چونکا دینے اور کتاب کی سیل ویلیو بڑھانے کے لیے ایسے نام کسی طور پر مفید قرار دیے جاسکتے ہیں مگر اس عنوان سے کتاب کی معنویت ثابت نہیں کی جاسکی۔

کتاب میں ایک اور بات بڑی نمایاں ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر محمد اقبال کے بارے میں ایسی کچی اور ناپختہ باتوں کا نوٹس لیتے وقت اپنا سارا وزن علامہ کے پلڑے میں ڈالا ہے اور ہر اس شخص کی خبر لینے کی کوشش کی ہے جوان کے ہاتھ آیا اور یہاں ان کی زبان علامہ کے حق میں بڑی زوردار اور جاندار ہے۔ تاہم جہاں قادیانیت کے بارے میں علامہ کا مؤقف بیان کیا ہے، وہاں خود ان کا اپنا لہجہ علامہ کے بارے میں غیر ثقہ، غیر ہمدردانہ بلکہ افسوسناک حد تک جارحانہ ہے اور انھوں نے ہر چھوٹا بڑا وہ واقعہ بیان کر دیا ہے جو کسی صورت بھی علامہ کے قادیانیت سے تعلق کو ظاہر کرسکتا ہو۔

اگر شیخ صاحب کی کتاب کو قادیانیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال سے بڑا واقعی کوئی مظلوم نہیں۔ انھوں نے نہایت چابکدستی سے غیر متعلقہ اور جزوی واقعات کے حوالے سے اقبال کو قادیانیت کے کیمپ میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے اور علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد، والدہ کریم بی بی، بھائی جوان کے والد ہیں، بھابھی جی جوان کی والدہ ہیں اور اپنی پھوپھیوں سب کو ایک ہی ہلے سے قادیانی بنا دیا ہے اور ان پر اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہوگا کہ ان کی سند بھی شیخ صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بھابھی (والدہ) اور پھوپھیوں سے ایسا سنا۔ اقبال اس لحاظ سے مظلوم اور بدقسمت ہے کہ خود اس کے چہیتے بھتیجے نے جوان سے پیار اور محبت کا مدعی ہے، ان کے عقائد پر حملہ کیا ہے اور اپنے عقائد کے استناد کے لیے علامہ اقبال کی شہرت کو بلیک میل کیا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی کتاب زندہ رُود جسے وہ حرفِ آخر اور مستند قراء دیتے ہیں، کے اقبال اور احمدیت کے سلسلے میں دلائل کے بعد اس کتاب کا کیا جواز تھا؟ اگر یہ کتاب زندہ رود سے پہلے آئی ہوتی تو اس کا ایک جواز مان لیا جاتا۔ مگر ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کو خاندانِ اقبال

کے قادیانی ہونے کے بارے میں اپنے دلائل کی مکمل تفصیل دینے اور شائع کرانے کے بعد ان کا مظلوم اقبال کے نام سے کتاب لکھنا ان کے کچھ دوسرے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے جو ان سے چھپائے نہیں چھپتے۔ اگر مظلوم اقبال سے پہلے یا اس کے پڑھنے کے بعد کوئی غیر جانبدار شخص زندہ رود کی تیسری جلد کے صفحات 551 تا 599 پڑھے تو قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے خاندان اور اقبال کا پورا موقف دلائل کے ساتھ مفصل طور پر سامنے آجاتا ہے اور شیخ اعجاز احمد کے دلائل کی قلعی کھل جاتی ہے۔ انھوں نے محض اپنے خونی اور خاندانی رشتے کے بل پر علامہ اقبال جو اس ملک کے نظریہ ساز ہیں، کے دل میں قادیانیت کے لیے نرم گوشہ ثابت کرنے کے لیے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، اس کی وجہ ملک کی وہ صورت حال ہے جس میں قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ ایسے وقت میں اس کتاب کی بڑے اہتمام کے ساتھ اشاعت دراصل اس سبب سے ہے کہ علامہ اقبال کے ساتھ قادیانیت کو نتھی کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ اس ملک میں جس کی بنیاد فکر اقبال پر ہے، وہاں قادیانیت کو جس سے وہ ہمدردی رکھتے تھے، غیر مسلم اقلیت قرار دیا جانا مناسب نہیں۔ شیخ صاحب کا یہ بیان کہ اقبال پر احراریوں کا اثر تھا جس کی بنا پر انھوں نے 1935ء میں سیاسی دباؤ کے تحت قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی حمایت کی، کے پس منظر میں شیخ صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے پیچھے احراریوں کی ہی تحریک ہے۔

'مظلوم اقبال' میں یوں تو پوری کتاب کے بین السطور میں اقبال کی مظلومیت کی آڑ میں قادیانیت کی نام نہاد مظلومی کا رونا رویا گیا ہے اور اقبالیات کے پردے میں قادیانیت کو پیش کیا گیا ہے مگر شیخ صاحب کھل کر اپنی کتاب میں باب 32 اور 33 میں سامنے آئے ہیں۔ باب 32 کا عنوان ہے ''زندہ رود۔ علامہ اقبال کے سوانح حیات'' اور باب 33 کا عنوان ہے ''علامہ اقبال اور احمدیت''۔ زندہ رود کے بارے میں ان کی رائے ہے:

❑ ''زندہ رود کی اشاعت سے پہلے علامہ اقبال کے سوانح حیات کی کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ زندہ رود نے اس کمی کو احسن طریق سے پورا کر دیا ہے۔ اس میں صرف ان کے نجی زندگی کے حالات ہی نہیں، ان کے افکار اور نظریات کے بتدریج ارتقا کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ میں کوئی نقاد نہیں لیکن اقبالیات کے ایک قاری کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ کے سوانح

حیات پر یہ کتاب حرفِ آخر سمجھی جائے گی۔''(1)

اس ابتدائی تمہید کے بعد شیخ اعجاز لکھتے ہیں کہ انھوں نے جسٹس جاوید اقبال کو لکھا کہ وہ اقبال اور احمدیت کے بارے میں صحیح صورتِ حال پیش کرنا چاہتے ہیں جس پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے انھیں لکھا کہ وہ اقبال اور احمدیت کے موضوع پر ایک مفصل نوٹ بھیج دیں تو وہ اختلاف کے باوجود اسے شائع کر دیں گے۔ چنانچہ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے وہ نوٹ کتاب میں شامل کر دیا جو زندہ رود کی جلد سوم کے بیسویں باب میں شامل ہے۔ جسٹس جاوید اقبال کی طرف سے ان کے موقف کی شمولیت پر شیخ صاحب نے اظہارِ انبساط کیا ہے اور اسے جاوید اقبال کی طرف سے اعلیٰ جوڈیشل کی مثال قرار دے کر کہا ہے کہ ان کا اگلا باب اسی کے ترمیم و اضافے پر مشتمل ہے۔

مختصراً زندہ رود اور اقبال اور احمدیت کے ابواب میں شیخ صاحب نے بنیادی طور پر جو باتیں کی ہیں، ان کا جواب مفصل طور پر جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب زندہ رود کی جلد سوم میں دے کر یہ فرض چکا دیا ہے۔ یہاں ہم قارئین کے استفادے کے لیے مختصراً اس بحث کا تذکرہ کرتے ہیں۔ شیخ صاحب کا بنیادی موقف یوں ہے کہ:

1- ''1935ء سے قبل احمدیت کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے سخت اختلاف کے باوجود چچا جان احمدیوں کو قطع نظر ان کے عقائد کے، مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ سمجھتے تھے اور جماعتِ احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیتے تھے۔

2- ''اپنی حیات کے آخری تین چار سالوں میں چچا جان نے احمدیت کے خلاف جو محاذ کھڑا کیا، اس کی ابتداء مئی 1935ء میں ہوئی۔ بیان کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ احمدی سرکارِ دوعالم ﷺ کے بعد ختم نبوت کے قائل نہیں، اس لیے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس جماعت کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس مطالبہ پر سٹیٹس مین میں اس پر تنقید ہوئی اور نہرو نے رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ میں تنقیدی مضامین شائع کیے۔

3- ''معلوم ہوتا ہے ان مضامین سے علامہ اور برافروختہ ہوئے۔ نہرو کی تنقید سے انھیں احمدی کانگریسی سیاسی گٹھ جوڑ کا شبہ ہوا جو بے بنیاد تھا۔ انھوں نے ایڈیٹر سٹیٹس مین کے اداریے کے جواب میں ان کو ایک خط لکھا (2) اور پنڈت نہرو کے جواب میں بھی ایک مفصل

وضاحتی بیان میں اپنے پہلے بیان کا اعادہ کیا (3) ان سب تحریروں کا لب لباب وہی ہے جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔''

-4 ''احمدیوں کے متعلق ان کے تکفیری بیانات کو مسلمانوں کے سنجیدہ حلقوں میں بھی تعجب سے پڑھا گیا۔ اوّل اس لیے کہ چچا جان تو ملاؤں کے شغلِ تکفیر بازی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ خود بھی اس اوچھے اور کثرتِ استعمال سے کند شدہ ہتھیار سے گھائل ہو چکے تھے۔ دوسرے اس لیے کہ احمدیوں کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے اختلاف کے باوجود علامہ عمر بھر اپنے قول و فعل سے احمدیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرتے تھے اور مئی 1935ء سے قبل انھوں نے کبھی احمدیت کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس وقت تک بانیِ سلسلۂ احمدیہ اور ان کے دو جانشینوں کے متعلق ان کی رائے عقیدت مندانہ رہی تھی۔''

اس کے بعد شیخ صاحب علامہ اقبال کے 1935ء کے قبل کے رویے کو زیرِ بحث لاتے ہوئے متعدد مثالیں دیتے ہیں جن سے علامہ اقبال کے قادیانی جماعت کے بانی، حکیم نورالدین، بشیر الدین محمود وغیرہم سے ملاقاتوں اور تعلقات کا ذکر ہے کہ اگر اقبال کو شکایت ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتے۔ اقبال سے بھی اس قسم کا سوال کیا گیا کہ پہلے تو آپ قادیانیت کی کسی نہ کسی پہلو سے تعریف کرتے تھے مگر اب آپ کا رویہ کیوں تبدیل ہو گیا ہے؟ آپ کے خیالات میں تناقض کیوں ہے؟ چنانچہ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر کے حوالے سے علامہ اقبال نے جو جواب دیا، وہ یوں ہے:

❑ ''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ ''براہینِ احمدیہ'' میں انھوں نے بیش قیمت مدد پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیے۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر کے شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا

کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت...... بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں، پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''(2)

یہاں شیخ صاحب سے صرف اس قدر کہنا ہے کہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف محاذ کھڑا نہیں کیا بلکہ اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان کا سوشل بائیکاٹ کر کے اور ان کے نماز و جنازہ میں شرکت سے انکار سے قادیانیت نے تمام مسلمان امت کے خلاف محاذ کھڑا کیا۔ اگر وہ پوری امتِ مسلمہ کو اپنے عقائد کی رُو سے کافر کہہ سکتے ہیں یا تقیہ کر کے کافر نہیں کہتے، صرف دل سے سمجھتے ہیں تو جمہور مسلمانوں اور ان کے ایک ممتاز قومی اور سیاسی لیڈر کی طرف سے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبہ پر کس اخلاقی اصول کے تحت سیخ پا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے قادیانیوں سے خود کو نہیں کاٹا بلکہ قادیانیوں نے خود کو مسلمانوں سے کاٹ کر خود کو کافر کہلوانے اور غیر مسلم اقلیت بننے کی راہ ہموار کی ہے۔ اس کے باوجود شیخ صاحب تصویر کا یہ رُخ دکھاتے ہیں کہ اقبال نے قادیانی جماعت سے بہتری کی توقعات بھی رکھیں اور بعض مواقع پر ستائش بھی کی۔ مگر اس طرف نہیں آتے کہ جماعت احمدیہ سے اقبال کے وہ اختلاف کیا تھے، جنھیں شیخ صاحب خود، سخت اختلاف کہتے ہیں اور نہ وہ ان اختلافات کا ذکر کرتے ہیں جو 1901ء کے مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کے بعد اقبال کے ہاں پیدا ہوتے ہیں اور جس کا اظہار اقبال نے 1902ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں اس شعر سے کیا:

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزمِ را روشن ز نُورِ شمعِ عرفان کردۂ ای (3)

پھر 1914ء میں انھوں نے ایک بیان دیا کہ:

❑ ''جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو، وہ خارج

ازاسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔“(4)

اس سے صاف مترشح ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم سمجھنے کا اقبال کا رویہ 1935ء میں سامنے نہیں آیا بلکہ وہ 1902ء اور 1914ء یعنی ایک تواتر کے ساتھ اس مسئلہ کا سنجیدگی سے نوٹس لے رہے تھے اور اس جماعت کے عقائد کو اسلام کے منافی تصور کرتے تھے۔ 1902ء میں ہی انھوں نے مئی 1902ء کے مخزن اور 11 جون کے محمد دین فوق کے ”پنجۂ فولاد“ میں نظم شائع کرائی جس میں قادیانی مذہب کے نتائج کا تجزیہ کیا۔

تُو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں (5)

اس میں قادیانیت کی طرف سے منافرت، بھائی بھائی میں تفریق اور مرزا قادیان کی طرف سے دوسروں کے لیے موت کی پیش گوئیوں پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے رویہ کو غیر پیغمبرانہ بتایا گیا ہے۔ یہ تو شیخ صاحب کے اس خیال کا جواب ہے کہ وہ 1935ء سے قبل قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے تھے۔

جملہ معترضہ کے طور پر ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اگرچہ 1901ء میں دعویٰ نبوت کر دیا تھا مگر وہ پوری جرأت کے ساتھ کبھی بھی اس پر قائم نہ رہا، کبھی خود کو مسیحِ موعود، کبھی مہدی، کبھی مصلح، کبھی ظلی نبی، کبھی بروزی نبی یعنی کبھی کچھ اور کبھی کچھ کے دعوؤں میں الجھتا رہا تاکہ وہ ہر موقع پر حسبِ منشاء اس کی تاویل کر سکے۔ خود نورالدین نے مرزا قادیان کو کبھی نبی تسلیم نہ کیا بلکہ اسے دعویٰ نبوت سے کسی حد تک باز رکھنے کی کوشش بھی کی۔ خود حکیم نور الدین نے اپنے عہد خلافت میں کبھی مرزا قادیان کو نبی نہ کہا اور نہ مانا۔ یہ مرزا غلام احمد قادیانی کا بیٹا بشیرالدین محمود تھا جس نے حکیم نورالدین کی وفات کے بعد خلیفہ بنتے ہی اپنے باپ کی نبوت کو منوانا شروع کر دیا اور یوں مرزا قادیانی، بشیرالدین محمود کے ہاتھوں، ”پکا“ نبی بن گیا ورنہ وہ تو

ساری عمر مختلف اور متضاد دعووں کے درمیان ہی گھرا رہا۔ اس کے باوجود 1901ء میں جب علامہ کے کان میں اس جھوٹی نبوت کی بھنک پڑی تو انھوں نے شرک فی النبوت کہہ کر اس کا فوری نوٹس لیا۔ پھر بلاشک 1911ء میں اس اعتراف کے باوجود کہ قادیانیوں نے ''ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ'' بننے کی سعی کی ہے، محض دعویٰ نبوت کی بنا پر انھیں 1914ء میں اپنے بیان کے ذریعے اسلام سے خارج کہا۔ چنانچہ 1935ء تک قادیانیت جس طرح عمرانی، تہذیبی اور سیاسی قوت بننے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی، اس کے ممکنہ نتائج کو محسوس کر کے اقبال نے اسے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر دیا۔

جہاں تک شیخ صاحب کے دوسرے نکتہ کا تعلق ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی حیات کے آخری سالوں میں قادیانیت کے خلاف محاذ کھڑا کیا، وہ یوں غلط ہے کہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ 1902ء اور 1914ء میں وہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے اور 1901ء میں مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کو انھوں نے شرک فی النبوت قرار دیا اور 1914ء میں اپنے بیان میں واضح کر دیا کہ اگر قادیانی جماعت نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت کی قائل ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ 1935ء میں علامہ نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ کیوں کیا؟ اس کی وجہ شیخ صاحب سیاسی تصور کرتے ہیں تو وہ حق بجانب ہیں، اس لیے کہ 1935ء میں صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب ہونا تھا اور مرکزی اسمبلی کا انتخاب ان ہی صوبائی اسمبلیوں سے ہونا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ فضل حسین اور ظفر اللہ خان کے گٹھ جوڑ سے یہ خدشہ تھا کہ ان انتخابات کے نتیجے میں درپردہ قادیانی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں نہ پہنچ جائیں اور اپنے ناموں سے جمہور مسلمانوں کو دھوکہ دے کر کانگریس کے ہاتھ میں مسلمانوں کے مفادات فروخت نہ کر دیں، اور قادیانی انگریز اور کانگریس کے ساتھ مل کر علیحدہ وطن کے منصوبے کو سبوتاژ نہ کر دیں۔ یہ خدشہ تھا جس کی بنا پر اقبال چاہتے تھے کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل مسلمانوں کی وحدت کے اندر نقب لگانے والی جماعت کو غیر مسلم قرار دے کر بے نقاب کر دیا جائے۔

جہاں تک قادیانیت کی طرف سے ظفر اللہ خاں کو برصغیر کی سیاست میں فیصلہ کن لیڈر بنانے کی سازش اور احراریوں کا معاملہ ہے، شیخ اعجاز نے اپنی کتاب میں جس اقبال کی تصویر ہمیں خود دکھائی ہے، وہ اتنا کم ظرف نہ ہو سکتا تھا کہ ظفر اللہ خاں کی وائسرائے کی کونسل کی ممبری پر اتنا بڑا

فیصلہ کرتا۔ تاہم اصل بات یہ بھی ہے مگر ذرا ایک دوسرے رُخ سے، جس طرح قادیانی سر فضل حسین سے اپنے مراسم کے ذریعے ظفر اللہ خاں کو برصغیر کی سیاست میں کاشت کر رہے تھے اور من حیث الجماعت سر فضل حسین سے مسلمانوں کے مفادات کے منافی فیصلے کروا رہے تھے اور ظفر اللہ خاں جیسے استحقاق نہ رکھنے والے شخص کی پشت پناہی کر کے اس کی لیڈری کو معتبر بنا رہے تھے اور اسے جس طرح انھوں نے سر فضل حسین کے ذریعے وائسرائے کی کونسل تک پہنچایا، اقبال کے لیے یہ تجربہ بھی بڑا تلخ تھا۔ وہ اس سارے ڈرامے کے عینی شاہد تھے کہ قادیانی پہلے کشمیر کو کشمیر کمیٹی کے ذریعے ہتھیانے اور پھر مسلم لیگ کی صدارت کے ذریعے جس کا نوٹس دہلی کے مسلمانوں نے بروقت لیا اور اس میں ناکامی کے بعد قادیانی یونینسٹ پارٹی اور سر فضل کے توسط سے پنجاب کو قادیانی صوبہ بنانے کا جتن کر رہے تھے۔ اقبال اس سے قبل پنجاب کو سکھوں کے پاؤں تلے روندا ہوا دیکھ چکے تھے۔ اب وہ قادیانیوں کے نرغے میں پنجاب کو آتا دیکھ کر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے خواہشمند تھے۔ اسی پس منظر میں انھوں نے یہ 1935ء والا بیان دیا۔ شیخ اعجاز اس پس منظر میں دیکھیں کہ فوری وجہ ظفر اللہ خاں کی ممبری نہیں تھی بلکہ 1935ء میں پنجاب کی سیاسی صورت حال کا یہ تقاضا تھا جو انھوں نے کمال جرأت کے ساتھ پورا کیا۔ جہاں تک احراریوں کے کہنے پر علامہ کے قادیانیوں کے خلاف محاذ آرا ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اقبال پنجاب کی سیاست اور قادیانیت کی پیدائش اور ارتقا کے احراریوں سے زیادہ باخبر اور عینی شاہد تھے لہٰذا وہ خود یہ فیصلہ کر سکتے تھے کہ انھیں کب اور کس وقت اس فتنے پر وار کرنا ہے۔ چنانچہ پنجاب اور برصغیر کی سیاست کے نہایت اہم موڑ پر انھوں نے ازخود یہ راست اقدام کیا۔ لہٰذا احراریوں کے کہنے پر اقبال کے اس فیصلے کو محمول کرنا صریحاً جھوٹ ہے۔ اقبال اگر کانگریس سے احراریوں کے تعلق کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے دباؤ میں نہ آئے تو قادیانیت کے سلسلے میں وہ دباؤ میں کس طرح آ سکتے تھے؟ پھر اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ احراریوں کے کہنے پر انھوں نے ایسا کیا تو کیا برا کیا، اگر ایک صائب فیصلہ تک پہنچنے میں انھیں احراریوں سے مدد یا راہنمائی ملی تو اس میں ہرج ہی کیا ہے! دیکھنا تو یہ ہے کہ ان کا یہ فیصلہ اپنے تناظر میں درست تھا یا نہیں۔ اگر قادیانیت کو 1935ء میں علامہ کے کہنے پر غیر مسلم قرار دیا جاتا تو یہ فتنہ اسی وقت مر سکتا تھا۔ بہرحال جمہور علما کی قادیانیت کے خلاف جنگ میں اقبال نے جمہور علما اور مسلمانوں

کے حق میں وزن ڈال کر مسلمانوں کو توانائی بخشی جس کے نتیجے میں ایک طویل محاذ آرائی کے بعد 1974ء میں آخر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلوا کر اہلِ پاکستان نے علمائے اسلام اور اقبال کے خواب کو اسی طرح تکمیل تک پہنچایا جس طرح ایک علیحدہ وطن کے ان کے خواب کو تعبیر بخشی تھی، حالانکہ افسوس اس وقت ہوتا اگر اقبال قادیانیوں کے بارے میں اس واضح موقف کا اظہار نہ کرتے۔

شیخ اعجاز احمد نے اپنے دادا دادی اور والد کے قادیانی ہونے پر تو اصرار کیا ہے مگر ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر نظیر صوفی کے اس بیان کی تردید نہیں کی کہ خود شیخ اعجاز کی اپنی اولاد بھی جو دو بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہے قادیانی نہیں بلکہ خدا کے فضل سے مسلمان ہے۔

❑ ''ان کی (شیخ اعجاز احمد کی) اولاد جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے، میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا موقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا موقف ہے۔''(6)

خود اقبال کی رائے بھی شیخ اعجاز کے بارے میں اچھی نہ رہی تھی۔ سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

❑ ''شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے، نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں؟''(7)

اب شیخ صاحب خود علامہ کی نظروں میں اپنے عقائد کے لحاظ سے کس قدر معتبر تھے، وہ واضح ہے۔ اسی طرح ان کا اپنے دادا، دادی اور والد پر قادیانیت کا بہتان بھی واضح ہے۔ شیخ عطا محمد اقبال کے بڑے بھائی کچھ عرصہ قادیانیت کے دامِ فریب میں ضرور اسیر رہے مگر علامہ اقبال کی مسلسل صحبت سے بالآخر انھوں نے، ان کے بیٹے مختار احمد اور بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم نے بھی احمدیت کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا ایک ثبوت ان کی قبروں کا مسلمانوں کے قبرستان میں ہونا اور ان کی نمازِ جنازہ کا مسلمانوں کی طرف سے پڑھا جانا ہے۔ شیخ اعجاز احمد نے محض ان کے عقائد کو مشکوک بنانے کے لیے ان کی اپنے احمدی دوستوں کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھی اور غیر قادیانیوں کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کے قادیانی حکم کا بھی بطلان کیا۔ اس پر پہلی گواہی تو ہم نے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی فراہم کی تو دوسری گواہی شیخ عطا محمد کے داماد ڈاکٹر نظیر صوفی کی

دیتے ہیں جن کے شیخ اعجاز احمد سالے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

❑ ''یہ کہنا کہ علامہ کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی، سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہ کے والد، والدہ، چچا، چچی، بہنیں بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں سوائے ایک بھتیجے کے جو کہ ججی میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے، اکلوتا ''قادیانی بن گیا۔''(8)

اس کی گواہی حکیم عبدالرحمٰن جواہر نے بھی ایک نجی ملاقات میں دی۔ حکیم صاحب اس وقت حیات ہیں۔ شام نگر میں اب بھی مطب کرتے ہیں۔ اس سے قبل وہ علامہ اقبال کے محلے میں مطب کرتے تھے۔ وہ شیخ اعجاز احمد کے ہمعصر اور بچپن کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے راقم کو بتایا کہ شیخ اعجاز چودھری ظفر اللہ کا پروردہ ہے اور نوکری کے لالچ میں دین سے ہاتھ دھو بیٹھا، ڈاکٹر نظیر صوفی کے مطابق:

❑ ''علامہ کے برادرِ بزرگ 12 دسمبر 1940ء کو فوت ہوئے۔ ان کا جنازہ حسب وصیت سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ یہ وصیت انھوں نے دورانِ بیماری مجھے کی تھی...... ان کی نمازِ جنازہ بھی حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم امام مسجد جہانگیری نے پڑھائی اور وہ حضرت امام صاحب سے ملحقہ قبرستان میں سالوں پہلے خود بنوائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔''(9)

شیخ اعجاز کی والدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

❑ ''علامہ کے اس اکلوتے قادیانی بھتیجے نے حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم کے پیچھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی والدہ کا جنازہ پڑھا۔ وہ اپنے والد مرحوم و مغفور کے جنازہ پر مسلمانوں سے علیحدہ کھڑے رہنے کا تلخ تجربہ کر چکے تھے۔ اس لیے قادیانی مسلک کو دُہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔''(10)

یہ دو واضح شہادتیں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ اقبال کے والد، ان کے بھائی، ان کی والدہ، ان کی بہنیں حتیٰ کہ شیخ صاحب کے بھائیوں، بہنوں اور اولاد کا بھی قادیانیت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ قادیانیت صرف شیخ اعجاز نے قبول کی اور بقول ان کے وہ اس پر اب بھی قائم ہیں جبکہ خاندانِ اقبال سے اگر کبھی کوئی ہمدردی بھی رکھتا تھا تو اس نے اس سے اپنا دامن چھڑا لیا۔

حواشی

1- شیخ اعجاز احمد۔مظلوم اقبال۔کراچی 1985ء ص 183۔

2- بشیر احمد ڈار۔اقبال اور احمدیت۔آئینہ ادب، لاہور ص 58-59۔

3- جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔زندہ رود جلد سوم۔شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1984۔ص 571۔

4- بشیر احمد ڈار۔اقبال اور احمدیت۔ص 17۔

5- غلام رسول مہر (مرتبہ) سرودِ رفتہ۔ص 30۔

6- جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔زندہ رود جلد سوم۔ص 571۔

7- جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔زندہ رود جلد سوم۔ص 570۔

8- ڈاکٹر نظیر صوفی۔حیات و پیامِ اقبال۔ص 91۔

9- ایضاً۔ایضاً۔ص 90-91۔

10- ڈاکٹر نظیر صوفی۔حیات و پیامِ اقبال۔ص 90۔

ڈاکٹر وحید عشرت

قصہ ایک خط کا

اقبالیات جولائی 1986ء میں علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی کتاب ''مظلوم اقبال'' پر تبصرہ شائع کیا گیا تھا جس میں ان حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا تھا جن کے نتیجے میں علامہ اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانی چونکہ خود اپنے سوا جمہور مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اور وہ انگریز اور ہندو کے ساتھ مل کر ایسی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں جن سے مسلمانوں کا اجتماعی تشخص اور مفاد خطرے میں ہے، لہٰذا ان کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے کر مسلمانوں کو اس فتنے سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ شیخ اعجاز نے کتاب میں عجیب منطق استعمال کی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق علامہ اقبال تھے تو نابغہ اور عبقری مگر انھوں نے احراریوں کے کہنے پر 1935ء میں قادیانیت کے خلاف اپنا لب ولہجہ، بہکاوے میں آ کر، سخت کر لیا تھا۔ نیز ان کے بیشتر عزیز و اقارب بھی قادیانی تھے اور خود اقبال بھی قادیانیت کے لیے ایک عرصے تک نرم گوشہ رکھتے تھے اور وہ چند شدید اختلافات کے باوجود بھی قادیانیوں کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔

ہم نے اپنے تبصرے میں شیخ اعجاز کی اس صریح غلط بیانی اور اقبال پر بہتان کا پردہ چاک کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ علامہ اقبال 1902ء سے لے کر 1914ء اور 1935ء تک قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کرتے چلے آ رہے تھے۔ 1935ء میں دستورِ جدید کے تحت چونکہ عام انتخابات ہونے والے تھے، چنانچہ ڈر تھا کہ مسلمانوں کے بھیس میں قادیانی اسمبلیوں میں پہنچ کر مسلمانوں کے علیحدہ آزاد وطن کی تحریک کو سبوتاژ نہ کر دیں، لہٰذا انھوں نے کھل کر سیاسی بنیادوں پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے یہ بھی بتایا کہ علامہ اقبال کے اعزہ میں شیخ اعجاز ہی چودھری ظفر اللہ کی طرف سے دیے گئے سب ججی کے لالچ کے تحت قادیانی ہوئے تھے۔ خود علامہ اقبال انھیں صالح تصور کرتے تھے مگر ان کے قادیانی عقائد

کی وجہ سے انھیں ناپسند کرنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اقبال نے انھیں اپنے بچوں کی گارڈین شپ سے بھی فارغ کرنے کا فیصلہ کرلیا اوران کی جگہ سرراس مسعود کو لانا چاہا اور سرراس مسعود کے نام خط میں شیخ اعجاز کے عقائد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ہمارے اس بیان پر پہلا تبصرہ تو خود شیخ اعجاز احمد صاحب نے کیا کہ آپ کے موقر مجلّہ میں ''مظلوم اقبال'' کا ذکر بہ بدی ہی سہی کیا تو گیا جبکہ متعدد دوسرے اصحاب نے ہم سے شیخ اعجاز صاحب کے بارے میں علامہ اقبال کے سرراس مسعود کے نام خط کا حوالہ طلب کیا۔ ہم نے اس سلسلے میں اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ دیکھا تو ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ اقبال نامہ کے ایک ہی ایڈیشن کے دو نسخوں کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ اس خط میں دانستہ تحریف کا یقین نہ کرنا حماقت ہے۔ خود ہم نے زندہ رود جلد سوم سے یہ حوالہ (1) لیا تھا اور زندہ رود کے فاضل مصنف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے ڈاکٹر اخلاق اثر کے مرتّبہ اقبال نامے کا حوالہ دیا تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں بھوپال میں ڈاکٹر اخلاق اثر سے مراسلت کی۔ انھوں نے فرمایا کہ علامہ کا یہ خط جس کا عکس ان کی کتاب ''اقبال اور ممنون حسن خان'' میں بھی موجود ہے، اقبال نامے میں اصل خط کی عبارت کا بھی ایک حصہ چھوٹ گیا تھا، جو اقبال نامے کے اس نسخے میں جو انھوں نے مجھے بھجوایا ہے، انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس خط میں تحریفات کے چیستان سے ایک بات پوری طرح عیاں ہے کہ ان تحریفات کے پیچھے کوئی طاقت ور ہاتھ کام کرتا رہا ہے اور اس کا مقصد علامہ اقبال کی شیخ اعجاز اور ان کے مذہب کے بارے میں رائے کو چھپانا ہے۔ ہم اس مختصر سے مضمون میں اس خط کے حوالے سے چند معروضات پیش کرتے ہیں۔

اس خط کے بارے میں ''مظلوم اقبال'' کے صفحہ 333 سے 339 تک شیخ اعجاز احمد کے مباحث بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان کے بقول یہ خط انھیں 52 سال بعد یعنی 1973ء میں سرراس مسعود کے نام خطوط میں پڑھنے کو ملا جو علامہ نے 10 جون 1937ء کو سرراس مسعود کو لکھا تھا۔ شیخ اعجاز کے بقول:

''یہ خط اور سیّد صاحب موصوف کے نام کئی اور خطوط صہبا لکھنوی مدیر ''افکار'' کراچی کی مرتّبہ کتاب ''اقبال اور بھوپال'' میں شائع ہوئے جسے اقبال اکادمی نے 1973ء میں شائع کیا۔ 10 جون والے اس خط کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔ شاید قارئین کی دلچسپی کا

باعث ہو۔ چچا جان کے بہت سے مکتوبات اوّل اوّل شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے 45ء میں ''اقبال نامہ'' اوّل کے نام سے شائع کیے تھے۔ انھیں شیخ عطاء اللہ پروفیسر علی گڑھ کالج نے مرتب کیا تھا۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اوّل) میں چچا جان کے کئی خطوط سیّد راس مسعود کے نام شامل ہیں جن میں 10 جون 37ء والا خط بھی ہے۔ اقبال نامہ 45ء کا ایک نسخہ میرے پاس ہے لیکن اس میں 10 جون 37ء والے خط میں میرے متعلق ان کا بھتیجا اور نہایت صالح آدمی ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ میں نے صہبا صاحب سے دریافت کیا کہ 10 جون 37ء والا خط انھوں نے کہاں سے نقل کیا ہے۔ ان سے یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ وہ خط اور سیّد راس مسعود کے نام دوسرے خطوط جو ''اقبال اور بھوپال'' میں شائع کیے گئے ہیں، سب کے سب شیخ محمد اشرف کے اقبال نامہ حصہ اوّل سے نقل کیے گئے ہیں۔ اپنے بیان کی تائید میں انھوں نے ''اقبال نامہ'' کا وہ نسخہ مجھے دکھایا جس سے یہ سب خطوط نقل کیے گئے۔ جب اس نسخہ میں مندرج خطوط بنام سر راس مسعود کا مقابلہ ان خطوط سے کیا گیا جو میرے پاس والے نسخہ میں شامل ہیں تو مزید تعجب ہوا کیونکہ دونوں نسخے اگرچہ 45ء والے پہلے ایڈیشن کے ہیں (دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی) لیکن ان میں حسب ذیل تین اختلاف ہیں:

1- خط محررہ 30 مئی 1935ء کا کچھ حصہ میرے پاس والے نسخے میں حذف شدہ ہے۔

2- خط محررہ 11 دسمبر 1935ء میرے پاس والے نسخے میں سرے سے موجود ہی نہیں۔

3- خط محررہ 10 جون 1937ء کا کچھ حصہ جس میں میرے متعلق متذکرہ بالا کلمۂ خیر لکھا گیا ہے، میرے پاس والے نسخہ میں حذف شدہ ہے۔''(2)

اس عقدہ کو بھی شیخ اعجاز نے خود ہی کھولا ہے کہ ''اقبال نامہ'' میں تحریفات کی شانِ نزول کیا ہے۔ شیخ اعجاز لکھتے ہیں:

''جب صہبا صاحب نے شیخ محمد اشرف سے اس معمہ کی گرہ کشائی چاہی تو انھوں نے اپنے خط محررہ 3 اکتوبر 1974ء میں یہ جواب دیا۔

مکاتیب اقبال کا ایک ایڈیشن شائع ہوا ہے، دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ پہلا ایڈیشن 1945ء میں طبع ہوا تھا جس وقت یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی، اس وقت چودھری محمد حسین جن کو آپ خوب جانتے ہوں گے، زندہ تھے۔ چودھری صاحب پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے

اور پیپر کنٹرولر بھی تھے۔ میرے ان سے تعلقات بھی تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے ایک خط سر راس مسعود کو تحریر کیا ہوا تھا جو بالکل درست تھا۔ وہ خط بھی طبع شدہ ایڈیشن میں موجود تھا۔ چودھری صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو۔ میں نے ہر چند ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً وہ خط حذف کر دیا گیا۔ جو نسخے قبل ازیں فروخت ہو گئے، ان میں وہ خط شامل ہوگا، بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے۔ یہ ہی فرق ہے جس کی طرف آپ نے نشان دہی کی ہے۔ اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اصل خط شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے، انھوں نے واپس نہیں کیے تھے۔ اب غالباً ان کے صاحب زادے مختار مسعود کے پاس موجود ہوں گے۔ آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے بعض نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں، چونکہ ایک اہم اور طویل خط حذف کر دیا گیا تھا، اس وجہ سے صفحات اور عبارت میں ضرور فرق ہونا لازمی تھا۔ امید ہے آپ کی الجھن دور ہو گئی ہوگی۔'' (3)

شیخ محمد اشرف کے صہبا لکھنوی کو اس جواب کے نقل کرنے کے بعد شیخ اعجاز نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ مختار کو جو لاہور میں رہتے تھے، یہ ساری صورت حال بتائی۔ چنانچہ شیخ مختار نے شیخ اشرف سے ملاقات کر کے اپریل 1975ء کو اپنے بڑے بھائی شیخ اعجاز کو خط لکھا کہ:

''میں کل شیخ محمد اشرف صاحب کو ملا تھا، وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اقبال نامہ حصہ اوّل کے بارے میں انھوں نے وہی بات بتائی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کتاب کی قریباً 100 کاپیاں جب فروخت ہو گئیں تو چودھری محمد حسین صاحب نے چند خطوں کے بعض حصوں کو حذف کرنے کو کہا۔ میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا، سب نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے علم ہوا کہ چودھری صاحب چھ ماہ کے بعد ریٹائرڈ ہو جائیں گے، چودھری صاحب اُس لڑائی کے زمانے میں پیپر کنٹرولر بھی تھے اور کاغذ کا کوٹہ بھی وہی دیتے تھے۔ انھیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح چھ ماہ گزر جائیں، ان کے ریٹائر ہونے کے بعد کتاب فروخت کریں گے۔ چودھری صاحب کو دو سال کی ایکسٹینشن مل گئی۔ میں مجبور ہو گیا، کتاب کی چار ہزار کاپیاں چھپی تھیں، ان کاپیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے جس میں مجھے کافی نقصان ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس اب کوئی

کاپی نہیں، ورنہ میں آپ کو مایوس نہ کرتا۔'' (4)

شیخ اعجاز نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے سیّد نذیر نیازی سے بھی پوچھا جس پر سیّد نذیر نیازی نے بھی تسلیم کیا کہ

''بعض (خطوط) میں چودھری صاحب مرحوم نے مصلحتاً کچھ تبدیلیاں بھی کیں، ان معنوں میں کہ جو عبارت پسند نہ آئی اسے قلم زد کر دیا۔'' (5)

شیخ اعجاز اس ساری بحث کے بعد خط میں تحریف کا سارا الزام چودھری محمد حسین پر دھرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کی اشاعت میرے محترم شریک کار (ہم دونوں (یعنی چودھری محمد حسین اور شیخ اعجاز) جاوید اور منیرہ کے گارڈین تھے) کی سیاست کو گوارا نہ ہوتی۔ اس سیاست بازی کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں۔'' (6)

شیخ اعجاز، ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبال نامے میں چھپنے والے 10 جون 1937ء کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شیخ عطاء اللہ کے مجموعہ خطوط کے اس اصل خط کی بھی نقل انھوں نے پنجاب پبلک لائبریری سے حاصل کر لی ہے جو چودھری محمد حسین کی تحریف سے بچ گیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبالنامے کا وہ فیصلہ اصل خط دیکھ کر ہی کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ اصل خط کس کے پاس ہے۔ پھر انھوں نے اصل خط کی فوٹو کاپی دینے کی استدعا کی ہے حالانکہ اس خط کی فوٹو کاپی اقبال اور ممنون حسن خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر نامی کتاب میں صفحہ 15 پر موجود ہے۔ خود اقبالنامے مرتّبہ ڈاکٹر اخلاق اثر میں بھی اس خط کا پورا متن شائع نہیں ہوا جبکہ علامہ اقبال نے اس خط میں یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ خود قادیانی مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اس واسطے ان کے نزدیک یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہم علامہ صاحب کے اس خط کا عکس اقبال اور ممنون حسن خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر سے لے کر شائع کر رہے ہیں۔ جس کے بعد ہم بھی چاہیں گے کہ شیخ اعجاز نے اس خط کے بارے میں جو یہ عذر تراشا ہے کہ شیخ مختار مسعود اور ممنون حسن خان نے ان کے استفسارات کے جواب نہیں دیے ورنہ

''اگر اس کتاب کی طباعت سے پہلے ان میں سے کوئی ایک فوٹو کاپی مل گئی تو صورتِ

حال عرض کر دی جائے گی۔''(7)

اب شیخ صاحب فرمائیں کہ اس عکسی نقول کی اشاعت کے بعد وہ بیچ اس معاملہ کے کیا فرماتے ہیں کیونکہ انھوں نے ساری تان اس خط کی عدم دریافت پر توڑ دی ہے۔ اس خط میں چودھری محمد حسین نے کیوں تحریف کی، شیخ محمد اشرف کیوں ان سے کسی قدر دبے رہے اور شیخ عطاء اللہ اور شیخ مختار مسعود نے اس کے بارے میں کبھی کوئی وضاحت کیوں نہیں کی۔ ایسے جواب ہیں جو ان ہی متعلقہ افراد کے لواحقین یا احباب دے سکتے ہیں مگر یہ دلچسپ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی کہ اس پردۂ زنگاری میں کون تھا جو چودھری محمد حسین کو یہ خط شائع نہ کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور شیخ محمد اشرف نے چودھری محمد حسین کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس خط کو اپنی اصل حیثیت میں پھر کبھی شائع کرنے یا اس کے بارے میں لکھنے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔ پھر شیخ اعجاز کا یہ الزام کہ اقبال کی طرف سے انھیں ملنے والے صالحیت کے سرٹیفکیٹ کے اخفا سے چودھری محمد حسین نے شیخ اعجاز سے کوئی سیاست کی، بھی نا قابلِ فہم ہے اس لیے کہ صالحیت کے اس سرٹیفکیٹ کو چھپانے کا چودھری صاحب کو کوئی فائدہ نہ تھا، اس لیے کہ صالحیت کے سرٹیفکیٹ سے زیادہ خطرناک بات شیخ اعجاز کے قادیانی عقائد کے حوالے سے اس خط میں موجود تھی جو ان کی صالحیت کی خوشی سے زیادہ اذیت ناک ہے اور ان کی صالحیت ان کے عقیدے کے ظاہر ہونے کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ چوہدری صاحب کو شیخ اعجاز کا عقیدہ سیاست کرتے وقت ان کی صالحیت اور گارڈین شپ کے لیے زیادہ مہلک ہتھیار کے طور پر ہاتھ آ سکتا تھا مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔ لہٰذا چودھری صاحب پر شیخ اعجاز کا یہ الزام ناروا ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس خط کے بارے میں یہ سند کافی ہے کہ یہ خط سر راس مسعود کو لکھا گیا جو بھوپال میں اس وقت وزیر تعلیم تھے اور ممنون حسن خان ان کے سیکرٹری تھے۔ اس امر کا اعتراف خود مظلوم اقبال میں ص 338 میں موجود ہے۔ تاہم یہ سوال قارئینِ اقبال کے لیے حل طلب ہے کہ علامہ اقبال کے خطوط میں کتر بیونت کا حق کیا اقبال نے ان کو دیا یا انھوں نے خود ہی اپنے مفادات یا اپنی صواب دید کے تحت کیا، اور ان کی یہ مصلحتیں کیا تھیں، خود شیخ اعجاز نے مظلوم اقبال میں خاندانی اور ذاتی حوالے کے پردے میں خطوطِ اقبال کی کتر بیونت کیوں کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان خطوط میں بھی اقبال کی شخصیت کے نہایت اہم گوشے شیخ صاحب کی کرم فرمائی سے اوجھل رہ

جائیں۔ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز سے سیاست کی تھی تو شیخ اعجاز نے کیا اقبال سے سیاست کی ہے؟ لیجیے ہم اس موضوع پر کچھ کہنے سے پیشتر آپ کی خدمت میں ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ خط عکسی نقل کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

یہ خط ہم نے نیچے نقل کر دیا ہے تا کہ اس کا مفہوم سمجھنے اور عبارت پڑھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہو۔

لاہور 10 جون 1937ء

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اَب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے۔ یہ Guardian از روئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں:

1- شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

2- چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

3- شیخ اعجاز احمد بی۔ اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

4- عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (3) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے، نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian

مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے، دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اب اس خط کا قصہ سنیے کہ تمام جگہ دوسرے سارے مضامین میں اس کی اشاعت میں سر مو فرق نہیں مگر ہر کہیں فرق ہے تو شیخ اعجاز احمد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس میں۔ شیخ اعجاز کہتے ہیں کہ گارڈین شپ میں ان کے حریف چودھری محمد حسین نے سیاست کرتے ہوتے علامہ اقبال کی طرف سے ان کی صالحیت کے سرٹیفکیٹ کو دبانے کے لیے یہ تحریف کی حالانکہ شواہد یہ ہیں کہ چودھری محمد حسین نے اس تحریف کے ذریعے شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ کو محفوظ کر دیا اور عبدالغنی مرحوم کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین شپ دینے کی اقبال کی خواہش ظاہر کی۔ ہم اقبال نامے کی دونوں عبارتوں کا عکس دے کر اس صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہیں۔

خط نمبر 1۔ اقبال نامہ کا وہ خط ہے جو چودھری محمد حسین کی قطع و برید سے قبل شائع ہوا۔ اس میں لکیر زدہ عبارت ملاحظہ ہو، اس میں مندرجہ ذیل باتیں واضح ہیں:۔

1- عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیر الدین سب رجسٹرار کو مقرر کرنے کا علامہ نے ارادہ ظاہر کیا۔

2- شیخ اعجاز کی جگہ سر راس مسعود کو Guardian مقرر کرنا چاہا۔

جبکہ تحریف کردہ خط نمبر 2 میں۔

1- عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیر الدین کے تقرر کا کوئی ذکر نہیں۔

-2 عبد الغنی کی جگہ سر راس مسعود کے تقرر کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔

-3 یوں شیخ اعجاز کی Guardian شپ کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔

یعنی چودھری محمد حسین نے تو شیخ اعجاز سے سیاست نہیں کی بلکہ شیخ اعجاز کی گارڈین شپ محفوظ کرنے کے لیے اقبال کے خط کی عبارت کو بدل دیا اور شیخ اعجاز کے عقائد اور ان کی Guardian شپ سے محرومی کی وجہ کو چھپا دیا ہے اور انھیں خط سے نکال کر شیخ اعجاز کی خدمت انجام دی۔ اس لیے شیخ اعجاز کو تو چودھری محمد حسین کا احسان مند ہونا چاہیے حالانکہ وہ اُلٹا گلہ کر رہے ہیں کہ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز کی متنازعہ شخصیت کو غیر متنازعہ بنا دیا۔ اس کی وجہ بچوں کی گارڈین شپ میں شیخ اعجاز کو شریک رکھنا بھی مطلوب ہو سکتا ہے کہ خاندان اقبال کے اس فرد کو کسی نہ کسی طرح گارڈین شپ میں باقی رکھا جائے۔ تاہم نیک نیتی سے بھی کی گئی اس کتر بیونت کے اخلاقی جواز کی تفہیم نہیں ہوتی کہ جس چیز کو علامہ شرعاً مشتبہ سمجھتے تھے، اس کو اس عبارت سے حذف کر کے مباح کرنے کی سعی کیوں کی گئی اور شیخ اعجاز کے لیے یہ نرم گوشہ کیونکر پیدا کیا گیا۔ ذیل میں ''ہم اقبال اور بھوپال''، از صہبا لکھنوی میں شائع کیے گئے اس خط کا عکس شائع کر رہے ہیں۔

لاہور...... 10 جون 1937ء

ڈیئر مسعود پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا، جو اَب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardians مقرر کیے تھے۔ یہ از روئے وصیت مقرر کیے گئے تھے، جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسبِ ذیل ہیں:

(1) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(2) چودھری محمد حسین ایم۔ اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

(3) شیخ اعجاز احمد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سب جج دہلی۔ (1)

(4) عبد الغنی مرحوم۔ (2) عبد الغنی بیچارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خاں صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر

3 شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے Guardian تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ iodex اس کے لیے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے، دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

راس مسعود نے اس خط کا فوراً جواب دیا۔ ان کا یادگار اور تاریخی خط ملاحظہ ہو۔

"بھوپال......14 جون 1937ء

نہایت پیارے اقبال......تمہارا خط مورخہ 10 جون ابھی 3 بجے میں نے بغور پڑھا۔ چوتھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ میں نہ لاہور میں رہتا ہوں اور نہ کوئی امید لاہور کے قریب رہنے کی ہے۔ تو مجھے مقرر نہ کرو بلکہ کسی ایسے دوست کو جو کم سے کم پنجاب ہی میں مقیم ہوں۔ البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور لکھو کہ اگر گارڈین کو کسی معاملہ میں جہاں تک کہ منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہٗ کی تعلیم کا تعلق ہے، کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں کیونکہ جب تک کہ ان دونوں کی ان شاء اللہ بائیس برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ میں زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔ یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلے میں جو الفاظ اپنے وصیت نامہ میں درج کرو جو کہ رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو، ان کی ایک نقل میرے پاس ضرور بھیج دینا۔ اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمھارے ان دونوں بچوں کے لیے ان کی تعلیم کے مسئلے میں، میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے۔ یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ

جہاں تک جائیداد وغیرہ کا تعلق ہے، اس کا انتظام اپنے سامنے ہی ایسا کر دو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ شکر ہے خدا کا نادرہ اب ذرا بہتر ہے۔

میں ہوں تمہارا چاہنے والا...... راس مسعود

''اقبال اور بھوپال'' میں علامہ اقبال کے اس خط کی اشاعت کا عکس اور سر راس مسعود کی طرف سے اس کے جواب کی اشاعت کا عکس اس بات کو تو ظاہر کرتا ہے کہ یہ خط ہر لحاظ سے درست اور صحیح ہے کیونکہ 10 جون 37ء کو علامہ نے خط لکھا اور 14 جون 37ء کو راس مسعود نے خط کا جواب دیا اور لکھا کہ 10 جون کا خط میں نے بغور پڑھا۔ اب خط پر اعتراض بے معنی ہے، تاہم ''اقبال اور بھوپال'' کے اس خط میں بھی شیخ اعجاز کے عقائد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس حذف کر دیے گئے ہیں۔ اب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود جلد سوم میں جو اقتباس دیا ہے، اس کے بارے میں اقبال نامے کے مرتّب ڈاکٹر اخلاق اثر نے ہمارے نام ایک خط میں وضاحت کی کہ وہ بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ خود اقبال نامے کی کتابت میں سے یہ عبارت رہ گئی:

''کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے۔''(12)

ڈاکٹر اخلاق اثر نے اس میں بتایا ہے کہ اصل میں اقبال نامے کا جو نسخہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو دیا گیا، اس میں یہ عبارت موجود نہ تھی۔ ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر اخلاق اثر کے خط کا عکس:

Dr.Akhlaq Asar

محترم وحید عشرت صاحب! وعلیکم السلام

زندہ رود (تین جلدیں) اور اقبال اور حیدر آباد موصول ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی حسبِ فرمائش اپنی تالیفات ''اقبال اور شیش محل'' ''اقبال نامے'' اور تصنیف ''اقبال اور ممنون'' رجسٹری سے روانہ کر رہا ہوں۔ ''اقبال نامے'' کا دوسرا اڈیشن اور ''اقبال کا وظیفہ'' اپریل تک مکمل ہونے کی امید ہے۔ ''مظلوم اقبال'' اور دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اقبال کے اقتصادی اور معاشی حالات پر معلومات مکمل ہو جائیں۔ اگر ممکن ہو تو یہ زحمت اور برداشت فرمائیں۔ میری تالیفات کے بارے میں آپ کی نیک خواہشات میرے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔

لاہور
۱۱ جون ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود۔ پرسوں تم نے بذریعہ ایکسپریس لکھا تھا۔
اسپرین کھا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس واسطے آج بہت لکھنا مشکل تھا۔ جواب لکھتا ہوں۔
~~[illegible]~~ [illegible] سینئر کے چار
منظور کئے تھے۔ ~~[illegible]~~ از روئے وصیت منظور کئے گئے ہیں۔ جو سب [illegible]
[illegible] میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔
(۱) شیخ [illegible]۔ یہ پہلے [illegible] ہیں۔ جو قریباً [illegible] سال کے عرصے
[illegible] (۲) [illegible] ایم۔ اے [illegible]
[illegible] مجلس [illegible]
(۳) شیخ [illegible] ایم۔ اے [illegible] (۴) [illegible]
[illegible]
[illegible] شیخ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ~~[illegible]~~ [illegible]
[illegible]
~~[illegible]~~ [illegible]
[illegible] اگر [illegible] ایسا ہوا [illegible]
~~[illegible]~~ [illegible] باقی [illegible]
[illegible] مسعود [illegible]
[illegible]
~~[illegible]~~ [illegible]
[illegible]

والسلام

محمد اقبال

(۲۲۹) ——— (۲۲۴)

لاہور

۲ جون ۱۹۳۶ء

خط نمبر ۱

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians ایک وصیت میں مقرر کئے گئے تھے. جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلرک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی مرحوم

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے۔ لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہو تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔ کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ مؤخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔ والسلام

محمد اقبال

(۲۲۹) ——— (۲۲۴)

لاہور

۲ جون ۱۹۳۶ء

خط نمبر ۲

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians ایک وصیت میں مقرر کئے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلرک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی مرحوم

عبدالغنی بیچارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہو تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ مؤخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے

والسلام

محمد اقبال

Dr. AKHLAQ ASAR
M.A. (URDU), M.A. (ENGLISH), Ph.D
Vice President
All India Urdu Writers & Journalist Forum
For National Integration (Registered)

SADIQ MANZIL,
Chowki Imambara,
BHOPAL - 462 001

Dated 7-1-86

محترم وحید عشرت صاحب! وعلیکم السلام

زندہ رود (تین جلدیں) لمعہ اقبال اور حیدرآباد موصول ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپکی حسب فرمائش اپنی تالیفات "اقبال اور شیش محل" "اقبال نامے" اور تصنیف "اقبال اور ممنون" رجسٹری سے روانہ کر رہا ہوں۔ "اقبال نامے" کا دوسرا ایڈیشن اور "اقبال کا وظیفہ" اپریل تک مکمل ہونے کی امید ہے۔ "مظلوم اقبال" اور دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اقبال کے اقتصادی اور معاشی حالات پر معلومات مکمل ہو جائیں۔ اگر ممکن ہو تو بہ زحمت اور برداشت فرمائیں۔ میری تالیفات کے بارے میں آپ کی نیک خواہشات میرے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔

"مظلوم اقبال" پر آپ کا تبصرہ پڑھ لیا تھا۔ اس میں اقبال کے ۱۰ جون ۳۷ء کے مکتوب کا حوالہ تھا جو آپ نے "زندہ رود" سے لیا تھا۔ اس وقت تک میں نے "زندہ رود" نہیں دیکھی تھی اور یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اقتباس "اقبال نامے" سے لیا گیا ہے۔ اس مکتوب کا مکمل متن "اقبال اور ممنون" صفحہ ۱۵ پر فوٹو کاپی کی شکل میں دیا گیا ہے۔ "زندہ رود" میں اس مکتوب کا اہم حصہ رہ گیا جو بعد کے نسخوں میں ہاتھ سے بڑھا دیا گیا تھا اور یہ تحریر اس نسخہ میں بڑھائی نہ جا سکی تھی جو جناب جاوید اقبال صاحب کی خدمت میں بھیجی گئی تھی۔ کتابت کی غلطی بہت بعد میں نظر آئی۔ وہ اہم حصہ یہ ہے:

"یہ کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔
اس واسطے یہ امر مشتبہ ہے"

امید ہے کہ ۱۰ جون ۳۷ء کے مکتوب کی فوٹو کاپی سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ دیگر مکاتیب کے علاوہ یہ مکتوب بھی مجھے جناب ممنون حسن خاں صاحب سے موصول ہوا تھا۔ جن کی تفصیل "اقبال نامے" میں دی ہوئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جناب رفیع الدین ہاشمی صاحب اس مکتوب اقبال کی فوٹو کاپی شیخ اعجاز احمد صاحب کو ارسال کر چکے ہیں۔

میری جن تصانیف یا تالیفات کے حقوق اشاعت کی ضرورت سمجھیں تو تحریر فرمائیں اور ذاتی طور کی شرائط کی تفصیلات بھی لکھیں تاکہ میں اپنے ملک سے اجازت لے کر کوئی کارروائی کروں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔ آپ کا

اخلاق اثر

''مظلوم اقبال'' پر آپ کا تبصرہ پڑھ لیا تھا۔اس میں اقبال کے 10 جون 37ء کے مکتوب کا حوالہ تھا جو آپ نے ''زندہ رود'' سے لیا تھا۔اس وقت تک میں نے ''زندہ رود'' نہیں دیکھی تھی اور یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اقتباس ''اقبال نامے'' سے لیا گیا ہے۔اس مکتوب کا مکمل متن ''اقبال اور ممنون'' صفحہ 15 پر فوٹو کاپی کی شکل میں دیا گیا ہے۔''زندہ رود'' میں اس مکتوب کا اہم حصہ رہ گیا جو بعد کے نسخوں میں ہاتھ سے بڑھا دیا گیا تھا اور یہ تو ہر اس نسخہ میں بڑھائی نہ جا سکی تھی جو جناب جاوید اقبال صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔کتابت کی غلطی بہت بعد میں نظر آئی۔وہ اہم حصہ یہ ہے:

''کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے۔''

امید ہے کہ 10 جون 37ء کے مکتوب کے فوٹو کاپی سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔دیگر مکاتیب کے علاوہ یہ مکتوب بھی مجھے جناب ممنون حسن خاں صاحب سے موصول ہوا تھا، جس کی تفصیل ''اقبال نامے'' میں دی ہوئی ہے۔جہاں تک مجھے یاد ہے جناب رفیع الدین ہاشمی صاحب اس مکتوبِ اقبال کی فوٹو کاپی شیخ اعجاز احمد صاحب کو ارسال کر چکے ہیں۔

میری جن تصانیف یا تالیفات کے حقوق اشاعت کی ضرورت سمجھیں تحریر فرمائیں اور رائلٹی کی شرائط کی تفصیلات بھی لکھیں تاکہ میں اپنے محکمہ سے اجازت لے کر کوئی کارروائی کروں۔امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔آپ کا۔اخلاق اثر

اب ایک اور محکم شہادت جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور منیرہ بیگم کی آیا محترمہ ڈورس احمد نے اپنی حالیہ انگریزی کتاب ''اقبال جیسا کہ میں جانتی ہوں'' میں فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علامہ اقبال، شیخ اعجاز احمد کو بہت عزیز رکھتے تھے مگر علامہ ان کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے ان سے سخت نالاں تھے اور وہ اپنے بچوں کے سرپرستوں میں سے بھی انھیں نکال کر کسی اور متبادل کی تلاش میں تھے؟ چنانچہ علامہ نے ان سے متعدد بار اپنے اس کرب کا اظہار کیا اور شیخ اعجاز کے قادیانی ہو جانے کے عمل کو ہمیشہ اور مکمل طور پر ناپسند کیا۔(14)

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اس خط میں تحریف کوئی نادانستہ طور پر کسی ایک فرد نے نہیں کی بلکہ کسی خاص فرد اور جماعت کی طرف سے ایک خاص منصوبہ بندی اور کوشش سے مختلف اشخاص سے اپنے اثر و نفوذ کی بنیاد پر تحریف کروائی گئی ہے اور اس کا مقصد شیخ اعجاز، ان کے عقیدے اور قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبال کے واضح اور صریح اظہار و موقف کو چھپانے کی سعی نامسعود کی گئی ہے۔ تاہم مختلف خطوط میں مختلف عبارات نے اس سراسر جھوٹ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہماری طرف سے اس تازہ خط اور اس کی عکسی نقل کی اشاعت کے بعد چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

1- علامہ اقبال کے جملہ خطوط کی چھان بین کی جائے۔

2- تحریفات اور خطوں کی عبارت کی قطع و برید کو ختم کیا جائے اور علامہ کے خط ان کی اصل حالت میں شائع کیے جائیں۔

3- ذاتی اور خانگی حالات کی آڑ میں علامہ کے خطوط کی تصحیح یا قطع و برید نہ کی جائے۔ اس لیے کہ علامہ کے خانگی حالات پر بہت کچھ سامنے آ چکا ہے۔ موجودہ صورت میں قطع و برید غلط فہمیوں کو جنم دے گی۔

4- علامہ کے خطوط کی عکسی نقول بھی شائع کی جائیں۔

5- علامہ کے اصل خطوط اقبال میوزیم میں یا کسی اور محفوظ مقام پر اپنی اصل حالت میں محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔

6- تمام اردو اور انگریزی خطوط کو ایک کلیات مکاتیب اقبال میں عکسی نقول کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

7- خطوط کے بارے میں معلومات، مکتوب الیہ، خطوط کا زمانۂ تحریر، وجہ تحریر، مقام تحریر وغیرہم واضح طور پر دی جائیں۔

8- مختلف خطوط کے مجموعوں کے تقابلی مطالعہ سے خطوط کی اصل عبارت کا تعین کیا جائے۔

9- تمام مکتوبات کی مائیکرو فلمیں بنائی جائیں۔

اس طریقِ کار سے علامہ اقبال کے خطوط محفوظ ہو سکیں گے اور تحقیق کاروں کو اصل متن اور ان کے مفہوم تک پہنچنے میں سہولت ہو گی اور بہت سے سیاسی، اخلاقی، ادبی، علمی اور تاریخی

حقائق تک اقبال کی اپروچ سے آ گاہی ہو سکے گی۔

حواشی

1- جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔ زندہ رود جلد سوم۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

2- شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4، ص 334۔

3- شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4، ص 334-335۔

4- شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4، ص 335-336۔

5- شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4، ص 336۔

6- شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4، ص 337۔

7- شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4، ص 338۔

8- ڈاکٹر اخلاق اثر۔ اقبال اور ممنون حسن۔ دار الاقبال بھوپال۔ ص 15۔

9- شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ۔ شیخ محمد اشرف لاہور۔ ص 386-387۔

10- صہبا لکھنوی۔ اقبال اور بھوپال۔ اقبال اکادمی کراچی حال لاہور۔ ص 245۔

11- صہبا لکھنوی۔ اقبال اور بھوپال۔ اقبال اکادمی کراچی حال لاہور۔ ص 245۔

12-13- ڈاکٹر اخلاق اثر کا ڈاکٹر وحید عشرت کے نام خط۔

14- ڈورس احمد۔ اقبال، جیسا کہ میں جانتی ہوں (انگریزی) اقبال اکادمی پاکستان لاہور 1986ء ص 43۔

علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت

مولانا ظفر علی خاں

علامہ اقبال اور قادیانیت

اس سرمدی حقیقت کا تکرار مسلمان کے ایمان کو ہر بار ایک نئی تازگی بخشتا ہے کہ حضور خیرالبشر **بآبائنا هو و امهاتنا** کے وصال کے ساتھ بنی آدم پر حق کی حجت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ فطرت انسانی کو ذہنی، اخلاقی اور روحانی عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچانے کے لیے خدائے بزرگ و برتر کی ارحم الراحمینی نے جو آسمانی ضابطہ مرتب کیا تھا، کامل و مکمل ہوگیا۔ جو نعمتیں انسان کو اپنے پروردگار کی طرف سے ملنے والی تھیں، اُن میں کسی مزید اضافہ کی گنجائش باقی نہ رہی یعنی اس کی دینی و دنیوی فلاح کا وہ دستور العمل جس کا جامع نام اسلام ہے، اپنی آخری شکل میں اس کے سامنے آ گیا۔ رب اکبر کے اسی احسان عمیم، اسی انعام عظیم کا نام ختم نبوت ہے جو ملت بیضا کے اوراق کی شیرازہ بند اور اس کی حیات جاودانی کی سرمدیت کی ضامن ہے۔ جس زادۂ توحید کو مبدء فیاض سے سوچنے اور سمجھنے کی کچھ بھی توفیق ارزانی ہوئی ہے، اس کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ بدستور جاری رہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا کا آخری پیغام جسے حضور ﷺ نے اس کے بندوں تک پہنچایا، ہنوز تشنۂ تکمیل تھا، ابھی انسان کو اپنی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کے لیے کسی نئی ہدایت، کسی جدید راہنمائی کی ضرورت تھی اور اس شریعت پر جس کے آخریں علم بردار حضور خواجہ دو جہاں ﷺ تھے، کسی نئی شریعت کا اضافہ ہونے والا تھا۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے ارتقا جاری کا یہ امکان اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر مسلمانوں کی قومی وحدت اور ان کے نظام اجتماعی کا پارہ پارہ ہو جانا چند دن کی بات ہے۔ اسی خطرہ کو حضور سرور کون و مکان ﷺ کی چشم جہاں بیں نے جس کے لیے علام الغیوب کے فیضان نہائی نے سراپردۂ غیب کا ایک گوشہ سرکا دیا تھا، پہلے سے دیکھ کر اپنی امت کو متنبہ کر دیا کہ **انه سيكون في امتي كذابون ثلثون كلهم يزعم انه نبي و انا خاتم النبيين لا نبي بعدي.** (مسلم)

یہ قابل رشک شرف پنجاب کی قسمت میں لکھا تھا کہ اس کی الحاد پرور خاک سے ایک شخص جس کا نام مرزا غلام احمد ہے، اٹھے اور از راہ غایت شوخ چشمی یہ دعوے کر دے کہ نبوت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ختم نہیں ہوئی بلکہ بدستور جاری ہے اور میں اس زمانہ کا نبی ہوں جس پر وحی آتی ہے اور جس کا کلام قرآن مجید کی طرف خطا سے پاک اور لغزشوں سے منزہ ہے اور جو مجھ پر ایمان نہ لائے، وہ صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اسی کے ساتھ اس شخص نے کلام اللہ کی آیات کو من مانی تاویلوں اور سوچی سمجھی ہوئی تحریفوں سے کچھ کا کچھ کر دیا۔ رسول اللہ کی شریعت غرا کے احکام کو اپنی خرافات واہیہ کا بازیچہ بنا دیا اور امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ میں ایک ایسا خوفناک فتنہ پیدا کر دیا کہ دنیائے اسلام کے طول وعرض میں شور قیامت بپا ہو گیا۔ اس شخص نے دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کو جو اس کے مزخرفات لایعنی کے منکر تھے، بیک کشش قلم دائرہ اسلام سے خارج کر دیا اور اپنی مٹھی بھر جماعت کو جس کی تعداد اس کے انوکھے دعوے کے بعد سے لے کر اس وقت تک کلھم چھپن ہزار تک پہنچی ہے، اسلام کا واحد اجارہ دار قرار دیا۔

ہندوستان میں اگر حکومت اسلامی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس قسم کا خطرناک ملحد جو نہ خدا کا قایل ہو، نہ قرآن کا اور جو حطام دنیوی کی خاطر اسلام کی سیزدہ صد سالہ روشن حقیقتوں کو جھٹلانے اور مسلمانوں کی مجاہدانہ فطرت کو غلامانہ دنائت کے زہریلے جراثیم سے آلودہ کرنے میں ذرا باک نہ کرتا ہو، یوں کھلے بندوں چھوڑ دیا جاتا، لیکن مسلمانوں کی شومئی قسمت اور اس کی خوبی تقدیر سے حکومت اغیار کی تھی جسے مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمانوں کے نفسیات سے طبعاً کچھ بہت زیادہ ہمدردی نہ ہوسکتی تھی۔ مرزا غلام احمد کی عیاری نے حکومت کو باور کرا دیا کہ صرف مرزائی ہی اس کے وفادار ہوسکتے ہیں جن کا مذہب اس وفاداری کو جزو ایمان قرار دیتا ہے۔ باقی تمام وہ لوگ جو مسلمان کہلاتے ہیں، اگر بالفعل باغی نہ ہوں تو بالقوۃ ضرور باغی ہیں اور ان کی بغاوت کے استقبالی خطرہ سے بچنے کی یہی سبیل ہوسکتی ہے کہ تمام مسلمانوں کو مرزائیت کا حلقہ بگوش بنا دیا جائے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، قادیانیت کا یہ خطرہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا اور میری ساری عمر اس ہولناک فتنہ کا مقابلہ کرنے میں گزر رہی ہے۔ مسلمانوں نے اول اول قادیانی خطرہ کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہ دی۔ علمائے امت نے اتنا ضرور کیا کہ جس طرح غلام احمد

قادیانی نے ان کو اور باقی تمام مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا، اسی طرح انہوں نے بھی اس پر اور اس کی امت قلیل الانفار پر کفر کا فتویٰ لگا دیا یا اس کے مایہ ناز مسئلہ ممات مسیح پر اس کے ساتھ اور اس کے اتباع واعوان کے ساتھ ہنگامہ خیز مناظرے کر لیے۔ لیکن زہر کا یہ تریاق کچھ بہت زیادہ سودمند ثابت نہ ہوا اور مرزائیوں کا پروپیگنڈا اس مذہبی رواداری کے سایہ میں جس کا حکومت وقت کو ادعا ہے، پروان چڑھتا رہا۔

آخر میرے شوروغل اور میرے رفقا کی ہائے وہو نے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھولیں اور جب حکومت نے مرزائیت کی پیٹھ پر علی الاعلان تھپکیاں دینی شروع کیں تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ جس فتنہ سے انہیں پالا پڑا ہے وہ کس قدر ہولناک ہے۔ میں پہلے دن سے پکار رہا ہوں کہ فرقہ ضالہ مرزائیہ جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں شب و روز مصروف ہے، ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہو بلکہ سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کی طرح اس فرقہ کا شمار بھی سرکاری کاغذوں میں ایک جداگاہ اقلیت کے طور پر ہونا چاہیے۔ جب حکومت کی امپیریل مصلحتوں نے چودھری ظفر اللہ خاں قادیانی کو جس کے عقیدہ میں تمام مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہ ماننے کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج ہیں، وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ''زمیندار'' نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ قادیانی فتنہ اب خطرناک تر ہونے والا ہے۔ چنانچہ طول وعرض ہند میں اس کے خلاف احتجاج ہوا مگر حکومت کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور چودھری ظفر اللہ خاں کا تقرر عمل میں آ ہی گیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان برابر پکار رہے ہیں کہ قادیانیوں کا اسلام سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ انہیں ایک جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے، حکومت ان کے ساتھ ایک غیر مسلم اقلیت کی حیثیت سے جو مراعات چاہے کرے لیکن انہیں اسلام کا نمائندہ سمجھ کر نہ کرے اس لیے کہ مسلمانوں سے ان کا کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں۔

مسلمانان ہند کا یہ سارا شور حکومت کے بہرے کانوں پر پڑا۔ اس اہم مسئلہ پر جس نے مسلمانوں کو ایک عرصہ سے بے چین کر رکھا ہے، اگر اس نے کبھی لب کشائی کی ضرورت بھی محسوس کی تو مسلمانوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ سارا شور غیر ذمہ وار اور متعصب لوگوں کا بپا کیا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا ذمہ دار اور فہیم طبقہ مرزائیوں کو پکا مسلمان سمجھتا ہے۔

آخر وہ وقت بھی آیا کہ حکومت کی نگاہ میں جو لوگ ذمہ دار اور فہیم اور غیر متعصب تھے، انہوں نے عامہ مسلمین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے لگی لپٹی رکھے بغیر حکومت کو جتا دیا کہ قادیانیت ایک بالکل جداگانہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر حکومت نے قادیانیوں کو ایک علیحدہ اقلیت قرار دینے میں کوتاہی کی تو مسلمانوں کا یہ شبہ یقین کے درجہ کو پہنچ جائے گا کہ حکومت مسلمانوں کی وحدت ملی کو پارہ پارہ ہوتا ہوا دیکھنے کی خود متمنی ہے۔

خدا بھلا کرے علامہ اقبال کا جن کے حکیمانہ بیان نے ان ساری حقیقتوں کو بکمال شرح وبسط الم نشرح کر کے مسلمانانِ ہند کی ایک ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی جس کا صلہ انہیں حضور سرورکون ومکان ﷺ کی ختم المرسلینی ہی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔

علامہ اقبال ؒ کا یہ دعویٰ کہ ختم نبوت کا عقیدہ جو دین حجازی کے آغوش میں پرورش پا کر ملت بیضا کی وحدت و اکتناز کا حصارِ عافیت بن گیا، بنی آدم کی ثقافت کی تاریخ میں اپنے اچھوتے پن کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے۔ ایک روشن وتابناک حقیقت ہے جسے تاریخ آج تک نہیں جھٹلا سکی۔ توحید اور رسالت کا صحیح تصور دنیا کے سامنے پیش کرنے کی توفیق صرف سامی تہذیب کو میسر ہوئی ہے۔ یہ تہذیب جس کا دور ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے شروع ہوتا ہے، کوئی پانچ ہزار سال پرانی ہے اور اس کی ورق گردانی سے مذہب کے طالب علم کو یہ پتہ تو چلتا ہے کہ ہر نبی نے جو خدائے بزرگ و برتر کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے من جانب اللہ مامور ہوا، اس پیغام کی تکمیل کے لیے اپنے کسی جانشین کے آنے کی پیشین گوئی کی اور اس کی امت اپنے قوائے ذہنی واخلاقی وروحانی کو درجہ کمال تک پہنچانے کی امید میں کسی آنے والے نبی کی آمد کی منتظر رہی۔ لیکن ہزار جستجو کے بعد بھی اس واقعہ کا سراغ ابداً نہیں ملتا کہ کسی رسول یا نبی نے یہ دعوے کیا ہو کہ دین کامل و مکمل ہو گیا، حق کی حجت تمام ہو گئی اور میرے بعد ابدآلاباد تک کے لیے نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ یہ دعویٰ انسان نے آج سے کوئی ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اول اول وادی بطحا میں سنا، جب کائنات کا ذرہ ذرہ اس آسمانی حقیقت کی شہادت دیتا ہوا پایا گیا کہ **ما کان محمد ابااحد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین.**

- ❑ ابراہیم آذر آئے اور دنیا والوں کو یہ خوشخبری دیتے گئے کہ ”میں (خدا) نے اسمٰعیل کی نسبت تیری سنی دیکھ میں نے اسے برکت دی ہے۔ میں اس کو بارآور کروں گا۔ اس کی نسل بے شمار

ہوگی، اس سے بارہ سردار ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا‘‘۔

(تورات کتاب پیدائش باب 17 فقرہ 20، 21)

❑ ’’موسیٰ عمران آئے اور دین قیم کے نور کے اتمام کا مژدہ اہل عالم کو یہ کہہ کر سناتے گئے کہ ’’خداوند جو تیرا خدا ہے، تیرے بھائیوں میں سے تیرے لیے ایک نبی میری مانند پیدا کرے گا۔ تم اس کی سنیو اور خدا نے مجھ سے کہا کہ میں تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی پیدا کروں گا۔ میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ جو کچھ میں حکم دوں گا، وہ میرے نام سے ان کو سنائے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میرا کلام جو وہ نبی کہے گا، نہ سنے گا، میں اس سے مواخذہ کروں گا۔ مگر جو نبی ایسی دلیری کرے گا کہ میری طرف وہ احکام منسوب کرے گا جس کی نسبت میں نے حکم نہیں دیا یا میرے سوا کسی اور معبود کی نسبت گفتگو کرے گا، وہ نبی ہلاک کیا جائے گا‘‘۔

(استثناء باب 18 فقرات 15، 18، 19 تا 20)

❑ ’’عیسیٰ مریم آئے اور جب گئے تو اپنی امت کو یہ بشارت دیتے گئے کہ ’’میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے ضرور ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو فارقلیط نہیں آئے گا مگر اگر میں جاؤں تو میں اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا‘‘۔ **(انجیل یوحنا باب 16 فقرہ 7)**

اسی قسم کی بیسیوں منقولی شہادتوں سے جن پر معقولی دلائل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہے کہ امم عالم کی کم از کم چار ہزار سال کی تاریخ میں ختم نبوت کے عقیدہ سے کسی قوم کا دماغ آشنا نہیں ہوا۔ اس عقیدہ کے عالم وجود میں آنے کا ایک وقت مقرر تھا۔ وہ ساعت موقوت حضور خواجہ کون ومکان ﷺ کے مسند رسالت پر فائز ہونے کے ساتھ آئی جو حق کے نقطۂ اوج اور باطل کے نقطہ حضیض پہ پہنچے کی ساعت تھی۔

ختم نبوت کے اس عقیدہ کو جھٹلانے کی جرأت اس ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصہ میں اگرچہ متعدد پرستاران طاغوت کو ہوئی ہے لیکن اس جرأت کا سب سے زیادہ بے باکانہ مظاہرہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی قلیل الانفار ذریت کی طرف سے ہوا اور میرا پختہ یقین ہے کہ اسی تکذیب کی پاداش میں طائفہ قادیانیہ جس کے نیم جان بدن میں حکومت وقت کے سیاسی مصالح نے تھوڑی بہت حرکت پیدا کر رکھی ہے، اپنے وقت پر اسی طرح گرد روزگار میں دب کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا جس طرح اس سے پہلے دوسرے جھوٹے مدعیان نبوت اور ان کی امتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں۔

جسٹس (ر) جاوید اقبال

زندہ رود

مصائب و آلام اور طرح طرح کی الجھنوں کے باوجود اقبال اپنی علمی و شعری کاوشوں، مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے وقت نکالتے رہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کی خاطر نواب بھوپال کو صدارت کے لیے لاہور بلوانے کی کوشش کی (1) ''زبورِ عجم'' بمعہ اردو ترجمہ (جو حواشی کی شکل میں تھا) کی اشاعت کا ارادہ کیا (2) ''صورِ اسرافیل'' (جو 1936ء میں ''ضربِ کلیم'' کے نام سے شائع ہوئی) کے لیے اشعار کی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا اور اسی طرح انہی ایام میں احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا انگریزی بیان بعنوان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' تحریر کیا۔ یہ بیان برصغیر کے مختلف انگریزی اخباروں مثلاً ایسٹرن ٹائمز، ٹریبیون، سٹار آف انڈیا کلکتہ، دکن ٹائمز وغیرہ میں شائع ہوا۔ علاوہ اس کے اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی چھپا۔ 14 مئی 1935ء کو سٹیٹسمین نے اسے شائع کیا اور ساتھ اس پر لیڈنگ آرٹیکل بھی لکھا۔

''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' میں مختصراً اقبال کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت کی بنیادیں مذہبی تصور پر استوار ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو جو اپنی اساس ایک نئی نبوت پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کرے کہ تمام مسلمان جو اس کا موقف قبول نہیں کرتے، وہ کافر ہیں، تو قدرتی طور پر ہر مسلمان ایسے گروہ کو ملتِ اسلامیہ کے استحکام کے لیے ایک خطرہ قرار دے گا اور یہ بات اس لیے بھی جائز ہوگی کہ مسلم معاشرے کو ختم نبوت کا عقیدہ ہی سالمیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک قبل از اسلام مجوسیت کے جدید احیاء نے جن دو تحریکوں کو جنم دیا، ان میں ایک بہائیت ہے اور دوسری قادیانیت۔ بہائیت اس اعتبار سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام سے اعلانیہ علیحدگی کا رستہ اختیار کرتی ہے لیکن قادیانیت اسلام کے بعض اہم ظواہر

کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی روح اور نصب العین سے انحراف کرتی ہے۔ اقبال کے بیان کے مطابق ''بروز''، ''حلول'' اور ''ظل'' کی اصطلاحات مسلم ایران میں اسلام سے منحرف تحریکوں نے اختراع کیں اور ''مسیحِ موعود'' کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے حاکموں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیں۔(3)

اس بیان پر احمدی اخباروں نے کئی اعتراض کیے اور اقبال پر مختلف قسم کے الزام لگائے۔ ہفتہ وار ''لائیٹ'' کے نمائندے نے ان کی توجہ ایک اور احمدی ہفتہ وار ''سن رائز'' کی طرف مبذول کراتے ہوئے سوال کیا کہ اس اخبار کے مطابق انھوں نے اپنے کسی گذشتہ خطبے میں احمدیت کے متعلق مختلف رائے کا اظہار کیا تھا۔ سوال کے اب کے بیان اور اس خطبہ میں تناقض کیوں ہے؟ اقبال کا جواب تھا کہ وہ یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے کہ اب سے ربع صدی پیشتر انھیں اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع تھی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں ظاہر نہیں ہو جاتی بلکہ اپنے مکمل اظہار کے لیے کئی عشرے لیتی ہے۔ اس تحریک کے دو گروہوں کے درمیان اندرونی اختلافات بھی اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ جو لوگ بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، انھیں بھی یہ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر تحریک نے کیا صورت اختیار کرنی ہے۔ درخت کو جڑ سے نہیں، اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پس اگر ان کے رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے۔(4)

اقبال نے سٹیٹسمین کے لیڈنگ آرٹیکل میں اپنے بیان پر تبصرہ کا جواب ایک خط کے ذریعہ دیا جو 10 جون 1935ء کو سٹیٹسمین میں شائع ہوا۔ جواب کے اہم نکات یہ تھے: اوّل یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے کسی رسمی عرض داشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انگریزی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بنیادی اختلاف کا انتظامی طور پر نوٹس لے، جیسے کہ سکھوں کو 1919ء تک انتظامی اعتبار سے ایک علیحدہ سیاسی یونٹ نہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر بعد میں بغیر ان کی طرف سے کسی عرض داشت کی وصولی کے انھیں ایسا تصور کیا گیا، باوجود اس کے کہ ہائی کورٹ لاہور کے فیصلہ کی رُو سے سکھ کوئی علیحدہ مذہبی فرقہ نہیں بلکہ ہندو تھے۔ دوم

یہ کہ احمدیوں کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا تو بہائیوں کی طرح مسلمانوں سے اپنے آپ کو خود مذہباً الگ کر لیں یا مسئلہ ختم نبوت کے متعلق اپنی تمام تاویلات مسترد کر کے اسلامی موقف قبول کریں۔ آخر دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے ان کا اسلام کے منافی تاویلات اپنانے میں اور کیا مقصد ہو سکتا تھا سوائے اس کے کہ سیاسی فائدہ اٹھایا جائے۔ سوم یہ کہ (اور یہ نکتہ خصوصی اہمیت رکھتا تھا) احمدیوں کو علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دینے میں اگر انگریزی حکومت نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانانِ برصغیر یہ شک کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انگریزی حکومت جان بوجھ کر اس مذہبی فرقہ کو اس وقت تک مسلمانوں سے الگ نہ کرے گی جب تک کہ احمدیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو جاتا، کیونکہ فی الحال احمدی اپنی تعداد میں کمی کے سبب پنجاب میں سیاسی طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ ایک چوتھا مذہبی فرقہ بن سکنے کے قابل نہ تھے لیکن اگر ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو وہ پنجاب میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت کو صوبائی لیجسلیچر میں شدید نقصان پہنچا سکتے تھے۔ پس اگر انگریزی حکومت 1919ء میں سکھوں سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انھیں ہندوؤں سے الگ مذہبی فرقہ تسلیم کر سکتی ہے تو اس ضمن میں اسے احمدیوں کی طرف سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کا انتظار کیوں ہے۔(5)

پندرہ روزہ اخبار ''اسلام'' کے نمائندے نے اقبال کی توجہ مرزا بشیر الدین محمود کے ایک خطبۂ جمعہ کی طرف دلائی جس میں ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ انگریزی حکومت سے احمدیوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں جیسے رومیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کے حوالے کر دیا تھا اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا۔ اقبال نے اپنے جواب مورخہ 22 جون 1935ء میں جو اس اخبار میں شائع ہوا، واضح کیا کہ ان کے گذشتہ بیان میں ایسا کوئی فقرہ موجود نہ تھا۔ البتہ انھوں نے یہ کہا تھا کہ انگریزی حکومت میں مسلمانوں کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں جتنی یہود کو رومی سلطنت میں حاصل تھی کیونکہ رومی اس بات کے پابند تھے کہ یہود کی مجلسِ امور مذہبی میں جو فیصلہ ہوگا، وہ دیکھیں گے کہ اس کی تعمیل قطعی طور پر ہو جاتی ہے۔(6)

''طلوعِ اسلام'' بابت اکتوبر 1935ء میں نذیر نیازی نے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کی بعض تحریروں کے اقتباسات پیش کیے جس میں انھوں نے نبوت کے دو اجزاء پر بحث کی تھی، یعنی نبوت روحانیت کے ایک خاص مقام کی حیثیت سے اور نبوت ایک ایسے

ادارے کی حیثیت سے جونئی اخلاقی فضا تخلیق کر کے انسانوں میں سیاسی اور معاشرتی تغیر کا سبب بنے۔ بقول اقبال اگر دونوں اجزاء موجود ہوں تو وہ نبوت ہوگی اور اگر صرف پہلا جزو موجود ہو، تو تصوف یا ولایت۔ اقبال نے تحریر کیا: (7)

''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے۔''

بالآخر احمدیوں کی حمایت میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس بحث میں کود پڑے اور انھوں نے اپنے تین انگریزی مضامین بعنوان ''اتحادِ اسلام'' اقبال کے مضمون پر تبصرہ'' میں جو کلکتہ کے رسالے ماڈرن ریویو میں نومبر 1935ء میں شائع ہوئے، اقبال کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے ان کے مضامین کا ایک نہایت جامع جواب بعنوان ''اسلام اور احمدیت'' تحریر کیا جو ''اسلام'' مورخہ 22 جنوری 1936ء میں شائع ہوا۔ اس طویل جوابی مضمون میں بھی، جو کئی بار چھپ چکا ہے، انھوں نے مسئلہ ختم نبوت کے متعلق مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کی۔ نیز ثابت کیا کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب ملائیت، تصوف اور مطلق العنان سلطنت ایسی منفی قوتیں تھیں۔ آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اس ریمارک کہ ان کے خیال میں سر آغا خان بھی صحیح العقیدہ مسلمان نہیں سمجھے جاتے، کے جواب میں اقبال نے آغا خان ہی کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت کی تھی کہ تم سب مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ ہی رہ سکتے ہو۔ لہٰذا اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مساجد میں نماز ادا کرو، روزے باقاعدہ رکھو، اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق شادیاں کرو اور سب مسلمانوں کو اپنے بھائی سمجھو۔ اس مضمون کا پورا احاطہ کر سکنا تو یہاں ممکن نہیں لیکن اقبال کا درج ذیل نکتہ یقیناً خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ (8)

''ظاہر ہے ایک ہندوستانی قوم پرست (یعنی پنڈت نہرو) جس کے سیاسی آئیڈیلزم نے اس کی حقیقت کو پرکھنے کی حس کا خاتمہ کر رکھا ہے، یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے دل میں حقِ خود ارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ غلط ہے کہ ہندوستانی نیشنلزم کے فروغ کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ مختلف ثقافتی

وحدتوں کو مکمل طور پر کچل دیا جائے۔''

بالآخر اپنے خط بنام پنڈت جواہر لال نہرو مورخہ 21 جون 1936ء میں اقبال نے احمدیوں کے سیاسی رویہ کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا، میرے ذہن میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔(9)

گذشتہ سالوں میں احمدی تحریک کے بارے میں اقبال کا نظریہ کیا تھا! احمدیت کی تردید کی ضرورت انھیں کیوں پڑی یا اس تحریک کے خلاف ان کے بیانات کس پس منظر میں دیے گئے؟ احمدیوں نے ان پر کیا کیا اعتراض کیے یا کیا کیا الزام لگائے؟ ان تمام سوالات پر علیحدہ بحث آگے آرہی ہے.................

جنوری 1936ء کے ابتدائی ہفتوں میں اقبال اپنے مضمون ''اسلام اور احمدیت'' کی تکمیل میں مصروف تھے، اس لیے بھوپال جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ (10) 16 فروری 1936ء کو ایڈیٹر اخبار ''لائیٹ'' نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی موت کو بہانہ بنا کر اپنے افتتاحیہ کالم میں اقبال کی ذات پر حملہ کیا۔(11) اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ احمدی عقیدہ رکھتے تھے اور انجمن حمایتِ اسلام کے ایک اہم رکن تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں احراری قادیانی نزاع نے پنجاب بھر کے مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی تھی، اس لیے اقبال نے بحیثیت صدر انجمن کو مشورہ دیا کہ اسے احمدیت کے متعلق اپنی پالیسی غیر مشتبہ الفاظ میں واضح کر دینی چاہیے۔ چنانچہ 2 فروری 1936ء کو انجمن کی جنرل کونسل نے زیر صدارت خلیفہ فضل حسین بہ تحریکِ عبدالمجید ایک قرارداد پیش کی جس میں ختم نبوت کے مسئلہ پر انجمن کے موقف کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر انجمن کی طرف سے ایک اعلان بدیں مضمون بھی تیار کیا گیا تھا جو بعد میں اخبارات میں شائع ہوا کہ عقائد نبوت، وحی اور خاتمیت میں انجمن عامۃ المسلمین کی ہم نوا ہے اور کونسل اس امر کا اعلان ضروری سمجھتی ہے کہ مسئلہ ختم نبوت اسلام کا ایک اساسی اصول ہے اور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے بعد کوئی نبی کسی رنگ میں نہیں آ سکتا۔ پس انجمن کا مسلک یہی ہے اور ایسا ہی رہے گا۔ خیر شیخ اکبر علی وکیل اور مولانا احمد علی نے قرارداد کی تائید کی۔ پھر انجمن کے ریکارڈ کے مطابق ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے نہ صرف قرارداد کی تائید کی بلکہ ارشاد فرمایا:

''جس صاحب کو جنرل کونسل کا رکن منتخب کرنا ہو، اس سے پہلے اس اعلان (جو اخبارات میں شائع ہوا) کے مطابق ختم نبوت کے عقیدے کا عہد لیا جائے کہ وہ اسی مسلک پر کاربند ہے اور رہے گا۔''

اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے سیکرٹری انجمن کی حیثیت سے صدرِ انجمن (یعنی اقبال) کے مطالبہ کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں قرارداد کی تائید کی:

''صدرِ محترم نے یہ محسوس کیا ہے کہ انجمن دن بدن مسلمانوں میں اپنا وقار کھو رہی ہے۔ جب تک احمدیت کے متعلق انجمن کی پالیسی غیر مشتبہ الفاظ میں واضح طور پر پبلک کے سامنے نہ کی جائے تب تک مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتے اور ایک بڑی بات جس پر کہ مسلمانوں میں ہیجان تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی کسی رنگ میں آ سکتا ہے یا نہیں، اس ریزولیوشن میں اس کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔''

اس مرحلہ پر ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جوش میں آ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلّا کر بولے:

''جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے جو تشریح کی ہے، وہ غلط ہے بلکہ مجازی رنگ میں نبی آ سکتا ہے۔''

مولوی غلام محی الدین ایڈووکیٹ نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا:

''انجمن عامۃ المسلمین پر اپنی جنرل کونسل کے ذریعہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ انجمن عامۃ المسلمین کے ساتھ ہے۔ مرزا صاحب کو اختلاف پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اصولِ مندرجہ بالا کے علاوہ ان کا کوئی عقیدہ ہے تو وہ اسے اپنے تئیں رکھیں اور انجمن میں ذریعۂ اختلاف نہ بنائیں اور میں اس اعلان کی پرزور تائید کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ غصہ میں میٹنگ سے واک آؤٹ کر گئے۔ نو دن کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا اور 11 فروری 1936ء کو رات کے گیارہ بجے فوت ہو گئے۔

انجمن کی اس کارروائی کے متعلق اخبار ''لائیٹ'' کے ایڈیٹر نے تحریر کیا کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی موت کا باعث انجمن کا وہ اعلان تھا جو اقبال کے مطالبے پر جنرل کونسل نے احمدیت کے بارے میں 2 فروری 1936ء کو تیار کر کے اپنے اخبار ''حمایتِ اسلام'' مورخہ 6 فروری 1936ء میں شائع کیا۔ مزید لکھا کہ اقبال نے انھیں کافر کہا تھا اور انجمن سے مطالبہ کیا

تھا کہ جب تک ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو انجمن کی ممبری سے الگ نہیں کیا جاتا، وہ صدارت قبول نہ کریں گے۔ بعدازاں ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے کونسل میں محولہ بالا اعلان کی بابت قرارداد پاس کرتے وقت ان کے خلاف متشددانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ وہ اپنی طبعی موت نہیں مرے بلکہ وہ انجمن سے حق کے لیے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایڈیٹر نے اقبال کے بارے میں تحریر کیا:

''ایک بہترین صبح کو ڈاکٹر محمد اقبال نے یہ خیال کیا کہ مرزا یعقوب بیگ کافر ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کو چیلنج بھیج دیا کہ مرزا یعقوب بیگ کو الگ کر دیا جائے۔ جیسا کہ وہ اس احسان فراموش اور بے ضمیر کتوں کی جماعت میں بوجہ اپنی شرافت کے رہنے کے قابل نہ تھا۔ خدا نے اس کو اپنی طرف بلا لیا۔ ہم ڈاکٹر محمد اقبال اور اس کے رہزن گروہ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اب گندہ آدمی دنیا میں نہیں رہا اور ڈاکٹر صاحب انجمن کی کرسی صدارت کو زینت بخشیں۔''

سیکرٹری انجمن ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کے متعلق لکھا:

''ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کی بابت یہ رپورٹ ملی ہے کہ انھوں نے خاص طور پر جنرل کونسل میں متشددانہ رویہ اختیار کیا ہے اور جونہی کہ وہ (ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ) اس میٹنگ سے باہر آئے ان پر فالج گرا اور 11 فروری 1936ء کو رات کے گیارہ بجے مر گئے۔ پس ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اسلام کے شہید ہیں۔''

اقبال نے ''لائیٹ'' کے لگائے گئے الزامات کا نوٹس نہ لیا۔ البتہ ہفت روزہ ''حمایتِ اسلام'' نے جنرل کونسل کی کارروائی کی تفصیل پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ سراسر غلط ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جونہی میٹنگ سے باہر نکلے اور مر گئے۔ پس شہید اسلام ہیں۔ دراصل کونسل کا اجلاس 2 فروری 1936ء کو منعقد ہوا تھا اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ 11 فروری 1936ء کو فوت ہوئے............

اب احمدیت کی تردید میں اقبال کی تحریروں کے پس منظر پر بحث کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے ان تحریروں کے سبب اقبال احمدیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ان کی وفات کے پندرہ سولہ برس بعد، اضطراباتِ پنجاب کے سلسلہ میں منیر انکوائری کمیشن کے سامنے شہادت دیتے

ہوئے ایک احمدی گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اقبال نے مرزا غلام احمد کی بیعت کی تھی اور 1930ء تا 1931ء تک اس بیعت کے پابند رہے لیکن اس کے بعد کشمیر کمیٹی میں مرزا بشیر الدین محمود اور اقبال کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے جس کے نتیجہ میں انھوں نے احمدیت کے خلاف بیانات دینا شروع کر دیے۔ جرح کے دوران گواہ نے پہلے تو کہا کہ یہ بیعت 1893ء یا 1894ء میں ہوئی تھی پھر کہا کہ 1897ء میں ہوئی تھی۔ بعدازاں گواہ نے اپنی شہادت کے کسی اور حصہ میں بتایا کہ اقبال 1930ء تک مرزا غلام احمد کو مجدد مانتے رہے، پھر کہا کہ اس نے اپنے بیان میں یہ کہیں بھی نہیں کہا کہ اقبال احمدی تھے۔(12) اسی طرح بعض احمدی حلقوں کی طرف سے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی گئی کہ اقبال کا احمدیت کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ ان کے خاندان کے کئی افراد نے احمدیت کو قبول کیا۔ ان کے والد احمدی تھے۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی تھے اور ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد احمدی ہیں، جنھیں اقبال نے وصیت نامہ میں اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ پس اگر بعد میں وہ احمدیت کے خلاف ہو گئے تو اس کی وجوہات ذاتی اور سیاسی تھیں۔(13)

اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ بہر حال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلہ پر مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد احمدی تھے۔ البتہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی کے ایک حصہ میں احمدی مذہب قبول کیا اور کچھ مدت تک جماعت احمدیہ میں شامل رہے۔ مگر بقول ان کے فرزند شیخ مختار احمد اور دختران عنایت بیگم و وسیمہ بیگم بعدازاں احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑ دیا۔ شیخ عطا محمد، اقبال کی وفات کے تقریباً دو سال بعد 22 دسمبر 1940ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انھیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔ نمازِ جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔ البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گذشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔ شیخ عطا محمد کی اولاد میں صرف شیخ اعجاز احمد احمدی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اقبال نے وصیت نامہ میں ان کا نام برادر زادہ

ہونے کی حیثیت سے اوران کی صالحیت کی بناپراپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ یہ وصیت نامہ انھوں نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان دینے کے پانچ ماہ بعد لکھا۔ لیکن تقریباً دوسال بعد وہ شیخ اعجاز احمد کی جگہ سرراس مسعود کو گارڈین نامزد کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ان کے خط مورخہ 10 جون 1937ء بنام سرراس مسعود سے ظاہر ہے، دیگراولیاء کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں: (14)

❑ ''نمبر 3 شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو گارڈین مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' ....

شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے آج تک کسی پر اپنا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا ان کی اولاد جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے، میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں، بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا موقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا موقف ہے۔............

اب اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ختم نبوت کے مسئلہ کے متعلق ابتدا ہی سے اقبال کا اپنا ذاتی موقف کیا تھا، اس ضمن میں سب سے پہلے راقم اقبال کی نظم بعنوان ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو'' کا حوالہ دینا چاہتا ہے۔ یہ نظم انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ 22 فروری 1902ء میں پڑھی گئی۔ اس نظم کے نویں بند میں سرورکائنات ﷺ کی توصیف کی گئی ہے اور درجِ ذیل شعر میں اقبال فرماتے ہیں: (15)

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنورِ شمعِ عرفاں کردۂ ای

اس شعر کو نظم میں شامل کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں احمدیت نے جو الجھاؤ پیدا کر دیا تھا اور جس کے باعث مسلمانوں کے ذہن مضطرب تھے، اس کی تردید مقصود تھی۔ ورنہ کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنا

اقبال کے نزدیک شرک فی النبوت کیوں قرار پاتا۔

اس کے بعد اقبال کی ایک اور نظم بعنوان ''خطِ منظوم پیغامِ بیعت کے جواب میں'' خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ یہ نظم مخزن بابت مئی 1902ء میں اور پھر محمد دین فوق کے اخبار ''پنجۂ فولاد'' مورخہ 11 جون 1902ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بقول محمد عبداللہ قریشی، اقبال پر بھی احمدیت قبول کرنے کے لیے ڈورے ڈالے گئے۔ (16) اس نظم کو احمدی ہفت روزہ ''الحکم'' قادیان نے اپنی 10 , 17 اور 24 جنوری 1903ء کی اشاعت میں نقل کیا اور ساتھ ہی مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک مخلص مرید سیّد حامد شاہ کی طرف سے اس کا منظوم جواب بھی شائع کیا۔ محمد عبداللہ قریشی کی رائے میں چونکہ سیّد حامد شاہ، مولانا سیّد میر حسن کے عزیزوں میں سے تھے اور اقبال کے دوست اور ہم محلّہ تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ اس قرب کی وجہ سے انھوں نے ہی اقبال کو مرزا غلام احمد کی بیعت کے لیے لکھا ہو جس کا جواب اقبال نے اس نظم کے ذریعے دیا۔ (17) اس نظم کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ وہ احمدیت کو ملت اسلامیہ میں ایک علیحدگی پسند تحریک سمجھ کر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ مسلمانوں کے اتحاد کو برقرار رکھنا ان کے ایمان کا لازمی جزو تھا۔ فرماتے ہیں: (18)

پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغِ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں
ایک دانہ پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تُو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
ایسی عبادت کو کیا سراہوں میں

مرگِ اغیار پہ خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں
میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تُو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

ان کی انگلستان سے واپسی کے چند برس بعد اخبار ''الحکم'' قادیان مورخہ 28 اگست 1910ء میں ایک خبر شائع ہوئی کہ شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ سو روپے حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ اقبال کے احباب واعزہ کو تعجب ہوا کہ انھوں نے قادیان جا کر احمدیوں سے رشتہ ناطہ جوڑ لیا، جن کے عقائد کے وہ خلاف تھے۔ اقبال کو اس بے سروپا خبر کی تردید چھپوانی پڑی جو ''پیسہ اخبار'' مورخہ 15 ستمبر 1910ء میں شائع ہوئی۔ فرمایا: (19)

''اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا ہے۔ سب حضرات کی آگاہی کے لیے بذریعہ آپ کے اخبار کے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جن ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا ذکر ایڈیٹر صاحب ''الحکم'' نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔''

احمدی اخبار ''الفضل'' مورخہ 9 اکتوبر 1915ء میں ایک مضمون بعنوان ''جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلافِ جماعت احمدیہ کے بارے میں'' شائع ہوا۔ یہ مضمون سیّد انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کا تحریر کردہ تھا اور احمدیوں میں قادیان پارٹی اور لاہوری پارٹی کے اختلاف سے متعلق تھا۔ اس مضمون میں اقبال سے یہ کلمہ منسوب کیا گیا کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں لیکن مجھے لاہور والوں سے ہمدردی ہے۔ اقبال کو اس کی تردید بھی بذریعہ خط بنام ایڈیٹر کرنی پڑی جو ''پیغام صلح'' مورخہ 13 نومبر 1915ء میں شائع ہوئی۔ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: (20)

''اختلافِ سلسلہ احمدیہ کے متعلق وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو، وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔''

بہر حال ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل پر وقتاً فوقتاً اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بعد کی تحریروں اور منظومات میں بھی کیا ہے، جن سے احمدی عقائد کی تردید ہوتی ہے۔مندرجہ بالا مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ 1935ء ہی میں پہلی بار انھوں نے ختم نبوت کے مسئلہ پر احمدی عقائد کو اپنی تنقید کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ گذشتہ کئی برسوں سے وہ ان کی تردید کرتے چلے آرہے تھے۔فرق اتنا تھا کہ 1935ء سے پیشتر انھوں نے اس سلسلہ میں کبھی مناظرانہ رویہ اختیار نہ کیا تھا۔اقبال نے عالم دین ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، نہ ہی وہ مسلمانوں میں موجود مختلف فرقوں کے دینی اختلافات پر کسی رائے کا اظہار کرنا پسند کرتے تھے، کیونکہ ان کا نصب العین منتشر ملت اسلامیہ میں اتفاق کے فروغ کے ذریعہ اتحاد و یگانگت کو وجود میں لانا تھا۔............

سو 1935ء سے پیشتر انھوں نے ختم نبوت اور متعلقہ مسائل پر کبھی احمدیوں سے مناظرہ کرنے کا قصد نہ کیا تھا۔آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے! اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے 1902ء سے بھی پیچھے جانے کی ضرورت ہے۔

اقبال کی ولادت سے پیشتر مرزا غلام احمد قادیانی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں چار پانچ برس سیالکوٹ میں مقیم رہے اور اس زمانہ میں وہ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں کے اسلام پر پے در پے حملوں کا جواب دیتے اور ان سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔اسی سبب سے ایک عالم دین کی حیثیت سے سیالکوٹ کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے اور وہاں کے دیگر علما و فضلا مثلاً مولانا غلام حسن، مولانا سیّد میر حسن وغیرہ کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔جہاں تک اقبال کے والد شیخ نور محمد کا تعلق ہے، وہ چونکہ مولانا غلام حسن اور مولانا سیّد میر حسن کے خاص دوستوں اور ہم نشینوں میں سے تھے، اس لیے مرزا غلام احمد کو جانتے تھے۔سیّد تقی شاہ فرزند مولانا سیّد میر حسن فرماتے ہیں کہ جب عیسائی مشنریوں کے ساتھ مرزا غلام احمد کے مناظرے ہوا کرتے تو مولانا سیّد میر حسن کو حکم بنایا جاتا تھا۔(21) بہر حال مرزا غلام احمد سیالکوٹ سے رخصت ہو گئے۔خاصی مدت کے بعد انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور ایک دو سال بعد پھر سیالکوٹ تشریف لے آئے۔یہ اقبال کی طالب علمی کا دور تھا۔سیالکوٹ میں مرزا غلام احمد کا قیام اقبال کے گھر کے قریب تھا۔اس لیے اقبال انھیں گلیوں میں آتے جاتے دیکھتے تھے۔سیالکوٹ کے علما نے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔چنانچہ شہر کے لوگوں میں ان کی

مخالفت روز بروز بڑھنے لگی۔ اس مرحلے پر مولانا سیّد میر حسن نے سر سیّد احمد خان کو ایک خط لکھا اور مرزا غلام احمد کی نبوت کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ سر سیّد نے انھیں اپنے خط محررہ 9 دسمبر 1891ء میں جواب دیا:(22)

''مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے تو بہتر، ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ نہ ہمارے دین کے کام کا نہ دنیا کے۔ ان کا الہام ان کو مبارک ہے۔ اگر انھیں ہوتا ہے اور صرف ان کے توہمات اور خللِ دماغ کا نتیجہ ہے، تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے، وہ جو ہوں سو ہوں، اپنے لیے ہیں۔............ جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے ان کی تصانیف میں نے دیکھیں۔ وہ اس قسم کی ہیں جیسا کہ ان کا الہام، نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔ مولوی حکیم نور الدین کی کوئی تحریر میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دینیات میں کسی کا الہام جب تک اس کو شارع تسلیم نہ کر لیا جائے کسی کام کا نہیں۔''............

ایک نکتہ جسے پوری طرح سمجھے بغیر بحث کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا، یہ ہے کہ اقبال نے کبھی بھی سیاست کو دین سے الگ تصور نہ کیا۔ ان کے سوانح حیات کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ وہ سیکولر سیاست کے قائل نہ تھے اور نہ کبھی اس میں ملوث ہوئے۔ ان کے ہاں سیاست سے مراد مسلمانانِ برصغیر کے مفادات کا بہر صورت تحفظ تھا۔ ملت اسلامیہ کے اتحاد، یگانگت، یک جہتی اور سالمیت کی خاطر وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے اور یہ جذبہ شروع سے لے کر آخر تک ان کے دل و دماغ پر حاوی رہا۔ پس اقبال کے ضمن میں جب سیاست کی اصطلاح استعمال کی جائے تو اس کے معانی ہوں گے مسلمانان برصغیر کے مفادات کا تحفظ، کیونکہ یہی تمام عمر اقبال کی سب سے اہم سیاسی غرض رہی۔

اس مرحلہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ 1935ء سے قبل ختم نبوت کے مسئلہ پر احمدی عقائد کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے کے باوجود اقبال کے جماعت احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دینے میں کیا سیاسی مصلحت تھی؟ بالفاظ دیگر اگر بقول اقبال، انھیں تحریک احمدیہ سے اچھے نتائج کی توقع تھی تو وہ اچھے نتائج کیا ہو سکتے تھے۔ برصغیر کے بیشتر علما نے تو ابتدا ہی سے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسی طرح ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل کے بارے میں بھی احمدی عقائد پر شدید اعتراضات کے باعث ان کا مطالبہ تھا کہ احمدیوں کو ایک

علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیا جائے۔ علاوہ ازیں عام مسلمان بھی احمدیوں کو غیر مسلم سمجھنے لگے تھے۔ بقول سیّد شمس الحسن 1931ء میں جب سر ظفر اللہ خان کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تو دہلی کے مسلمانوں نے شدید احتجاج اور مظاہرہ کیا کیونکہ وہ سر ظفر اللہ خان کو احمدی ہونے کی وجہ سے غیر مسلم سمجھتے تھے۔(23)

آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں اقبال کو تحریک احمدیہ کے ارکان کے ساتھ کام کرتے وقت کس قسم کا تجربہ حاصل ہوا! کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر کیے گئے تھے اور سیکرٹری عبدالرحیم درد (یعنی دونوں اہم عہدے احمدیوں کو سونپے گئے تھے) ان کے علاوہ کمیٹی کے دیگر ارکان مسلمان بھی تھے اور احمدی بھی۔ جولائی 1931ء میں کمیٹی قائم کرتے وقت چونکہ خیال تھا کہ یہ ایک عارضی تنظیم ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی قسم کا دستور وضع کرنے یا قواعد وضوابط مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ صدر اور سیکرٹری کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ دو ایک برس میں احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں اور اس کے ذریعے ان کا اصل مقصد کشمیری مسلمانوں کو احمدی بنانا ہے۔ اب شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ سب احمدیوں کے خلاف احراریوں کا پراپیگنڈا تھا اور ان کے دباؤ یا ڈرانے دھمکانے کے پیش نظر اقبال جیسی شخصیت نے بھی اس الزام کو درست تسلیم کر لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جماعت احمدیہ کے ممبران اپنے عقیدے کی نشر و اشاعت یا تبلیغ میں جوش و خروش کے اظہار کی وجہ سے مشہور یا بدنام نہیں ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس تہمت پر یقین کرنے والے حق بجانب بھی سمجھے جا سکتے تھے۔

بہر حال کشمیر کمیٹی کے بعض ارکان نے، جن میں اقبال بھی شامل تھے، تجویز پیش کی کہ چونکہ کمیٹی کو بحیثیت ایک تنظیم ابھی کچھ مدت تک قائم رکھنا پڑے گا، اس لیے اس کی خاطر دستور اور قواعد وضوابط وضع کر لینے چاہئیں تا کہ ہر کام ان کے مطابق انجام دیا جا سکے اور کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ احمدی ارکان کو یہ تجویز منظور نہ تھی کیونکہ ان کی دانست میں اس کا مقصد ان کے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا تھا۔ پس اس مرحلہ پر مرزا بشیر الدین محمود کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے لیکن شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ احراریوں نے اقبال کے ساتھ سازش کر کے فیصلہ کیا تھا کہ مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ''سول اینڈ ملٹری

گزٹ‘‘ میں خبر شائع کرائی گئی کہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی مسلمان ہونا چاہیے اوراس کے بعد مرزا بشیر الدین محمود کو کمیٹی کا اجلاس برائے انتخاب عہدہ داران بلانے کے لیے تحریر کیا گیا۔ انھوں نے وہ اجلاس بلوایا اور انتخابِ عہدہ داران کے لیے رستہ صاف کرنے کی غرض سے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ یہاں بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا کشمیری مسلمانوں میں احمدی عقیدے کی تبلیغ کے الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے احمدی ارکان نے کوئی قدم اٹھایا! جواب ہے، نہیں۔ اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنا استعفا پیش کر دیا تھا۔

مرزا بشیر الدین محمود کی جگہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کا قائم مقام صدر منتخب کیا گیا اور جب اقبال نے کمیٹی کے دستور کا مسودہ تیار کر کے اجلاس میں پیش کیا تو احمدی ارکان نے ان کی مخالفت کی۔ بلکہ دورانِ بحث اقبال پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔ یعنی وہ مسلمانوں کی اکثریت کی بنا پر وضع کیے ہوئے کسی دستور کے پابند نہیں ہو سکتے بلکہ وہ تو وہی کریں گے جو ان کے امیر کا حکم ہو گا۔ بالفاظِ دیگر احمدی بظاہر کشمیر کمیٹی کو قائم رکھتے ہوئے اسے اندر سے دو حصوں یعنی مسلمانوں اور احمدیوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھے۔ یہ صورت اقبال کے لیے ناقابلِ قبول تھی، اس لیے انھوں نے کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد اور راہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو کوئی اور کشمیر کمیٹی بنائیں جو صرف مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ لیکن شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ اقبال احراریوں کے ایماء پر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں مصروف ہو گئے اور احراریوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے...... بعد میں احمدیوں نے ’’تحریکِ کشمیر‘‘ کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی اور اقبال کو اس کی صدارت پیش کی لیکن اقبال نے اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے اپنے بیان مورخہ 2 اکتوبر 1933ء میں فرمایا: (24)

’’قادیانی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ابھی تک ایسا کوئی واضح اعلان جاری نہیں ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں منقسم نہیں ہوں گی۔ دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ جسے قادیانی پریس ’’تحریکِ کشمیر‘‘ کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار ’’الفضل‘‘ مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل

ہونے کی اجازت دی گئی ہے، ایک ایسی تنظیم ہے، جس کے مقاصد اور محرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔''

شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے ایام میں جب اقبال سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ تو اس فرقہ کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' سمجھتے تھے، تو جواب میں انھوں نے اعتراف کیا کہ پچیس برس پیشتر انھیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقعات تھیں لیکن انھیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانیِ اسلام ﷺ کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔ اس کے بعد شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور اقبال کے حاشیہ نشینوں نے انھیں احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی تھی لیکن افسوس ہے شیخ اعجاز احمد نے اس ضمن میں اقبال کا پورا فقرہ درج نہیں کیا۔ اقبال فرماتے ہیں: (25)

❏ ''ذاتی طور پر مجھے اس تحریک کے متعلق اس وقت شبہات پیدا ہوئے جب ایک نئی نبوت، جو بانیِ اسلام ﷺ کی نبوت سے بھی برتر تھی، کا دعویٰ کیا گیا اور تمام عالم اسلام کے کافر ہونے کا اعلان کیا گیا۔ بعد ازاں میرے شبہات نے اس وقت مکمل بغاوت کی صورت اختیار کر لی، جب میں نے اپنے کانوں سے اس تحریک کے ایک رکن کو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں نہایت نازیبا زبان استعمال کرتے ہوئے سنا۔''

پس یہ محض احراریوں یا حاشیہ نشینوں کے بھڑکانے کا نتیجہ نہ تھا۔ اقبال کے اپنے کان بھی تو تھے، جنھیں وہ سننے کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممکن ہے بقول شیخ اعجاز احمد، بانیِ سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہ کیا ہو اور نہ کوئی احمدی بانیِ سلسلہ احمدیہ کو سرکار دو عالم ﷺ سے برتر یقین کرتا ہو، مگر کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنے میں یہی تو قباحت ہے کہ یوں بعد کی نئی نبوت کی برتری کے اظہار کی طرح ڈالی جا سکتی ہے یا ایسے منفی اندازِ فکر کے لیے دروازہ کھل جانے کا امکان ہے۔ عین ممکن ہے کہ شیخ اعجاز احمد یا دیگر احمدیوں کا عقیدہ وہی ہو جو انھوں نے بیان کیا ہے لیکن جس بدبخت کی باتوں کو اقبال نے اپنے کانوں سے سنا، وہ بھی تو اپنے آپ کو تحریک احمدیہ کا رکن ہی سمجھتا تھا۔

شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ اقبال اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ ساتھ بچوں کی طرح معصوم اور بھولے بھالے تھے۔ سنی سنائی بات کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیتے۔ اس ضمن میں انھوں نے اقبال کے بھولپن کی تین مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ تحریک احمدیہ کے عقائد کے متعلق بھی انھوں نے سنی سنائی باتوں کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیا تھا۔ راقم کی رائے میں ایک ایسا شخص جو ہندو رہنماؤں یا انگریز حاکموں کی سیاسی چالوں کو پوری طرح سمجھتا ہو، جس کی یخ بستہ منطق نے واضح کیا ہو کہ مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ علیحدہ نیابت کے مطالبے کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑیں جو ایک تجربہ کار وکیل کی حیثیت سے انفرادی یا اجتماعی لین دین کے معاملات میں اپنی فلسفہ دانی یا شاعرانہ تخیل کے باوجود عملی اور کاروباری قسم کا آدمی ہو، اس سے ایسے معصومیت یا بھولپن کی توقع رکھنا یا یہ سمجھنا کہ اس نے سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے احمدیت کے خلاف بلاوجہ شور مچا دیا، قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اعجاز احمد، اقبال کے تمام سوانح حیات میں غالباً یہی تین مثالیں ان کے بھولپن کی پیش کر سکتے تھے۔ مگر راقم کے نزدیک یہ مثالیں اقبال کے بھولپن کو ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ مثلاً سردار بیگم کے ساتھ نکاح کے بعد بعض گمنام خطوں پر ان کا یقین کر لینا اور پھر اپنی غلطی پر پشیمان ہونا، ان کا بھولپن ظاہر نہیں کرتا بلکہ ذہنی اضطراب یا بے چینی کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ ان کی پہلی شادی ناکام رہی تھی اور وہ دوسری بار ضرورت سے زیادہ محتاط ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر یہ کہنا کہ کسی کی گپ پر اعتبار کرتے ہوئے انھوں نے یقین کر لیا کہ روس کا نیا صدر محمد استالین مسلمان ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے یا انھیں اپنا مطیع رکھنے کی خاطر شروع میں روسی کمیونسٹوں نے اسی قسم کا پراپیگنڈا کیا تھا اور عین ممکن ہے کہ یہ پراپیگنڈا سرحدیں عبور کر کے برصغیر میں بھی پہنچا ہو۔ اقبال نے غالباً اسی پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر اپنے بڑے بھائی کو یہ خوشخبری سنائی لیکن بعد میں تحقیق پر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ اسی طرح اس زمانے میں مغربی پریس دنیائے اسلام میں اس قسم کی غلط خبروں کی تشہیر بطور پالیسی کیا کرتا تھا کہ کسی ملک کے مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو اڑا دیا، یا کسی مسلم ملک میں نماز میں تبدیلیاں کر دی گئیں یا ایسی تحریک دیگر مسلم ممالک میں بھی جاری ہے۔ اس پراپیگنڈے کا مقصد دنیائے اسلام کے حصے بخرے کرنا یا اس میں انتشار پھیلانا تھا اور اس قسم کا طرز عمل آج بھی یہود نواز مغربی پریس اختیار کر

لیتا ہے۔ اس اعتبار سے ایسی خبروں سے اقبال کا دل گرفتہ ہونا، ان کے بھولپن یا معصومیت کا ثبوت فراہم نہیں کرتا بلکہ ملتِ اسلامیہ کے متعلق ان کی فکرمندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کشمیر کمیٹی میں اقبال اپنے ذاتی تجربہ کی بناپر احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔

شیخ اعجاز احمد سمجھتے ہیں کہ کشمیر کمیٹی کے قیام کے دوران اقبال اور جماعت احمدیہ کے تعاون میں احراری رخنہ انداز ہوئے اور انھوں نے اقبال کو ڈرا دھمکا کر اپنے ساتھ مفاہمت کرنے کی راہ ہموار کی۔ پس اسی مفاہمت کے پس منظر میں اقبال اور احراریوں کی سازش کے ذریعہ مرزا بشیرالدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے الگ کیا گیا اور بعد میں اقبال مجلسِ احرار کی ہرطرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ بقول ان کے، احراریوں نے احمدی عقائد کے متعلق بے بنیاد باتیں تراش کر اقبال کے عشقِ رسول ﷺ کو ایکس پلائیٹ کرتے ہوئے انھیں احمدیت کے خلاف بھڑکایا اور اقبال نے بغیر تحقیق کیے ان کی باتوں کو درست تسلیم کرلیا۔

کشمیر کمیٹی میں احمدیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں اقبال کا ذاتی تجربہ تھا اور اس ضمن میں ان کے بیانات سے ظاہر ہے کہ وہ احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اقبال احمدیوں سے من حیث الجماعت 1933ء میں مایوس ہوئے لیکن انھوں نے تحریکِ احمدیہ کے خلاف اپنا پہلا بیان دو سال بعد یعنی 1935ء میں جاری کیا۔ احراریوں کی جماعت احمدیہ سے پرانی عداوت تھی اور جب اقبال کشمیر کمیٹی میں احمدیوں سے مایوس ہوئے تو عین ممکن ہے کہ احراریوں نے احمدیوں کے خلاف ان سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی ہو کیونکہ یہ صورت حال دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کا ذریعہ بنتی تھی مگر اس صورت حال کے صحیح تجزیہ کے لیے تین چار دیگر امور بھی ذہن میں رکھنے چاہئیں، جنھوں نے مستقبل میں بالخصوص پنجاب کی مسلم سیاست پر اثر انداز ہونا تھا۔ یہ امور تھے: کمیونل ایوارڈ، محمد علی جناح کے ہاتھوں 1934ء میں مسلم لیگ کا احیاء 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خودمختاری کا مسئلہ، سرفضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کا پروگرام اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں درپیش خطرات، ان امور کے پس منظر میں محمد علی جناح، اقبال اور پنجاب کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں، احراریوں، یونینسٹوں اور احمدیوں کے سیاسی عزائم نے 1935ء تک جو شکل اختیار کی، اس کی روشنی ہی میں اقبال کے تحریکِ احمدیہ کے

خلاف بیانات کو پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ اگر اقبال احمدیوں سے 1933ء میں مایوس ہو گئے تھے تو انھوں نے دو برس انتظار کے بعد 1935ء میں احمدیت کے متعلق اپنی تبدیلی رائے کا برملا اظہار کیوں کیا؟ ایک طبقۂ فکر کی رائے ہے کہ جب احمدیوں کے سیاسی عزائم واضح طور پر سامنے آ گئے تو اقبال نے احمدیت سے بیزاری کا اعلان کر دیا۔(26) آخر احمدیوں کے کوئی سیاسی عزائم تھے تو کیا تھے؟ بالفاظ دیگر اگر اقبال نے عامۃ المسلمین کے لیے تحریکِ احمدیہ کے سیاسی عزائم سے کوئی خطرہ محسوس کیا تو وہ کیا تھا؟

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ برصغیر میں سیاسی بیداری کے دور میں بھی تحریکِ احمدیہ انگریزی حکومت کی اطاعت اور وفاداری کا دم بھرتی تھی۔ اپنے ابتدائی ایام ہی میں اس نے جہاد کی حرمت کا اعلان کر رکھا تھا اور اس سے مراد یہ لی گئی کہ احمدیوں کے نزدیک انگریز کے ساتھ وفاداری کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ اس کے خلاف سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا بھی حرام قرار دیا گیا تھا۔ تحریکِ احمدیہ کا تعلق خالصتاً پنجاب کی سرزمین سے تھا پنجاب میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھوڑی سی تھی اور اس اکثریت کے بل بوتے پر یہاں کسی مستحکم مسلم وزارت تشکیل دے سکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا البتہ اگر مسلمانوں میں اتحاد برقرار رکھا جاسکے تو وہ مخلوط وزارت قائم کر سکتے تھے۔ چنانچہ پنجاب میں سر فضل حسین نے غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی قائم کر رکھی تھی۔ سر فضل حسین کے والد کے بانی تحریک احمدیہ سے خاندانی مراسم تھے۔ جب سر فضل حسین انگلستان سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس تشریف لائے تو ان کے والد انھیں ساتھ لے کر مرزا غلام احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے لیے دعا کی درخواست کی۔(27) بعد میں 1926ء میں جب سر ظفر اللہ خان پنجاب کی کونسل کے لیے منتخب ہوئے تو مرزا بشیر الدین محمود (سلسلہ احمدیہ کے دوسرے جانشین) نے انھیں ہدایت کی کہ کونسل میں اور سیاسی میدانِ عمل میں سر فضل حسین کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے۔(28) سر ظفر اللہ خان فرماتے ہیں:(29)

”میں تو پہلے ہی میاں صاحب کا مداح اور ممنونِ احسان تھا، اس لیے حضور کے ارشاد کی تعمیل میرے لیے آسان تھی۔“

سو پنجاب میں جماعتِ احمدیہ نے سیاسی میدانِ عمل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کے ذریعہ اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا کی۔ سر ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت کے تحت یونینسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور یہ تعلق آخر تک قائم رہا۔ سر فضل حسین کے بارے میں ان کے فرزند عظیم حسین کی تحریر کردہ کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو قطعی پسند نہ کرتے تھے اور اپنے اردگرد صرف ایسے لوگوں کو دیکھنے کے خواہش مند تھے جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں یا ان کی رائے سے اتفاق کرتے رہیں۔ سر ظفر اللہ خان بھی اسی سبب سے ان کے منظورِ نظر تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ جو اصلاً ایک مذہبی جماعت تھی، کو سیاسی وابستگی پیدا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جواب ہے، سیاسی قوت حاصل کیے بغیر کوئی بھی مذہبی تحریک نہ تو اپنا الگ تشخص برقرار رکھ سکتی ہے اور نہ اس کے اراکین کی تعداد میں اضافہ ہو سکنے کا امکان ہے۔ جماعت احمدیہ نے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعلق کس سیاسی مصلحت کے تحت قائم کیا تھا؟ اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ اوّل یہ کہ یونینسٹ پارٹی ایک غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت تھی، یعنی باوجود اس کے کہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہ اصولاً ایک سیکولر پارٹی تھی جس میں احمدی بحیثیت ایک مذہبی فرقہ مسلمانوں میں رہتے ہوئے بھی انھیں اندر سے تقسیم کر کے اپنی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے تک اپنی علیحدہ حیثیت برقرار رکھ سکتے تھے۔ دوم یہ کہ یونینسٹ پارٹی انگریزی حکومت کی اطاعت کا دم بھرتی تھی اور اس کے ذریعہ احمدی (جو عقیدتاً انگریزی حکومت کے وفادار تھے) بظاہر عامۃ المسلمین میں شمار ہوتے ہوئے وہ مناصب حاصل کر سکتے تھے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص تھے۔ بہر حال اس زمانہ میں مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس جیسی سیاسی جماعتیں عوامی نہ تھیں۔

اسی دور میں کشمیر کمیٹی میں اقبال کو خالصتاً احمدی قیادت میں کام کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔ کشمیر کمیٹی ایک عارضی تنظیم کی صورت میں عجلت میں بنائی گئی تھی۔ اس کا نہ تو کوئی دستور تھا اور نہ قواعد و ضوابط۔ جب احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو کشمیر میں احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں تو اس قسم کے الزامات کے تدارک کے لیے تجویز پیش کی گئی کہ کشمیر کمیٹی کے لیے دستور اور قواعد و ضوابط وضع کر لیے جائیں تا کہ کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع نہ

مل سکے۔لیکن بجائے اس کے کہ الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے قدم اٹھائے جاتے، احمدیوں نے اس تجویز کو اپنے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنے کے لیے ایک چال تصور کیا اور مرزا بشیرالدین محمود نے کشمیر کمیٹی سے استعفادے دیا۔ جب اقبال کشمیر کمیٹی کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے تو احمدی اراکین نے ان کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور بقول اقبال ان پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق اگر وہ کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔پس اقبال پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ احمدی اگر مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں یقیناً منقسم ہوں گی۔یعنی ان کی اوّلین وفاداری اپنی جماعت کے ساتھ ہوگی، نہ کہ ملت اسلامیہ کے ساتھ۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں میں اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں میں اتحاد کی اشد ضرورت تھی۔ بعدازاں اقبال کے کان میں کسی احمدی کے منہ سے نکلی ہوئی دو ایک ناخوشگوار باتیں پڑیں جن کے سبب وہ جماعتِ احمدیہ سے بیزار ہوگئے۔ یہ سب 1933ء میں ہوا لیکن اقبال نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان 1935ء میں جاری کیا۔اس کی وجہ کیا تھی؟

شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ 1935ء میں احراریوں نے احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک چلا رکھی تھی۔ چنانچہ احراریوں یا اپنے کسی احمدیت کے مخالف حاشیہ نشین کے بھڑکانے پر اقبال نے بھی احمدیت کے خلاف مضمون داغ دیا۔اس ضمن میں وہ اپنے بیان کی تائید میں عبدالمجید سالک کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔مگر راقم کی رائے میں شیخ اعجاز احمد اور عبدالمجید سالک دونوں کا استدلال درست نہیں۔اقبال نے احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا بیان کسی کے اکسانے پر محض اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں دیا تھا بلکہ اس کے چند اہم محرکات تھے جن کا تعلق پنجاب میں مسلم سیاست کے مستقبل سے تھا۔علاوہ ازیں یہ بیان گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن کی تقریر کے جواب میں دیا گیا جس میں اس نے احمدیت کے خلاف احرار کی ایجی ٹیشن کا حوالہ دیتے ہوئے مسلمانوں کو رواداری کا درس دیا تھا۔

ایمرسن نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اپنے خطبہ میں احمدیت کے خلاف مجلس احرار کے مظاہروں کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف مسلمانوں کو رواداری کی

تلقین کی تھی بلکہ مسلمانوں کے باہمی نفاق پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانانِ پنجاب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی قوم میں کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کریں۔ پس تحریکِ احمدیہ کے خلاف اقبال کا پہلا بیان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' اسی کے جواب میں جاری کیا گیا۔

اس بیان کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ اقبال نے ایمرسن کے درسِ رواداری کو مسلمانوں کے تمدنی نقطہ نگاہ سے بے خبری قرار دیا اور فرمایا کہ انگریزی حکومت کو اس بات سے غرض نہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد برقرار رہتا ہے یا نہیں، کیونکہ اس کا مفاد تو صرف اسی میں ہے کہ نئے مذہب کا جو بانی بھی ابھرے، وہ برطانیہ کا وفادار رہے۔ اس ضمن میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی خاطر انھوں نے اکبر الٰہ آبادی کا درجِ ذیل شعر بھی پیش کیا ہے ۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
''انا الحق'' کہو اور پھانسی نہ پاؤ

اقبال نے مزید کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اسلام کے باغی گروہ کو تو اپنے اشتعال انگیز عقائد کی تبلیغ جاری رکھنے کی آزادی ہو لیکن اگر ملتِ اسلامیہ کوئی دفاعی تدبیر اختیار کرے تو اسے رواداری کا سبق دیا جائے۔ اگر انگریزی حکومت اس گروہ کی خصوصی خدمات کے سبب اسے پسند کرتی ہے تو اسے اس کی خدمات کا جو جی چاہے صلہ دے سکتی ہے مگر یہ زیادتی ہے کہ مسلمانوں سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اپنے معاشرے کی سالمیت کے تحفظ کے لیے فکرمند نہ ہوں۔ (30)

شیخ اعجاز احمد، احمدی حلقوں، سر فضل حسین یا عظیم حسین کے خیال میں اقبال نے احمدیت کی مخالفت اپنی سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر کی تھی لیکن اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ اقبال کی سب سے اہم سیاسی غرض مسلمانانِ برصغیر کے مفادات کا تحفظ تھی۔ نظریاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ مشرک اللہ تعالیٰ کی توحید، یکتائیت اور خودی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کی پاداش میں دوزخ میں جھونکا جاتا ہے۔ لیکن اقبال کے ہاں امتِ محمدیہ یا ملتِ اسلامیہ کے اتحاد، یگانگت، یک جہتی اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے والا تو اس کی اجتماعی خودی کا منکر ہے، لہٰذا ایسا گنہگار ہے جسے دوزخ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

کیا اقبال نے اپنی کسی ذاتی غرض کی تحصیل کی خاطر یا احساسِ محرومی کے سبب تحریک احمدیہ کی مخالفت کی تھی؟ شیخ اعجاز احمد یہ تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں چونکہ انگریزی حکومت

نے اقبال کے بجائے سر ظفر اللہ خان کو مستقل طور پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیا تھا اس لیے اقبال نے تحریک احمدیہ کی مخالفت میں بیان جاری کرنے شروع کر دیے۔ یہ عذر کچھ اسی قسم کا ہے جو ہندو اخبار ''ٹریبیون'' نے اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد 1930ء کے موقع پر پیش کیا تھا۔ یعنی اقبال نے برصغیر میں علیحدہ مسلم ریاست کا تصور انتقاماً دیا کیونکہ حکومت برطانیہ نے انھیں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو نہ کیا تھا۔ اقبال نے اگر انگریزی حکومت کی ملازمت ہی کرنی تھی تو سر فضل حسین سے بنا کر رکھتے یا ان کی یونینسٹ پارٹی سے آخری دم تک وابستگی قائم رکھتے۔ انگریز حکمران سر فضل حسین پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس لیے 1932ء میں جب وہ چار ماہ کی رخصت پر گئے تو سر فضل حسین کی سفارش پر ہی سر ظفر اللہ خان کو عارضی طور پر وائسرائے کی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا (31) اسی طرح جب اکتوبر 1934ء میں مستقل طور پر سر ظفر اللہ خان کے اس منصب پر تقرر کا اعلان ہوا تو اسے بھی سر فضل حسین کی کوششوں کا نتیجہ سمجھا گیا۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے ''زمیندار'' ''ویکلی میل'' اور ''مجاہد'' میں تند و تیز بیانات یا احراریوں کی ایجی ٹیشن صرف سر ظفر اللہ خان کے تقرر یا احمدیوں کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کے خلاف بھی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اسی اثنا میں سر ہربرٹ ایمرسن کے خطبہ کے جواب کی صورت میں اقبال کو بھی یونینسٹ احمدی گٹھ جوڑ پر کھل کر تبصرہ کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے احمدیت کی تردید کے ساتھ ساتھ سر فضل حسین کے کردار پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔ سر فضل حسین پر الزام لگایا گیا کہ وہ انگریز حاکموں کے اشارے پر شہری دیہاتی تفریق کے ساتھ احمدیوں کو آگے بڑھا کر پنجاب میں مسلمانوں کے اتحاد پر ضربِ کاری لگا رہے ہیں۔ سر فضل حسین وائسرائے کی کونسل میں سر ظفر اللہ خان کے تقرر پر مسلمانوں میں اضطراب سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ 24 ستمبر 1934ء بنام سر ظفر اللہ خان میں اس اضطراب کی وجوہات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن ساتھ ہی تحریر کیا: (32)

''اب انھوں نے اپنی تمام تر توجہ میری طرف مبذول کر لی ہے اور کہتے ہیں کہ زیادہ عرصہ تک اونچے منصب پر فائز رہنے کے سبب میں مسلم رائے عامہ سے بے پروا ہو گیا ہوں اور میں نے آمرانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ خیر، مجھے توقع ہے کہ اب تک آپ کے تقرر کا فیصلہ ہو چکا ہوگا، گو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تقرر کے اعلان سے مخالفت ختم ہو جائے گی، بلکہ کچھ بڑھ ہی

جائے گی۔ بہر حال میں دیکھوں گا کہ اس کے خاتمے کے لیے کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔''

اقبال کی اگر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت میں دلچسپی تھی تو سر فضل حسین کی ڈائری یا خطوط میں اس کا کہیں ذکر ملتا یا عظیم حسین کی تصنیف میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہوتا۔ دراصل عظیم حسین کا تو گلہ ہی یہی ہے کہ ان کے والد سر فضل حسین، اقبال کو انگریزی حکومت میں کسی بلند عہدے پر فائز کروانے کے لیے بار بار کوشش کرتے تھے۔ مگر اقبال ہر بار انگریزی حکومت پر نکتہ چینی کر کے حکومتی حلقوں کا اعتماد کھو دیتے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انگریز حکمران اتنے کمزور نہیں تھے کہ احراریوں کی ایجی ٹیشن پر یا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے اخبارات میں اقبال کا نام لینے پر انھیں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیتے۔ یہ درست ہے کہ اس منصب پر سر ظفر اللہ خان کی متوقع تقرری کے خلاف ''زمیندار'' اور دیگر اخباروں میں سخت احتجاج ہو رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ ایک احمدی کے بجائے کسی جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب دیا جائے اور اس ضمن میں اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اقبال اس منصب کے لیے امیدوار تھے، درست نہیں۔ انگریز حکمرانوں کو اس قسم کے تقرر کرتے وقت سب سے پہلے ایسے لوگوں کی تلاش ہوتی تھی، جو ان کے اطاعت گزار اور وفادار ہوں، نہ کہ ان کے نقاد۔ اس لیے یہ بات پنجاب میں ہر کوئی جانتا تھا کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کے لیے اسی شخص کا تقرر ہو گا جو انگریز حاکموں کی توقعات کے مطابق سر فضل حسین کا صحیح جانشین ہو، جسے سر فضل حسین یا انہی کی طرح کی کسی شخصیت کی حمایت حاصل ہو اور اگر یہ محسوس کیا جاتا کہ مسلم ایجی ٹیشن کے سبب سر ظفر اللہ خان کا تقرر مناسب نہ رہے گا، تو اس منصب کے لیے سر فضل حسین کو کسی اور جانشین کی سفارش کرنے کے لیے کہا جاتا لیکن اقبال جیسی شخصیت، جس نے کئی بار انگریزی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا، کے تقرر کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس ضمن میں شیخ اعجاز احمد میاں محمد شفیع (م۔ش) کے بیان کو سند کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن ایام میں سر فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیر غور تھا تو وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ایک ملاقات میں اقبال کو یہ کہہ کر کہ اب ہم اکثر ملتے رہیں گے، سر فضل حسین کی جگہ ان کے تقرر کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ راقم کو اس روایت کی صحت پر کئی اعتراض ہیں۔ اوّل یہ کہ 1934ء یا 1935ء میں میاں محمد شفیع (م۔ش) سے اقبال کے کسی قسم

کے روابط قائم نہ ہوئے تھے بلکہ اس زمانے میں وہ میاں محمد شفیع (م۔ش) کو جانتے تک نہ تھے۔ دوم یہ کہ ان دو سالوں میں ایسی کوئی شہادت راقم کی نظر سے نہیں گزری جس سے ثابت ہو سکے کہ اقبال کی لارڈ ولنگڈن سے ملاقات ہوئی تو کہاں ہوئی تھی۔ سوم یہ کہ جس روایت کا شنید پر انحصار ہو اور جس کی تائید کسی واقف حال ہمعصر شخصیت کے بیان یا کسی معتبر تحریری ذریعہ سے نہ ہوتی ہو وہ تحقیقی نقطہ نگاہ سے قابل اعتماد نہیں سمجھی جا سکتی۔

مئی 1935ء میں جب احمدیت کے خلاف اقبال نے اپنا پہلا بیان جاری کیا تو گلے کا عارضہ لاحق ہوئے ڈیڑھ برس کی مدت گزر چکی تھی۔ بھوپال سے برقی علاج کا پہلا کورس مکمل کر کے واپس لاہور آئے تھے۔ آواز بہت نحیف تھی۔ صحت مسلسل گر رہی تھی اور مستقل طور پر صاحبِ فراش ہو چکے تھے بلکہ انہی ایام میں سردار بیگم کی تشویش ناک بیماری، پھر ناگہانی موت اور نابالغ بچوں کی نگہداشت وغیرہ ایسے مصائب و آلام نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ آواز کی خرابی کے سبب تقریباً ڈیڑھ برس سے وکالت بھی چھوٹ چکی تھی۔ یہ درست ہے کہ اقبال کو مالی فراغت یا آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی لیکن 1934ء اور 1935ء میں تو بوجہ علالت وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت قبول کرتے۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت کے امیدوار تھے، یا اس منصب پر تقرری کے خواب دیکھ رہے تھے اور جب ان کے بجائے یہ منصب وزیر ہند نے سر ظفر اللہ خان کو سونپ دیا تو وہ انتقاماً احمدیت کی مخالفت میں بیانات جاری کرنے لگے، اصل حقائق سے بے خبری ہے یا انھیں تعصب کی عینک سے دیکھنے والوں کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔(34)

حواشی

1- اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ جلد اوّل صفحہ 354۔

2- مکتوبات اقبال مرتبہ سیّد نذیر نیازی صفحہ 270۔ یہ کبھی شائع نہ ہوا۔

3- بیان کے انگریزی متن کے لیے دیکھئے اقبال کی تقریریں اور بیانات مرتبہ اے آر طارق (انگریزی صفحات 91 تا 98)

4- ایضاً صفحات 99 تا 104۔

5- ایضاً صفحات 105 تا 108۔

6- اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی) صفحات 174 تا 176۔

-7 انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحات 45-46۔

-8 اسلام اور احمدیت کے انگریزی متن کے لیے دیکھئے اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی) صفحات 176 تا 199۔ اقتباس صفحہ 177 سے لیا گیا ہے۔

-9 ایضاً صفحہ 200۔

-10 مکتوبات اقبال مرتبہ سیّد نذیر نیازی صفحہ 315۔

-11 اقبال اور انجمن حمایت اسلام از محمد حنیف شاہد صفحات 131 تا 136۔

-12 مضمون ''قادیانیت اور علامہ اقبال'' نوائے وقت مورخہ 13 اپریل 1954ء۔

-13 دیکھئے کتابچہ بمشتمل چودہ صفحات بعنوان ''احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'' مرتبہ عبدالمالک خان ناظر اصلاح وارشاد وصدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ۔ مزید دیکھئے اس کتابچہ پر تبصرہ ہفت روزہ چٹان مورخہ 27 مئی 1974ء صفحات 25,24,17۔

-14 اقبال نامے مرتبہ اخلاق اثر بھوپال صفحات 77,76۔ یہ خط اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل صفحات 387,386 پر بھی موجود ہے لیکن اس میں یہ فقرے ''مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں۔'' حذف کیے گئے ہیں۔

-15 باقیات اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحہ 129۔

-16 معاصرین اقبال کی نظر میں صفحہ 232۔

-17 ایضاً صفحات 232 تا 241۔

-18 باقیاتِ اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحہ 163 تا 165۔

-19 معاصرین اقبال کی نظر میں مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحات 242,241,232,231۔

-20 خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی صفحات 124 تا 126۔

-21 روایاتِ اقبال مرتبہ محمد عبداللہ چغتائی صفحہ 45۔

-22 خط کے اقتباس کے لیے دیکھئے مضمون ''سرسیّد احمد خان، شمس العلما مولوی میر حسن سیالکوٹی اور مرزا غلام احمد قادیانی'' از کلیم اختر ہفت روزہ چٹان مورخہ 17 نومبر 1975ء صفحہ 27۔

-23 صاف گو مسٹر جناح (انگریزی) صفحہ 53۔

-24 اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی) صفحات 234-235۔

-25 اقبال کی تقریریں اور بیانات مرتبہ اے آر طارق (انگریزی) صفحہ 101۔

-26 خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی صفحہ 124۔ اقبال اور قادیانی از نعیم آسی۔ اقبال اور قادیانیت از شورش کشمیری۔ اقبال نے انھیں اپنے مقالے مسلم کمیونٹی کے انگریزی مسودے کے حاشیہ میں ذہناً

''میگین''، قرار دیا ہے۔

27- تحدیث نعمت از سر ظفر اللہ خان صفحہ 10۔

28- ایضاً صفحہ 237۔

29- ایضاً صفحہ 237۔

30- اقبال کی تقریریں اور بیانات مرتبہ اے آر طارق (انگریزی) صفحات 96,95۔

31- فضل حسین ایک سیاسی بیاگرافی از عظیم حسین (انگریزی) صفحات 313-314۔ میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی) اندراجات ڈائری مورخہ 17 مئی و 22 مئی 1932ء صفحات 138 تا 140۔

32- فضل حسین ایک سیاسی بیاگرافی از عظیم حسین (انگریزی) صفحہ 314۔ میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی) صفحہ 154۔

33- احمدیوں کو چونکہ ہندو اور سکھ مسلمان سمجھتے تھے، اس لیے قیام پاکستان پر احمدیوں نے بھی دیگر مسلمانوں کی طرح مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لی اور قادیان کے بجائے سرگودھا کے نزدیک ربوہ کو اپنا مرکز بنایا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران 1974ء میں آئین کی ترمیم کے ذریعہ انھیں غیر مسلم یا ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیا گیا اور 1984ء میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے تعزیرات پاکستان میں ایک ترمیم کے ذریعہ ان کے لیے اسلامی اصطلاحات کا استعمال جرم قرار دے دیا۔

آغا شورش کاشمیریؒ

اقبال اور قادیانیت

علامہ اقبال مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے داعی تھے اور اپنی فکر کے مطابق انھیں کائنات میں فائز المرام دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئے جب مسلمانوں کا آفتاب گہنا چکا تھا اور ان کی آنکھوں کے سامنے ملتِ اسلامیہ کا حصار مختلف حادثوں سے گر رہا تھا۔ ان کے افکار ابتداء ہی میں گرد و پیش کے سانحوں سے شدید متاثر تھے لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد تاریخ کے تجربوں کی طویل گزرگاہ سے وہ مطالعہ و مشاہدہ کی ایک ایسی منزل تک پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کے حصار کا انہدام ان کے لیے عظیم سانحہ تھا اور وہ ان اسباب و وجوہ کی تلاش میں تھے جو مسلمانوں کے زوال و ادبار کا باعث ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ سفر ذہنی اذیت کا باعث ضرور تھا، لیکن ان بنیادوں کو پالینا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ ان کے سامنے ہندوستان کی سیاسی تحریکیں بھی تھیں، ایشیا کے نشیب و فراز بھی تھے اور یورپ کا وہ استعماری چنگل بھی تھا جو مشرق کا گلا گھونٹ رہا تھا لیکن یورپ کا اپنا گلا بھی اسی کے ہاتھوں گھٹ رہا تھا۔ ان کے نزدیک یورپ کا استعماری نظام اور صنعتی تہذیب خوش آئند نہ تھے۔ ان کا دوٹوک نظریہ تھا کہ مشرق تو مغرب کے ہاتھوں مر رہا ہے، لیکن یورپ بھی اپنے ہاتھوں پنپ نہیں سکتا بلکہ اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر رہا ہے۔

علامہ اقبال کی سوچ کسی سیاست دان کی سوچ نہ تھی۔ وہ ایک مدبر کی طرح سوچتے تھے اور ان کے تجزیے ایک مفکر کے تجزیے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی مشترکہ جدوجہدِ آزادی کو مسلمانوں کے حسب حال نہ پاکر ان کے لیے الگ راستہ تجویز کیا۔ ان کا پیغام سارے ایشیا کے لیے تھا۔ لیکن اُن کا پہلا معمل ہندوستان تھا اور ان کے ابتدائی مخاطب اسی خطّہ کے مسلمان تھے۔ بالفاظ دیگر انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی معرفت ایشیائی مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ مسلمانوں کی شکست و ریخت کا پورا نقشہ ان کے سامنے تھا۔ وہ مسلمان ریاستوں کے وفاق سے پہلے تمام

مسلمانوں کی وحدت چاہتے تھے۔ان کے نزدیک کرۂ ارض کے مسلمانوں کا اسلامی وحدت میں ڈھلنا اس وقت تک ناممکن تھا جب تک ان کا داخلی وجود ان عوارض سے چھٹکارہ پا کر صحت یاب نہ ہو جو محمد عربی ﷺ کی امت میں کئی واسطوں سے مختلف رُوپ دھار کر پھیل چکے تھے۔

علامہ اقبالؒ کے مقالات اور ان سے متعلق بعض سوالات کی تصریحات اتنی جامع تھیں کہ امتِ قادیاں کے پاؤں تلے کی زمیں نکل گئی اور وہ آئیں بائیں شائیں پر آ گئی۔علامہ اقبالؒ مسلمانوں کی محبوب متاع تھے،ان کا ہر جگہ احترام کیا جاتا حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی شدید سیاسی فاصلے کے باوجود ان کا احترام کرتے اور انھیں ہندوستان و ایشیا کی ذہنی بیداری کے سرفہرست زعماء میں گردانتے تھے۔پنڈت جی کی مشہور کتاب تلاشِ ہند(Discovery of india)سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے...... پنڈت جی علامہ اقبالؒ سے خط و کتابت کرتے اور علامہ انھیں جواب لکھتے۔پنڈت جی لاہور آتے تو اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود علامہ سے ضرور ملتے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان سے مبادلہ افکار کرتے۔علامہ اقبالؒ کی جامع تصریحات کے بعد پنڈت جی قلم انداز ہو گئے،بالفاظ دیگر اعتراف فرما لیا کہ علامہؒ نے جو کچھ لکھا،وہ درست ہے۔ غرض محولہ مقالہ اسلام اور قادیانیت کے مسئلہ میں حرفِ آخر تھا۔

مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے والد مرزا قادیانی کی پیروی میں علامہ کے خلاف رطب و یابس اختیار کیا اور قادیانی امت کے بعض منچلوں نے مختلف اخباروں کی خرید و فروخت سے علامہ سے متعلق ژاژ خائی شروع کی،لیکن علامہؒ نے انھیں معذور سمجھا،ژاژ خائی کو نظر انداز کیا اور اپنے متبعین و مخلصین کو اس مسئلہ میں تو تکار سے روک دیا۔علامہؒ کے خلاف لاف گزاف کی خاطر مرزائی روپیہ کلکتہ سے لاہور تک گردش کرتا رہا لیکن ایک آدھ گمنام پرچے کے سوا علامہؒ کے خلاف کسی مسلمان جریدے سے وہ کچھ لکھوا نہ پائے۔اس مسلمان جریدے نے بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھا،لیکن کچھ عرصہ بعد اس جریدے کے مالک و مدیر نے مرزائی اُمت کے خلاف ایک مبسوط کتاب لکھی کہ اس امت کا ڈھانچہ کن مقاصدِ مشئومہ کے تحت قائم ہوا ہے۔

مرزا بشیر الدین محمود نے 18 جولائی 1935ء کے ''الفضل'' میں علامہ اقبالؒ کے جواب میں مقالہ تحریر کیا جو محض رطب و یابس تھا،پھر اس کو ٹریکٹ کی شکل میں چھاپ کر ملک بھر میں تقسیم کیا گیا۔مرزا صاحب نے لکھا کہ:

''احمدی سر محمد اقبال اوران کے ہمنواؤں کو روحانی بیمار قرار دے کر انھیں اپنے علاج کی طرف توجہ دلاتے ہیں اوران کے ایمان کی کمزوریوں کوان پر ظاہر کرتے ہیں۔'' (تاریخ احمدیت جلد ہشتم صفحہ 190)

علامہ اقبالؒ سے خلیفۂ ثانی (مرزا بشیرالدین محمود) کے بغض اور کد کا یہ حال تھا کہ اُس نے اپنی جماعت کو پنڈت جواہر لال نہرو کی لاہور میں آمد پر شاندار استقبال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ 31 مئی 1936ء کے الفضل میں استقبال کی روداد درج ہے۔اخبار کی شہ سرخی ہے:

''فخرِ وطن پنڈت جواہر لال کا لاہور میں شاندار استقبال۔''

رپورٹ الفضل کے خاص رپورٹر کی ہے۔استقبال 29 اپریل کو کیا گیا۔رپورٹ میں درج ہے (اسی کے الفاظ) کہ

1- استقبال کے لیے قادیان سے تین سو اور سیالکوٹ سے دوسو کے قریب والنٹیر ز لاہور پہنچے۔انھیں احمدیہ ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا، جہاں شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے ایک مختصر، برمحل اور برجستہ تقریر میں بتایا کہ آج ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں کہ آزادیِ وطن کی خواہش میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

2- پنڈت جی کے استقبال کو صبح چھ بجے باوردی والنٹیرز باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔استقبال کا تمام انتظام کور ہی کر رہی تھی۔ یہ نظارہ حد درجہ جاذبِ توجہ اور رُوح پرور تھا۔ پلیٹ فارم پر جناب چودھری اسد اللہ خاں (قادیانی) بیرسٹر نفس نفیس موجود تھے۔شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ نے پنڈت جی کی آمد پر ان کے گلے میں کور کی طرف سے ہار ڈالے،اس کور کے پاس جھنڈیوں پر حسبِ ذیل ماٹو خوبصورتی سے آویزاں تھے:

1- Beloved of the Nation welcome you.

قوم کے محبوب ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

2- We Join in Civil Liberties Union.

ہم سول لبر یٹز میں شامل ہوتے ہیں۔

3- Long Live Jwahar Lal.

جواہر لال زندہ باد!

(الفضل 31 مئی 1936ء)

مرزا بشیر الدین محمود نے جمعہ کے خطبہ میں اس استقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے ان مضامین کا رد لکھا جو انھوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گزشتہ رویہ کے خلاف ہے، تو ایسے شخص کا استقبال بہت اچھی بات ہے۔''

(الفضل جلد 23 نمبر 287 مورخہ 11 جون 1936ء)

ایک سال بعد دوبارہ پنڈت جواہر لال نہرو 1937ء میں لاہور آئے تو ریلوے سٹیشن سے سیدھا اپنی قیام گاہ لاجپت رائے بھون چلے گئے۔ وہاں مولانا ظفر علی خاں کو بلوایا، راقم ساتھ تھا۔ پنڈت جی نے مولانا سے کہا کہ انھیں پار سال جون میں اقبالؒ کا خط ملا تھا، وہ علامہؒ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے کہا میں ابھی انھیں کہلواتا اور جواب پہنچاتا ہوں۔ مولانا وہاں سے سیدھا علامہؒ کے ہاں گئے۔ علامہؒ نے کہا، پنڈت جی ہر لحظہ تشریف لا سکتے ہیں۔ مولانا نے پنڈت جی کے پاس راقم کو بھیجا ہے۔ اس کے گھنٹہ بعد پنڈت جی علامہ کے ہاں چلے گئے اور وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تخلیہ میں ملاقات کی۔ علامہؒ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پنڈت جی سنا پار سال قادیانی آپ کے استقبال کو آئے تھے اور اب کی دفعہ غائب رہے ہیں۔''

پنڈت جی نے کھلکھلاتے ہوئے کہا:

''تب آپ سے جو بغض پیدا ہوا تھا، وہ انھیں وہاں لے آیا تھا۔ دراصل وہ میری آڑ لے کر آپ کو بتانے آئے تھے کہ ہم بھی ہیں۔''

علامہؒ نے فرمایا:

''مرزا محمود نے اس طرح دہلی سرکار کو ٹنڈر داخل کیا تھا کہ مجھے مناؤ، میں روٹھ گیا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔''

علامہؒ کا وہ خط حسب ذیل ہے جو آپ نے 21 جون 1936ء کو پنڈت جی کے نام لکھا، اور اب A Bunch of Old Letters مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو کے صفحہ

181ء پر درج ہے۔ اس کے علاوہ سیّد عبدالواحد معینی نے بھی Thoughts and Reflections of Iqbal میں نقل کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کا خط (ترجمہ)

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام

لاہور 21 جون 1936ء

مائی ڈیئر پنڈت جواہر لال!

نامۂ گرامی کل ہی ملا، بہت بہت شکریہ۔ جب میں نے آپ کے مقالوں کا جواب لکھا تو مجھے یقین تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے سے متعلق کوئی علم نہیں۔ بلاشبہ یہ جواب لکھنے کا اہم سبب یہ تھا کہ میں بالخصوص آپ پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی وفاداری کا اصل سرچشمہ کیا ہے اور احمدیت میں کس طرح اس کو نیا رنگ دیا گیا ہے۔ میرے مقالات کی اشاعت کے بعد، یہ جان کر مجھے انتہائی تعجب ہوا کہ تعلیم یافتہ مسلمان بھی ان تاریخی وجوہ سے ناآشنا ہیں جو احمدیت کی تعلیمات کو متشکل کرنے کا باعث ہوئیں۔ مزید برآں پنجاب اور دوسرے علاقوں میں آپ کے مداح مسلمانوں میں آپ کے مقالات پر اضطراب پیدا ہوگیا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ آپ کی ہمدردیاں احمدیہ تحریک کے ساتھ ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کے مقالات پر احمدی بہت مسرور ہیں، اور آپ کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی زیادہ تر ذمہ داری احمدیہ پریس پر ہے، تاہم مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے متعلق میرے تاثرات غلط تھے۔ میں بھی ذاتی طور پر علم الکلام سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا، لیکن اس مذاکرہ میں محض اس لیے الجھا ہوں کہ احمدیوں سے انھیں کی پیچ پر مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہندوستان کے لیے بہترین خواہشات کا مظہر ہے۔ میرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

معذرت خواہ ہوں کہ لاہور میں آپ سے ملاقات نہ کرسکا۔ میں ان دنوں شدید بیمار تھا اور اپنے کمرہ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ پچھلے دو سال سے میں مسلسل علالت کی وجہ سے عملاً ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ براہِ کرم مطلع فرمایئے کہ آپ پنجاب دوبارہ کب آ رہے ہیں؟ کیا آپ کو میرا وہ خط مل گیا ہے جو میں نے شہری آزادیوں سے متعلق آپ کی مجوزہ یونین

کے بارے میں لکھا ہے؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کا ذکر نہیں کیا، اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ شاید آپ تک نہیں پہنچا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

ملفوظاتِ اقبالؒ کے مضمرات

ہندوستان میں برطانوی عملداری نے اپنی تعلیم وطاقت سے مسلمانوں کی دینی عصبیت کو معطل کر دیا تھا۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ضرور تھا جو دین کی تڑپ رکھتا تھا اوران کی اکثریت جہاد باللسان سے دستبردار نہ ہوئی تھی لیکن جو لوگ حکومت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعاون کر رہے تھے، وہ دین کے ان امور میں ہمیشہ غیر جانبدار رہتے، جو انگریزوں کی منشا کے اُلٹ ہوتے۔ مثلاً ہندوستانی مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ اعتقادات وعبادات میں سچا ہونے کے باوصف ان معاملات میں حکومت کی ناراضی کا خطرہ کبھی مول نہ لیتا، بلکہ اپنی پسپائی کا جواز پیدا کر لیتا، جن معاملات میں انگریزی حکومت کی منشا مختلف ہوتی۔ گو ان واقعات کی ایک طویل فہرست ہے لیکن پہلی جنگِ عظیم میں مسلمان ریاستوں پر جو بیتی اور دوسری جنگ عظیم میں مسلمان ممالک کا جو حال رہا، ہندوستانی مسلمانوں کا سرکاری عنصر اعتقادات میں استغراق وانہماک اور عبادات میں خضوع وخشوع کے باوجود حکومت کے اشارۂ ابرو کی متابعت فرض گردانتا تھا۔ پھر یہ حالت صرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ ہی کی نہ تھی بلکہ دانشمندانِ دین میں بھی شروع سے آخر تک اس قسم کے لوگ پیدا ہوتے رہے جن کے متعلق اقبالؒ کو کہنا پڑا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے مسلمان ہے آزاد

ان دانشمندانِ دین میں صرف افراد ہی نہ تھے بلکہ بعض فرقے پیدا ہو چکے تھے اوران کا ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت پر قوی اثر تھا۔ مسلمان عوام سیاسی مسائل کی جدوجہد میں ہندوؤں کے مدمقابل سخت قسم کے مسلمان تھے لیکن انگریزوں کے مقابلہ میں مردم شماری ہی کے مسلمان تھے۔ انھیں انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر کسی مسلمان ملک پر چڑھائی کرنے میں کوئی

عار نہ تھا۔ ان کے پیرانھیں جنگ کے زمانہ میں تعویذ دیتے تھے کہ وہ بازو پہ باندھ کر یا گلے میں پہن کر لڑیں گے تو کوئی ملک بھی انھیں شکست نہ دے سکے گا۔ جب ترکوں سے پنجابی مسلمان نبرد آزما ہوئے تو یہی تعویذ ان کے ''پشتیبان'' تھے۔

ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے بعد مسلمانوں کی تاریخ یہ ہوگئی تھی کہ وہ کفرِ مغلوب سے لڑتے اور کفرِ غالب سے دبتے بلکہ اس سے تعاون کرتے تھے۔ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس نے مسلمانوں کے حقوق سے اعراض و اغماض کیا، لہٰذا وہ کافرانہ ادارہ تھا۔ اس کے گاندھی و نہرو تو ''کافر'' تھے۔ لیکن ابوالکلامؒ اور حسین احمدؒ بھی کافر تھے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے مل جل کے آزادیٔ ہندوستان کی جدوجہد میں شرکت کی دعوت دیتے تھے لیکن مرزا غلام احمد کی امت سے انھیں کوئی تعرض نہ تھا۔ مرزا صاحب نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا، جو انھیں نہ مانے، اسے کافر کہا اور اس طرح سوادِ اعظم کو دائرہ اسلام سے خارج کر ڈالا۔ ان کے جانشینوں نے ان دعاوی میں اتنی شدت پیدا کی کہ محمد عربی ﷺ کی امت کو دوزخ کا ایندھن قرار دیا اور جہاد کی تنسیخ فرما کر مرزا غلام احمد کے نہ ماننے والوں کو فاحشہ عورتوں کی اولاد کہا، لیکن اس ارتداد کے خلاف مسلمانوں کی انگریزی خواندہ سیادت کا جم غفیر چپ رہا، کیا اس لیے کہ انگریزی حکومت کی ناراضی کا خطرہ تھا یا وہ مرزا غلام احمد کے دعاوی سے نابلد تھے۔

علما نے اپنے دوائر کے مطابق مرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کی چھتاڑ کی اور دین کے محاذ پر ڈٹ کے مقابلہ کیا، پھر جب قادیانی بے نقاب ہو گئے اور اس خطرہ کو فعال علما نے محسوس کیا، تو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقا کی بدولت مرزائیت کے پھیلاؤ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ قادیانی امت کا تبلیغی محاذ سونا پڑ گیا...... المختصر علامہ اقبالؒ کے احتساب سے پہلے مذہب کی حیثیت سے قادیانی تحریک رُک چکی تھی۔ علامہ قبالؒ کے محولہ بیانوں نے مرزائیت کو سیاسی ہندوستان میں (قبل از آزادی) بے نقاب کیا اور ان کے باطنی مفہوم سے پردہ اٹھایا۔ علامہ کے محولہ ارشادات قادیانی امت کے سر پہ ضربِ کاری تھے۔ علامہ نے اس غرض سے ان علماوفضلا سے قادیانی مسئلہ کی چھان پھٹک کی اور ختم نبوت کے مفہوم سے آگاہ ہوئے جن سے وہ مختلف دینی مسائل میں استفسار کرتے اور مشورہ چاہتے تھے۔ انھوں نے حضرت علامہ انور شاہؒ، حضرت پیر مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ اور علامہ سیّد سلیمان ندوی قدس سرہ العزیز سے خط و کتابت

کی۔ جب ختم نبوت کا مسئلہ ان کے فہم وفکر میں رچ بس گیا تو پھر اس مسئلہ کے علمی وعمرانی اور سیاسی وقومی مضمرات پر نہایت شرح وبسط سے روشنی ڈالی کہ یہی اسلوب واستدلال تھا جو قادیانی تحریک کے مالہ وماعلیہ کو ان دماغوں میں اُتار سکتا تھا جن کے نزدیک کسی وجہ سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا، اگر مسئلہ تھا تو ملائیت کا جھمیلا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے سرایمرسن گورنر پنجاب کی تقریر کے فوراً بعد قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دینے اور ایک علیحدہ اقلیت بنانے کا مطالبہ کیا تو وہ کوئی مذہبی مجادلے کے خطوط نہ تھے بلکہ قادیانی تحریک کے مضمرات کا جواب تھا۔ پنڈت نہرو نے قادیانی امت کا دفاع کیا تو علامہ اقبالؒ کا جواب علمی، تاریخی، عمرانی اور معاشرتی بنیادوں پر تھا۔ آخری مقالے کے بین السطور کا سیاسی خول پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی شخصیت کا جواب تھا۔

یہ چیز تو حضرت علامہؒ نے شروع ہی میں صاف کر دی کہ وہ کسی مذہبی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ کا مطالبہ انگریزی حکومت سے تھا اور حکومت سے مذہبی بحث کا سوال ہی نہ تھا اور نہ علامہؒ قادیانی امت سے مخاطب تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ علما قادیانی نبوت کو دینی محاذ پر شکست دے چکے ہیں۔

علامہؒ نے فرمایا کہ وہ قادیانی تحریک کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ بھی نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔ علامہ اس وقت سے بہت پہلے رحلت فرما گئے۔ پاکستان علامہ کے تصور کی اساس پر تھا، لیکن اس نے مرزائیت کو اس طرح پناہ دی کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا جو مطالبہ اقبالؒ نے انگریزی حکومت سے کیا تھا، وہ پاکستان میں متروک ہو گیا۔ مرزا غلام احمد کے نفسیاتی تجزیے کا وقت پاکستان میں تھا، لیکن اقبالئین نے اقبالؒ کا نفسیاتی تجزیہ کیا اور جو اقبالؒ کے موضوع تھے، ان سے روگردانی کی۔ ضروری تھا کہ علامہ اقبالؒ کے افکار کی بنیادیں تلاش کی جاتیں اور ان اصطلاحات کے ماخذ ڈھونڈے جاتے جو قرآن وسیرت کے علاوہ عجمی فضا میں ایجاد ہوئی تھیں، لیکن لغو چیزوں کے تحقیقی انبار لگتے رہے اور جو چیزیں اساسی تھیں، وہ اقبالئین کی تحقیق سے خارج ہو گئیں اور یہ افکارِ اقبالؒ سے متعلق خیانتِ مجرمانہ کا ارتکاب تھا۔ ممکن ہے وہ ان کے فہم سے قاصر ہوں یا ان موضوعات پر انھیں دستگاہ نہ ہو، لیکن بروز، حلول اور ظل وغیرہ اصطلاحات کے ماخذ ڈھونڈنا مشکل نہ تھا۔ علامہؒ نے لکھا ہے کہ مسیحِ

موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں، اجنبی ہے، لیکن اقبالؒ کے محققوں میں کسی نے اِدھر توجہ ہی نہ کی۔ وہ دین کا سوال ہو تو اقبالؒ کی سیاست دیکھتے اور سیاست کا مسئلہ ہو تو ان کی شاعری میں جھانکتے ہیں اور یہ ایک دلچسپ گریز ہے۔

ختم نبوت کے مضمرات پر کسی اقبالی مصنف نے قلم نہیں اُٹھایا، حالانکہ مسلمانوں کی وحدت ختم نبوت کے بغیر قائم نہیں رہتی۔ علامہؒ نے تشکیل جدید الٰہیات میں لکھا ہے کہ:

''اسلام بحثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن بحثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم ﷺ کی شخصیت نے اٹھایا ہے۔''

ایک دوسری جگہ لکھا ہے:

''دین خدا سے آتا ہے لیکن ملت کی تشکیل پیغمبر کرتے ہیں۔''

وطن سے بغاوت جرم ہے، حکومت سے بغاوت جرم ہے لیکن نبوت سے بغاوت جرم نہیں؟ جب کہ اس سے ایک قوم کی وحدت استوار ہوتی اور اسی وحدت پر وطن کا مدار اور حکومت کا استحکام ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مطالبہ کا لب لباب کیا ہے کہ مرزائی مسلمانوں سے الگ ہو جائیں۔ انھیں اعتراض تھا تو ان کے مسلمانوں میں رہنے پر، اور دوسرا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔

اقبالیین کا فرض تھا کہ وہ انگریزی ہندوستان میں جہاد کی منسوخی کے متعلق تحقیق فرماتے کہ اس تحریک کا آغاز کب ہوا اور کن کن عناصر نے اس میں حصہ لیا۔ مرزا غلام احمد نے کب اور کیونکر ربانی سند مہیا کی۔ پنجاب ہی اس غرض سے کیوں منتخب کیا گیا۔ اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی سیاسیات کا میلان ورجحان کیا تھا، لیکن قلمکارانِ اقبال اس باب میں آج تک مُہر بلب ہیں۔ علامہؒ نے پنڈت جی کے جواب میں فرمایا (تلخیصات) کہ:

ہندوستان میں **1799**ء سے دینیات کی جو تاریخ رہی ہے، اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اسی سال سلطان ٹیپو کو شکست ہوئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اپنے ہمراہ کئی سوالات لائی تھی اور یہ سوالات برطانوی شہنشائیت کے استحکام کی اساس تھے، مثلاً:

1- کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟
2- وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں، وہ ترکی خلافت سے کیونکر وابستہ رہ سکتے ہیں؟
3- ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام؟
4- اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟
5- قرآن کی رُو سے اُولی الامر سے مراد کیا ہے؟ کیا مسلمان یا ان کے علاوہ کوئی دوسرا حکمران بھی اس کا اہل ہے؟
6- امام مہدی کی حدیث کے معنوی اطلاق کی نوعیت کیا ہے؟

علامہ فرماتے ہیں کہ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے، وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر!

قلمکارانِ اقبالؒ نے اپنے طاقت ور قلم کو معطل رکھا بلکہ موقوف کر دیا اور جو موضوع فکرِ اقبال کے تذکرے میں منتخب کیے وہ کتابی تھے، جو کسی قوم کی تاریخ نہیں، تفریح ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق ادب برائے زندگی سے نہیں ہوتا بلکہ ادب برائے ادب سے ہوتا ہے۔

اقبالیین کی اس جماعت کا مقصود اقبال کے افکار نہیں، سوانح ہیں اور سوانح کا بھی وہ حصہ جس کا تعلق فکر سے نہیں ذکر سے ہے۔

افکارِ اقبال کے عناصر خمسہ

افکارِ اقبال نظم ونثر دونوں میں ہیں۔ نثر میں ان کے خطوط ہیں، مقالات ہیں، خطبات ہیں، بیانات ہیں اور بعض تقاریر ہیں۔ اسی طرح بعض تجویزیں اور ان کے خاکے ہیں۔ بلاشبہ علامہ اقبال کی شاعری کے مجموعے ہی ان کی عظمت کا طرۂ دستار ہیں، لیکن علامہ اقبالؒ کی نثریات ایک ایسا گنجِ شائگاں ہیں کہ ان سے افکارِ اقبال کے مربوط سلسلے آشکار ہوتے اور انسانی ذہن کو جلا ملتی ہے۔ نظم میں استدلال نہیں حسن ہوتا ہے اور وہ انسان کے جذبے کو متحرک کرتا ہے۔ نثر افکار کے انضباط کا نام ہے اور اس سے دماغ مطمئن ہوتے ہیں۔ مختصراً شاعری میں سچائی اور حسن اور نثر میں دلیل وصداقت کا دبدبہ کام کرتا ہے۔ اقبال نے جو کچھ نثر میں لکھا، وہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں کوئی سی چیز مبہم نہیں۔ شاعری میں تو ذوق کے مطابق معنوی راہیں مختلف ہوسکتی اور ہوتی ہیں لیکن نثر میں معنویت صراط مستقیم ہے۔ اقبالؒ نے قادیانیت پر جو کچھ کہا، وہ عمر بھر کی ارتقائی

بصیرت کا نچوڑ تھا لیکن یہی چیز پاکستان میں طاقِ نسیاں کا چراغ ہوگئی اور اس کا تذکرہ اقبالی ادب کے بازارِ عکاظ کی ضرورت ہوگیا۔

علامہ اقبالؒ کے مستند مجموعوں میں اشعار کی تعداد 12491 ہے۔ ان میں 94 شعر اور ایک مصرعہ مستعار ہیں۔ کلامِ اقبالؒ کے عناصرِ خمسہ ہیں:

1- خودی۔
2- مشرق کی نشاۃِ ثانیہ۔
3- توحید و رسالت کی اساس پر اسلام سے غیر متزلزل وابستگی۔
4- مغرب پر تنقید۔
5- عشق کی پختگی عقل کی خام کاری۔

نظر بہ ظاہر یہ پانچوں الگ الگ موضوع ہیں لیکن تمام وادیاں قطع کرنے کے بعد ان کی یکجائی ہی سے اقبال کا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

خودی کا مطلب ہے احساسِ نفس، معرفتِ حق اور تعینِ ذات۔ علامہ فرماتے ہیں ''خودی کا عرفان قرآن کے سوا اور کہیں نہیں۔ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی...... حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔''

مشرق پیغمبروں کی سرزمین ہے۔ تمام مذاہب کے سوتے مشرق سے پھوٹے، لیکن مشرق مغلوب ہوگیا اور مغرب مقتدر، مشرق کی نشاۃِ ثانیہ ہی سے کرۂ ارض کا انسانی اضطراب رفع ہوسکتا ہے۔ اسلام عالمِ انسانی کے لیے ضابطۂ حیات ہے، بشرطیکہ توحید و رسالت کے تصور میں کوئی سا خلل نہ ہو۔ مغرب پر تنقید کا مطلب ہے، سائنس اور فلسفہ کی ناتمامیوں سے اجتناب، مادی تصورات سے قطعِ تعلق اور قرآنی عدل وقسط کی فرمانروائی۔ عشق کی پختگی سے ایمان کی تکمیل ہوتی یعنی زوالِ شک ہوتا اور عقل کی خامکاری کا عقیدہ انسان کے دماغ کو یمین و یسار کے تذبذب سے روکتا اور آخرت کا سبق دیتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ ہی میں اوامر و نواہی انسان کی اپنی خواہش بن جاتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک مسلمان نظریاتی اعتبار سے ایک ایسے وفاق کے شہری ہیں جو مختلف

ملکوں کی مسلمان اقوام کو اسلامی معاشرہ مہیا کرتا اور انھیں دینی وحدت کی لڑی میں پرو کر بالآخر انسانی وحدت کی طرف لے جاتا ہے۔

مرزا غلام احمد کا وجود اس کی نفی پر تھا۔ ان کا پیدا ہونا مسلمانوں کے زوال کا آغاز تھا۔ آج ان کی موت کو بھی تقریباً ستر برس ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کا زوال دار باز ٹلا نہیں بڑھا ہے۔ پیغمبر ملتوں کے احیا و استحکام کے لیے آتے ہیں نہ کہ زوال دار باز کے لیے۔ مرزا صاحب اور ان کے جانشین مسلمانوں کی شکست و ریخت پر خوشیاں مناتے اور چراغاں کرتے رہے۔ ان کے فرزند مرزا محمود احمد (خلیفہ ثانی) کے الفاظ میں یہ سب اس لیے تھا کہ مسلمانوں نے مرزا صاحب کو تسلیم نہیں کیا تو کیا عیسائیوں، یہودیوں اور بعض دوسری مشرک قوموں نے انھیں نبی تسلیم کر لیا تھا کہ محمد ﷺ کے غلاموں پر انھیں فتح و کامرانی حاصل ہوتی گئی۔ کسی نبی نے غلامی پر فخر نہیں کیا لیکن مرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں نے برطانوی گورنمنٹ کو اپنے لیے خدا کی نعمت اور انگریزوں کو محسنِ اعظم کہا۔ خدا کے پیغمبر اپنی ملتوں کے اقبال و عروج اور فلاح و بہبود پر فخر کرتے ہیں لیکن مرزا صاحب کا سرمایۂ تفاخر یہ تھا کہ ''میں نے برطانوی حکومت کی طاعت و حمایت میں تنسیخِ جہاد کی غرض سے اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ ان سے پچاس الماریاں بھر سکتی ہیں۔''

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''قادیانیت'' کے آخری باب میں ''قادیانیت نے عالمِ اسلام کو کیا عطا کیا'' کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ:

''مرزا صاحب نے اسلام کے علمی و دینی ذخیرہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا جس کے لیے اصلاح و تجدید کی تاریخ ان کی معترف اور مسلمانوں کی نسلِ جدید ان کی شکر گزار ہو۔ ان کی جدوجہد کا تمام تر میدان مسلمانوں کے اندر رہے اور اس کا نتیجہ صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری مذہبی کشمکش ہے جو اس نے اسلامی معاشرے میں پیدا کی۔ اگر ہندوستان میں وہ ذہنی انتشار نہ ہوتا جس کا پنجاب خاص میدان تھا اور اسلامی ذہن ماؤف نہ ہو چکا ہوتا تو قادیانی تحریک اتنی مدت باقی نہ رہ سکتی لیکن اسلام کی دعوت سے انحراف اور اس ملک کے مخلصین و مجاہدین کی ناقدری کی سزا خدا نے یہ دی کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ایک ذہنی طاعون مسلط کر دیا اور ایک ایسے شخص کو ان کے درمیان کھڑا کر دیا جو امت میں فساد کا مستقل بیج بو گیا ہے۔'' (تلخیصات)

قادیانیت پاکستان میں

قادیانی پاکستان میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ وہ اگر پاکستان میں آنا چاہتے تو ریڈکلف باؤنڈری کمیشن کو قادیان کے الگ ریاست بنانے کی یادداشت پیش نہ کرتے بلکہ گورداسپور کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے ساعی ہوتے، لیکن چودھری سر ظفر اللہ خاں نے مسلم لیگ کی وکالت کے باوجود (اور ہم اس میں ہار گئے) قادیان سے متعلق علیحدہ مقدمہ پیش کیا اور مسلمانوں سے الگ امت کی بنا پر مطالبہ کیا کہ ان کے لیے قادیان پاکستان سے الگ ایک مقدس شہر کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ وہ ان کے نبی کا مولد، مسکن اور مرقد ہے۔

کیا یہ پاکستان سے مرزائی امت کا اخلاص تھا؟ ہمارے سامنے ایسا کوئی اعلان نہیں جس سے معلوم ہو کہ مرزائی امت کبھی لیگ میں شامل ہوئی ہو، ان کے خلیفہ نے لیگ میں شمول کا حکم دیا ہو، قائداعظمؒ کو...... قائداعظمؒ تسلیم کیا ہو یا مسلم لیگ کے لیے کسی عنوان سے کوئی چندہ دیا ہو۔ واقفانِ حال کا بیان ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود قائداعظم سے معاملہ کرنا چاہتے تھے لیکن قائداعظم نے ان سے کہا آپ مسلمانوں میں سے ہیں تو لیگ میں شامل ہو جائیں، کسی معاہدے یا شرط کا سوال ہی نہیں۔ بعض کوتاہ فکر فرماتے ہیں، قادیانی اُمت پاکستان سے متفق نہ ہوتی تو چودھری سر ظفر اللہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے وکیل کیوں ہوتے؟ یہ ایک بودا استدلال ہے۔ چودھری سر ظفر اللہ خان مسلمان کی حیثیت سے باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش نہیں کیے گئے بلکہ ایک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے قائداعظمؒ نے انھیں نامزد کیا تھا اور شاید قائدؒ کے ذہن میں یہ نقشہ تھا کہ مسئلہ قانون سے کہیں زیادہ سیاسی ہے۔ چونکہ ظفر اللہ خاں سرکارِ انگلشیہ کے فرزند دلبند ہیں، لہٰذا انھیں پیش کرنے سے ممکن ہے مثبت نتائج مرتب ہوں۔ قائداعظمؒ ان مسائل میں صرف قانون کو دیکھتے تھے۔ قائداعظمؒ کو شہید گنج کی مسجد کے مسئلہ میں وکالت کے لیے گزارش کی گئی تو آپ نے مقدمہ کی نوعیت کے پیش نظر ایک انگریز کا نام تجویز کیا اور اسے وکیل کیا گیا۔ المختصر ایک مسجد کے مسئلہ میں ایک انگریز وکیل تھا۔

اس طائفہ کی ایک اور دلیل ہے کہ مرزا غلام احمد کی حلقہ بگوشی کے باعث ظفر اللہ خاں نامسلمان ہوتے تو قائداعظمؒ انھیں پاکستان کی کابینہ میں نہ لیتے۔ اس کٹ حجتی کا علاج نہیں۔ قائداعظمؒ دینی پیشوا نہ تھے، وہ ہندوستان کی سیاسی جنگ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے قائد

تھے اور اپنے صوابدید کے مطابق پاکستان حاصل کیا۔ان کی زندگی وفا کرتی تو پاکستان اس طرح خوار نہ ہوتا جس طرح آج ابتلا و تذبذب کے نرغہ میں ہے، نہ مرزا بشیر الدین محمود کو اپنے اقتدار کی خفی خواہش کے اقتضاء پر سیاسی پھلجڑیاں چھوڑنے کا حوصلہ ہوتا اور نہ 1953ء میں مسلمانوں کے سینے ختم نبوت کی پاداش میں گولیوں سے چھلنی کیے جاتے۔ظفر اللہ خاں پاکستانی کابینہ میں جوگندر ناتھ منڈل کی طرح ایک وزیر تھے۔کیا منڈل مسلمان تھا؟ اگر پاکستانی کابینہ میں شمول کے باوجود وہ مسلمان نہیں تھا تو ظفر اللہ خاں کے وزیر ہو جانے سے ان کا اسلام کیونکر ثابت ہوتا ہے۔

قائداعظمؒ ایک سال ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ان کے جانشین لیاقت علی خاں تھے لیکن انھیں ایک شقی القلب کی گولی نے ابدی نیند سُلا دیا۔ظفر اللہ خاں، خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے زمانہ میں وزیر خارجہ تھے یا پھر محمد علی بوگرہ کی وزارت میں ٹکے رہے، تو یہ استعماری طاقتوں کا شعبدہ و منشاء تھا اور پاکستان اپنے سیاست دانوں کی بد عملیوں کے باعث ان کے ہاتھوں مجبور تھا۔ خواجہ ناظم الدین نے منیر انکوائری کمیشن کے روبرو اظہار کیا تھا کہ ظفر اللہ خاں کو سبکدوش کر کے ہم امریکہ سے گندم حاصل نہ کر سکتے تھے، ان دنوں پاکستان غذائی بحران سے گزر رہا تھا۔گویا ظفر اللہ خاں پاکستان کابینہ میں مسلمان ہونے کی وجہ سے نہ تھے۔قائداعظمؒ نے انھیں اپنی کابینہ میں لیا تھا تو محض اس لیے کہ انھیں برطانوی ہندوستان میں مرکزی حکومت کا طویل تجربہ تھا۔ان کے بعد وہ پاکستان میں استعماری ہدایت پر تھے۔مرزائی قیامِ پاکستان سے ناخوش تھے۔

5 اپریل 1947ء کو قادیانیوں کے ترجمان الفضل نے ایک بار پھر اپنا موقف ان الفاظ میں دہرایا:

- ''بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔''
- ''ہم نے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہی ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک پاکستان کا بننا اصولاً غلط ہے''۔

(خطبہ مرزا محمود احمد مندرجہ روزنامہ الفضل قادیان، 12-13 اپریل 1947ء)

- ''ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوئے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائے''۔

(تقریر مرزا محمود احمد خلیفہ قادیانی مندرجہ الفضل قادیان 16 مئی 1947ء)

❑ ''ممکن ہے کہ عارضی طور پر کچھ افتراق ہو اور کچھ وقت کے لیے دونوں قومیں (مسلم اور ہندو) الگ الگ رہیں مگر یہ حالت عارضی ہوگی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جلد دور ہو جائے۔ بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے''۔ (روزنامہ الفضل قادیان، 17 مئی 1947ء)

جسٹس منیر نے فسادات پنجاب کی تحقیقاتی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ احمدی پاکستان کو اپنے لیے منتخب نہ کرتے...... ان کا خلیفہ ثانی 1922ء ہی میں اعلان کر چکا تھا کہ:

❑ ''ہم احمدی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔'' (الفضل 14 فروری 1922)

لیکن مرزائی پاکستان میں استعماری گماشتہ کی حیثیت سے وارد ہوئے۔ انھیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں وہ استعماری جاسوس کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے اور نہ انھیں کسی مرحلے میں کوئی مقام حاصل ہوسکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ رحلت کر چکے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں آغوشِ لحد سے قریب تھے۔ مرزا بشیر الدین محمود کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کی سیاسی مزاحمت کے باعث فعال علما پٹ چکے ہیں اور احرار مسلم لیگ کی مخالفت کے باعث مسلمانوں کے مغضوب و معتوب ہو چکے ہیں۔ ان کے لیے حکومت میں کوئی سی جگہ نہیں اور نہ ان کی سرکاری دوائر میں کوئی آواز ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے قائد اعظمؒ کی وفات کو قادیانی امت کے لیے نیک فال جانا۔ جب لیاقت علی خاں شہید ہو گئے تو پاکستان کا سیاسی میدان ان کے لیے زیادہ صاف تھا۔ ان کا پہلا شبخون محاربۂ کشمیر میں فرقان بٹالین تھا۔ سر ڈگلس گریسی اس کے سرپرست تھے۔ مرزا بشیر الدین نے مسٹر ڈی وائی فل (پولیٹیکل ایجنٹ کوئٹہ) اور مسٹر جیفرے ایجنٹ جنرل بلوچستان سے پخت و پز کے بعد بلوچستان کو استعماری مقاصد کے لیے مرزائی صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ ان کا یہ خطبہ 4 اگست 1948ء کے الفضل میں درج ہے اور جسٹس منیر کی انکوائری رپورٹ میں اس کا حوالہ آچکا ہے۔ اگر 1953ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک نہ چلتی اور اس کے ہمہ گیر اثرات مرتب نہ ہوتے تو مرزائی امت کا خواجہ ناظم الدین اور ملک غلام محمد کے زمانہ میں گل کھلانا مشکل نہ تھا، لیکن اس تحریک نے انھیں پیچھے کو دھکیل دیا اور انھیں اپنا طریق (Strategies) بدلنا پڑا۔ امریکہ و روس اپنے ذہن کے مطابق ہندوستان کو چین کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان نے عذر کیا کہ ان کے دو طرف شانے پر پاکستان بیٹھا ہے اور وہ اس کی پیٹھ میں خنجر کے مصداق ہے۔ پہلے اس کو ٹھیک کیا جائے پھر چین کے مسئلہ پر غور ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کے لیے پاکستان کا

مطلب مغربی پاکستان رہا ہے۔ اسی صوبہ کی عسکری طاقت پاکستان کی فوجی طاقت تھی، چنانچہ 1965ء کی جنگ عالمی استعمار نے مرزائیت کے بزرجمہروں کی معرفت پاکستان کے سر پر مڑھ دی۔ لیکن خدا کا فضل وکرم پاکستان کے شامل حال تھا۔ فوج کی جواں مردی اور حمیتِ دینی کام آئی، اس طرح پاکستان بچ گیا۔

عالمی استعمار اور ہندوستان کے لیے یہ ایک اور ذہنی شکست تھی۔ اس کے بعد پاکستان قادیانی امت اور بعض دوسرے سیاسی عناصر کی معرفت خارجی مداخلتوں کا محور ہو گیا...... اس کی تفصیلات بڑی ہی اندوہناک اور جانگداز ہیں اور یہ موضوع ان سے مختلف ہے۔ المختصر مرزائیت نے ایک خارجی تحریک کے طور پر اس طرح سر اُٹھایا کہ:

اوّلاً: اسرائیل کی ملی بھگت سے پاکستان کے اسلامی ذہن کو غارت کیا اور اس کے سرمائے سے ملک کی سیاسی زندگی کے شب وروز اُتھل پتھل کیے۔ پاکستان میں اسلام کے خلاف دورانِ انتخابات مرزائی، اسرائیلی سرمائے سے تخریبی عناصر کی معاونت کرتے رہے اور اپنے حسبِ منشا ذہنی مزاج کے نتائج پیدا کیے۔

ثانیاً: مشرقی پاکستان الگ کرانے کی سازش بہ لطائف الحیل کاشت کی اور اس کی مختلف واسطوں سے آبیاری کرتے رہے۔ ایم ایم احمد نے مالیاتی اعتبار سے مشرقی پاکستان کو برہم کیا جس سے علیحدگی کا ذہن بھڑک اُٹھا اور منظّم ہو گیا۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کا فوجی عمل مرزائیت کی ہولناک منصوبہ بندی کے تحت ایک المیہ تھا۔ پنجاب کی عسکری روایات ٹوٹ گئیں اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش ہو کر الگ ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کی موجودگی میں مرزائیت کے لیے مغربی پاکستان میں پنپنا ناممکن تھا۔

ثالثاً: اب مغربی پاکستان مرزائیت کے بین الاقوامی مہروں چودھری ظفر اللہ خاں، مسٹر ایم ایم احمد اور ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ کی معرفت استعمار کے تقسیمی منصوبوں کی جولاں گاہ ہے اور پاکستان میں ربوہ کا مرکز ان منصوبوں کا سر دفتر ہے۔ منصوبے کیا ہیں؟ مغربی پاکستان کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنا اور انھیں خود مختاری کا فریب دے کر نظریاتی واستعماری تحویل میں رکھنا، جس طرح یورپ میں بلقان کی ریاستیں تقسیم کی گئیں اور پہلی جنگ عظیم میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کو پچھاڑ کر جزیرۃ العرب کی بندر بانٹ کی گئی۔ اسی طرح عالمی استعمار مغربی پاکستان

کو پختونستان، بلوچستان، سندھودیش اور پنجاب کی علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں بانٹنا چاہتا اور کراچی کو ہانگ کانگ کی طرح مسلمانوں کی ایک خاص جماعت کے حوالے کر کے ایک آزاد بندرگاہ بنانا چاہتا ہے اور یہ ابوظہبی، کویت، قطر، مسقط وغیرہ کے طرز کی الگ الگ ریاستیں بنا دینے کا منصوبہ ہے...... پاکستان میں قادیانی اُمت اس مقصد کے لیے سرگرم جہد ہے اور وہ پاکستان کی مختلف سیاسی تنظیموں میں اشتراک وتعاون یا مفاہمت و میثاق کی ہر فضا کو سبوتاژ کر رہی ہے۔ مرزائیت نے پاکستان میں مالیات کے مختلف شعبوں کو تصرف میں لانے اور عسکریات میں اپنی طاقت بڑھانے کے منصوبے کو بال و پر دے کر ملک سے باہر افریشیائی ریاستوں میں اسرائیل کے لیے عربوں کی جاسوسی اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ان خدمات ہی کے صلہ میں استعماری منصوبے کے مطابق پنجاب کی ریاست سکھوں کو ملا کر انھیں عطا کرنے کا استعماری فیصلہ ہو چکا ہے۔ جس طرح شریفِ مکہ نے ترکوں سے غداری کی اور برطانیہ کا آلہ کار ہو کر حجاز حاصل کیا تھا اسی طرح مرزا ناصر احمد پاکستان سے غداری کر رہا اور استعمار کا آلہ کار ہو کر پنجاب پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے۔

پاکستانی مسلمانوں کی غفلت

پاکستان اقبالؒ کی عبقریت کا نام ہے۔ اقبالؒ کو پاکستان سے حذف کر دیں تو پاکستان ایک بغیر دماغ ڈھانچہ رہ جاتا ہے...... نپولین نے کہا تھا، فرانس کا انقلاب کیا ہے، روسو! وکٹر ہیوگو نے کہا تھا کہ والٹیئر اور اس کی روح کو سمجھنا اٹھارویں صدی کی روح کو سمجھ لینا ہے۔ روس و چین کے انقلابی معمار بلاشبہ لینن و ماؤزے ہیں لیکن ان کے فلسفہ کی روح مارکس ہے۔ پاکستان کے تصوراتی معمار اقبال تھے، لیکن ملکی سیاست دانوں اور قومی دانشوروں نے فکر اقبالؒ سے غداری کی ہے۔ وہ اپنے سیاسی استحکام یا شخصی مقام کے لیے تو اقبال کو بڑھ بڑھ کے پیش کرتے ہیں لیکن اقبالؒ جو چاہتے اور جن بنیادوں سے ان کے افکار متجلی ہوتے تھے، ان دانشوروں اور سیاست دانوں نے ان کو لپیٹ کے رکھ دیا اور ان کا تذکرہ بعض حالتوں میں جرم قرار دیا۔ وہ اقبالؒ کے گلے میں اپنی آواز ڈال کر اقبال کو پیش کرتے ہیں اور افکارِ اقبال کی اصل روح کو ہلاک کرنے سے شرماتے تک نہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے پہلے ایک کتابچہ ''مُلّا اور اقبال'' پھر ''فکرِ اقبال'' ایسی ضخیم کتاب لکھ کر اس خیانت مجرمانہ کا ارتکاب کیا۔ جن بنیادوں پر افکارِ اقبال کا مدار تھا، ان کی تغلیط کی اور جن کا ان کے ہاں ذکر تک نہ تھا، انھیں افکارِ اقبال کا موضوع بنایا۔

علامہ اقبالؒ نے تشکیلِ جدید الٰہیات کے پانچویں خطبہ میں ختم نبوت کے تصور پر بحث کی اور مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کا لازمہ قرار دیا ہے کہ اس تصور میں کوئی سا خلل پیدا ہو تو وحدتِ اسلامی ہی باقی نہیں رہتی۔ علامہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں لکھا کہ محمد ﷺ کے بعد کسی شخص کے ملہم ہونے کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ جو شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام کا غدار ہے۔ مسٹر محمود نظامی نے بعض حلقہ نشینانِ اقبال کے مختلف مقالات پر مشتمل 1938ء میں ''ملفوظات'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ جناب محمد حسن عرشی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

علامہؒ نے فرمایا:

''قادیانی فرقہ کا وجود عالم اسلامی، عقائدِ اسلام، شرافتِ انبیا، خاتمیت محمد ﷺ اور کاملیت قرآن کے لیے قطعاً مضر و منافی ہے۔''

علامہ نے پروفیسر الیاس برنی کو ایک خط میں لکھا تھا:

''بروز کا مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ میری رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہے۔''

لیکن اقبالئین نے جنھیں اپنے فضلا و محقق ہونے پر ناز ہے، اقبالؒ کے یومِ ولادت کی تلاش میں کئی سال گزار دیے لیکن اقبال کا جو مشن تھا، اس سے فرار کیا۔

عبدالرشید طارق نے ملفوظات میں لکھا ہے ''علامہ موسیٰ جار اللہ نے حضرت علامہ سے اس مصرعہ کی وضاحت چاہی۔

آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد

فرمایا:

بہا اللہ ایرانی اور غلام احمد قادیانی۔

جناب خضر تمیمی اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے فرمایا:

''قادیانیت اسلام کی سیزدہ صد سالہ علمی و دینی ترقی کے منافی ہے۔'' (ملفوظات)

خضر تمیمی راوی ہیں:

''علامہ کا ارشاد تھا کہ **الیوم اکملت لکم دینکم** کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ قادیانی اسلاف کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں۔''

جناب بشیر احمد ڈار اقبال اکادمی کراچی کے اڈیٹر تھے۔ انھوں نے علامہ اقبالؒ کی تقاریظ، خطوط، مضامین اور کلام وغیرہ کے باقیات، انوارِ اقبالؒ کے نام سے مرتب کیے اور مارچ 1967ء میں وہ مجموعہ شائع کیا، اس کے صفحہ 45 پر علامہ اقبالؒ کے ایک خط کا فوٹوسٹیٹ ہے۔ علامہ نے مسئلہ ختم نبوت سے متعلق جو کہا، وہ کتابت کے صفحہ پر بھی ہے، لیکن جو علاج بتایا، وہ درج نہیں، البتہ فوٹوسٹیٹ (خط کا عکس) میں درج ہے، علامہؒ فرماتے ہیں:

''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزائے نبوت موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے، تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا۔''

جسٹس ایس اے رحمٰن سپریم کورٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد آج کل بزمِ اقبال لاہور کے سرخیل ہیں۔ ان کے علم و فضل میں کلام نہیں، لیکن مسئلہ ارتداد پر حال ہی میں آپ نے جو کتاب حوالۂ قلم کی، وہ علامہ اقبال کے اس نظریہ کی نفی کرتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بزمِ اقبال لاہور میں خصوصی شہرت کے فضلا اقبال کے بنیادی نظریات کی نفی کرتے اور اس کو افکارِ اقبال کی خدمت گزاری پر محمول کرتے ہیں۔

یورپی فکر کے محققین

اقبال کے شارحین و ناقدین و محققین کی وہ کھیپ جو علومِ مغربی سے بہرہ مند ہے، وہ علوم اسلامی اور معارفِ قرآنی سے نابلد ہونے کے باعث معذوری و کوتاہی کا شکار ہے۔ المختصر فہم اقبال سے قاصر ہے۔ علامہؒ نے علی گڑھ کے مشہور ادیب پروفیسر آل احمد سرور کو لکھا تھا:

''میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔''

لیکن جن لوگوں نے پاکستان میں سرکاری اکادمیوں سے حصول زر کے لیے اقبال پر قلم اُٹھایا ہے یا جو لوگ علم کے جدید و قدیم سے آشنا نہیں اور آشنا ہیں تو یک طرفہ جدید کے یا قدیم کے، ان سے متعلق ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے فیضانِ اقبال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

''فکرِ اقبال سر پیٹ رہا ہے کہ مجھے ان اکادمیوں اور مدرسوں سے بچاؤ جن میں میری روح ذبح کی جا رہی ہے۔ افسوس کہ یہ لوگ جو کچھ میرے بارے میں کہہ رہے ہیں، وہ میرے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں گزرا۔''

ان لوگوں نے اقبالؒ سے متعلق جو ستم کیا، وہ یہ تھا کہ ان کے افکار کو یورپی فلاسفروں کے اخذ و تاثر سے منسوب کیا اور اس طرح ان کی اسلامی فکر کو ارادی طور پر نہ سہی غیر ارادی طور پر تاراج کرنا چاہا۔

پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے علامہ اقبال کے خطوط ''اقبال نامہ'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہؒ عمر بھر علمائے اسلام کی حقیقی جماعت سے مختلف مسائل میں استفادہ و مشورہ کرتے رہے، لیکن شارحینِ اقبال جو مغربی تعلیم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور اپنے تئیں ان کا وارث گردانتے رہے، وہ ان علما سے مستفید ہونا تو ایک طرف رہا، ان کی اہانت کے مرتکب ہوتے رہے۔ انھوں نے غور ہی نہ کیا کہ اقبالؒ نے جو کام پاکستان سے شروع کیا، اس کی انتہا سارے ایشیا کے اسلامی انقلاب تک پہنچتی ہے اور اقبالؒ ہی کی فکری بنیاد پر ایشیا میں اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

اقبالؒ نے سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:

''مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔''

عبدالماجد دریا آبادی کو لکھا کہ:

''مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے نوجوان روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں، ان کو معلوم نہیں اسلامیات کیا ہیں؟''

اقبالؒ نے یورپی تعلیمات کے اس طائفہ کو اپنے کلام میں جن الفاظ سے یاد کیا، ان کی عمومی فہرست حسبِ ذیل ہے:

(1) بتانِ وہم و گماں (2) زناری برگساں (3) خانزادگانِ کبیر (4) نقش ہائے فرنگ (5) نیام تہی (6) وجود محض (7) مرکب ایام (8) فتنۂ عصر (9) مورومگس (10) لبِ گور (11) ارواحِ خبیثہ (12) بیگانۂ خودی (13) غارت گرِ دین (14) داشتۂ فرنگ (15) بندگانِ معاش (16) قمارباز (17) مردِ بے کار (18) زنِ تہی آغوش (19) رات کا شہباز (20) ادراک فروش (21) ابلیس زادے (22) سوداگرانِ مے و قمار (23) تاجرانِ زنانِ بازاری (24) جان بھی گردِ غیر بدن بھی گردِ غیر (25) کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر (26) مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس (27) جوانانِ خاکباز (28) کرگس (29) شکم

پرست (30) پُرکاروسخن ساز (31) صیدظن وتخمیں (32) ذریت افرنگ (33) ممولا (34) جہلِ مرکب (35) نگاہش نقشبندِ کافری ہا(36) سلطانی بہ شیطانی بہم کرد (37) بینائے غلط بیں (38) بے دین دانشمند (39) فروتر از زاغِ دخمہ (40) خرِ استعمار (41) چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (42) نہ معرفت نہ محبت نہ زندگی نہ نگاہ (43) زاغِ دشتی (44) حشیش فروش (45) شرعِ پیغمبر ﷺ سے بیزار (46) شکارِ مردہ (47) ہم نفسانِ خام (48) مفلسانِ شعر۔

اقبال نے شروع سے آخر تک مغرب اوراس کے ایشیائی بالخصوص مسلمان حلقہ بگوشوں پر سخت سے سخت تنقید کی ہے۔ان کے نزدیک مرگھٹ کا کوّا ان سے بہتر ہے۔مغربی نظامِ تعلیم کے ان خوشہ چینوں ہی کا کرشمہ ہے کہ طلبہ کے گلے **لا الہ الا اللّٰہ** سے محروم ہو گئے۔شاہبازوں نے خاکبازی کا سبق حاصل کیا اور مکتب مذبح بن گئے۔اقبالؒ نے اس مغرب زدہ طبقہ ہی سے متعلق کہا ہے کہ۔

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است
جبینِ خود منہ جُز بر درِ او
سریں را ہم بہ چوبش دہ کہ آخر
حقے دارد بہ خر پالاں گرِ او

اس سے بڑھ کر درشت تنقید کیا ہو سکتی ہے اور یہ وہی عبقری عصر کہہ سکتا تھا جس کا گھر اپنوں ہی کے چراغ سے جل رہا ہو۔ان چار مصرعوں میں ایک احتجاج ہے کہ ’’تیری فراست و عظمت اگر مغرب کی وجہ سے ہے تو پھر اپنی پیشانی کو اس کی چوکھٹ کے سوا اور کہیں نہ جھکا۔اور دلیل کیا دی ہے کہ اس کے ڈنڈے میں اپنے چوتڑوں کو دے دے کہ گدھے پر کمہار کا حق ہے۔

ارمغانِ حجاز میں اس کھیپ سے متعلق اقبالؒ کے بہت سے قطعات ہیں،مثلاً:

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے
ز بینائے غلط بینے نکوتر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش
ز دانشمندِ بے دینے نکوتر

بینائے غلط بیں سے مردِ کورچشم نکوتر ہے اور بے دین دانشمند سے نکوکیش نادان افضل ہے۔

اقبالؒ کی بصیرت نے ان اکادمیوں کے فضلا ہی کا اندازہ کیا تھا کہ ۔

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

خلیفہ عبدالحکیم، ملک غلام محمد (گورنر جنرل) سے مخصوص دوستی کے باعث عمر بھر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے سربراہ رہے اور انجمن ستائشِ باہمی کی معرفت افکار اقبال پر اتھارٹی (Authority) قرار دیے گئے۔ انھوں نے جن دوستوں سے اقبال پر کتابیں لکھوائیں، وہ ان کی منڈلی کے ارکان تھے اور ان کے ذہن کی نمائندگی کرتے تھے۔ خود خلیفہ صاحب نے فکرِ اقبال لکھی اور اس کی بدولت نامور ہونا چاہا لیکن خلیفہ صاحب نے اس میں کیا لکھا، مُشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیے۔ فکر اقبال کے صفحہ 201 , 215 , 218 , 223 پر فرماتے ہیں:

1- ''اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے اور یہ مخالفت اس کے رگ و ریشہ میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اثر ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ تمام کارخانۂ ابلیس کی تجلی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان، تصوف اور ذوق وشوق کے اشعار کہتے کہتے یونہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بالِ جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں لیکن اچھے اشعار کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ عیوب سے لبریز سہی لیکن یہاں اس کا ذکر نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفا آبِ رواں کا لب جو بیٹھے لطف اٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بیک ایک مردہ جانور کی لاش بھی تیرتی ہوئی سامنے آ گئی۔''

2- ''مغرب کے خلاف اقبال نے اس قدر تکرار کے ساتھ لکھا ہے کہ پڑھنے والا اس

مغالطہ میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ اقبال بڑا مشرق پرست، جامد ملا اور رجعت پسند ہے۔''

3- ''اقبال نے جو تنقید مغرب پر کی ہے، اس سے کہیں زیادہ مغربی مفکرین نے اپنے عیوب گنوائے اور ان کے علاج تجویز کیے ہیں۔''

4- بالِ جبریل میں ایک شعر ہے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں:

''چلو قصہ تمام ہوا۔ ہم تو ڈوبے تھے صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔''

اقبال نے اسی مغرب زدہ طائفہ سے متعلق کہا تھا:

''میں قرونِ وسطیٰ کا ڈکٹیٹر بن جاؤں تو اس طبقہ ہی کو ہلاک کر دوں۔''

ایک قومی ضرورت

پاکستان اقبالؒ کے خواب کی تعبیر تھا، لیکن یہ سب کچھ اقبالؒ سے پاکستان میں ہوا۔ چونکہ اقبالؒ ایک قومی ضرورت تھا، لہٰذا ان کا چرچا شدت سے کیا گیا۔ پاکستان بنا تو بعض ''دانشور'' جو اس وقت قلیل التعداد تھے، اقبالؒ کی فکر سے کٹ کے رہنا چاہتے اور ان کی شخصیت کو پاکستان کا ذہنی ہیرو یا اس خطے کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا محرک قرار دینے کے خلاف تھے۔ وہ نہ تو اس کی فکر کو فکر تسلیم کرتے اور نہ اس رعایت سے انھیں مسلمانوں کا ذہنی راہنما مانتے تھے۔ وہ انھیں ایک شاعر کے درجہ تک رکھنا چاہتے تھے۔ ان میں اکثریت اشتراکیوں اور اشتمالیوں کی تھی اور ان کے ساتھ کچھ ایسے عناصر بھی تھے جو اس وقت اپنے ذہنی بغض کی نمائش کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے تھے۔ کئی ایک صوبائی عصبیتوں کا شکار تھے اور ان کا پاکستان کی جدوجہد سے متعلق ایک منفی ذہن تھا۔

بہرحال پاکستان میں اقبالؒ کا نام اجتماعی طور پر تو شدت سے لیا گیا، لیکن اقبالؒ کا کام جو اس کے افکار کا نصب العین تھا، اس کے ساتھ اغماض کیا گیا۔ جن لوگوں کو ناز تھا کہ وہ اقبال کی زندگی میں ان کے صحبت نشیں تھے انھوں نے اقبالؒ پر شاذ ہی قلم اٹھایا۔ اگر کسی نے ایک دراز مدت کے بعد کچھ لکھا تو وہ اقبالؒ کا نصب العین نہیں تھا اور نہ ان افکار کا تذکرہ تھا جو اُن کے ہاں ملّی

وحدت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے۔اقبالؒ سے متعلق عمومی لٹریچر کی بہتات ہے۔کئی ایک کتابیں ان کے سوانح وافکار پر آ چکی ہیں،لیکن ان کے پاکستانی سوانح نگار بہمہ وجوہ کئی ایک تشنگیاں رکھتے ہیں اور کچھ غلط چیزیں بعض ناگفتہ بہ مصلحتوں کے تابع سوانح میں شامل کی گئی ہیں۔ رہاافکار کا مسئلہ تو اس بارے میں زیادتر فروعات پر قلم اٹھایا گیا اوران موضوعات کو فی الجملہ روحِ اقبال سے نسبت دی گئی ہے جوافکارِ اقبال کا اساسی نہیں عمومی حصہ ہیں۔ان موضوعات کو اقبال کے نصب العین سے کوئی نسبت نہیں۔

ان شارحینِ اقبال میں اکثریت ان ''حکماء'' و''فضلا'' کی ہے جو اسلام کی بہ نسبت اقبال کے طرفدار اور اقبال کے مقابلہ میں اپنی ذات کے پیش کار ہیں۔

جن لوگوں نے تصنیفات وتالیفات کے تحت پاکستان میں اقبالؒ پر قلم اٹھایا، انھیں سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1- وہ لوگ جو فی الواقعہ اقبالؒ سے مخلص ہیں۔انھوں نے کسی ایک موضوع یا بعض سوانحی عنوانوں پر قلم اٹھایا ہے،لیکن وہ کوئی جامع چیز پیش نہیں کر سکے اور نہ اقبالؒ کی دعوت و پیام اور تشریح وتفسیر پر قادر ہیں۔

2- وہ لوگ جو اقبالؒ سے جذباتی تعلق رکھتے ،لیکن اس کے نظریوں سے ابلاغ کا تعلق پیدا کرنے کے بجائے اس کی یادوں کے چراغ جلاتے ہیں۔

3- وہ لوگ جو سرکاری اکادمیوں سے منسلک ہو کر اپنی معاش کے لیے غیر ضروری عنوانوں اور موضوعوں پر کتابیں لکھتے لکھواتے اور ڈھیر لگواتے رہے ہیں ،ان کتابوں میں بعض چیزیں سرکاری منشا سے لکھی گئیں اور ان کے بین السطور میں حکومت کی خواہش کو دخل تھا۔

4- کئی لوگ جو خود کوئی سی ادبی وجاہت یا علمی منزلت نہ رکھتے تھے اوران کا اہل قلم میں مستقلاً شمار نہ ہوتا تھا،انھوں نے اقبال کی معرفت مختلف واسطوں سے اپنی ذات کو قائم کرنے کے لیے اقبال سے متعلق تصنیفات کا پیشہ اختیار کیا۔

5- وہ لوگ جو اقبالیات کے فہم سے قاصر ہیں اوران کی استعداد کمزور ہے،لیکن اقبالیات کے زمرۂ نگارش میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

6- وہ لوگ جو اقبالؒ کو شاعر کی حیثیت سے دیکھتے لیکن اس کی فکر سے نابلد ہیں۔ وہ صرف اقبالؒ کے شاعر ہونے پر زور دیتے ہیں اور انھیں اقبال کے محض شاعر ہونے پر اصرار ہے۔ وہ اقبال کی فکر سے انکار کرتے اور ان کے نظریات سے اغماض برتتے ہیں۔

7- وہ لوگ جو اشترا کی فکر کے ہیں، وہ اپنی روایتی تکنیک کے تحت اقبالؒ پر تضاد کا الزام لگا کر ان کی شاعرانہ رفعت کا تذکرہ کرتے لیکن اس آڑ میں ان کی فکر کو سبوتاژ کرتے ہیں۔

سرکاری ادارے

اقبالؒ سے متعلق سرکاری اعانت سے دو ادارے قائم ہوئے۔ ایک بزمِ اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور، دوسرا اقبال اکادمی کراچی۔ ان اداروں نے اقبال سے متعلق جتنی کتابیں شائع کیں، اقبال کی دعوت و پیام سے ان کا تعلق کھینچا تانی کے باوجود مترشح نہیں ہوتا، کچھ سوانحی خطوط ہیں۔ بعض چیزیں اقبال کی لغزیدہ پائی سے متعلق ہیں اور بعض دوراز کار مباحث یا مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ سے لاتعلق مسائل کا مجموعہ ہیں۔ اس سلسلہ میں بزم اقبال لاہور کے بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فربہ تصنیف ''فکر اقبال'' سب سے فروتر تصنیف ہے اور اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انھوں نے اقبالؒ کو مسخ کیا اور ان کے پیغام کو تضحیک کے لہجہ سے ملانا چاہا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے تحریک ختم نبوت کے زمانہ میں ''اقبال و مُلّا'' کے عنوان سے 28 صفحات کا ایک کتابچہ لکھا جو سرکاری طور پر تقسیم کیا گیا یا مرزائی امت نے بانٹا، لیکن اس کتابچہ کا مافی الضمیر سو فیصد غلط تھا۔ مطالب کی مینا کاری مؤلف کے ذہن کی کھٹی تقے ہے۔ اقبال کا نظریۂ فن، اقبال کا نظریۂ ابلیس، اقبال اور برگساں، اقبال کا تصورِ ارتقا اور جمالیات، اقبال کی تشکیل، قسم کے مقالات کو جمع کرنا اور انھیں فلسفۂ اقبال کے نام سے شائع کرنا اضحوکۂ افکار ہے۔ کیا اقبالؒ اس فلسفہ کے لیے اپنے شب و روز پیچ و تابِ رازی اور سوز و سازِ رومی کی نذر کرتے رہے۔ آخر پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے عوام اس سے کیونکر اپنی قومی تعمیر کے بال و پر حاصل کر سکتے تھے؟

اقبال اکادمی کراچی نے اپنی مطبوعات میں لاہور کی بزم اقبال کے مقابلہ میں سوانحی حد تک یا فنی رعایت سے ایک دو عمدہ چیزیں نکالی ہیں لیکن اقبالؒ کی دعوت و پیام کے اصل خطوط

اس کی مطبوعات میں بھی سرکاری مصالح کی نذر ہوتے رہے ہیں۔ کئی تالیفات محض میلہ اقبال کے غبارے ہیں۔

اقبالؒ نے تعلیم سے فارغ ہو کر ابتداءً ''فلسفہ عجم'' اور ''علم الاقتصاد'' شائع کیں۔ یہ ان کے امتحانی مقالے تھے...... ''فلسفہ عجم'' بہر حال امتحانی مقالہ تھا اور وہ ان دونوں کتابوں کو اپنے خیالات کی پختگی کے بعد ابتدائی مشق سمجھتے تھے لیکن یار لوگوں نے ساٹھ سال بعد...... ان کی اشاعت لازم قرار دے لی کہ اقبال کے قلم سے ہیں، حالانکہ ان کا پاکستان کی ملی تاسیس سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ان کے مندرجات افکارِ اقبال کی اساس تھے۔ علم الاقتصاد 1902ء میں شائع ہوئی تھی لیکن اقبال اکادمی کراچی نے 1961ء میں اسے شائع کیا کہ خواہ اقتصادیات کے نظریے یکسر بدل چکے ہیں لیکن علم الاقتصاد بہر حال اقبال کے قلم سے ہے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے اقبال کے تعلیمی نظریات پر ایک کتاب شائع کی جو انجمن کے نام کی رعایت سے درست ہو لیکن اس میں اقبال کی دعوت یا فکر کا پرتو تک نہیں۔ ایک صاحب نے علامہ اقبالؒ کی پہلی بیوی (والدۂ آفتاب اقبال) کے نام سے شیخ عطا محمد برادرِ اکبر علامہ اقبال کے خطوط نہایت عمدہ کاغذ پر شائع کیے جو مرتّب کی ایک نامسعود حرکت ہیں۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور نے اقبال کا نظریۂ اخلاق چھاپا جو عوام کے حدودِ فہم سے خارج تھا۔ ایک صاحب نے خوشحال خاں خٹک اور اقبال تصنیف فرمائی جو اقبال کی فکر میں خوشحال خاں خٹک کی فکر کے داخلہ کا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اقبال کے آخری دو سال لکھ کر لیگ کے اندرونی اختلافات کی حکایت بیان کی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایک جید انسان تھے۔ انھوں نے ''حکمتِ اقبال'' کے نام سے خودی کے موضوع پر تقریباً پانچ سو صفحات قلمبند کیے۔ ''اقبال اور سیاستِ ملی'' اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کی۔ مصنف رئیس احمد جعفری ہیں، لیکن اس میں بھی قلم کی مصلحتوں کا خلا موجود ہے۔ بزمِ اقبال لاہور کی ایک اور کتاب ''مطالعۂ اقبال'' مرتبہ گوہر نوشاہی ہے، لیکن 19 مضامین کے اس مجموعہ میں اقبال اور کشمیر، اقبال اور حیدر آباد دکن، اقبال اور مسئلہ جبر و قدر، اقبال اور آرٹ، طرز کے مضامین تو ہیں لیکن اقبال کی وہ دعوت مطلقاً نہیں جو اقبال کا نصب العین تھا۔ آخر اقبال اور حیدر آباد اور اقبال و بھوپال کے مطالعہ سے وہ کون سی بصیرت حاصل ہوتی ہے جو افکارِ اقبال کی پہچان میں مدد دیتی ہے اور اگر

انھیں شائع نہ کیا جاتا تو اقبال ادھورا رہ جاتا؟

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانہ میں ادیبوں اور شاعروں کے ڈنک کو ٹھنڈا کرنے کے لیے رائٹرز گلڈ قائم ہوا، اس کی معرفت مختلف کتابوں پر تقسیمِ انعامات کا دام بچھایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایک منڈلی قائم ہوگئی جس نے اونے پونے ادب پر حقِ دوستی ادا کیا۔ اس سال (1974ء) ''اقبال اور بھوپال'' کو دو میں سے ایک معیاری تصنیف قرار دے کر پانچ ہزار روپے انعام دیا گیا۔ اس کتاب میں ہے کیا؟ بعض دوسرے مضمرات سے قطع نظر ہمارے اس نظریے کی توثیق ہوتی ہے کہ اقبال روایتی قلمکاروں کے مذبح میں ہے اور اس کا نصب العین اس طائفہ کی دستگاہ میں نہیں یا ان کے فہم سے ماورئ ہے، یا پھر وہ عقیدتِ اقبال کی آڑ میں مسخ اقبال کی مہم چلا رہے ہیں۔

اقبالؒ اور عشقِ رسول ﷺ

اقبال اور عشقِ رسول ﷺ ایک مستقل موضوع ہے۔ اس عنوان سے ایک ضخیم کتاب ہوسکتی ہے۔ بعض دوستوں نے جن کا تعلق سرکاری اکادمیوں سے نہیں، اس موضوع پر کلامِ اقبال جمع کیا اور نعت گوئی کے مختصرات بھی لکھے ہیں۔ لیکن اقبالؒ نے عشقِ رسول کے تحت جو کچھ لکھا حقیقتہً بہت کچھ لکھا۔ اس کا پس منظر اور تہہ منظر ان کی نگاہ سے اوجھل رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ رسولِ اکرم ﷺ کو کائناتِ انسانی کے سب سے بڑے راہنما کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، ان کے کلام کی بنیاد یہی عشق تھا۔ وہ اس مطمحِ نظر کے تھے کہ جب تک کسی دعوت یا تعلیم کی علمبردار کوئی عظیم شخصیت نہ ہو، اس دعوت و تعلیم کا طاقتور ہونا ممکن ہی نہیں اور نہ کوئی معاشرہ اس دعوت و تعلیم پر قائم ہوسکتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ آپ کی ذاتِ اقدس کو ازل سے ابد تک کائناتِ انسانی کے لیے سب سے بڑا قائد اور سب سے بڑا معلم سمجھتے تھے۔ دوسرا کوئی انسان ان کی مثل نہیں۔ ان کے بعد کسی ظلی یا بروزی نبوت کا سوال ہی عبث ہے۔ وہ اس کو کفر کے مصداق سمجھتے اور وحدتِ اسلامیہ کی شکست و ریخت کا حربہ خیال کرتے۔ ان کی دعوت کا مرکزی نکتہ پہلے بھی عرض کیا، یہی تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک ایسے وفاق کے شہری ہیں جو مختلف ملکوں کی مسلمان اقوام کو اسلامی معاشرہ مہیا کرتا اور انھیں اپنی وحدت کی لڑی میں پرو کر بالآخر انسانی وحدت کی طرف لے جاتا ہے۔

''روزگارِ فقیر'' کے مصنف نے علامہ اقبالؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''قرآن کو اس زاویۂ نگاہ سے مت پڑھو کہ تمھیں فلسفہ کے مسائل سمجھائے گا، اسے

اس زاویہ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ اور کائنات میں تمہارا مقام کیا ہے؟''

نیاز الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہیے تا کہ قلب میں محمدی ﷺ نسبت پیدا کرے۔''

میلاد النبی ﷺ کی ایک تقریر مطبوعہ ''صوفی'' اکتوبر 1926ء میں فرماتے ہیں:

''قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہیں لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالبِ عالیہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ فی الحال مسلمانوں کو اخلاقِ نبوی کی تعلیم دینی چاہیے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

''مسلم بحثیت فردوحی خداوندی کی رُو سے احسن التقویم ہے اور ملتِ اسلامیہ خیر الامم۔''

آل انڈیا مسلم لیگ الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت جس میں پہلی دفعہ پاکستان کا تصور پیش کیا گیا، فرمایا کہ:

''اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیؑا پر ایمان اور رسول کریم ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان۔ یہ آخری تعین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ اِمتیاز ہے۔''

مرزائیت نہ صرف ختم رسالت ﷺ کی نفی پر ہے بلکہ اس عالمی وفاق کے اسلامی معاشرہ کی تغلیط و تنسیخ کرتی ہے جو دینی وحدت کے سانچے میں ڈھل کر انسانی وحدت کا محرک ہوسکتا ہے۔

قادیانی ہائی کمانڈ نے حال ہی میں مسلمانوں کے احتساب سے خوفزدہ ہو کر حضور ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا ''اقرار'' شروع کیا ہے لیکن عقیدۃً وہ خاتم النبین کی مختلف تعبیریں اور تاویلیں کرتے ہیں۔ مرزا غلام احمد کی نبوت ان کا اساسی عقیدہ ہے۔ ان کے نزدیک خاتم النبین کے معنی ہیں کہ اب کوئی کتاب اللہ نازل نہیں ہوگی، لیکن اس زمانہ میں رسول اللہ کی دعوت کا احیا و تکمیل مرزا غلام احمد کی نبوت کو منتقل ہو چکا ہے۔ وہ مسیحِ موعود اور مہدیِ موعود ہیں۔ ان کی کتاب تذکرہ جسے وہ قرآنِ پاک کے برابر درجہ دیتے ہیں، میں ہے اور جو مسلمان ان کو نہیں مانتے، وہ کافر ہیں۔ اس کے علاوہ ان پر فحش سے فحش گالیاں بکی ہیں۔

مرزا غلام احمد کے نہ ماننے والوں کو کافر گردانتا، ان سے دینی و معاشری طور پر الگ رہنا

اور خود مسلمان کہلانا فی الواقعہ ملتِ اسلامیہ کو غارت کرنے کی استعماری سازش کا خطرناک منصوبہ ہے جو ہندوستان میں انگریزی راج کے ورود نے پیدا کیا اور اب قادیانی امت اپنی ریاست قائم کرنے کی غرض سے مسلمان ریاستوں میں عالمی استعمار کا ففتھ کالم ہے۔

حضور ﷺ کے بعد اجرائے نبوت کا سوال نہیں، سوال اُن ﷺ کی ملت کے اسلامی معاشرہ کا ہے کہ وہ قائم ہو تو کائناتِ انسانی کا اضطراب ختم ہوتا ہے۔ لیکن مرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے افکار کی پاداش میں ساری دنیائے اسلام کو کافر قرار دے کر بہ لطائف الحیل لاکھ سوا لاکھ انسانوں کی ایک جماعت پیدا کر سکے ہیں اور یہ فصل بھی اسّی نوے برس کے درمیان کاشت ہوئی ہے۔ قادیانی امت کا مشن کیا ہے کہ وہ ''کافر مسلمانوں'' کو ''احمدی مسلمان'' بناتی ہے لیکن عملاً عالمی استعمار کے لیے جس میں امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل شامل ہیں، وہ کئی ایک اسلامی ریاستوں میں استعماری نزاج برپا کراتی اور مسلمانوں کے روپ میں استعمار کے لیے جاسوسی کرتی ہے۔ فی الجملہ مرزا غلام احمد کا واحد کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت تمام دنیائے اسلام کافر ہو چکی ہے۔ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں لیکن مسلمان کافروں کی جاسوسی مرزائی امت کا فریضہ ہے۔ آج تک مرزائی امت جواب نہیں دے سکی کہ اس کے تبلیغی مشن ان علاقوں ہی میں کیوں ہیں، جہاں استعماری طاقتیں اپنے اجیروں کی معرفت سیاسی ناٹک کھیلتی ہیں۔ اسرائیل عرب مسلمانوں کی نفی پر ہے اور دنیا بھر کے یہود وہاں بسائے جا رہے ہیں۔ وہاں عیسائی تبلیغی مشن قائم کرنے کی اجازت نہیں لیکن قادیانی تبلیغی مشن قائم ہے۔ آخر اسرائیل میں قادیانی تبلیغ کن لوگوں پر ہوتی ہے؟ کیا یہود قادیانی ہوتے ہیں یا حجازی مسلمانوں کو قادیانی مسلمان بنانا مقصود ہے؟ کوئی یہودی مسلمان ہوا؟ ایک نہیں، تو پھر اسرائیل میں ''زرِ مبادلہ'' کس غرض سے صرف کیا جاتا ہے یا پھر عربوں کی جاسوسی کے لیے مشن کے تمام اخراجات حکومتِ اسرائیل برداشت کرتی ہے؟

اقبالؒ کے خلاف سازش

قلمکارانِ اقبال نے ان کے نصب العین سے جو برتاؤ کیا اس کا اجمالی ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اگر اس طائفہ میں کوئی فرد اقبالؒ سے مخلص ہوتا تو وہ ضرور اقبال اور قادیانیت کے موضوع اور اس موضوع سے متعلق علامہؒ کے اشارات و ارشادات پر تحقیقی قلم اٹھاتا۔ لیکن قادیانی امت

بالخصوص مرزا بشیر الدین محمود اور چودھری سر ظفر اللہ خاں نے پاکستان آ کر جو پخت و پز کی، اس کی مختلف شاخوں میں ایک شاخ کا منشا اقبال کی ہیٹی اور اس کے فکر کا اخفاء تھا۔ ان دونوں قادیانی ''بزرچمہروں'' نے اپنی عقلِ عیار سے اس طرح کام لیا کہ افکارِ اقبال کو بالواسطہ اور بلاواسطہ غائب غلہ کرایا اور اقبالؒ کی رحلت سے پہلے جو افکار و نظریات تشکیلِ ملت کی بنیاد تھے انھیں گلدستۂ طاقِ نسیاں بنوا دیا۔ اقبالؒ قادیانی امت سے متعلق ایک طاقت ور قلم کی ضرورت پر زور دے گئے تھے۔ کسی نے اس قلم کی ضرورت کا احساس نہ کیا اور کوئی رجلِ رشید نہ تھا جو ہندوستان میں تنسیخِ جہاد کی استعماری سرگزشت پر تحقیق کرتا اور کھوج لگاتا کہ مرزا غلام احمد کو کن استعماری ضرورتوں کے تابع پیدا کیا گیا۔

یہ سب اقبالؒ کے خلاف ایک سازش تھی۔ ہمارے حکمران مغربی تعلیم اور یورپی تفکر کے سیکولر انسان تھے۔ انھوں نے قادیانی مسئلہ کو فرقہ وار مسئلہ قرار دے کر قادیانی امت کو معسکر مہیا کیا کہ وہ طاقتور ہوتی رہی...... بعض نے فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے قادیانی جماعت کو **1911**ء میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ کہا تھا، اب ان کی مخالفت تضاد پیدا کرتی ہے۔ ان لوگوں کو تضاد کے معنی ہی کا علم نہیں کہ تضاد کیا ہے؟ افکار کا ارتقا کسے کہتے ہیں؟ علم کس طرح پختگی حاصل کرتا اور قطعیت کو پہنچتا ہے؟ علامہ اقبالؒ نے خود اس کا جواب دیا تھا۔ جب ان کے محاسبہ پر قادیانی امت نے اسی ایک فقرے کا حوالہ دیا، تو فرمایا کہ اُس وقت میرے سامنے وہ الفاظ نہیں، تاہم دنیا میں پتھر ہی سوچنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ میں نے اس وقت قادیانیت کے داخلی احوال و ظروف کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اب اس مطالعہ کے بعد میں اس کے حقیقی خدوخال سے آگاہ ہو کر اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ وہ (قادیانی) محمد عربی ﷺ کی امت میں نقب لگا کر ایک الگ امت پیدا کرنا چاہتے اور مسلمانوں سے الگ تھلگ ایک دوسری ملت ہیں، انھیں خود اپنے عقائد کی بنا پر بھی ملتِ اسلامیہ میں رہنے کا حق نہیں ہے۔

غرض اس طرز کے اوچ پوچ دلائل پر قادیانی نبوت اور قادیانی خلافت کا انحصار ہے۔ اگر یہ دلیل کوئی دلیل ہوتی تو شاید افکارِ عالم کی سچائیوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ کسی چیز کے بارے میں رائے وہی ہوتی ہے جو آخری اور قطعی ہو۔ مرزائی استدلال کے مطابق قرآن کی وہ آیتیں جن سے پہلی آیتوں کے احکام منسوخ ہوئے، گویا ناقابلِ قبول ہیں کہ ان سے پہلے مختلف احکام ہیں۔

افراد کا معاملہ لیا جائے تو پھر حضرت عمرؓ کا اسلام (خاکم بدہن) قابل استرداد تھا کہ وہ قبولِ اسلام سے پہلے اسلام سے نبرد آزما تھے اور گھر سے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے آئے تھے۔ مرزائی منطق کے مطابق انھیں کیا حق تھا کہ اسلام کی حمایت کرتے اور قریشِ مکہ کے جہل و شرک کو رگیدتے۔

بزمِ اقبال لاہور ارادی حادثوں کا شکار رہی ہے؟ یا اقبالؒ سے متعلق اس کا لٹریچر اتفاقی سانحہ ہے لیکن عجیب سی چیز ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم کی ''فکرِ اقبال'' کے علاوہ عابد علی عابد کی تالیف ''شعرِ اقبال'' بھی اغلاط کا پلندہ ہے۔ تیسری کتاب علامہ اقبال کے سوانح ''ذکرِ اقبال'' مولانا عبدالمجید سالک کے قلم سے ہے۔ مولانا خود مسلمان تھے اور ان کے صاحبِ طرز ادیب ہونے میں شک ہی نہ تھا لیکن ان کے والد چونکہ قادیانی العقیدہ تھے، اس لیے ان کا دل قادیانی مسئلہ میں علامہ اقبالؒ سے متفق نہ تھا کیونکہ اس طرح ان کے والد پر آنچ آتی اور سگے بھائی کٹ جاتے تھے۔ علامہ اقبالؒ سے متعلق ذکرِ اقبال میں لکھا ہے کہ جاوید اقبال کی والدہ سے متعلق ایک بدبخت کے خفیہ خط سے جو سُوءِ ظن پیدا ہوا، اس کی تلافی کے لیے علامہ اقبالؒ نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔ مرزا نے مسئلہ پوچھا، واپس آ کر ایک مولوی کو طلب کیا اور ان کے حسبِ مشورت نکاح دوبارہ پڑھوایا گیا۔

اس احترام کے باوجود جو سالک مرحوم کے لیے احقر کے دل میں ہے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''ذکرِ اقبال'' میں اس داستان سرائی سے انھوں نے اقبال کی ہیٹی کی ہے اور مرزائیوں نے اس روایت سے اقبال پر چھینٹے اُڑائے ہیں۔ ''اقبال و احمدیت'' کے زیرِ عنوان ذکرِ اقبالؒ کے صفحہ 210 پر مولف نے مولانا ظفر علی خاں اور مجلس احرار کی تحریک کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ ''خدا جانے علامہ اقبالؒ نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا، جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے''......اس خدا جانے پر غور کیجیے۔ علامہ اقبال کے عقیدت مند کی درخواست ماننے پر توجہ فرمایئے اور فرقہ کی بنیاد میں غلطی کا لفظ پرکھیے کہ علامہ نے غلطی لکھا یا کچھ اور فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ قادیانیت کے کفر کو سالک صاحب نے غلطی کہا اور اقبال سے منسوب کیا، حالانکہ انھوں نے غداری، کفر اور ارتداد کے الفاظ لکھے ہیں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی نہیں کی، میں اس آدمی کو اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے۔'' (خطوط و خطبات)

پاکستان میں قادیانی امت نے غایت درجہ عیاری کے ساتھ اپنے مسئلہ کو احرار قادیانی نزاع کا نام دے کر حکومت کے مختلف الاصل افسروں اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی حمایت حاصل کی۔ حمایت کے پس منظر میں بعض شاعرانہ پہلو بھی تھے جو اسرائیلیوں کی طرح قادیانیوں کے نخاسہ بازار کا ہتھکنڈا ہیں۔ کیا اقبال اسلام سے نہیں احرار سے متاثر تھے؟ اور اسی تاثر کو انھوں نے اسلام کا نام دیا تھا۔

ان لوگوں کے نزدیک وہ کسوٹی کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فلاں افکار پر اقبال نے خود سوچا اور فلاں افکار خارجی محرکات کا نتیجہ تھے اور ان افکار میں اقبالؒ کا دماغ اپنا نہیں پرایا تھا۔ گویا جن افکار کی ان لوگوں کو ضرورت ہے، وہ اقبال کے ہیں اور جن کی ضرورت نہیں وہ اقبال کے نہیں ،کسی عقیدت مند کے ہیں۔ اگر یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر افکارِ اقبال کی ساری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلاف اقبال کا ایک قطعہ ہے اور سیاسی چھچھورے اب تک مولانا کے کفن میں اس قطعہ کو ٹانکتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ گویا شاعری جو اضطراری ہوتی ہے، وہ اقبال کی ہے، لیکن نثر جو ذہن کی صحیح نمائندہ ہوتی ہے، اقبالؒ کی نہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

خلیفہ عبدالحکیم بھی رحلت فرما گئے، عابد علی عابدؔ بھی وفات پا گئے اور مولانا عبدالمجید سالک بھی رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد بزمِ اقبال جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی، ان میں جسٹس ایس اے رحمٰن جیسے فاضل انسان نے مرتد کے مسئلہ پر ایک ایسی کتاب لکھی جو اس مسئلہ میں اقبال کی نفی کرتی ہے۔ آج (1974ء) پنجاب یونیورسٹی کے سبکدوش وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں بزمِ اقبال میں رونق افروز ہیں، آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں مسند اقبال کا صدر ایک سکہ بند قادیانی پروفیسر کو بنایا تھا۔ آپ سے عرض کیا گیا، ایں چیست؟ تو آپ نے ماتھے پر شکن ڈالی۔ تب آپ اقتدار کے اسپ تازی پر سوار تھے۔

مختصرات

قادیانیت سے متعلق اقبالؒ نے شاعری نہیں کی۔ ہر سخن نثر کی ترازو میں ناپ تول کے لکھا ہے۔ کام اس پر ہونا چاہیے اور جواب بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ اقبالؒ جذبات کی مخلوق نہ تھے

اور نہ کوئی ایجی ٹیٹر تھے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کے حکیم تھے۔ سیاست دان اپنے مستقبل پر اور مدبر ملت کے مستقبل پر سوچتے ہیں۔ ایک مدبر، ایک حکیم اور ایک مفکر کی حیثیت سے انھوں نے قادیانیت کا جائزہ لے کر اس کا محاسبہ کیا۔ ان کا یہ سوال جائز تھا کہ ''جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟'' مسلمانوں کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ جو لوگ اس مسئلہ میں رواداری کا درس دیتے یا کمزوری کو اختیار کرتے ہیں وہ قومی خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں، کیونکہ جو ملت اپنی دینی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر سکتی، وہ بالآخر مٹ جاتی ہے۔ پاکستان برعظیم کے مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کے دینی خدوخال کی اساس پر ایک جغرافیائی ریاست کا ظہور تھا۔ اسلام کے نام سے قائم ہوا اور اسلام ہی اس کو باقی رکھ سکتا ہے۔ اگر ہندوؤں سے الگ ہونے کا موقف اس لیے اختیار کیا تھا کہ ہم محمد عربی ﷺ کی امت میں سے ہیں، تو پاکستان میں ایک ایسی امت کا جواز کیا ہے جو ''قادیانی پیغمبر'' کے استعماری اغراض کی پیداوار ہے؟ لیکن حجازی پیغمبر (فداہ امی وابی) کی امت سے چوری کی گئی ہے اور جس کے نزدیک وہ تمام مسلمان جو مرزا غلام احمد کو نہیں مانتے کافر ہیں۔ قادیانی اس عالمگیر تکفیر پر نصرانی و اسرائیلی استعمار سے منسلک ہو کر جاسوسی کرنا اپنے پیغمبر کے ''اسوۂ حسنہ'' کا اتباع سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کو اس لیے بانٹا تھا کہ برعظیم کا سیاسی مسلمان محمد عربی ﷺ سے نسبت کے باعث اپنی ایک الگ ریاست چاہتا تھا، اور اب پاکستان کا سیاسی مسلمان قادیانی اقلیت سے اس لیے مرعوب ہے کہ استعماری طاقتیں اس کی سرپرست ہیں۔ گویا افریشیا میں مقبوضہ نظام ختم ہو جانے کے بعد ایک مقبوضہ امت مسلمانوں کی روحانی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ کے نصرانی و اسرائیلی استعمار کی آلہ کار ہے۔

آغا شورش کاشمیریؒ

قادیانیت، اقبال کی نظر میں

''احمدیت، علامہ اقبال کی نظر میں'' کے زیرِ عنوان عبدالمالک خاں ناظر اصلاح و ارشاد و صدر انجمنِ احمدیہ پاکستان ربوہ نے ایک کتابچہ مرتب کیا ہے۔ سرورق نصرت آرٹ پریس ربوہ میں چھپا۔ نظارتِ اشاعت نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے چھپوا کر شائع کیا اور خفیہ طور پر سیکولر قسم کے خواص اور سادہ دل عوام میں تقسیم کیا جا رہا یا ڈاک کے ذریعہ بھجوایا جا رہا ہے۔ مضمون کے صفحات چودہ ہیں۔ مذکورہ کتابچہ ایک دوست نے ربوہ سے ارسال کیا ہے۔

عبدالمالک خان جو بزعم خویش مولانا کہلاتے ہیں، آغاز ہی میں تحریر فرماتے ہیں:

''علامہ اقبال جو اس برصغیر کے ایک بڑے شاعر اور فلسفی تھے، ان کا احمدیت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق رہا (کب اور کہاں؟ مرتب نے یہ نہیں بتایا، چٹان) ان کے خاندان کے کئی افراد نے احمدیت کو قبول کیا۔ ان کے والد مرحوم احمدی تھے، ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی تھے، ان کے اکلوتے بھتیجے احمدی ہیں۔ علامہ موصوف نے اپنے وصیت نامہ میں ان کو اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا۔''

صحیح جواب تو علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال ہی دے سکتے ہیں کہ ان کے دادا جان سے متعلق مرزائی تلبیس کی اساس کیا ہے؟ یا پھر صوفی نظیر احمد سیالکوٹ سے روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ان کی بیگم صاحبہ کے دادا جان اور ان کے خسر شیخ عطا محمد قادیانی تھے یا نہیں؟

ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال کے والدؒ کو قادیانی کہنا محض تلبیسی روایت ہے۔ اس سے پہلے قادیانی امت نے کبھی انکشاف نہ کیا اور جب علامہ اقبال نے مرزائی امت سے متعلق معرکہ آراء و بصیرت افروز مضامین لکھے اور انھیں اسلام کا غدار اور قرآن حکیم کی رُو سے مرتد قرار دیا بلکہ ان کے واجب القتل ہونے تک کا اظہار کیا (ملاحظہ ہو انوارِ اقبال میں سیّد نذیر

نیازی کے نام حضرت علامہ کے خط کا عکس) تو اس وقت بھی مرزائیوں نے اظہار نہ کیا۔ آج ان کی رحلت کو 36 برس ہوتے ہیں تو مرزائی خفیہ طور پر اپنی بدگوئی کو پھیلا رہے ہیں کہ علامہ اقبال کے والد خدانخواستہ احمدی تھے۔

شیخ عطا محمد احمدی ہوتے تو سیالکوٹ کے مسلمان انھیں کبھی امام علی الحقؒ کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیتے۔ ان کا انتقال علامہ اقبال کی وفات کے تین سال بعد 1940ء میں ہوا۔ علامہ اقبال کی ہیٹی کے لیے مرزائی ان کی لاش قادیان لے جاتے اور اخباروں میں غلغلہ کرتے۔ ان کی دختر فرخندہ اختر صوفی نظیر احمد کے ساتھ نہ بیاہی جاتی۔ وہ احمدی ہو کر غیر احمدی کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہتے تو مرزا بشیر الدین ان کے مقاطعہ کی تحریک کرتے، ان سے جواب طلبی کی جاتی؟ اُن کی وفات پر جنازہ کوئی مرزائی پڑھاتا۔ نہ جانے مرزائی اپنی اس یاوہ گوئی سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ عطا محمد کی شہرت کا سبب علامہ اقبال ہیں۔ علامہ اقبال کی شخصیت کا سبب وہ نہیں۔ شیخ عطا محمد کوئی شخصیت ہوتے تو علامہ اقبال پر حجت ہو سکتے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک کی بعض روائتیں قادیانی امت کے لیے حجت ہیں اور اگر یہی معیار ہے تو انھوں نے ذکرِ اقبال کے صفحہ 9 پر لکھا ہے کہ شیخ عطا محمد نے معمولی سی تعلیم پائی تھی۔ گویا خاندان کی فضیلت علامہ اقبال سے ہے۔ رہا علامہ اقبال کے بھتیجے (شیخ اعجاز احمد) کا سوال تو ان کے متعلق ہم تک یہی روایت پہنچی ہے کہ وہ احمدی تھے اور ان کے احمدی ہونے کا سبب ظفر اللہ خاں تھا جو اُن کی ملازمت اور اس میں ترقی کا زینہ تھا۔ وہ ان کے دام کا شکار ہو گئے لیکن شیخ اعجاز احمد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اب وہ احمدیت سے متنفر ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور آئے تو اپنے چچا (علامہ اقبال) کے مزار پر حاضر ہو کر آبدیدہ ہو گئے اور رو رو کر مرزائیت سے تائب ہونے کا اظہار کرتے رہے۔ چونکہ اس روایت سے متعلق ہمیں ذاتی معلومات نہیں، اس لیے ہم اپنی ذمہ داری پر ان سے متعلق کچھ عرض کرنے سے معذور ہیں۔ تاہم ہماری مصدقہ معلومات یہ ہیں کہ ان کی اولاد ان کے روبرو مرزا غلام احمد پر تبریٰ تولتی اور اس کی نبوت کا مذاق اُڑاتی ہے۔ یہی معاملہ ان کی بیگم صاحبہ کا ہے۔ وہ بھی مرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کو استعماری مسخرہ قرار دیتی ہیں۔

عبدالمالک خان نے خاندانِ اقبال پر اس اتہام کے بعد لکھا ہے کہ انھوں نے رسالہ انڈین اینٹی کیوری 1900ء میں ایک مضمون تحریر کیا اور لکھا ہے کہ:

''موجودہ ہندی مسلمانوں میں مرزا غلام احمد قادیانی سب سے بڑے دینی مفکر ہیں۔''

اوّل تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ مرزائی اس قسم کے غلط حوالے وضع کرنے میں دلیر ہیں۔ لازم تھا کہ وہ اس مضمون کی بالعموم اور اس فقرے کی بالخصوص فوٹوسٹیٹ شائع کرتے! بالفرض علامہ نے مذکورہ فقرہ لکھا ہو تو یہ کوئی حجت نہیں۔ انھوں نے پیغمبر نہیں، دینی مفکر لکھا ہے۔ تب علامہ اقبال کی عمر ہی کیا تھی وہ 27 برس کے تھے۔ وہ کوئی عالم دین نہ تھے۔ تب نہ کسی دینی تحریک یا کسی دینی شخصیت سے ان کا تعلق تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ پروفیسر ٹامس آرنلڈ ان کے استاد تھے۔ انھوں نے 1899ء میں ایم اے کیا۔ ایک سال بعد 1900ء میں ان کے قلم سے ایسا کوئی مضمون نکلا ہو تو وہ قلم کا ابتدائی سفر تھا۔ اس اقبال کے قلم سے نہ تھا جو ایک طویل ذہنی سفر کے بعد حکیم الامت کے درجہ پر فائز ہوا اور پیغمبری عمر میں داخل ہوتے ہی اس شخص کا پوسٹ مارٹم کیا جو برطانوی سیاست کی شعبدہ بازی سے مسیحِ موعود، مہدیِ موعود اور ظل و بروز کا جامہ اوڑھ کر نبی بن گیا تھا۔

دروغ گو را حافظہ نہ باشد کے مصداق عبدالمالک کو یاد نہیں رہا کہ اس کے نبی کی سوانح عمری کیا ہے۔ مرزا غلام احمد نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ 1901ء میں کیا اور علامہ اقبال کا مضمون اگر قادیانی امت کے لیے کوئی سند ہے تو 1900ء میں لکھا گیا ہے۔ عجیب استدلال ہے کہ علامہ اقبال نے 1900ء میں فلاں بات کہی وہ درست ہے لیکن جس نتیجہ پر 1936ء میں پہنچے وہ غلط ہے۔ اگر معیار یہی ہے کہ پہلی بات درست ہے اور دوسری غلط تو قادیانی کس دلیل کے تحت مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں۔ مرزا کی بے شمار تحریریں اپنے نبی ہونے کا انکار کرتی ہیں اور اس کو مخبوط الحواس قرار دیتی ہیں جو حضور سرورِ کونین ﷺ کے بعد کسی طرز کی نبوت پر فائز ہونے کی گستاخی کرتا ہے۔ مرزا غلام احمد کا اپنا قول ہے کہ ایسا شخص ذہنی طور پر دیوالیہ ہو کر پاگل ہو چکا ہے۔

آغا شورش کاشمیریؒ

اقبالی مجرم

’’ذکرِ اقبال‘‘ مولانا عبدالمجید سالک کے قلم سے علامہ اقبال کی سوانح عمری ہے۔ ناشر بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ لاہور، صفحات 296 سالِ اشاعت 1955 عیسوی۔

مولانا سالک ایک باغ و بہار ادیب تھے۔ علامہ سے متعلق ان کے دل و دماغ میں احترامات فائقہ تھے لیکن ’’ذکرِ اقبال‘‘ مرتب کرتے وقت ان کا پُر بہار قلم حدودِ انشا پھاند گیا اور بعض اُڑتی ہوئی روایتوں اور حکایتوں کے ہو کے رہ گئے جو اُن کے دوستوں نے بیان کیں اور انھیں سوانح میں شامل کر لیا۔ شاید ان کے علم میں نہ تھا کہ بعض حلقوں نے اقبال کی سیرت داغدار کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے اور وہ اقبال کے حکیم الامت ہونے کا تصور پاش پاش کرنا چاہتے ہیں۔ قادیانی اس مہم میں اندر خانہ پیش پیش تھے۔ مرزا بشیر الدین محمود سے مولانا سالک کا میل ملاپ تھا۔ مولانا کے والد قادیانی تھے، اور سگا بھائی بھی قادیانی تھا۔ غالباً اسی باعث مولانا قادیانیت سے متعلق متشدد نہ تھے لیکن نجی محفلوں میں مرزا غلام احمد کی ’’پھبتیوں‘‘ سے چٹھارڈ کرتے۔ تعجب ہے کہ ذکر اقبال میں مرزا کو سہارا دیا اور دو ایک مضحک باتیں علامہ سے اس طرح منسوب کی ہیں، گویا ان کا تعلق فی الواقعہ سوانح اقبال سے ہے۔

مولانا سالک نے ’’یارانِ کہن‘‘ (مطبوعہ مکتبہ چٹان) میں مولانا ابوالکلام کے ذکر کو بھی مرزائیت کی بالواسطہ مدافعت میں استعمال کیا، اپنے مختصر خاکے میں لکھا کہ ’’مولانا مرزا غلام احمد سے ملنے کے لیے قادیان گئے تھے اور ان کی رحلت پر امرتسر کے سہ روزہ ’’وکیل‘‘ میں تعزیتی شذرہ لکھا تھا۔‘‘ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تردید میں اپنے سیکرٹری پروفیسر محمد اجمل خاں سے راقم کو خط لکھوایا، ادھر مولانا سالک کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی گئے تو اس خفگی میں مولانا نے ان سے ملاقات نہ کی۔ سالک نے لاہور پہنچ کر ہفتہ وار چٹان میں اس کی تصحیح کر

دی، اب وہ تصحیح ''یارانِ کہن'' کے دوسرے ایڈیشن میں آ چکی ہے۔ سوانح اقبال میں سالک کا نقطہ نظر اپنی آپ بیتی ''سرگذشت'' سے قطعاً مختلف ہے، اپنی سوانح عمری مشرقی انداز کی ہے لیکن اقبالؒ کے سوانح حیات، مغربی انداز میں تحریر کیے ہیں کہ جب تک حسب ونسب کی ہڈیاں توڑ نہ لیں مغرب کے سوانح نگاروں کو اپنے ممدوحین کے سوانح حیات ادھورے محسوس ہوتے ہیں۔

مولانا سالک نے صفحہ 10 پر لکھا ہے کہ:

''علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے 82 سال کی عمر میں وفات پائی اور امام صاحب (امام علی الحقؒ) کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے۔''

شیخ عطا محمد کا ''احمدی'' ہونا مشہور ہے لیکن خاندانِ اقبال کی روایت ہے کہ اقبالؒ کا برادرِ بزرگوار ہونے کے باوجود وہ علامہ کے ہاں آتے تو مرزا غلام احمد کو زبان کے اڑنگے پر لا کر پٹخنی دیتے اور اس کی خانہ ساز نبوت پر تبرّیٰ تولتے تھے۔ اگر وہ قادیانی ہوتے تو سیالکوٹ جیسے شہر میں جو مدینۃ الاحرار تھا، ان کا امام صاحب کے قبرستان میں دفن ہونا ناممکن تھا، وہ ابتداءً کسی وجہ سے قادیانی ہوئے تھے لیکن علامہ نے مرزائی امت سے متعلق اپنے معرکہ خیز مقالات لکھے، تو انھوں نے قادیانیت سے توبہ کر لی اور مسلمان ہو گئے، البتہ ان کے فرزند شیخ اعجاز احمد ضرور قادیانی ہیں لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ ان کی اہلیہ اور عیال، مرزا غلام احمد پر قہقہے لگاتے اور قادیانی امت کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔

''دوسری شادی'' کے ضمن میں مولانا سالک رقمطراز ہیں:

''چونکہ علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی تھی، مطمئن نہ تھے اور موافقت و مصالحت کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں، اس لیے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہاں تھے۔ احباب میں ذکر ہوا تو شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی جو اس وقت وکٹوریا گرلز سکول میں پڑھتی تھی، جب بات پکی ہو گئی تو علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آئے اور مرزا جلال الدین، میاں شاہ نواز بیرسٹر، مولوی احمد دین وکیل اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر علامہ کا نکاح پڑھا گیا۔ اس موقع پر صرف نکاح ہوا تھا، رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی، نکاح ہو جانے کے بعد علامہ کے پاس چند گمنام خطوط پہنچے جن میں منکوحہ خاتون کے خلاف نامناسب شکایات لکھی تھیں۔ علامہ سخت ضغطے میں پڑ گئے۔ دوستوں سے ذکر کیا، انھوں نے حالات کی چھان بین کا وعدہ کر لیا، ان

حالات کی وجہ سے رخصتی کا معاملہ غیر معین وقت تک ملتوی ہو گیا۔ علامہ اس زمانے میں بے حد ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ایک بیوی سے اَن بَن ہو گئی تھی، دوسری کے متعلق یہ حالات رونما ہو گئے۔"

علامہ نے تیسری شادی لدھیانہ کے نولکھا خاندان میں کی۔ اس دوران میں دوسری شادی کا معاملہ معلق رہا، مولانا سالک لکھتے ہیں کہ کچھ مدت بعد یہ واقعات رونما ہوئے:

1- "وکٹوریا گرلز سکول کی ہیڈ مسٹرس مس بوس سے مرزا جلال الدین کی بیگم نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اس نے اس لڑکی کی بے حد تعریف کی اور اس کی ذہانت، طباعی اور نیکی کو بیحد سراہا۔"

2- "علامہ کے والد مرحوم نے جو بیحد پرہیز گار اور مقدس بزرگ تھے، استخارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ لڑکی بالکل پاکدامن ہے۔"

3- مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں نے اپنے منشیوں اور کارکنوں کے ذریعے سے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ گمنام خطوط کا ذمہ دار نبی بخش وکیل تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی اس کے بیرسٹر لڑکے سے ہو جائے۔"

4- "جب یہ انکشاف ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اس بات پر بیحد افسوس ظاہر کیا کہ علامہ نے بہتان پر یقین کر لیا؟ اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے، اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روزِ قیامت آپ کی دامنگیر ہوں گی۔ آخر علامہ اس بیگم کو لانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھیں شبہہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے مبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہو، انھوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوئی لیکن اگر آپ کے دل میں کوئی شبہ اور وسوسہ ہے تو دوبارہ نکاح کر لیجیے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھوایا گیا۔ یہی خاتون جاوید اور منیرہ کی والدہ ہیں۔

کیا یہ سوانح عمری ہے؟ وہ کیا چیز تھی جو اس کے بغیر تشنہ رہتی؟ یا ذکر اقبال ادھورا رہتا؟ سوانح اس لیے مرتب کیے جاتے ہیں کہ دوسروں کے لیے نمونہ ہوں اور لوگ ان سے مختلف العنوان بالیدگی حاصل کریں۔ جس سوانح حیات میں کوئی سی افادیت نہیں، یا کوئی تاریخی پہلو نہیں، اور جو واقعہ بیان کیا ہے، اس میں کوئی سی خوبی یا حسن نہیں، بلکہ ذم کا پہلو ہے، اس کو سوانح

میں درج کرنا کس منطق واستدلال کی رُو سے جائز ہے، اوراس میں کون سی بڑائی ہے۔ اس قسم کے واقعات بہت سی زندگیوں کو پیش آتے اور وہ ان سانحات میں سے گزرتی ہیں لیکن ان کے لیے مشرقی سوانح حیات میں کوئی سی جگہ نہیں اور نہ مشرقی ادب کے سوانح نگاروں نے ان حادثوں کو کسی رعایت سے کوئی جگہ دی ہے۔ علامہ اقبال نے دوسری شادی کی تو عفیفہ خاتون پر افترا باندھا گیا لیکن آخرکار وہ جھوٹ چھٹ گیا۔ مولانا سالک نے اس کا ذکر کیوں ضروری خیال کیا؟ واللہ اعلم!

آخر نئی پود کے لیے اس میں کیا ہے؟ الا یہ کہ نئی پود عنفوانِ شباب میں لہوولعب کی زندگی بسر کرنے کے لیے علامہ کے عنفوانِ شباب کو حجت بنا لے اور اس خیال سے مطمئن ہو کہ عنفوانِ شباب میں معصیت کی راہوں سے گزرنا ناگزیر روایت ہے۔

محولہ بالا اقتباس میں سوانح حیات کی ادنیٰ سی رفعت بھی نہیں ہے۔

یہ روایت کہ علامہ نے والدۂ جاوید کو حرم میں لانے کے لیے مرزا جلال الدین کو حکیم نور الدین خلیفۂ اوّل کے پاس قادیان بھیجا کہ شرعی مسئلہ پوچھ آؤ۔ پھر اس کی رائے کے مطابق ایک مولوی صاحب کو بلا کر دوبارہ نکاح پڑھا گیا، بظاہر ایک افسانہ ہی ہے۔ نہ جانے اس کا واضع کون ہے؟ سالک صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ علامہ قادیانیت کے ارتداد کا اعلان کر چکے ہیں اور وہ قادیانی امت کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے تھے، اس روایت کو اس تفصیل سے بیان کیا کہ بالواسطہ احمدیت کا ''دفاع'' ہو گیا ہے۔ کیا لاہور میں تب کوئی عالم دین نہ تھا۔ علامہ اس زمانے میں ہندوستان بھر کے چیدہ علما سے خط وکتابت رکھتے تھے، کیا اُن سے نہ پوچھ سکتے تھے؟ بالفرض علامہ اس زمانے میں مرزائیت کے خدوخال سے ناواقف تھے اور تب انھیں مسلمانوں ہی میں شامل سمجھتے تھے لیکن اس معمولی سی بات کے لیے اپنے ایک دوست کو حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجنا محض شوخی تحریر ہے۔ اس کے حق میں کوئی سی روایت یا درایت نہیں۔ علامہ مسئلے کی نوعیت خط لکھ کر دریافت کر سکتے تھے اور اگر خط اس لیے نہ لکھا کہ اس میں رسوائی کا پہلو تھا یا وہ سبکی محسوس کرتے تھے تو سالک صاحب نے اس واقعے یا افسانہ کو لکھ کر علامہ کی دستارِ عزت میں کونسا طرۂ ٹانکا ہے۔ اگر سالک صاحب کے لیے ''دوسری شادی'' کا ذکر سوانح حیات کا لازمہ تھا تو چار فقروں میں بیان کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے اس کہانی کو پھیلا کر سیرتِ اقبال کو ہیٹا کیا ہے۔ مولانا سالک نے خاندانِ اقبالؒ اور علامہ اقبالؒ ہی سے مرزا غلام احمد، حکیم نور الدین یا ان کی

امت کا رشتہ نہیں ٹانکا بلکہ ان کے استاد شمس العلما سیّد میر حسن شاہ کے ضمن میں بھی مرزا غلام احمد اور حکیم نورالدین سے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ:

''شاہ صاحب کے داماد سیّد خورشید انور بعارضۂ دق بیمار ہو گئے تو وہ انھیں قادیان لے گئے تا کہ حکیم نورالدین سے علاج کرائیں۔ قادیان پہنچ کر مسجد میں گئے اور اس دریچے میں جا بیٹھے جہاں مرزا صاحب بیٹھتے تھے، لوگ ان کو جانتے نہ تھے۔ انھوں نے انھیں وہاں سے اٹھا دیا لیکن وہ پھر دریچے کے پاس ہی آ بیٹھے، مرزا صاحب آئے تو سلام کا معمولی جواب دے کر بیٹھ گئے، اور متوجہ نہ ہوئے۔ شاہ صاحب نے کہا غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں، مرزا صاحب نے دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کو بلا کر کہا کہ شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ، دو باتوں کی خاص طور سے تاکید کی۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ہی صبح بھوک لگ جاتی ہے کیونکہ یہ عادتاً کالج جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کی حسبِ خواہش صبح ہی صبح کھانا دے دیا جائے، دوسرے انھیں اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے دی جائیں، ساتھ ہی کہا صبح چائے میرے ساتھ پئیں، بہت خاطر تواضع کی، اور جب شاہ صاحب واپس جانے لگے تو مرزا صاحب دو میل تک یکے کے ساتھ ساتھ آئے۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب نے ایک طرف جا کر ان کی باتیں سنیں، بعد میں مفصل معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوئیں، نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔'' (ذکرِ اقبال صفحہ 278)

سالک صاحب مرزائیت کے معاملے میں اس قدر فیاض تھے کہ علامہ اقبالؒ نے اس کے متعلق جو کچھ کہا اور جو قدم اٹھایا، وہ تمام حذف کر دیا ہے۔ جہاں ذکر کیا ہے مفہوم اُلٹا کر اختصار کے ساتھ لیکن مرزا غلام احمد اور ان کے حواریوں کے لیے ان سوانح میں جگہ ضرور نکالی ہے، آخر اس واقعہ کا سوانحِ اقبال سے کیا تعلق ہے۔ ذکر بس اتنا تھا کہ شمس العلما میر حسن شاہ علامہ اقبالؒ کے اُستاد تھے، ان کے سوانحی حالات نہیں لکھے، اقبالؒ کے شاگرد ہونے یا بعض دوسرے معروف شاگردوں پر ان کے التفات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے قادیان جانے کا ذکر ''شتر گربہ'' کے طور پر جڑ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے شاہ صاحب سے علیحدگی میں باتیں کی ہوں گی، لیکن سالک صاحب کے لیے مسئلہ یہ تھا:

''معلوم نہ ہو سکا کیا باتیں ہوئیں نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔''

اب اس سے کیا اخذ کیا جائے؟ کبھی اس طرح کے دو آدمی آپس میں ملیں اور معلوم نہ ہو کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں، تو ظاہر ہے کہ اس ملاقات کا ذکر ان کی یا کسی دوسرے کی مستقل سوانح عمری میں حشو محض ہوگا، گمان غالب ہے کہ سالک صاحب نے تاریخ احمدیت کو مواد مہیا کرنے کے لیے اس قسم کے ماخذ قائم کیے ہیں۔

سالک صاحب نے کبھی ان لوگوں کا تذکرہ احسن طریق سے نہیں کیا جو مرزائیت کے خلاف تھے۔ مولانا ظفر علی خاں ان کے قلم کی شدید زد میں رہے، حالانکہ اپنے صحافتی سفر کا آغاز سالک نے زمیندار سے کیا تھا اور مولانا کے دبستانِ صحافت سے فیضیاب ہوئے تھے۔ مرزا غلام احمد سے متعلق ان کا قلم ہمیشہ محتاط رہا۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سوانحی تذکرے یا سوانحی خاکے میں مرزا غلام احمد کا ذکر بلاضرورت شامل کیا۔ واضح رہے کہ برعظیم میں مسلمانوں کے سیاسی مکتبِ فکر دو تھے، ایک کے عظیم ذہنی رہنما اقبالؒ تھے، دوسرے کے مولانا ابو الکلام آزاد، سالک نے ان دونوں کو مرزا غلام احمد کے آستانے پر حاضر کیا۔ پس منظر میں کیا تھا؟ اللہ تعالیٰ ہی علیم وخبیر ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی سب سے بڑی نثری تحریر، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے خطبات ہیں، ان خطبات سے وہ عمر کے آخری دور میں مطمئن نہیں تھے، فرماتے ''علم بہت آگے بڑھ چکا ہے چونکہ انسانی فکر نے بہت سی راہیں ڈھونڈھ لی ہیں لہٰذا خطبات نظر ثانی کے مستحق ہیں'' اس کے بعد علامہ کی سب سے بڑی نثری تحریر، قادیانیت سے متعلق ہے اور اس بارے میں علامہ نے آخر تک کوئی ترمیم نہیں کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں جو کچھ لکھا یا اس سے پہلے قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کے متعلق جو بیان دیا، اور کئی اخباری سوالات کے جوابات جن نپے تلے الفاظ میں دیے، وہ سب ان کی نثری تحریروں کا حرفِ آخر ہیں۔ سالک صاحب نے ان عظیم بیانوں کا ذکر ایک صفحے سے زیادہ نہیں کیا۔

فرماتے ہیں:

''خدا جانے علامہ اقبالؒ نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا جس میں یہ بتایا کہ اس فرقے (احمدیت) کی بنیاد ہی غلطی پر ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کیے اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔

علامہ نے انتہائی اشتعال و ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت امام جماعت احمدیہ، اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا۔'' (صفحہ 210)

سالک صاحب کی ذہنی اُپج ہے کہ انھوں نے قادیانیت سے متعلق علامہ کے خیالات کو ''خدا جانے کس عقیدت مند کی درخواست'' قرار دیا ہے۔ قادیانیت کی بنیاد علامہ نے غلطی پر نہیں لکھی بلکہ اپنے مقالے کے بین السطور میں برطانوی استعمار کی تخلیق قرار دیا، اسلام سے غداری پر محمول کیا اور اس کا تجزیہ مستقبل میں ایک طاقتور قلم کے حوالے کیا ہے۔

سالک صاحب نے سوانح کے ضمن میں بعض سرسری واقعات بھی رقم کیے ہیں لیکن حضرت علامہ نے کشمیر کمیٹی سے جس اساس پر استعفا دیا، اس کا رُخ ہی پھیر دیا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ علامہ کشمیر کمیٹی سے قادیانی امت کی دسیسہ کاری کے باعث الگ ہوئے تھے۔ اسی طرح سالک صاحب نے انجمن حمایتِ اسلام سے مرزائی امت کے نکالے جانے کا ذکر ہی نہیں کیا کہ علامہ نے اس وقت تک اجلاس ہی نہ ہونے دیا جب تک ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو اجلاس سے اٹھا کر رخصت نہ کیا۔ قادیانی امت سے متعلق سالک صاحب کی اس فیاضی کا سبب کیا ہے کہ ان کے والد قادیانی المذہب تھے۔ ان کے بھائی بھی قادیانی تھے اور وہ خود بھی مرزا بشیر الدین محمود سے ملتے ملاتے تھے۔

تاریخِ احمدیت جلد ہفتم مؤلفہ دوست محمد شاہد ادارۃ المصنفین ربوہ نے 1967ء میں شائع کی، اس کے صفحہ 240 پر عبدالمجید سالک کے ایک خط کا عکس ہے جو مرزا بشیر الدین محمود کے نام لکھا تھا، اس میں لکھا ہے:

محترمی حضرت قبلہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''جتنی ساعتیں میں نے قادیان میں گزاریں، آپ کی برکت سے بے حد مسرت و اطمینان سے بسر ہوئیں۔ مولوی عبدالوہاب عمر، عبدالعزیز خاں صاحب، شاکر صاحب نے میری خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ افسوس ہے کہ میں بوقتِ رخصت آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا، اس لیے کہ آپ مجلس شوریٰ میں مصروف تھے۔ مہر صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔''

عبدالمجید سالک

11 نومبر 1956ء کو (ذکرِ اقبال کی اشاعت کے بعد) سالک صاحب نے ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج کے متعلق لکھا کہ:

''تعلیم الاسلام کالج احمدی جماعت اور پرنسپل میاں ناصر احمد کی مخلصانہ مساعی اور شبانہ روز محنت کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ اس کالج کے کارکن جماعت کے تعمیری و تعلیمی تصورات کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہیں اور میرے نزدیک ایک ایسی درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور برکت یہ ہے کہ ربوہ کی فضا آج کل کی شہری آلودگیوں سے قطعی طور پر محفوظ ہے اور وہ ترغیبات بالکل مفقود ہیں جو تربیتِ اخلاقی میں حائل ہو کر تعلیم کے بلند تصورات کو برباد کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس درسگاہ کو پاکستانیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید و بابرکت بنائے اور اس کے کارپردازوں کو بیش از بیش سعی وجدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔

ربوہ 11 فروری 1956ء　　　　عبدالمجید سالک

(تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ 161-162)

واضح رہے کہ ''ذکرِ اقبال'' اور ''محولہ اقتباس'' پنجاب کی خلافِ قادیاں تحریک 1953ء کے بعد کی تحریریں ہیں۔ مسلمانوں کا فیصلہ دوٹوک تھا کہ وہ قادیانی امت کو ملتِ اسلامیہ میں شامل نہیں کرتے اور دائرہ اسلام سے خارج گردانتے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے اس کے فوراً بعد اپنی مدافعت کے لیے مسلمان اکابر کے تذکروں میں پناہ لینا شروع کی اور اس غرض سے ان اہل قلم کو تلاش کیا جو اپنے قلم کی معرفت مسلمانوں میں قادیانی امت کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔ ''ذکرِ اقبال'' اس رعایت سے ایک مدافعتی شہ پارہ ہے۔

فی الجملہ سالک صاحب نے سوانح اقبالؒ اس طرح مرتب کیے ہیں کہ اقبال کی عظمت کا مینار قائم نہیں رہتا، اس میں بہت سی دراڑیں یا خلل محسوس ہوتے ہیں۔ سالک جہاں ان کے سوانح کا ذکر کرتے، وہاں اس انداز سے قلم لگاتے ہیں کہ علامہ کی شخصیت لہو ولعب سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور جہاں ان کے افکار کا ضمناً تذکرہ کیا ہے وہاں ہندوؤں سے متعلق ان کی مغائرت کھل کے لکھی ہے۔ گاندھی و نہرو پر طنزیں کی ہیں اور وہ مسلمان جو انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ تھے، انھیں بھی نیشنلسٹ ہونے کے جرم میں رگیدا ہے، لیکن رجعت پسند سرکاری مسلمانوں کا ذکر احترام سے کیا اور ان کی کاسہ لیسی کو مخفی رکھا ہے، قادیانیت کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا علامہ

اقبالؒ نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا وہ بداہتہً کسی عقیدت مند کی درخواست پر تھا، ان کے اپنے ''مطالعہ وتجزیہ'' اور ''غور وفکر'' کا حاصل نہیں تھا ورنہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد قادیانی العقیدہ تھے اور والدۂ جاوید کے متعلق علامہ کی بدگمانی رفع ہوگئی تو ازدواجی زندگی قائم کرنے کے لیے حکیم نورالدین (خلیفۂ اوّل) سے شرعی مسئلہ دریافت کیا۔ پھر انہی کے حسبِ مشورہ عمل کیا۔

حضرت علامہ نے یہ کہیں نہیں کہا کہ قادیانی امت کی بنیاد غلطی پر ہے۔ انھوں نے اس کی بنیاد اسلام سے ''غداری'' قرار دی ہے۔ غداری کو غلطی کہنا قلم کی اچھوتی بانگی ہے۔ المختصر ذکرِ اقبال کئی ایک غلطیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سالک کے بہار آفریں قلم کی سب سے بڑی غلطی ہے۔

محمد عطاء اللہ صدیقی

علامہ اقبالؒ کے خلاف قادیانی پراپیگنڈہ

ربِ کائنات اور حضور رحمتہ للعالمین کی ہدایت و گواہی کے بعد اسلام اپنی صداقت اور حقانیت کے لیے کسی انسان کی حمایت و شہادت کا مکلّف و محتاج نہیں خواہ وہ حکمت و دانش، قوت و عظمت اور فہم و بصیرت کے کتنے ہی بلند درجے پر فائز کیوں نہ ہو۔ مگر قادیان سے خانہ ساز نبوت کا پرچم لہرانے والے مرزا غلام احمد قادیانی کی جماعت اپنے موقف کو سچا ثابت کرنے کے لیے کبھی چوہدری ظفر اللہ کی ''سیاسی بصیرت'' کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، کبھی ڈاکٹر عبدالسلام کے نوبل پرائز کو لہرا کر لوگوں کو غیر ضروری طور پر مرعوب کرنے کی کاوش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے تو کبھی شاعرِ مشرق اور ان کے خاندان کے مرزا آنجہانی کے ساتھ ''گہرے تعلق'' کا ''سراغ'' لگا کر اس کی جھوٹی نبوت کے شجرِ خشک کو سیراب کرنے کی بے کار سعی میں ہلکان ہوتی نظر آتی ہے۔ حالانکہ علامہ اقبال نے اپنے اشعار اور مضامین کے ذریعے مرزا غلام قادیانی کی جھوٹی نبوت پر وہ کاری ضربات لگائی ہیں کہ ان کی چوٹ سے قادیان و ربوہ کا پایۂ چوبیں آج بھی لرزہ براندام ہے۔ اقبال نے قادیانیت کے لیے ''برگِ حشیش، غارت گر، فتنۂ ملتِ بیضاء، یہودیت کا مثنیٰ، قوتِ فرعون کی در پردہ مرید، سٹہ باز، وغیرہ جیسے ہوش ربا الفاظ استعمال کیے۔ انھوں نے قادیانیوں کو ''اسلام اور ہندوستان دونوں کا غدار'' قرار دیا۔ اس لیے اگر علامہ اقبال ان قادیانی محققین کی کاوش ہائے ''تحقیق'' کا آئے دن نشانہ بنے رہتے ہیں تو یہ بات زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے۔

قادیانی مصنفین اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے نہایت تواتر سے یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ علامہ اقبال کا قادیانیت سے ''گہرا تعلق'' یا ''گہری وابستگی'' رہی ہے۔ ان کے خیال میں اقبال کی یہ گہری وابستگی 1932ء تک قائم رہی، بعد میں مجلسِ احرار کے زیرِ اثر اور کچھ اپنی ذاتی محرومیوں کی وجہ سے وہ قادیانیت کے شدید مخالف ہو گئے۔ اقبال کے قادیانیت سے اس

''گہرے تعلق'' کے ثبوت کے طور پر وہ درج ذیل واقعات پیش کرتے ہیں۔

1- علامہ اقبال نے 1911ء میں خطبہ علی گڑھ میں قادیانی فرقہ کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' قرار دیا۔

2- اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں کہا تھا کہ ''وہ غالباً ہندوستانی مسلمانوں میں سب سے بڑے دینی مفکر ہیں۔''

3- 1897ء میں اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

4- اقبال نے اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کو تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے بھیجا تھا۔

5- خاندان اقبال کی احمدیت اور بانی سلسلہ احمدیہ سے گہری وابستگی تھی۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے قادیانی مصنف ایک سے زیادہ مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ یہ گمراہ کن تاثر دینا چاہتے ہیں کہ قادیانی مذہب صداقت پر مبنی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اقبال جیسا حکیم الامت شاعر اتنا طویل عرصہ اس جماعت سے ''گہرا تعلق'' کیوں رکھتے؟ ان کا دوسرا مقصد اقبال کی شخصیت کے متعلق عوام الناس میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں اقبال اور فکر اقبال سے متعلق عقیدت واحترام کے جذبات کو ختم کرنا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اقبال مستقل مزاج دانشور نہ تھے، مذہب کے متعلق ان کی اپروچ محض سطحی تھی، وہ جذبات میں آ کر کسی گروہ کے خلاف ہو جاتے تھے، وغیرہ۔ ان کے خیال میں جب اقبال کی اپنی شخصیت مشکوک قرار پائے گی، تو اقبال کے ان مضامین کا عوام پر اثر باقی نہیں رہے گا جو انھوں نے 1935ء اور 1936ء کے دوران قادیانیت کے خلاف تحریر کیے تھے۔ یہ مضامین رد قادیانیت کے ضمن میں معرکتہ الآراء لٹریچر کا درجہ رکھتے ہیں، قادیانی ذہن شروع سے ان کے اثرات کو زائل کرنے کی تدابیر سوچنے میں مصروف رہا ہے۔

ایک عام شخص جس کا اقبال کے متعلق مبلغ علم بانگ درا، بالِ جبریل یا اسرار ورموز تک ہی محدود ہو اور وہ ان کی سوانح کے تمام پہلوؤں سے واقفیت نہ رکھتا ہو، یا وہ دیسی یہودیت یعنی قادیانیت کے پراپیگنڈہ کے ''اسرار ورموز'' کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو، وہ اگر ایسی باتیں پڑھ کر چکرا جائے اور اقبال سے اس کی عقیدت کا روحانی رشتہ متزلزل ہوتا نظر آئے تو اس میں حیرت

کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اقبال اور قادیانیت کے حوالہ سے یہ وہ زہریلا پراپیگنڈہ ہے جس کا فسوں بہت سے لوگوں کے قلوب میں اوہام پیدا کر چکا ہے۔ وہ ذرا بھر کے لیے یہ سوچنے کو بھی تیار نہیں ہیں کہ ''بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست'' کا درس دینے والا اور ''خودی کا سر نہاں، لا الہ الا اللہ'' جیسے دلوں کو گرمانے والے ترانوں کا حدی خواں، اقبال قادیانیت کے لیے ''ٹھیٹھ نمونہ'' جیسے الفاظ بھی کہہ سکتا ہے؟ کیا وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو عظیم ''دینی مفکر'' بھی کہہ سکتا ہے؟ قادیانی دانش بازوں کے یہ سوال ایسے نہیں ہیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے یا انھیں خود ساختہ بے بنیاد الزامات کہہ کر دل کو مطمئن کر لیا جائے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا قادیانی پراپیگنڈہ کا شکار ہو کر اقبال سے عقیدت کا تعلق توڑ لیا جائے؟ کلام اقبال جیسے عظیم تہذیبی ورثہ سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے؟ کیا مان لیا جائے کہ اقبال وہ کچھ تھا جو قادیانی ہمیں دکھانا چاہتے ہیں؟ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو اس کے عام قاری کو ایک اچھی خاصی آزمائش میں مبتلا کر سکتا ہے۔ مگر یہ آزمائش اور امتحان کا مرحلہ محض اس وقت تک رہتا ہے جب تک ایک قاری اپنے آپ کو ''اقبال اور احمدیت'' کے مصنف کی جمع کردہ معلومات تک ہی محدود رکھتا ہے۔ اگر اس میں طلبِ صادق ہے اور وہ حقیقی معنوں میں ان سوالات کے صحیح جوابات تلاش کرنے میں ذرا بھر بھی سنجیدہ ہے، اگر وہ ملتِ اسلامیہ کے عظیم ترین شاعرانہ و تہذیبی ورثہ سے محض قادیانی مصنفین کی گواہی کی بنیاد پر محروم نہیں ہونا چاہتا تو پھر جلد ہی اصل حقائق اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد اس کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو قادیانیت کے ایک عام طالب علم کی اصل حقائق سے آگاہی کے بعد ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ عبدالماجد یا اس طرح کا کوئی قادیانی مصنف اسے کہیں سرِ راہے مل جائے اور وہ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھے، کہ اقبال جیسے عاشقِ رسول کو قادیانیت کے گند سے ملوث کرنے کی تو نے جسارت کیونکر کی؟ جسے تو نے حقائق بنا کر پیش کیا ہے، کذبِ صدق نما کی طرح کی باتیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

علامہ اقبال سے منسوب مندرجہ بالا واقعات و خیالات نہ تو سب کی سب جھوٹ اور ''بے بنیاد'' باتیں ہیں اور نہ یہ ''تاریخی شواہد'' اور ''تمام تر حقائق'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعض معمولی سے واقعات کو قادیانی پراپیگنڈہ مشینری نے اپنی ابلاغی مہارت سے کام لیتے ہوئے ایک خاص رنگ میں پیش کرنے کی کاوش کی ہے۔ تفصیلات آگے آئیں گی، یہاں ہم مختصراً نہایت ذمہ داری

کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان باتوں سے اقبال کا قادیانیت سے ''گہرا تعلق'' ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ 1911ء میں اقبال نے اپنے انگریزی خطبہ میں جن الفاظ کا استعمال کیا تھا، ان کا ترجمہ ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' درست نہیں ہے۔ اقبال نے 1897ء میں قادیان جا کر مرزا غلام احمد کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی۔ اقبال نے مرزا قادیانی کو ''دینی مفکر'' کبھی نہیں کہا۔ آفتاب اقبال کو قادیان تعلیم کے لیے علامہ اقبال نے نہیں، بلکہ ان کے بھائی شیخ عطا محمد نے بھیجا تھا۔ تازہ ترین حقائق کے مطابق خاندانِ اقبال میں سوائے شیخ اعجاز احمد کے کسی نے بھی قادیانی مذہب اختیار نہیں کیا۔ خاندانِ اقبال کے کسی دوسرے فرد نے کبھی بھی مرزا کی نبوت کے دعویٰ کو قبول نہ کیا۔ اقبال کا کچھ پڑھے لکھے قادیانیوں سے تو تعلق رہا، مگر قادیانیت سے ان کا کبھی تعلق نہیں رہا۔ ان دونوں باتوں میں جو اصولی فرق ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے جو کچھ کہا، اس کا حقیقی مفہوم اس دور کے معروضی حالات کو پیش نظر رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ اقبال سے منسوب ان باتوں کے مختصر جوابات ظاہر ہے عام قاری کے لیے مکمل تشفی کا باعث نہیں بن سکتے۔ لہٰذا اپنے اس دعویٰ کی تائید میں ہم نے ان تمام نکات کو ترتیب وار مفصل بیان کر دیا ہے۔ ان کو پڑھنے کے بعد قارئین کرام خود ہی فیصلہ کر لیں کہ اقبال کا قادیانیت سے کس حد تک تعلق تھا۔

اب آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ ان باتوں کا پس منظر اور حقیقت کیا ہے جس کی بنیاد پر قادیانی مصنف شیخ عبدالماجد اقبال کے قادیانیت سے ''گہرے تعلق'' کا دعویٰ کرتا ہے۔

1- ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ؟''

قادیانی فرقہ سے علامہ اقبال کے گہرے تعلق کو ثابت کرنے کے لیے قادیانی محققین اپنے فرسودہ تخیل کی پٹاری سے جو دلائل ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئے ہیں، ان میں ہماری نگاہ میں ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' والی دلیل سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ اگر ہم اس معاملہ کے متعلق اقبال کے بارے میں مطمئن ہو جائیں تو دیگر دلائل سطح سمندر پر حباب کے مانند نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون کا اچھا خاصا حصہ ہم نے اسی موضوع کے لیے مختص کیا ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، علامہ اقبال نے 1911ء میں علی گڑھ میں **The Muslim Community - A Sociological Study,** کے عنوان سے ایک خطبہ دیا تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس خطبہ کا اردو ترجمہ ''ملت بیضا پر ایک عمرانی

نظر'' کے عنوان سے شائع کیا تھا، مگر اصل انگریزی خطبہ ناپید ہوگیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا بھلا ہو کہ وہ اپنی تحقیق کے دوران اقبال میوزیم سے اس عظیم الشان خطبہ کا پورا انگریزی متن ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انھوں نے 1980ء میں اسے دوبارہ شائع کرایا۔ ہاشمی صاحب کے بقول اصل خطبہ معدوم ہو چکا تھا۔ خود اقبال کے پاس بھی اس کی نقل محفوظ نہ تھی۔ ڈاکٹر رفیع الدین کو جو مسودہ ملا ہے، اس کے آغاز میں اقبال کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وضاحتی شذرہ بھی ہے۔ یہ اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ خود اقبال نے اپنے ہاتھ سے یہ وضاحت لکھ دی کہ اس خطبہ میں انھوں نے قادیانیت کے بارے میں جو کچھ کہا، اس کا پس منظر کیا تھا۔

''مسلم کمیونٹی'' والے خطبہ میں ایک ادھورا جملہ ایسا ہے، جس سے قادیانی مصنفین نے اقبال کے خلاف اپنے پراپیگنڈہ کی عمارت کو استوار کرنا چاہا ہے۔ وہ جملہ یوں ہے:

"In the Punjab, the essentially Muslim type of character has found a powerful expression in the so-called Qadiani sect."

مولانا ظفر علی خان جو عربی اور فارسی زبان کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست مترجم بھی تھے، نجانے کس کیفیت میں تھے کہ انھوں نے اس جملہ کا ترجمہ یوں کیا:

''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔''

مولانا کے ذوقِ نظر اور اردو محاورہ سے بے پناہ شغف نے ایسا رنگ دکھایا کہ ترجمہ میں محاورہ کا رنگ کچھ چوکھا ہی پڑ گیا۔ انہیں اگر ذرا برابر بھی خدشہ ہوتا کہ بعد میں قادیانی پراپیگنڈہ باز ان کے اس با محاورہ ترجمہ کو قادیانیت کی تشہیر کے لیے یوں لے اُڑیں گے، تو وہ محاورہ بازی سے ضرور باز رہتے اور اردو زبان پر اپنے عبور کے اظہار کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے۔ مولانا کی روح سے ذرا معذرت کے ساتھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اقبال کے خطبہ کے انگریزی الفاظ اور مولانا کے ترجمہ کردہ الفاظ میں تاثیر اور ابلاغ کے اعتبار سے بہت نمایاں فرق ہے۔ انگریزی الفاظ کے مقابلے میں ترجمہ کردہ الفاظ بے حد جاندار، بلیغ، تیکھے اور مؤثر ہیں۔ تاثر کا فرق اس قدر زیادہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہہ دوں کہ یہ ترجمہ درست نہیں ہوا۔ مولانا اگر زندہ ہوتے تو شاید اس خطا گرفتنی پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے داد ضرور دیتے۔ میں **"Muslim type of character"** کا ترجمہ ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' کرنے کے متعلق تحفظات کا شکار

ہوں اور ترجمہ کی صحت کو قبول کرنے میں تامل کا شکار ہوں۔ ان انگریزی الفاظ کے لیے ''اسلامی سیرت'' اور ''ٹھیٹھ نمونہ'' کی تراکیب دلکش اور بامحاورہ ہونے کے باوجود لفظی ترجمہ کی حدود سے بہت دور جا پڑی ہیں۔ میں ابھی تک یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ مولانا نے اپنے جملہ میں ''جماعت'' کا لفظ کس انگریزی لفظ کے ترجمہ کے طور پر استعمال کیا۔ اسلامی لٹریچر میں ''سیرت'' کا لفظ عام طور پر ''سیرت النبی ﷺ'' کے مفہوم میں ادا ہوتا ہے، کسی گروہ کے لیے ''کردار'' ہی بہتر سمجھا جاتا ہے۔ قادیانی فرقہ کے لیے ''سیرت'' کا لفظ بارِ خاطر گراں گزرتا ہے، مزید برآں مولانا نے جملہ میں So-called کا ترجمہ ''نام نہاد'' شامل نہیں کیا۔ غالباً مولانا ظفر علی خان کے دماغ میں قادیانی فرقہ کے بارے میں ''اسلامی سیرت'' کی تراکیب استعمال کرتے ہوئے اس کے وہ مضمرات نہ تھے جو بعد میں ظاہر ہوئے۔ بعد میں قادیانیوں نے مولانا ظفر علی خان کے ان چار الفاظ کو اپنے حق میں اس طرح استعمال کیا کہ گویا اب اس کے بعد کسی اور صداقت کی سند کی انہیں حاجت نہیں رہی۔ شیخ عبدالماجد قادیانی نے اپنی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں کم از کم 50 مقامات پر ان الفاظ کو دُہرا کر اقبال کو طعنہ دیا ہے کہ 1910ء میں قادیانیت کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' کہنے والا اقبال 1935ء میں محض سیاسی مقاصد کے لیے اس پر شدید تنقید پر اتر آیا۔ اپنی مطلب براری کے لیے ان الفاظ کی تکرار قادیانی پراپیگنڈے کی ایک خاص ٹیکنیک کو ظاہر کرتی ہے جو معلوم ہوتا ہے انہوں نے یہودیوں سے سیکھی ہے۔

اقبال اور قادیانیت کے حوالہ سے شاید ہی کسی قادیانی کا کوئی مضمون یا کتاب ہو جس میں ''اسلامی سیرت'' اور ''ٹھیٹھ نمونہ'' کے الفاظ کا ذکر نہ پایا جاتا ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب جسٹس (ر) جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' تحریر کی تو مولانا ظفر علی خان کے ترجمہ کو نقل کرنے کے بجائے اپنی جانب سے ان الفاظ کا ترجمہ ''خالصتاً مسلم کردار کا طاقتور مظہر'' کے الفاظ میں کیا جو نسبتاً بہتر ہے، لیکن راقم کو اس ترجمہ پر بھی کلیتاً اطمینانِ قلب نہیں ہے۔ جناب جاوید اقبال نے 'Essentially' کا ترجمہ ''خالصتاً'' کیا ہے، جو شاید قریب ترین تو ہے مگر حقیقی لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ اس انگریزی لفظ کے لیے ''بنیادی طور پر'' یا ''بدیہی طور پر'' کے الفاظ زیادہ قریبی مفہوم ادا کرتے ہیں پھر انھوں نے 'Muslim type of character' کا ترجمہ ''مسلم کردار'' کیا ہے۔ راقم کی ناقص رائے میں یہ ترجمہ 'Muslim character' کا

ہے، ''مسلم ٹائپ آف کریکٹر'' کا ترجمہ شاید تھوڑا سا مختلف ہونا چاہیے تھا، اس کے لیے ''مسلم طرز کا کردار'' کی ترکیب انگریزی الفاظ کے زیادہ قریب نظر آتی ہے بہرحال جاوید اقبال صاحب کی طرف سے ''مسلم کردار'' کے الفاظ مولانا ظفر علی خان کے ''اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونہ'' سے بدرجہا بہتر ہیں۔ میرے خیال میں ''طاقتور مظہر'' کے الفاظ بھی انگریزی الفاظ سے زیادہ قوی تاثر دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا انگریزی جملہ کا ترجمہ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے:

''پنجاب میں بنیادی اعتبار سے مسلم نوعیت کا کردار مؤثر طور پر نام نہاد قادیانی فرقہ میں ظاہر ہوا ہے۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ میں مسلم طرز کے کردار کے قادیانی فرقہ میں ظہور کی بات کس تناظر میں کی اور کیوں کی؟ ان سوالات کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ اقبال نے اس خطبہ میں کن موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ اقبال نے خطبہ کے تمہیدی کلمات میں خود ہی بیان کیا کہ وہ ''مسلم کمیونٹی'' کے بارے میں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے تین بنیادی نکات پر اظہارِ خیال کرنا ضروری سمجھتے ہیں: یعنی

1- The general strurture of Muslim community.
2- The uniformity of the Muslim culture.
3- The type of character essential to a continuous National life of Muslim community.

''نکتہ نمبر 1'' کے تحت مسلم کمیونٹی کی عمومی ساخت بیان کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ مسلم قوم اور دیگر اقوامِ عالم کے درمیان بنیادی فرق ہمارا مخصوص تصورِ قومیت ہے۔ زبان، ملک یا معاشی مفادات کی وحدت ہماری قومیت کی بنیاد نہیں ہیں، ہماری بنیاد اس تصور پر مبنی ہے کہ ہمارا کائنات کے متعلق نظریہ ایک ہے اور ہم اس سوسائٹی کے ارکان ہیں جس کی بنیاد پیغمبر اسلام ﷺ نے ڈالی تھی۔ اقبال نے نہایت وضاحت سے بیان کیا کہ علاقائی یا وطنی قومیت کا تصور اسلام سے میل نہیں کھاتا۔ انھوں نے وطنی قومیت کے تصور کو بت پرستی سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اقبال نے فرمایا کہ درحقیقت تمام قوموں میں ایک خاص نوعیت کی بنیاد پرستی (Fanaticism) پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایک فرانسیسی کے مذہب پر تنقید کریں، وہ اس کا زیادہ بُرا نہیں منائے گا۔ مگر آپ اس کے وطن، تہذیب اور قومی رویہ پر معمولی سی

تنقید کریں تو وہ بھڑک اٹھے گا۔ انھوں نے کہا کہ ایک مسلمان کے جذبات اس کے مذہب پر تنقید سے برانگیختہ ہوتے ہیں، کیونکہ اس کی عصبیت کی بنیاد مذہب ہے نہ کہ وطن۔ اقبال نے بتایا کہ اسلام کی اہمیت ہمارے لیے محض ایک مذہب کی نہیں ہے، یہ ہمارے لیے ایک قومی مفہوم بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اسلامی اصولوں پر ایمان لائے بغیر ہماری سماجی زندگی ناقابلِ تصور ہے۔ مذہب ہمارے لیے تمام چیزوں سے اعلیٰ و برتر معاملہ ہے۔

''نکتہ نمبر 2'' کے ضمن میں اقبال نے فرمایا کہ یہی عقیدے کی وحدت جس پر ہماری سماجی زندگی انحصار کرتی ہے، مسلم کلچر کی وحدت سے تقویت پاتی ہے۔ محض اسلامی اصولوں پر ایمان ہی کافی نہیں ہے۔ اجتماعی زندگی میں بھرپور شرکت کے لیے ایک فرد کا ذہن مکمل انقلاب سے گزرتا اور مختلف اسلامی اداروں سے تشکیل پاتا ہے۔ ہمارا کلچر نسبتاً آفاقی نوعیت کا ہے، یہ کسی خاص علاقے کے لوگوں پر انحصار نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے کلچر کی تشکیل میں ایران کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے ایران کی فتح کو اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مسلم کلچر سامی اور آریائی تہذیبوں کے امتزاج سے پروان چڑھا ہے۔ مسلم معاشرے کا رکن بننے کے لیے ایک فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہبی اصول پر غیر مشروط ایمان رکھتا ہو اور اسے چاہیے کہ وہ اسلامی کلچر کو اپنے اندر مکمل طور پر جذب کرے۔ اس انجذاب کا مقصد یہ ہے کہ ایک متفقہ ذہنی نکتہ نظر پیدا کیا جائے، ایک متعین مطمح نظر جس کی روشنی میں ان مخصوص اقدار کا ادراک کیا جائے جو ہمیں بحیثیت قوم دوسری اقوام سے ممتاز کرتی ہیں اور ایک مسلمان کی اس انداز میں ماہیتِ قلبی کرتا ہے کہ جس کے پیش نظر ایک مخصوص مقصد اور نصب العین ہو۔ اقبال نے انجذاب کے ان مقاصد کی تکمیل کو ''بنیادی طور پر مسلم طرز کا کردار'' **Essentially Muslim type of character** کا نام دیا۔ یہ **Phrase** زیر بحث امور کو سمجھنے کے لیے ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

اقبال نے قادیانی فرقہ کا ذکر نکتہ نمبر 3 کی وضاحت کے ضمن میں کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نکتہ کا مکمل متن سامنے رکھنے کے بعد اس پر بات کی جائے تا کہ اس بات کا سیاق و سباق دیکھتے ہوئے اقبال کے منشاء کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے کہا:

"The third point need not detain us long. The above

remarks indicate the principal features of an essentially Muslim type of character. The various types of character, however, that become popular in a community do not appear haphazard. Modern Sociology teaches us that the moral experience of nations obeys certain definte laws. In primitive societies where the struggle for existences is extremely keen and draws more upon man's physical rather than intellectual qualities it is the valiant man who becomes an object of universal admiration and imitation. When, however, the struggle relaxes and the peril is over, the valorous type is displaced, thought not altogether, by what Giddings calls the convivial type, which takes a due share in all the pleasures of life and combines in itself the virtues of liberality, generosity and good fellowship. But these two types of character have a tendency to become reckless and by way of reaction against them appears the third great type which holds up the ideal of self control, and is dominated by a more serious view of life. In so far as the evolution of the Muslim community in India is concerned. Temur represented the first type, Babar combined the first and the second. Jahangir embodied pre-eminently the second, while the third type was foreshadowed in Alamgir whose life and activity forms, in my opinion, the starting point in the growth of Muslim Nationality in India. To those whose knowledge of Alamgir derived from the Western interpreters of Indian history, the name of Alamgir is associated with all sorts of cruelty, intolerance, treachery and political intrigue. I shall be drifting away from the main point of this lecture if I undertake to show, by a right interpretation of contemporary history, the legitimacy of motives that guided Alamgir's political life. A critical study of his life and times has convinced me that the charges brought against him are based on a misinterpretation of contemporary facts, and a complete misunderstanding of the name of social and political forces, which were the working in the Muslim

State. To me the ideal of character, foreshadowed by Alamgir is essentially the Muslim type of character, and it must be the object of all our education to develop that type. If it is our aim to secure a continuous life of the community, we must produce a type of character, which at all costs, holds fast to its own, and while it readily assimilates all that is good in other types, it carefully excludes from its life all that is hostile to its cherished traditions and institutions. A careful observation of the Muslim Community in India reveals the point on which the various lines of moral experience of the community are now tending to converge. In the Punjab the essentially Muslim type of character has found a powerful expression in the so-called Qadiani-sect: while in the United Provinces, owing to a slightly different intellectual environment, the need of such a type of character is loudly proclaimed by a great poetic voice. In his light-hearted humour Maulana Akbar of Allahabad, aptly called the tongue of the times, conceals a keen perception of the nature of the forces that are at present working in the Muslim Community. Do not be misled by the half-serious tone of his utterances; he keeps his tears veiled in youthful laughter, and will not admit you into his workshop until you come with a keener glance to examine his wares. So deeply related are the currents of thought and emotion in a homogeneous community that if one portion reveals a certain organic craving the material to satisfy that craving is almost simultaneously produced by the other."

(تصانیفِ اقبال از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صفحہ 491 تا 493)

''تیسرے نکتہ'' کے ضمن میں اقبال نے جدید عمرانی علوم کی روشنی میں تاریخی ارتقا کے اعتبار سے اقوام کو تین مختلف درجات (Types) میں تقسیم کیا۔ وہ کہتے ہیں تمدن کی بالکل ابتدائی شکل وہ ہوتی ہے جہاں جہد للبقاء بہت اہمیت رکھتی ہے، اس میں انسان کی عقلی صلاحیتوں کے مقابلے میں جسمانی طاقت زیادہ قابلِ اعتناء ہوتی ہے۔ اس دور میں تشدد پسند انسان ہی

''نمونہ'' سمجھا جاتا ہے۔ پھر جب جہد للبقاء کی کشمکش ڈھیلی پڑتی ہے تو قوموں کے کردار کی دوسری شکل سامنے آتی ہے، اس میں تشدد اور عسکریت پسندی میں کافی حد تک کمی واقع ہوتی ہے۔ زندگی سے لطف اٹھانے کا داعیہ تو ہوتا ہے، آزاد پسندی، فیاضی اور باہمی مصاحبت کے اوصاف سامنے بھی آتے ہیں۔ البتہ پہلی اور دوسری صورتوں میں جبر کا رجحان باقی رہتا ہے۔ ان کے ردعمل میں قوموں کے کلچر کی تیسری عظیم صورت رونما ہوتی ہے جس میں ضبط نفس کو نصب العین سمجھا جاتا ہے اور اس عرصہ کے دوران زندگی کے متعلق سنجیدہ اور پختہ نکتہ نظر تشکیل پاتا ہے۔ اقبال انڈیا میں مسلم کمیونٹی کے ارتقا کی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیمور پہلی ٹائپ کا نمائندہ تھا، بابر میں پہلی اور دوسری صورتوں کا امتزاج تھا جبکہ تیسری صورت کی مثال ہمیں عالمگیر میں ملتی ہے جو کہ انڈیا میں مسلم کمیونٹی کے ارتقا کا نقطہ آغاز تھا۔ اس کے بعد کی سطور ''ٹھیٹھ نمونہ'' والے جملہ سے فوراً پہلے آتی ہے، اس لیے ہم یہاں ان کا لفظ بہ لفظ ترجمہ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

''عالمگیر کی حیات اور اس کے دور کے ناقدانہ مطالعہ کے بعد میں قائل ہو گیا ہوں کہ اس کے خلاف عائد کردہ الزامات عصری حقائق کی غلط تعبیر اور اُس وقت کی مسلم ریاست میں سیاسی اور سماجی قوتوں کے متعلق غلط رائے قائم کرنے پر مبنی ہیں۔ میرے نزدیک وہ مثالی کردار جو عالمگیر کی شکل میں نمودار ہوا، ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' (مولانا ظفر علی خان کا ترجمہ) ہے اور ہماری تمام تعلیم کا مقصد ہی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس طرز کے کردار کو فروغ دے۔ اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ملت اسلامیہ کی حیات کے تسلسل کا تحفظ کریں، ہمیں ایک ایسی طرز کا کریکٹر پیدا کرنا چاہیے جو کہ ہر قیمت پر قائم رہے، یہ دوسری اقوام کے اچھے اوصاف کو اپنے اندر جذب ضرور کرے مگر اسے اپنی اجتماعی حیات سے ان عناصر کو نکال باہر کرنا چاہیے جو ہماری محبوب روایات اور اداروں سے متصادم ہوں۔ ہندوستان میں مسلمان معاشرے کا ایک محتاط مشاہدہ ایک خاص مرکزی نقطہ کو ظاہر کرتا ہے کہ جس پر امت کے مذہبی تجربے کی مختلف شکلیں مرتکز ہونے کا میلان ظاہر کر رہی ہیں۔ پنجاب میں بنیادی طور پر مسلم طرز کا کردار (اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونہ۔ ظفر علی خان) موثر انداز میں نام نہاد قادیانی فرقہ میں ظاہر ہوا ہے۔''

فقرہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس جملہ کا سباق سمجھنے کے لیے اس کے بعد آنے والی سطور کا

ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

......جبکہ یو پی میں، نسبتاً مختلف فکری فضا کی بناء پر، ایک عظیم شاعرانہ آواز کی طرف سے اس طرز کے کریکٹر کی ضرورت کی صدا بلند کی جارہی ہے۔ مولانا اکبرالٰہ آبادی جنھیں بجاطور پر لسان العصر کہا جاتا ہے، نے اپنے ہلکے پھلکے مزاحیہ کلام میں مسلم کمیونٹی میں کارفرما عناصر کی نوعیت کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اکبرالٰہ آبادی کے نیم سنجیدہ لہجہ کے متعلق غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، وہ اپنے بھرپور قہقہہ میں آنسوؤں کی مالا چھپائے رکھتے ہیں اور وہ اپنے خیالات سے مزین دکان میں اس وقت تک داخلہ کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ انھیں یقین نہ ہوجائے کہ آپ ان کی اشیاء کے سنجیدہ خریدار ہیں۔ باہم متجانس مسلم کمیونٹی میں خیالات اور جذبات کی لہریں اس حد تک باہمی طور پر منسلک ہیں، کہ اگر ایک حصہ ایک مخصوص نامیاتی تجسس کو ظاہر کرے تو اس تجسس کی تسکین کے لیے دوسرا حصہ بیک وقت مواد پیدا کرتا ہے۔'' (تصانیفِ اقبال صفحہ 499)

قارئین کرام، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ میں منطقی ترتیب کے ساتھ پہلے مسلم کمیونٹی کے عمومی ڈھانچے کا علمی تجزیہ پیش کیا، پھر مسلم کلچر میں قدرِ اشتراک کی نشاندہی فرمائی، اس کے بعد مسلمانوں کی قومی زندگی کے تسلسل کے لیے مخصوص طرز کے کردار کی تشکیل پر تفصیل سے روشنی ڈالی، دوسرے نکتہ کے آخری حصہ میں انھوں نے ''مسلم ٹائپ کے کریکٹر'' کی وضاحت کی۔ انھوں نے اس کریکٹر کے لیے مذہبی اصولوں پر غیر مشروط ایمان اور اسلامی کلچر میں انجذاب کو ضروری قرار دیا، ان کی رائے میں مسلم ٹائپ کریکٹر ایک مخصوص آفاقی تصور اور نصب العین رکھتا ہے جو ملت اسلامیہ کو دیگر اقوام سے خصوصی امتیاز عطا کرتا ہے۔ قوموں کے کردار کی تین مختلف صورتیں بیان کرنے کے بعد علامہ اقبال نے برصغیر کی مسلم تاریخ سے شہنشاہ عالمگیر کے کردار کو آئیڈیل ''مسلم ٹائپ کریکٹر'' کا نام دیا۔ اس کے بعد انھوں نے پنجاب میں اس طرز کے کردار کے ظاہر ہونے کو امکانات کے طور پر قادیانی فرقہ کا نام لیا۔ ابھی قادیانی فرقہ کا نام ہی لیا تھا کہ فوراً لسان العصر اکبرالٰہ آبادی کا تذکرہ فرمایا۔ ظفر علی خان کے الفاظ کو مستعار لیا جائے تو یوں کہا جانا چاہیے کہ ''اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونہ'' کا ان کی نگاہ میں حقیقی مصداق عالمگیر اورنگ زیب اور ان کے دور کا مسلم کلچر تھا۔ اسے وہ آئیڈیل قرار دیتے ہیں اور پھر اکبرالٰہ آبادی جس مسلم کلچر کے احیاء کے لیے اپنی شاعری کو بروئے کار لارہے تھے، وہ کلچر بھی

اقبال کے خیال میں عالمگیر کے دور کا کلچر ہی تھا۔ یہاں تک تو بات خوب تھی، مگر چلتے چلتے انھوں نے ''قادیانی فرقہ'' کا تذکرہ بھی کر دیا جسے تاریخ کے صفحات نے محفوظ رکھا، اصل سخن در ایں است'' والا معاملہ اس خطبہ کے اس ادھورے جملے نے پیدا کیا ہے۔ اقبال کی زبان سے عالمگیر اور اکبرالہ آبادی کے سیاق وسباق کے ساتھ درمیان میں ''قادیانی فرقہ'' کا ذکر نہ صرف توجہ طلب ہے بلکہ بہت سوں کے لیے آج بھی حیران کن ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم ٹائپ کے کردار کی مثالیں دیتے ہوئے اقبال ''قادیانی فرقہ'' کو بیچ میں کیوں گھسیٹ لائے؟ ؎ چہ نسبت ایں خاک را بہ عالم پاک۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ہم اقبال کو موقع دیں کہ وہ خود اس کا جواب دیں، بعد میں ہم اس دور کے معروضی حالات کی روشنی میں اقبال کے اس بیان کی عقلی ونقلی توجیہ پیش کریں۔

اقبال کی طرف سے محولہ بالا مضمون پر فوری طور پر دو حوالہ جات راقم کے سامنے ہیں، ممکن ہے ان کے اور بھی بیانات ریکارڈ پر ہوں لیکن اس کا علم راقم کو نہیں ہے۔ بیان کے اہم جملے حسب ذیل ہیں:

-1 ''مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں ظاہر نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیے۔

-2 ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت، پیغمبر اسلام ﷺ سے بھی برتر (نعوذ باللہ) کا دعویٰ واضح طور سے پیش کیا گیا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔

-3 بعد میں میرا یہ شبہ، یقین میں اور مثبت بغاوت میں اس وقت بدل گیا جب میں نے اپنے کانوں سے تحریک کے ایک پیرو کو پیغمبر اسلام ﷺ کا تذکرہ سخت تحقیر آمیز زبان میں کرتے ہوئے سنا۔

-4 کسی درخت کی جڑوں سے نہیں بلکہ اس کے ثمر سے آپ اس کی حقیقت کو پہچان سکتے ہیں۔

-5 اگر میرا موجودہ رویہ میری اپنی تردید کرتا ہے تو صرف زندہ اور سوچنے والے انسان ہی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنی تردید آپ کر سکے۔ صرف پتھر ہی اپنی تردید آپ نہیں کر سکتے۔''

''مسلم کمیونٹی'' والے خطبہ کی وضاحت کے متعلق دوسرا حوالہ اقبال کا وہ وضاحتی شذرہ ہے جو آپ نے اس کے اصل مسودہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے 21 اکتوبر 1935ء کو تحریر کیا۔ اس شذرہ کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

''کتاب تصانیف اقبال صفحہ نمبر 491''

ترجمہ: ''یہ لیکچر 1911ء میں علی گڑھ میں دیا گیا تھا۔ اس لیکچر میں قادیانیوں کے بارے میں ریمارکس پر 1911ء کے بعد سے اس تحریک کی اصل روح کے متعلق انکشافات کی روشنی میں نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ قادیانی اب بھی ظاہری طور پر مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے ظاہری معاملات کے بارے میں خاص طور پر محنت کرتے ہیں۔ لیکن اس تحریک کی روح جو اکثر ظاہر ہوتی رہتی ہے، مکمل طور پر اسلام دشمنی پر مبنی ہے۔ بظاہر وہ مسلمان دکھائی دیتے ہیں اور ایسا نظر آنے کے لیے بے تاب بھی رہتے ہیں، لیکن اندرونی طور پر ان کی تمام ذہنیت مجوسیوں جیسی ہے۔ امکان غالب ہے کہ یہ تحریک بالآخر بہائیت پر جا کر منتج ہوگی جس سے لگتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ اثر قبول کر کے پروان چڑھی ہے۔''

علامہ اقبال نے مندرجہ بالا سطور میں جو وضاحت کر دی ہے، اس سے بہتر وضاحت ان حالات میں مشکل تھی۔ بے حد ایجاز و اختصار پر مبنی اسلوب میں آپ نے بیان کر دیا کہ ربع صدی قبل قادیانی تحریک کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے اور بعد میں ان کے دل میں اس کے خلاف بیزاری اور حقارت کے جذبات کیوں پیدا ہو گئے۔ ان کا بے باکانہ اعتراف ان کے عظمتِ کردار کی دلیل ہے۔ سوال کرنے والے شخص نے ان پر تناقض (inconsistency) کا الزام عائد کیا تھا اور بادیٔ النظر میں یہ الزام کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا، مگر اقبال جیسے عظیم فلسفی نے خاندانِ مرزا اور ان کے غالی حواریوں کی طرح دجل وفریب اور سُوئے تاویل یا اپنی جھوٹی انا کی پاسداری کا کوئی بھی اسلوب اختیار نہ کیا بلکہ صاف صاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع رکھتے تھے۔ انھوں نے جن الفاظ میں اعتراف کیا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنی اس اجتہادی غلطی کا احساس بھی تھا۔ مگر کم ظرف قادیانیوں نے ایک عظیم انسان کے اس انکسارانہ مگر عظیم اعتراف کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور برابر ان کی کردار کشی کی گھناؤنی تحریک کو جاری رکھا۔ اگر قادیانی حضرات علامہ محمد اقبال کی اس وضاحت کو قبول کر لیتے

تو اس کا مطلب ہوتا:

1- قادیانی مرزا غلام احمد کی جھوٹی نبوت کو پیغمبر اسلام ﷺ کی حقیقی نبوت سے برتر جانتے ہیں۔ گو اپنے قلوبِ باطلہ میں وہ یہ فتنہ لاکھ پالتے رہیں مگر اس سوچ کے برملا اظہار و اعتراف کے مضمرات سے وہ بخوبی واقف ہیں۔

2- مرزا غلام احمد قادیانی کے حواری اس کی محبت میں اس حد تک غلو کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ رسالت مآب ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات کہنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اگر قادیانی برملا یہ بات مان لیں تو ان کے ''ظلی و بروزی'' نبوت والے مکڑی کے جال کب تک کسے رہ سکتے ہیں کیونکہ عقلی اعتبار سے ''بروز'' اصل سے برتر کیسے ہو سکتا ہے۔ اور جو اصل کے متعلق نازیبا کلمات کہہ سکتا ہے، اس کی ''بروز'' کے بارے میں عقیدت پر اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے؟

3- قادیانی بظاہر مسلمان لگتے ہیں، مگر قادیانی تحریک اسلام دشمن ہے۔ علامہ اقبال کا یہ تجزیہ آج بھی سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی اپنے آپ کو غیر مسلم کہلوانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اسلام کے پردہ میں رہ کر ہی قادیانیت پھیلانے کے ماہر ہیں۔

4- قادیانی تحریک اپنے خیالات میں بہائیت کے زیر اثر ہے۔

5- قادیانی ذہن مجوسیت کا عکس لیے ہوئے ہے۔

اس لیے قادیانی علامہ اقبال کے اس اعتراف اور وضاحت کو اپنے لیے موت کا پیغام سمجھتے ہیں۔ قادیانی اپنے تئیں یہ خیال کرتے تھے کہ اقبال کے خلاف شدید منفی پراپیگنڈہ کر کے وہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چپ کرا دیں گے یا نفسیاتی طور پر اس قدر مرعوب کر دیں گے کہ وہ ہاتھ کھڑے کر دیں گے۔ مگر علامہ صاحب نے اپنی فکری لغزش کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ قادیانی ٹولہ کی اجتماعی نفسیات اور اس تحریک کے عوامل و نتائج کا اس قدر بلیغ اور مؤثر انداز میں تجزیہ فرمایا کہ ان کی فراست کی داد دینی پڑتی ہے۔

قادیانیوں کے لیے تو علامہ اقبال کی وضاحت کو رد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا مگر علامہ اقبال کے بعض عقیدت مندوں کے ذہن میں بھی کئی سوالات جنم لے سکتے ہیں۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ جب علامہ صاحب خود کہتے ہیں، ''اگر میرے موجودہ رویہ میں تناقض ہے تو

یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان ہی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنی تردید آپ کر سکے'' تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قادیانی فرقہ کو ''مسلم کریکٹر'' کا مظہر سمجھتے تھے۔ اگر وہ ایسا سمجھتے تھے تو کیوں سمجھتے تھے؟ مزید برآں وہ قادیانیوں سے اچھے نتائج کی توقع کیوں رکھتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس ''کیوں'' کا فوری اور سادہ جواب تو یہی ہے کہ شہنشاہ عالمگیر کے دور کے مسلم کردار سے قادیانی فرقہ کو تشبیہ دینا یا ''مسلم ٹائپ آف کریکٹر'' کی جو تعریف علامہ اقبال نے خود وضع کی، اس کا قادیانی فرقے کو کسی بھی درجہ میں مصداق سمجھنا صحیح تعبیر و توضیح کے زمرے میں نہیں آتا۔ یہ ایک سوچنے والے ذہن کی one-time اجتہادی خطا تھی۔ علامہ اقبال جیسے فلسفی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کی طرف سے اس طرح کی فکری لغزش کے ارتکاب کے اسباب کا تعین کرنے کے لیے ان کے خاندانی پس منظر، قادیانی تحریک کے ارتقا، علامہ اقبال کے حلقۂ احباب، اس وقت کی عمومی فضا، سماجی و سیاسی عوامل، اقبال کے فلسفیانہ مزاج وغیرہ کے متعلق جاننا ضروری ہے۔

1910ء میں علامہ اقبال قادیانی فرقہ کے متعلق ایسا کیوں سوچتے تھے؟

اقبال نے قادیانی فرقہ کا نام کیوں لیا؟

قارئین اگر ٹھنڈے دل سے ان نکات پر غور کریں تو شاید ان کے دل میں اس طرح کے سوالات جنم نہ لیں:

(1) اقبال بنیادی اعتبار سے فلسفہ کے آدمی تھے۔ انھیں مذہب کی وہ باتیں زیادہ مرغوب تھیں جن میں مافوق الطبیعیاتی مسائل کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ 1910ء میں جب انھوں نے خطبہ علی گڑھ دیا، ان کا ذہن مشرق اور مغرب کے فلسفیانہ افکار کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس خطبہ کا آغاز انھوں نے بے حد فلسفیانہ انداز میں کیا، اس میں بے حد مشکل فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کیں۔ ان کے خطبہ کا پورا متن فلسفیانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ''مسلم کمیونٹی'' کو عمرانیات کے اصولوں میں بیان کرنے کی کوشش کی، مگر ان کا طرزِ استدلال ایک ماہر عمرانیات کے بجائے ایک ماہر فلسفی کا سا ہے۔ ظاہر ہے اس مزاج کے شخص کا تجزیہ ایک عالم دین کے تجزیہ سے مختلف ہوگا۔ 1905ء سے 1906ء کے درمیان اقبال یورپ میں بغرضِ تعلیم قیام پذیر رہے۔ یہ عرصہ بھی ان کے فلسفیانہ مزاج کی تشکیل میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہی دور تھا جب وہ جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کے نامور فلسفیوں کے کاموں سے نہ صرف متعارف ہوئے، بلکہ

وہاں کے اہل علم کی مجالس سے بھرپور مستفید بھی ہوئے۔ اب ان کا ذہن ایک عام ہندوستانی کے بجائے ایک ایسے انسان کی طرح سوچنے لگا جو کائنات کے بارے میں آفاقی نقطہ نظر کا قائل ہو اور جو اپنی فکر کی جولانگاہ کے لیے روزمرہ کے موضوعات کے بجائے اعلیٰ نظریات وافکار کو منتخب کر چکا ہو۔ اقبال جب ہندوستان واپس آئے تو ان کا حساس ذہن اُس بلندی سے نیچے آنے کے لیے مائل نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کو وہ درخور اعتناء نہ سمجھتے تھے۔ کیا بعید ہے کہ ردقادیانیت جیسے مباحث میں حصہ لینا وہ فلسفیانہ شان سے فروتر سمجھتے ہوں۔

(2) مصنف ''زندہ رود'' کا کہنا ہے کہ ''اقبال کے دوستوں میں بعض احمدی بھی تھے'' انگلستان میں قیام کے دوران ان کا جن افراد سے ملنا جلنا تھا، ان میں بھی بعض قادیانی تھے۔ خواجہ کمال الدین جو ایک معروف قادیانی مبلغ تھے اور جن کو خاص طور پر انگلستان میں ''اشاعتِ اسلام'' کے لیے بھیجا تھا، ان سے اقبال کی ملاقات اکثر ہو جاتی تھی۔ انگلستان میں Voking کے مقام پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی، اس کے لیے سرمایہ بھوپال کی نواب شاہ جہاں بیگم نے فراہم کیا تھا۔ اس مسجد پر آہستہ آہستہ خواجہ کمال الدین اور دیگر قادیانیوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ وہاں اپنے آپ کو سچے مبلغین اسلام کے طور پر پیش کرتے تھے اور نشاۃِ اسلامیہ کے اپنے آپ کو پُرجوش علمبردار بنا کر پیش کرتے تھے۔ کافی عرصہ تک لوگ ان کو مسلمان سمجھتے رہے۔ ان کے ہاتھ پر بعض اہم انگریزوں نے ''اسلام'' قبول کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ 1912ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا تو خواجہ کمال الدین باقاعدگی سے انگلینڈ میں اپنی ''اشاعتِ اسلام'' پر مبنی سرگرمیوں کی رپورٹ بھیجتے رہے، جو ''الہلال'' میں شائع ہوتی تھی۔ اس میں بڑے فخریہ انداز میں بیان کیا جاتا تھا کہ ایک ''مبلغِ اسلام'' نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور انگلینڈ جیسے اہم یورپی ملک میں ''اشاعتِ اسلام'' کے کیا کیا امکانات روشن ہیں۔ بعض روایات کے مطابق اقبال انگلینڈ میں قیام کے دوران Voking مسجد سے وابستہ رہے اور وہاں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ ان دنوں میں عبداللہ سہروردی اور شبیر حسین قدوائی نے لندن میں پان اسلامک سوسائٹی قائم کی تھی۔ اقبال اس سوسائٹی میں دلچسپی لیتے رہے۔ شبیر حسین کے متعلق راقم نے سب سے پہلے ''الہلال'' میں پڑھا۔ یہ خواجہ کمال الدین کے دوست تھے اور اُن کے بارے میں بھی مشہور تھا کہ یہ احمدی تھے۔ اقبال کے قریبی دوست شیخ عبدالقادر ایڈیٹر ''مخزن''

بھی ان دنوں انگلینڈ میں تھے۔ اقبال ان سے اکثر ملتے تھے۔ شیخ عبدالقادر کے متعلق قادیانی پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ وہ قادیانیت دوست تھے۔ خواجہ کمال الدین اور دیگر قادیانی بھی فلسفہ سے رغبت رکھتے تھے۔ کیا بعید ہے کہ اقبال ان کی ''اشاعتِ اسلام'' کی کوششوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہوں اور ان افراد نے قادیانیت کے بارے میں جو معلومات دی ہوں، وہ انھیں درست سمجھنے کا میلان رکھتے ہوں۔ یہاں ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی قادیانی مبلغ کسی مسلمان کے سامنے مرزا غلام احمد کے وہ بیانات پیش نہیں کرتا جس میں اس نے ''نبوت'' کا دعویٰ کیا تھا۔ مرزا غلام احمد کا تعارف ایک مجدد کے طور پر کرایا جاتا ہے جو امت مسلمہ کے روشن مستقبل کا خواب دیکھتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی ''مسیح موعود'' والی حیثیت کی اہمیت بیان کی جاتی ہے۔ پھر مرزا غلام احمد کے وہ منتخب جوشیلے بیانات کثرت سے بیان کیے جاتے ہیں جس میں وہ عیسائیت کے نیست و نابود ہونے اور اسلام کے احیاء کے نعرے لگاتا تھا۔ ''مسلم ثقافت'' کا احیاء بھی قادیانیوں کا ایک مرغوب موضوع ہے۔ مزید برآں ہر قادیانی مبلغ اپنے آپ کو حضورِ اکرمؐ کا عقیدت مند ظاہر کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے تاکہ ایک مسلمان اس کے بارے میں اچھا تاثر قبول کرے۔ شاید ہی کوئی قادیانی ہو جو کھل کر اپنے اصل خیالات بیان کرے۔ ایسی صورت میں ہر اس شخص کے فریب کھانے کا امکان باقی رہتا ہے جس نے قادیانیت کے لٹریچر کا بہ تمام مطالعہ نہ کیا ہو اور ان کی اجتماعی نفسیات سے بخوبی واقف نہ ہو۔ اگر میں یہ گمان کروں کہ اقبال جیسا ابھرتا ہوا فلسفی نوجوان قیام انگلستان کے دوران مذکورہ قادیانی مبلغین کی چرب زبانی کا شکار ہو گیا ہو، تو اسے اقبال کے متعلق کسی سُوئے ظن کے بجائے ان معروضی حالات میں اقبال کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کی ادنیٰ کاوش پر محمول کیا جانا چاہیے۔ راقم الحروف نے اس مسئلہ پر اقبالیات کے معروف ماہر پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب سے جب اقبال کے ''ٹھیٹھ نمونہ'' والے بیان کی توجیہ چاہی، تو انھوں نے بھی اس کے پس منظر میں مذکورہ معروضی حالات کا ذکر کیا۔ کچھ دیگر ماہرین اقبالیات بھی اس توجیہ کی تائید کرتے ہیں۔ مگر یہ دورانیہ بہت طویل نہ تھا، اقبال کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ قادیانی فرقہ ''ٹھیٹھ نمونہ'' کا مصداق نہیں ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اقبال کے قادیانیوں سے متاثر ہونے کے امکان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ختم نبوت کے عقیدے پر ان کا ایمان کسی بھی وقت متزلزل ہوا ہو یا وہ مرزا غلام احمد کو ''نبی'' کا درجہ دینے لگے ہوں۔ ایسا نہ آج

تک کسی قادیانی مصنف نے دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی اقبال کی کسی تحریر یا تقریر سے اس طرح کا کوئی شائبہ ابھرتا ہے۔ ختم نبوت کے بارے میں ان کا عقیدہ ہمیشہ اس طرح کے خیال سے مبرا رہا ہے۔ اگر راقم کو کسی بھی لمحے اقبال کے بارے میں یہ بدگمانی ہوتی تو یہ سطور ان کے دفاع میں کبھی بھی نہ لکھتا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ان کے عظیم الشان شاعرانہ مرتبے کے علی الرغم ان کی مذمت میں اپنی تمام توانائیاں بروئے کار لانے کو اپنا ایمان جانتا۔

(3) ملتِ اسلامیہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام دشمنی پر مبنی جب بھی کسی فتنہ نے سر اٹھایا ہے عامتہ المسلمین میں اس کے خلاف حساسیت بہت دیر بعد بیدار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فتنے جو معمولی سی کاوش سے کچلے جا سکتے تھے، وقتی چشم پوشی یا بروقت بیداری کے نہ ہونے کی وجہ سے بعد میں اس قدر قوت پکڑ گئے کہ ریاستی قوت کے استعمال کے باوجود ان کی مکمل بیخ کنی نہ کی جا سکی۔ خوارج اور سبائیت کے فتنے اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف میں ایران میں محمد علی باب نے جب اپنی تعلیمات کا آغاز کیا تو بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔ جب یہ فتنہ خطرناک حد تک پروان چڑھا، تو ریاستی قوت کے استعمال سے محمد علی باب کو سزائے موت دی گئی، مگر پھر بھی اس کے پیروکاروں کو ختم نہ کیا جا سکا۔ حسن بن صباح کے گروہ پر اگر شروع میں ہی توجہ دی جاتی تو ان کے شر کے اثرات سے حکمران کبھی غیر محفوظ نہ ہوتے۔ اس بارے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ میں سے جب بھی کوئی گروہ انتشار و افتراق پر مبنی فلسفہ لے کر سامنے آیا، اس کی اکثریت نے کبھی اس کو اپنے وجود کے لیے خطرہ محسوس نہ کیا۔ ایک مختصر گروہ اس شر پسند ٹولہ کے خلاف ردِعمل کا آغاز کرتا ہے، جب کہ اکثریتی طبقہ عام طور پر اس تصادم اور کشمکش سے اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے۔ مسلمانوں کا دانش ور اور تعلیم یافتہ طبقہ جسے اس طرح کے فتنہ کے خلاف علمی جدوجہد کرنی چاہیے، عموماً وہ اس تصادم میں پرُ جوش فریق بن کر حصہ لینے سے گریز کرتا ہے۔ اب ذرا ان تلخ حقائق کی روشنی میں قادیانیت کے ظہور و ارتقا پر غور کیجیے۔ یہ فتنہ اس اعتبار سے منفرد فتنہ تھا کہ اسے فتنہ سمجھتے سمجھتے بھی ایک زمانہ لگا۔ مرزا غلام احمد نے چھوٹتے ہی ظلی و بروزی نبوت کا میزائل نہیں داغ دیا تھا۔ شروع شروع میں وہ عیسائی پادریوں کے سیلاب کے خلاف بند باندھنے کے لیے میدان میں اترے۔ پھر انھوں نے آریہ سماجی شر پسندوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ یکا یک اس جوش و خروش کے ساتھ اسلام کے دفاع کے لیے میدان میں اترے، کہ جلد ہی اس اسلامی

پہلوان کو مسلمانوں میں پذیرائی حاصل ہوگئی۔قادیان کے اس رئیس زادے نے عیسائی پادریوں اور آریہ پنڈتوں کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے اپنے قلم کے ساتھ زبان کا بھی بھرپور استعمال کیا۔آئے روز مناظرے ہونے لگے اور بحث وجدل کا وہ بازار گرم ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی جہاں بھی جاتا، لوگ ''عظیم مبلغ اسلام'' کے طور پر اس کا استقبال کرتے۔ابھی ان مناظروں سے فارغ ہی نہیں ہوئے تھے کہ موصوف نے اپنے الہامات کو بروئے کار لاتے ہوئے ''اشاعت اسلام'' کا بیڑا اٹھالیا۔اب کیا تھا نت نئے الہامات کی بارش ہونے لگی، کبھی وہ مجدد ہونے کا مژدہ سناتے، کبھی محدث ہونے کا راگ الاپتے، جب دیکھا کہ ان کے دعووں کی کوئی خاص مخالفت نہیں ہوئی، تو ایک الہامی تدبیر کے زیر اثر مسیحِ موعود کا نقارہ بجا دیا، پھر مہدویت کا تاج بھی سر پر سجا کر ''ہم سا ہو تو سامنے آئے'' کا نعرۂ مستانہ لگا دیا۔ابھی لوگ ان کے ایک دعویٰ پر غور وفکر کر رہے ہوتے تو وہ زقند لگا کر کسی اور طرف جا گھستے۔**1870**ء سے لے کر **1892**ء تک مرزا صاحب یہ منزلیں طے کر چکے تھے۔مرزا غلام احمد کی پذیرائی کو سمجھنے کے لیے **1857**ء کے بعد کے مخصوص سیاسی، معاشرتی اور معاشی تناظر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔مسلمان اس قدر بے بس اور کچلے گئے تھے کہ کہیں سے کوئی شخص ان کے روشن مستقبل کی نوید سناتا، وہ باؤلوں کی طرح اس کی طرف لپک پڑتے تھے۔یہ بھی خیال نہیں کرتے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس میں کس قدر صداقت ہے۔مرزا غلام احمد تو واجبی طور پر پڑھا لکھا اور فارسی وعربی علوم کا کسی حد تک فاضل تھا، اگر کوئی نرا جاہل آدمی بھی بے سروپا دعووں کے ساتھ اپنی سیاست وشعبدے بازی کی دکان چمکانا چاہتا، تو اسے بھی گاہکوں کی کمی کی شکایت کبھی نہ ہوتی۔

(4) **1910**ء تک یہ حالت تھی کہ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کو بہت کم آگاہی تھی، عام مسلمان تو ایک طرف، بڑے بڑے علما اور دینی سکالر بھی اس فتنہ کے مضمرات کے بارے میں زیادہ فکر مند یا حساس نہیں تھے۔قادیانیت کے خلاف جو علما نبرد آزما تھے، ان کا زیادہ تر تعلق قادیان سے جغرافیائی طور پر قریبی علاقوں سے تھا۔بٹالہ، لدھیانہ اور امرتسر کے علما مکانی قربتوں کی وجہ سے نسبتاً زیادہ حساس ہوگئے تھے۔انھوں نے اپنے تئیں لوگوں کو اس فتنہ کے خلاف بیدار کرنے کی کوشش کی، مگر اس دور میں جب ٹیکنالوجی نام کو بھی نہ تھی، ان کی صدائے احتجاج ایک محدود علاقے میں سنی گئی۔لاہور میں علما کا ایک گروہ اس احتجاج میں شامل تھا، مگر اجتماعی طور پر فضا

زیادہ Charged نہ تھی۔ دہلی میں بھی چند لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے مگر فضا ایسی نہیں تھی کہ جسے عام بیداری کہا جا سکے۔ اس وقت کے دینی سکالر اس طرف کم ہی متوجہ تھے۔ اہل ندوہ تو شاید ایسے مباحثوں اور تحریکی جدل کو اپنی علمی ثقاہت سے کوئی فروتر معاملہ سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی اور اس دور کے دیگر ندوہ کے بزرگوں کی شاید ہی کوئی تحریر ہو جسے ردقادیانیت میں شمار کیا جا سکے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے 1912ء سے لے کر 1915ء تک ''الہلال'' بے حد جوش و جذبہ سے نکالا۔ وہ علی گڑھ تحریک کا مسلسل محاکمہ و تعاقب کرتے رہے، اہل ندوہ کی کمزوریوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے رہے، مگر ان کا اصل میدان عالمی جدوجہد تھا۔ ان کے ''الہلال'' کا دو تہائی حصہ خلافت عثمانیہ اور ترکوں کے تازہ حالات پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ قادیان کے مدعی نبوت کے خلاف ''الہلال'' میں انھوں نے اپنی طرف سے ایک بھی مضمون نہ لکھا۔ یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ مرزا غلام احمد سے متاثر تھے، شاید وہ مرزا کے خلاف کچھ لکھنا اپنے مرتبہ سے کم تر خیال کرتے تھے۔ ان حالات میں اقبال جیسا نوجوان فلسفی اگر لاعلمی میں قادیانی فرقہ سے کوئی ''اچھی توقعات'' وابستہ کر لیتا ہے، تو وہ معاف کیے جانے کا پورا مستحق ہے۔ 1910ء میں کوئی شخص مولانا محمد حسین بٹالوی کا رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' نہ پڑھتا یا مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی کتابیں اس کی نگاہ سے نہ گزرتیں یا لدھیانہ کے علما کے مناظروں کے متعلق کچھ نہ جانتا اور نہ ہی مرزا غلام احمد کی کتابوں کو براہِ راست پڑھنے کا اُسے موقع میسر آتا، تو ایسا شخص قرآنِ مجید کا چاہے ہر روز مطالعہ کرتا، یا اسلامی تاریخ و فلسفہ پر اس کی کتنی ہی گہری نگاہ کیوں نہ ہوتی، قادیانیت کے خلاف محاذ قائم کرنے کی اس سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہی وہ المیہ تھا جس سے ہمارا ممدوح فلسفی دوچار تھا، یہی وہ حالات تھے جس میں اقبال نے علی گڑھ میں خطبہ ارشاد فرمایا۔

(5) 1910ء میں اقبال کی زبان سے ''قادیانی فرقہ'' کا ذکر سن کر کچھ تعجب تو ہوتا ہے، مگر اس سے کہیں بڑھ کر خوشگوار حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس کے فوراً بعد کے برسوں میں انھوں نے جو کلام تخلیق کیا، اس میں ان کی اسلام سے شیفتگی، رسالت مآب ﷺ سے والہانہ محبت اور حتیٰ کہ ختم نبوت کے عقیدے پر ان کے غیر متزلزل ایمان کا بھرپور اظہار بھی ہوتا ہے۔ اقبال نے 1910ء کے بعد ہی جس عظیم نظم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا، اور جس کا ذکر انھوں نے اپنے کئی دوستوں سے بھی کیا، وہ بالآخر 1913ء میں ''اسرارِ خودی'' کے نام سے منظر عام پر آئی،

یہ طویل مثنوی صرف انڈیا ہی نہیں، پوری اسلامی تاریخ کا انمول شاعرانہ وتہذیبی سرمایہ ہے۔اسی عرصہ کے فکر سخن کے نتیجہ میں ان کی دوسری مثنوی ''رموز بے خودی'' کے نام سے 1918ء میں شائع ہوئی۔ ''اسرار ورموز'' بلاشبہ قرآن وسنت کی تفسیر، محبت رسول ﷺ اور ملت اسلامیہ کے استحکام، قرآن کو راہنما بنانے کے اصول اور اسلامی ثقافت کے نادر واقعات کا خوبصورت اور جادو اثر مرقع ہے۔اس کا ایک ایک شعر ایسے شاعر کا تخلیق کردہ ہے، جو عشق رسول میں خود بھی مست ہو اور ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو بھی اس مستی میں شریک کرنا چاہتا ہو۔اسرار ورموز میں ہمیں ایسے اشعار جواہر پاروں کی طرح ہر صفحہ پر بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ترجمہ:''وہ زندہ کتاب قرآن حکیم ہے۔اس کی حکمت غیر زوال پذیر بھی ہے اور قدیم بھی۔ اگر مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے تو یاد رکھ کہ سوائے قرآن پر قائم رہنے کے اور کوئی طریقہ کار نہیں۔''

اسرار ورموز میں ''لا نبی بعدی'' کی تفسیر پر مبنی اشعار بھی ہیں۔یہی وہ اشعار ہیں جو ایک ایسے قاری کے لیے خوشگوار حیرت اور بے پایاں مسرت کا باعث بنتے ہیں جس کا ذہن خطبۂ علی گڑھ کے زیر اثر ہو۔اس موضوع پر اشعار کا ایک طویل سلسلہ ہے۔مگر یہاں ہم صرف چند منتخب اشعار نقل کریں گے۔اقبال فرماتے ہیں۔

ماز حکم نسبت او ملتیم
اہل عالم را پیام رحمتیم
دینِ فطرت از نبی ﷺ آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ﷺ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

لا نبی بعدی ز احسانِ خدا ست
پردہ ناموسِ دین مصطفیٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظ سرِ وحدتِ ملت ازو
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیراللہ مسلمان برکند
نعرۂ **لا قوم بعدی** می زند

ترجمہ: ہم جو ایک ملت قرار پاتے ہیں، تو حضور نبی کریم ﷺ سے نسبت پیدا کر لینے کی وجہ سے۔ آپ کی ذات رحمتہ للعالمین ہے۔ لہٰذا ہم بھی دنیا کے لیے پیغام رحمت ہیں۔ مسلمان کی وحدت دین فطرت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے یہ دینِ فطرت نبی کریم ﷺ سے سیکھا اور آپ ہی کی تلقین کے توسط سے حق کے راستے میں مشعل روشن کی......

پس خدا نے شریعت ہم پر ختم کر دی، اسی طرح جیسے ہمارے رسول ﷺ پر رسالت کا اتمام کیا۔ ہم سے محفلِ ایام کی رونق ہے۔ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی رسولوں کی خاتم ہے اور ہم اقوام امم کے خاتم ہیں۔ یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے رسول کی زبانی کہلوا دیا کہ اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ قولِ حق دین مصطفیٰ کی عزت و آبرو ہے۔ قوم کو اسی سے سرمایۂ قوت حاصل ہوتا ہے اور وحدتِ ملی کا بھید بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لیے ہر دعویٰ کو باطل کر دیا اور ابد تک کے لیے اسلام کی شیرازہ بندی کر کے اس کو استحکام بخشا۔ اسی لیے مسلمان غیر اللہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اور ''**لا قوم بعدی**'' کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ (ترجمہ از ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی)

ان اشعار میں اقبال نے ختم نبوت کو اللہ تعالیٰ کا احسان اور اس عقیدہ کو دینِ اسلام کی ناموس کا نام دیا ہے۔ یہ مصرعہ: ''حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست'' بھی قابل غور ہے۔ راقم خاکسار کا خیال ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کو ذہن میں رکھ کر تحریر فرمایا جو آئے دن اپنے باطل دعوؤں کے ثبوت کے لیے نت نئے نقش ہائے آسمانی و الہامی بیان کرتا رہتا تھا۔ اقبال قادیانیوں کو ان اشعار کے ذریعے بتانا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کا احسان فرما کر ایسے

تمام دعوے پہلے ہی باطل قرار دے دیے ہیں، لہٰذا تم اب حق کے سامنے جبین جھکا دو۔ اس شعر کا دوسرا مصرعہ بھی ردِ قادیانیت کا انداز لیے ہوئے ہے۔ یعنی ''تا ابد اسلام را شیرازہ بست۔''

اقبال ختم نبوت کو اسلام کی شیرازہ بندی قرار دیتے ہیں اور منکرین ختم نبوت کو اس شیرازہ کو منتشر کرنے والے سمجھتے تھے۔ یہاں قارئین اقبال کے 1902ء میں کہے گئے اشعار ذہن میں لائیں جس میں آپ نے فرمایا۔

ایک دانہ پہ نظر ہے تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

ان دونوں اشعار کا آپس میں معنوی ربط ہے۔ مختلف لوگوں نے قادیانیت کے رد کا مختلف اسلوب اختیار کیا۔ اقبال کے ہاں ردِ قادیانیت کا انداز شروع میں اسلام کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے پس منظر میں ملتا ہے۔

قارئین کرام! اس طرح کے اشعار کہنے والا اقبال کیا ایسے فرقہ کو ''اسلامی کردار کا مظہر'' کہہ سکتا ہے جو ختم نبوت کا منکر ہو۔ یہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ اقبال کی طرف سے یہ الفاظ کسی لاعلمی کا نتیجہ تھے۔ یہ لاعلمی جلد ہی رفع ہو گئی اور انھیں انشراحِ صدر ہو گیا۔ یہ اشعار اسی انشراحِ صدر کا مظہر ہیں۔

(6) 1910ء تک اقبال کو بعض باتوں کے متعلق انشراحِ صدر نہیں تھا، اسی لیے وہ قادیانیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھتے تھے۔ اس الجھن کا شکار اقبال ہی نہیں، بہت سے مسلمان رہے ہیں اور بعض تو شاید اب بھی ہیں۔ وہ مرزا قادیانی کو نبی نہیں سمجھتے مگر قادیانیوں کو ''کافر'' قرار دینے پر بھی تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ دراصل قادیانی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہم تو رسولِ اکرم ﷺ کو خاتم الانبیا مانتے ہیں، ہم منکر اور دائرہ اسلام سے خارج کیسے ہوئے؟ اقبال نے 1935ء میں اپنے مضمون میں خود اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

❑ ''ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ

بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے''۔

❑ ''جب کسی نے حضور نبی کریم ﷺ کو خاتم الانبیا مان کر آپ ﷺ کے بعد کسی اور نئے نبی کی نبوت کو تسلیم کر لیا تو اس کا خاتم الانبیا کا اقرار باطل ہو گیا۔ گویا دائرہ اسلام سے نکلنے کے لیے حضور ﷺ کا انکار ضروری نہیں۔ کسی نئے نبی کا اقرار بھی آدمی کو اسلام کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ انشراحِ صدر انھیں 1910ء میں اس وقت نہیں تھا جب انھوں نے قادیانی فرقہ کو ''مسلم کردار کا مظہر'' کہا۔

(7) صرف اقبال کو ہی مطعون کیوں ٹھہرایا جائے، دورِ اول میں بہت سے جید علما بھی تھے جنھوں نے مرزا غلام احمد کے متعلق فتوائے تکفیر سے اختلاف کیا، ان میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ علمائے احناف میں نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ وہ دیوبند کے معروف علما کے استاد بتائے جاتے ہیں۔ یہ بات آج ہمیں تعجب انگیز لگتی ہے کہ مولانا گنگوہیؒ نے شروع میں علمائے لدھیانہ کے فتوی تکفیر کی مخالفت میں ایک مضمون لکھ کر مرزا قادیانی کو ''مردِ صالح'' بھی قرار دیا، بلکہ انھوں نے ان علمائے لدھیانہ پر تنقید بھی کی جنھوں نے اسے ''کافر'' قرار دیا تھا۔ مولوی محمد لدھیانویؒ، مولوی عبداللہ لدھیانویؒ اور دیگر علما نے مولانا گنگوہیؒ کے اس مضمون کا مفصل جواب لکھ کر انھیں بھیجا اور اس میں مرزا قادیانی کے کلماتِ کفریہ پر مفصل روشنی ڈالی۔ مولانا گنگوہیؒ کو اپنے استدلال کی کمزوری کا احساس ہوا۔ بعد میں یہی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے جنھوں نے 1892ء میں فتویٰ دیا۔

❑ ''مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تاویلاتِ فاسدہ اور ہفواتِ باطلہ کی وجہ سے دجال کذاب اور طریقۂ اہل سنت و جماعت سے خارج، اس کے پیرو بھی اسی کی مانند ہیں۔''

(حوالہ رئیس قادیان، مولانا رفیق دلاوری صفحہ 372، 451)

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پہلے حسنِ ظن کا باعث ان کا قریب الوطن نہ ہونا اور مرزائی کتابوں کا مطالعہ نہ کر سکنا بتایا جاتا ہے۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ 1910ء میں اقبال نے مرزا کی کتابیں مثلاً ''فتحِ اسلام، توضیح المرام، ازالۂ اوہام'' وغیرہ کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ورنہ وہ ہرگز اس رائے کا اظہار نہ کرتے۔

(8) 1901ء میں ''قادیانی فرقہ'' کے متعلق علامہ اقبال کا تمام تر علم مرزا کے غالی معتقدین کی روایات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔اس فرقۂ ضالہ کے اندرونی حالات کا انھیں ہرگز علم نہیں تھا اور نہ وہ اسے ''مسلم کردار کا مظہر'' کبھی قرار نہیں دیتے،خود مرزا قادیانی کو اعتراف تھا:

❑ ''بعض حضرات جماعت میں داخل ہو کر اور اس عاجز سے بیعت کر کے اور عہد توبہ نصوح کر کے پھر بھی ویسے کج دل ہیں کہ اپنی جماعت کے غریبوں کو بھیڑیوں کی طرح دیکھتے ہیں۔ وہ مارے تکبر کے سیدھے منہ سے السلام علیک نہیں کر سکتے چہ جائیکہ خوش خلقی اور ہمدردی سے پیش آویں اور انہیں سفلہ اور خودغرض اس قدر دیکھتا ہوں کہ وہ ادنیٰ ادنیٰ خودغرضی کی بنا پر لڑتے اور ایک دوسرے سے دست بدامن ہوتے ہیں اور ناکارہ باتوں کی وجہ سے ایک دوسرے پر حملہ ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات گالیوں تک نوبت پہنچتی ہے اور دلوں میں کینے پیدا کر لیتے ہیں اور کھانے پینے کی قسموں پر نفسانی بحثیں ہوتی ہیں۔''

(شہادت القرآن صفحہ 99 مندرجہ روحانی خزائن جلد 6 صفحہ 395 از مرزا قادیانی)

بشیر احمد مصری جو قادیان میں پیدا ہوئے،بعد میں قادیانی خلیفہ دوم کے کرتوت دیکھ کر قادیانیت سے علیحدہ ہوئے،لکھتے ہیں:

❑ ''ان لوگوں کے خلاف میرا ابتدائی ردعمل بداخلاقی اور جنسی بدکاریوں کی وجہ سے تھا''...... پتہ چلا کہ اس نیم دیوتا (خلیفۂ قادیان) نے زناکاری کا ایک خفیہ اڈا بنا رکھا ہے،جس میں منکوحہ،غیر منکوحہ حتیٰ کہ محرمات کے ساتھ کھلے بندوں زناکاریاں ہوتی ہیں۔صرف یہ بدذات شخص اکیلا جنسی خبط میں مبتلا نہ تھا،بلکہ اس کے دونوں بھائی اور نام نہاد ''خاندانِ نبوت'' کے اکثر افراد بھی اسی رنگ میں رنگے ہوتے تھے،حتیٰ کہ اس جماعت کے سرکردگان جو ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز تھے،ان میں سے بھی اکثر نمائشی ڈاڑھیوں کو لہراتے اپنے اپنے سیاہ کاریوں کے اڈے جمائے بیٹھے تھے۔''

قاضی خلیل احمد صدیقی جامعہ احمدیہ ربوہ کے متعلم تھے۔''میں نے قادیانیت کیوں چھوڑی''میں لکھتے ہیں:

❑ ''میں بااثر قادیانیوں سے تعلق رکھتا ہوں...... مرزا طاہر احمد کے ذریعے مجھے قصر خلافت میں آمدورفت کا شرف حاصل ہو گیا،اس دوران مجھے وہاں کا ماحول عجیب نظر آیا،رنگین و

سنگین واقعات دیکھنے میں آئے، اپنی آنکھوں کے سامنے عصمتوں اور ناموس کو لٹتے ہوئے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔"

معروف صحافی زیڈاے سلہری لکھتے ہیں کہ "کلام اقبال نے میری کایا پلٹ دی۔"

وہ قادیان میں کافی عرصہ زیر تعلیم رہے، بعد میں مسلمان ہوگئے۔ قادیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

- "پس منظر میں کچھ جنسی سکینڈل منڈلاتے تھے"......اسی طرح کی باتوں نے مجھے قادیانی مؤقف سے بیزار کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اپنے عقیدے سے وابستہ ہیں تو دنیا میں لوگ طرح طرح کی بوالعجبیوں کو مانتے ہیں، انسانی ذہن ہر عقیدے کا جواز ڈھونڈ لیتا ہے۔"

اب اقبال کو ان باتوں کا اندازہ کیسے ہوتا۔ نہ کبھی وہ قادیان گئے، نہ انھیں قادیانیوں کے حلقوں میں قریبی اختلاط کا موقع ملا۔ کشمیر کمیٹی کے دوران جب انھوں نے قادیانیوں کو قدرے قریب سے دیکھا، تو فوراً ردعمل بھی ظاہر کیا۔

(مندرجہ بالا تمام واقعات "قادیانیت ہماری نظر میں" مؤلفہ محمد متین خالد صاحب سے لیے گئے ہیں)

نعیم آسی

اقبالؒ اور قادیانی

قادیانی جماعت نے برصغیر پاک و ہند کے اندر اور باہر جس برطانوی ضرورت کو پورا کیا اور دنیائے اسلام کو جس قدر نقصان پہنچایا، اس کا حال کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں۔ ظاہر ہے مسلمان اپنی حیاتِ اجتماعی پر کلہاڑا کیسے چلنے دیتے؟ ختم نبوت ایسے اصولِ اتحاد کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے۔ یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ انگریز کی ساختہ و پرداختہ اس جماعت کا تعاقب ہوا اور خوب ہوا۔

قادیانیت کے خط و خال واضح کرنے اور اس کے مضرات کی نشاندہی میں اگرچہ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ، چودھری افضل حقؒ، سیّد ابوالحسن علی ندوی، الیاس برنی اور سر ظفر علی وغیرہ مشاہیر و اکابر نے بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں مگر قادیانیت کو نقد و نظر کے ترازو میں جس طرح شاعرِ مشرق، حکیم امت اور مصورِ پاکستان اقبالؒ نے تولا، واقعہ یہ ہے کہ یہ انہی کا حق تھا............ یہ الگ بات کہ آج ان کی تصویر---- پاکستان---- میں یہ رنگ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

نظریۂ خاتمیت کو جدید رنگ میں پیش کرنے کا شرف سب سے پہلے حضرت علامہؒ ہی کو حاصل ہوا۔ انھوں نے قادیانیت کو نہ صرف ہندوستان میں بے نقاب کیا بلکہ یورپ میں بھی اس کے خلاف آواز سب سے پہلے حضرت علامہؒ ہی نے اٹھائی۔

ختم نبوت کا مسئلہ مسلمانوں کے دل و دماغ کا مسئلہ ہے اور اس کے لیے مسلمان شروع ہی سے بڑا احساس رہا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی نسبت امام موفق بن احمد المکیؒ لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے سچا ہونے کی نشانیاں دکھلانے کی خاطر مہلت چاہی۔ امام صاحب نے سنا تو فرمایا، جس کسی نے اس متنبّی سے کوئی علامت طلب کی، کافر ہو جائے گا،

کیونکہ اس طرح نبی کریم ﷺ (فداہ امی وابی) کے فرمان لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (میرے بعد کوئی نبی نہیں) کی تکذیب لازم آتی ہے۔(1) امام المورخین علامہ ابن خلدونؒ کے مطابق مسلمانوں میں سب سے پہلا اجماع اسی نظریہ کے تحفظ پر ہوا (2) اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں سینکڑوں صحابہؓ و تابعینؒ نے جن کی اکثریت حفاظِ قرآن پر مشتمل تھی، اپنے مقدس خون کا نذرانہ دے کر اس پردۂ ناموس دینِ مصطفیٰ، اور سرِّ وحدتِ ملت، کی محافظت کا فرض ادا کیا۔(3)

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

حضرت علامہؒ بلاشبہ اس دور کے ایک عظیم مسلمان مفکر و فلسفی تھے----- تاریخ اسلام اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ خوب جانتے تھے کہ قوموں کا شیرازہ کیسے مجتمع ہوتا اور کیونکر بکھر جاتا ہے؟ ان کے نزدیک اسلامی وحدت دو چیزوں سے عبارت تھی (الف) توحید (ب) ختم نبوت اور بقول ان کے:

- ''دراصل عقیدۂ ختم نبوت ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہِ اِمتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن کہ (فلاں) فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟'' (4)

چنانچہ جب ''فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں'' کا نغمہ الاپنے اور **لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ** کو ''حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو'' بتانے والے نے قادیانیت کا بغور مطالعہ و تجزیہ کیا تو بے ساختہ پکار اٹھا:

"I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India." (5)

کہ میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان (تب ہندوستان ایک تھا) دونوں کے غدار ہیں اور بہ بانگِ دُہل یہ مطالبہ کر دیا کہ:

- ''حکومت قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔'' (6)

اور کہا:

- ''ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔

اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔" (7)

اگر اقتدار حضرت علامہؒ کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ قادیانیت کو آئینی احتساب کے شکنجے میں یوں جکڑتے کہ وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتی اور یہ تو امر واقعہ ہے کہ جہاں تہاں ان کا بس چلا، انھوں نے جکڑا بھی۔ انجمن حمایتِ اسلام کا ریکارڈ گواہ ہے کہ اس کے مرزائی ارکان کو جب تک بھرے اجلاس سے نکلوا نہ دیا، کرسیِ صدارت پر تشریف فرما نہ ہوئے۔ (8) اور جب بقول عاشق حسین بٹالوی احرار کے اصرار پر مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے حلف نامے میں یہ شق رکھی کہ:

❑ "میں اقرارِ صالح کرتا ہوں اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کے لیے انتہائی کوشش کروں گا۔ (9)

تو حضرت علامہؒ نے بحیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ اس کی توثیق فرما کر قادیانیت کو سیاسی سطح پر ایک اور ضربِ کاری لگائی۔ (10) سچ تو یہ ہے کہ حضرت علامہؒ قادیانیت سے اس درجہ نفرت کرنے لگ گئے تھے کہ ان کے نزدیک اس سے بڑا معاشرتی ناسور کوئی نہ تھا۔ یہ 1930ء یا اس سے کچھ پہلے کی بات ہے۔ (11) حضرت علامہؒ کے بڑے بھائی (شیخ عطا محمد صاحب) نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں ان سے ایک رشتہ کا ذکر کیا اور ان کی رائے دریافت کی۔ لڑکا اور اس کے والدین ختم نبوت کے منکرین میں سے تھے۔ آپ نے جواب دیا:

"بھائی صاحب! اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو میں ہرگز ہرگز یہاں شادی نہ کرتا۔"

یہ تھی حضرت علامہؒ کی دینی حمیت، ملی غیرت اور سیاسی بصیرت۔ حیرت ہے اس کے باوجود اقبال کے نام پر روٹیاں توڑنے والے بزرجمہر قادیانیت کے بارے میں مداہنت کرتے، سیاسی جماعتیں پہلو بچاتیں اور لیڈر کنی کتراتے ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے:

"علما میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔" (12)

قادیانی اکثر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان کا جنونی مسلمان مذہب کے پردے میں ان کے مال وجان اور آبرو کا درپے ہے لیکن یہ درست نہیں، قادیانیوں کا واویلا صرف اس لیے ہے کہ وہ احتساب سے بچے رہیں۔ مگر حضرت علامہؒ کے افکار و خیالات کی روشنی میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ...... کوئی مسلمان بھی قادیانیوں کا بحیثیت انسان مخالف نہیں، نہ ان کی عزت و آبرو کا دشمن ہے۔ البتہ ان کی مضرت سے بچنا اپنا قدرتی حق خیال کرتا ہے۔ اگر جمہور مسلمانوں کے اس حق کا احترام کرتے ہوئے قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دے دیا جائے تو یہ ایک ایسا عمل ہوگا جو کئی ایک مفاسد کی روک تھام کرے گا۔ قادیانیوں کو حضرتِ علامہؒ کے اٹھائے ہوئے اس مطالبہ پر غور کرنا چاہیے۔ یہ ان کے فائدے کی بات ہے اور پھر جب ان کے پیغمبر اور اس کے جانشینوں کے نزدیک بھی وہ جمہور مسلمانوں سے ایک الگ امت ہی ہیں (13) تو پھر آئینی طور پر اس علیحدگی میں انھیں کیا قباحت نظر آتی ہے؟ مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہر لحاظ سے نہایت معقول ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی طور پر مسلمانوں سے الگ ہیں تو پھر سیاسی حیثیت میں بھی انھیں مسلمانوں سے علیحدہ ہو جانا چاہیے اور اگر وہ خود ایسا نہیں چاہتے تو پھر حکومت کو اپنی ذمہ داری اور معاملے کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیے۔

اب میں حضرت علامہؒ کے اٹھائے ہوئے بعض نہایت اہم نکات کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ اس ضمن میں بعض انتہائی تلخ حقائق اور کچھ افسوسناک واقعات کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اگرچہ مجھے پتہ ہے کہ اس سے بعض جبینیں شکن آلود اور کچھ چہرے غضبناک ہوں گے مگر کیا کروں، ان حقائق کو نظرانداز کرنا میرے بس میں نہیں۔ یہ قوم کی امانت تھی جو مجھے ودیعت ہوئی اور جو میں قوم کو لوٹا رہا ہوں...... چل میرے خامے بسم اللہ!

1- قادیانیت، یہودیت کی طرف رجوع ہے؟

حضرت علامہؒ نے آج سے اڑتیس برس پیشتر قادیانی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اس بات کی نشان دہی کی تھی کہ:

❑ ''اس کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں، اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ

یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔“(14)

مگر تب (1936ء میں) یہ محض ایک نظری بحث تھی، جس پر مزید رائے زنی اب بھی ممکن ہے مگر یہاں ایک بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی اور وہ ہے فکر و خیال کے دائرے سے حرکت و عمل کے میدان تک قادیانیت کا یہودیت کے مماثل اور پھر ان دونوں کے مابین ایک خاص قسم کے روابط و تعلقات کا موجود ہونا۔

برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بالفور کے 1917ء کے اعلان کے مطابق جب 1948ء میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ فلسطین کی سرزمین پر قابلِ نفرین اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تو جن عربوں کی یہ سرزمین تھی وہ سب چن چن کر باہر نکال دیے گئے۔ یہ شرف صرف قادیانیوں ہی کو عطا ہوا کہ وہ بلا خوف و خطر اور بصد تسلی و اطمینان وہاں رہیں، ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ خود مرزا بشیر الدین محمود جنھیں قادیانی اپنے عقیدے کے مطابق مصلحِ موعود، کا خطاب دیتے ہیں) نہایت فخریہ انداز میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

- ”عرب ممالک میں بے شک ہمیں اس قسم کی اہمیت حاصل نہیں جیسی ان (یورپی اور افریقی) ممالک میں ہے۔ پھر بھی ایک طرح کی اہمیت ہمیں حاصل ہوگئی ہے اور وہ یہ کہ فلسطین کے عین مرکز میں اگر مسلمان رہے ہیں تو وہ صرف احمدی ہیں۔“(15)

اور تب سے اب تک قادیانیوں کے اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ جو بین الاقوامی صہیونیت کے علمبردار ہیں، نہایت گہرے دوستانہ تعلقات چلے آتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان اور پاکستانی عوام کے نزدیک اسرائیل کا وجود ہی غلط ہے۔ وہ اسے سازش اور جارحیت کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ پاکستان، اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کا سب سے بڑا حمائتی ہے اور اس نے اس عرب دوستی کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کا سب سے بڑا دشمن اسرائیل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسرائیل کے بانی ڈیوڈ بن گوریان کی وہ تقریر جو اس نے اگست 1967ء میں ساروبون یونیورسٹی پیرس میں کی، وہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ بن گوریان نے کہا:

- ”پاکستان دراصل ہمارا آئیڈیالوجیکل چیلنج ہے...... بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی

طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی پاکستان کے خطرے سے غفلت کرنی چاہیے۔ پاکستانی عوام عربوں سے محبت کرتے ہیں اور یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے یہ محبت خود عربوں سے زیادہ خطرناک ہے۔لہٰذا ہمیں پاکستان کے خلاف جلد سے جلد قدم اٹھانا چاہیے۔ پاکستان میں فکری سرمایہ اور جنگی قوت ہمارے لیے آگے چل کر سخت مصیبت کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا ہندوستان سے گہری دوستی ضروری ہے بلکہ ہمیں اس تاریخی عناد ونفرت سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو ہندوستان، پاکستان کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی عناد ونفرت ہمارا سرمایہ ہے۔ ہمیں پوری قوت سے بین الاقوامی دائروں کے ذریعے سے اور بڑی طاقتوں میں اپنے نفوذ و اثر سے کام لے کر ہندوستان کی مدد کرنی چاہیے اور پاکستان پر بھرپور ضرب لگانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ یہ کام نہایت رازداری کے ساتھ اور خفیہ منصوبوں کے تحت انجام دینا چاہیے۔'' (16)

اس پس منظر میں یہ بات اور زیادہ اہم اور تعجب خیز ہو جاتی ہے کہ اسی اسرائیل نے ایک ایسی جماعت کو آخر کیوں اپنے سینے سے لگا رکھا ہے جس کا ہیڈ کوارٹر ہی اس کے آئیڈیالوجیکل چیلنج...... پاکستان...... میں واقع ہے اور جس کا سربراہ اور دیگر منصبدار سب پاکستانی ہیں۔ آخر قادیانی وہاں کیا کرتے ہیں؟ قادیانیوں کا مفروضہ یہ ہے کہ وہ تبلیغِ اسلام کے لیے وہاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس کو تبلیغ کرتے ہیں؟ کیا ان یہودیوں کو جو اپنی تمام عصبیتوں کے تحت وہاں اکٹھے ہیں اور اپنی مملکت کا استحکام اور اس کی توسیع چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں، تو پھر کیا ان عربوں کو مسلمان بنانے کے لیے یہ مشن قائم ہے جو پہلے ہی رسولِ عربی ﷺ کے حلقہ بگوش ہیں۔ عرب احمد ﷺ کو چھوڑ کر غلام احمد کے متبع بن جائیں گے؟ ناممکن! تو پھر معاملہ کیا ہے؟

ایک مشہور یہودی فوجی ماہر پروفیسر ہرٹز کا کہنا ہے:

- ''پاکستانی فوج اپنے رسول محمد ﷺ سے غیر معمولی عشق رکھتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس نے پاکستان اور عربوں کے باہمی رشتے مستحکم کر رکھے ہیں۔ یہ صورتِ حال عالمی یہودیت کے لیے شدید خطرہ رکھتی ہے اور اسرائیل کی توسیع میں حائل ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہودیوں کو چاہیے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے پاکستانیوں کے اندر سے حبِ رسول ﷺ کا خاتمہ کریں۔'' (17)

اگر پروفیسر ہرٹز کی مذکورہ رائے ڈیوڈ بن گوریان کی تقریر International Zionism کے طرزِ عمل اور قادیانیت کے مخصوص تاریخی و سیاسی پس منظر کی روشنی میں دیکھا

احمدیہ تحریکِ جدید کے سالانہ بجٹ 1966-67ء کے صفحہ 25 کا عکس

۲۵

تفصیل آمد خرچ مشنہائے بیرون

(اسرائیلی پونڈ)
= ۲,۶۷ روپے

حیفا

(۱۲)

خرچ

عملہ

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۵-۶۴	بجٹ ۶۶-۶۵	بجٹ ۶۷-۶۶
۱	مرکزی مبلغین ۱	۹۷۲	۹۷۲	۹۷۲
۲				
	میزان عملہ	۹۷۲	۹۷۲	۹۷۲

سائر

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۵-۶۴	بجٹ ۶۶-۶۵	بجٹ ۶۷-۶۶
۱	اشاعت لٹریچر	۱,۰۵۵ (مجموعی)	۴۰	۴۰
۲	تبلیغی مجالس وعیدین		۶۰	۶۰
۳	دورے وسفرخرچ		۴۰	۴۰
۴	مہمان نوازی	-	۵۰	۵۰
۵	کرایہ مکان فرنیچر			
۶	بجلی۔پانی۔گیس وغیرہ		-	-
۷	سٹیشنری		۱۵	۱۵
۸	ڈاک تار و ٹیلیفون		۵۰	۵۰
۹	کتب اخبارات		۵۰	۵۰
۱۰	متفرق		۵۰	۵۰
۱۱	اخراجات رسالہ البشریٰ		۷۰۰	۷۰۰
	میزان سائر	۱,۰۵۵	۱,۰۵۵	۱,۰۵۵
	کل خرچ عملہ و سائر	۲,۰۲۷	۲,۰۲۷	۲,۰۲۷
	ریزرو مرکزی	۱,۳۷۳	۱,۳۷۳	۱,۳۷۳
	کل میزان	۳,۴۰۰	۳,۴۰۰	۳,۴۰۰

آمد

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۵-۶۴	بجٹ ۶۶-۶۵	بجٹ ۶۷-۶۶
۱	چندہ تحریک جدید	۳,۴۰۰ (مجموعی)	۱,۴۵۰	۱,۴۵۰
۲	عام وحصہ آمد		۱,۶۰۰	۱,۶۰۰
۳	زکوٰۃ		۱۰۰	۱۰۰
۴	عید فنڈ		۱۲۵	۱۲۵
۵	فطرانہ			
۶	متفرق		۱۲۵	۱۲۵
	میزان آمد	۳,۴۰۰	۳,۴۰۰	۳,۴۰۰

خلاصہ

آمد	۳,۴۰۰
خرچ	۳,۴۰۰
خالص	-

جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی جماعت بین الاقوامی صہیونیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہے اور وہ اس سے اپنے حسبِ منشاء کام لیتے ہیں۔ بالخصوص دنیائے اسلام کے قلعہ...... پاکستان...... کے خلاف اس کا کردار بڑا گھناؤنا دکھائی دیتا ہے اور اس تاثر کو موجودہ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اس بیان سے اور زیادہ تقویت ملتی ہے جس میں انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان کے عام انتخابات (1970ء) میں اسرائیلی روپیہ پاکستان آیا اور انتخابی مہم میں اس کا استعمال ہوا تھا۔ آخر وہ روپیہ کس کے توسط سے پاکستان آیا؟ پاکستان کے وجود کے خلاف تل ابیب میں تیار کی گئی سازش (جس کا انکشاف خود وزیر اعظم بھٹو نے ''الاہرام'' کے ایڈیٹر مسٹر حسنین ہیکل کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کیا) (18) کیسے پروان چڑھی؟ پاکستان میں بین الاقوامی صہیونیوں کی آلہ کاری کس نے کی؟ ان سب سوالات کا تمام تر جزئیات سمیت جواب تو جناب وزیر اعظم بھٹو ہی دے سکتے ہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ قادیانی جماعت کے ایک مشہور چہرے اور پاکستان کی بیوروکریسی کے ایک رُکنِ رکین (19) پر یہ الزام تو کئی ایک ذمہ دار حلقوں نے بارہا عائد کیا کہ اس نے ایوب خان کی گول میز کانفرنس کو ناکام بنانے اور مارشل لا کا راستہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے پس پردہ یہودی اثرات کارفرما تھے۔ پاکستان کے ایک مشہور اور قابلِ احترام سیاستدان مولوی فرید احمد نے اپنی کتاب "The Sun behind the Clouds" میں اس شخص کا نام لے کر لکھا ہے کہ ایوب خان کی ''گول میز کانفرنس'' کے دوران یہودیوں نے اسے استعمال کیا۔ (20) حیرت ہے کہ آج تک پاکستان کی کسی حکومت نے بھی ان تعلقات کا نوٹس نہیں لیا بلکہ ستم تو یہ ہے کہ پاکستان کا لاکھوں روپے کا زرِ مبادلہ بیرونی ملکوں میں ''تبلیغِ اسلام'' کے نام پر قادیانیوں کے سپرد کر دیا جاتا رہا۔ کیا تصورِ پاکستان کے خالق کی رُوح اس پر ماتم نہ کرتی ہوگی، جنھوں نے فرمایا تھا کہ:

- ''ہمیں دنیائے اسلام سے متعلق قادیانیوں کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔'' (21)

بہرحال میرا مقصد حضرت علامہؒ کے ایک اہم نکتے اور اس کی تشریح میں بعض ناقابلِ تردید حقائق کا بیان تھا جو میں نے کر دیا۔ اس سے آگے ذمہ داری میری نہیں، کسی اور کی ہے۔

2- قادیانی اور کمیونسٹ

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کمیونسٹ تحریک سے ہمدردی رکھنے اور مذہب کو افیون قرار

دینے والے عناصر قادیانی تحریک کے بارے میں زبان نہیں کھولتے، بلکہ ان کی اکثر کوشش یہی ہوتی ہے کہ قادیانیوں کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھے۔ وہ ہر مقام پر قادیانیوں کی مخالفت سے گریز کرتے اور اس ''ایماندارانہ مسئلہ'' کو فرقہ وارانہ جھگڑا کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے اور مذہباً دہریہ تھے۔ علامہ اقبالؒ نے قادیانیت کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے خلاف اپنے بیانات چھپوائے تو پنڈت جواہر لال اپنی تمام تر ''دہریت مآبی'' کے باوجود قادیانیت کی حمایت پر اتر آئے اور ''ماڈرن ریویو'' کلکتہ میں ''مسلمان اور احمدِ زم'' کے عنوان سے یکے بعد دیگرے تین مضمون لکھ مارے۔ ایسا کیوں ہے؟ یا ایسا کیوں ہوا؟ میرے خیال میں حضرت علامہؒ نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا وہی قادیانیوں اور کمیونسٹوں کے درمیان نقطۂ اتصال ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

❑ ''..........(ہندوستان میں) مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے اور بالآخر مذہب کے اہم عنصر کو اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔''(22)

ظاہر ہے اس طرح ایک طرف مذہب پر زد پڑتی اور دوسری طرف کمیونزم کے فلسفہ کے لیے راستہ ہموار ہوتا ہے اور یہی مقصود ہے جس کے حصول کی خاطر ایک کمیونسٹ، ایک نام نہاد ''نبی'' کی نبوت کو گوارا کرتا یا اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ویسے بھی ایک فلسفہ ربِّ محمد ﷺ کا باغی، دوسرا خود محمد ﷺ کا باغی، بھلا یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اپنے دل میں ''نرم گوشہ'' کیوں نہ رکھیں؟

حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کی نشاندہی آج سے اڑتیس برس پیشتر کی۔ تب سے اب تک بالخصوص تقسیم کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر جو بیتی اسے ''قادیانی کمیونسٹ ارتباط'' کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ اڑتیس برس اس کی تفسیر نظر آئیں گے۔ اے کاش! ہمارے دانشور اور ہمارے ''فرمانروا'' اس پر غور کریں۔

3- قادیانی مسلمان کہلانے پر اِصرار کیوں کرتے ہیں؟

حضرت علامہؒ نے اس بات پر بھی بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی ہے کہ قادیانی مسلمانوں کا جزو بنے رہنے پر اِصرار کیوں کرتے ہیں؟ ان کے خیال میں ایسا صرف اس لیے ہے:

''...... کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تا کہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔'' (23)

ان کے خیال میں اور اس خیال کی صداقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے:

''قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔'' (24)

اور اس کی وجہ وہی سیاسی فوائد ہیں جن کی طرف میں نے ابھی حضرت علامہؒ کے حوالے سے اشارہ کیا اور میرے خیال میں حضرت علامہؒ کی یہ عبارت ان ''سیاسی فوائد'' کی بڑی اچھی تشریح کرتی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

❑ ''اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو 56,000 (چھپن ہزار) ہے، انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔'' (25)

مخلوط طریق انتخاب کے باوجود آج بھی پوزیشن قریب قریب وہی ہے جو آج سے اڑتیس برس پیشتر تھی۔ اگر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے تو ایک طرف ان کی وہ تمام کلیدی ملازمتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں جن کے سہارے قادیانیت کے بھیانک سائے تیزی کے ساتھ ارضِ پاک پر پھیل رہے ہیں۔ دوسری طرف اسمبلیوں میں انھیں بمشکل ایک آدھ نشست ملتی ہے جبکہ مسلمانوں میں شمولیت کا ڈھونگ رچا کر پنجاب اسمبلی سے سینٹ تک وہ کئی نشستوں پر قبضہ جما چکے اور پاکستان کی سیاست میں ایک اہم عنصر کی حیثیت سے بڑے مخصوص اور غیر محسوس انداز میں اپنا نقش جما رہے ہیں اور یقیناً یہی وہ سیاسی اغراض ہیں جن کی خاطر قادیانی نت نئی تاویلیں گھڑتے اور مسلمانوں کا جزو بنے رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ مرزا ناصر احمد، خلیفۂ ثالث، نے صدر اور وزیر اعظم کے حلف نامے میں عقیدۂ ختم نبوت کا اقرار ضروری قرار دیے جانے پر یونہی تو یہ بیان نہیں دیا تھا کہ:

''میں نے اس حلف نامہ کے الفاظ پر بڑا غور کیا ہے اور میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچا

ہوں کہ ایک احمدی کے راستہ میں اس حلف کے اٹھانے میں کوئی روک نہیں۔" (26)

ظاہر ہے حضور رسالت مآب ﷺ کو آخری نبی مان کر بھی قادیانیوں کے نزدیک حضور رسالت مآب ﷺ کی اتباع میں نبوت کا سلسلہ جاری رہ سکتا، مرزا غلام احمد کی نبوت ظل و بروز کا جامہ اوڑھ کر برقرار رہتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہوسِ اقتدار کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو کر قادیانی معتقدات کے مطابق ربوہ دنیوی لحاظ سے بھی ایک اہم مقام بن جاتا ہے۔ (27) پھر بھلا یہ حلف نامہ ایک قادیانی کی راہ میں روک کیسے ہو؟ سچ فرمایا آپ نے مرزا صاحب سچ فرمایا۔

4- مذہب میں "عدم مداخلت" کی پالیسی اور ہم!

حضرت علامہؒ کے نزدیک "ہندوستان میں انگریزوں کی یہ پالیسی کہ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہ کریں گے" ہندوستان میں بسنے والے تمام مذاہب کے لیے ضرر رساں تھی کیونکہ ان سب کی بقاء ان کے اندرونی استحکام کے ساتھ وابستہ تھی اور اگر اندرونی استحکام کو ٹھیس لگتی اور حکومت "مذہبی معاملات میں عدم مداخلت" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس کے تحفظ کی خاطر کوئی قدم نہیں اٹھاتی تو ظاہر ہے اس جماعت کی سالمیت کو ضرور ضرر پہنچے گا۔ چنانچہ وہ اس امر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

❑ "اس پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بدقسمتی سے بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے جتنا حضرت مسیح کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت تھا۔ (28) ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے (29) اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔" (30)

آج بھی اگر کسی ملک کی حکومت اس نام نہاد عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہتی ہے تو ظاہر ہے اس کا یہ عمل اس ملک میں بسنے والے مذاہب کے لیے مہلک ہی ثابت ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریز اگر اس پالیسی کو اختیار نہ کرتے تو کون سی پالیسی اختیار کرتے؟ ظاہر ہے اگر وہ اس کے برعکس مداخلت کی پالیسی اپناتے تو خود ان کے اقتدار کو دھچکا لگتا۔ لہٰذا انھوں نے وہ

پالیسی اپنائی جس سے اس ملک میں بسنے والے مذاہب واقوام کی وحدت پر زد پڑتی مگر اس کا اقتدار استحکام پکڑتا تھا اور یہ بھی اس نے اس حد تک ہی اپنائی جس حد تک کہ اس کو فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

دراصل انگریز کی پالیسیاں کوئی سے اخلاقی سانچوں میں ڈھلی ہوئی نہ ہوتی تھیں، وہ تو اس کے مفاد کے تابع تھیں گویا ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ اسی مذہب میں مداخلت نہ کرنے کا نعرہ لگانے والے انگریز نے جب دیکھا کہ ہندوستان کی مختلف قومیں آپس میں ایکا کر کے اس کے اقتدار کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہیں تو اس نے مذہب میں مداخلت کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور یہ حقیقت تو الم نشرح ہے کہ سکھ 1919ء تک ہندوؤں ہی کا ایک حصہ شمار ہوتے تھے۔ لاہور ہائی کورٹ نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں، سکھوں کی طرف سے علیحدگی کا کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا گیا تھا مگر انگریز نے اپنی مشہورِ زمانہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے ماتحت 1919ء میں سکھوں کو ہندوؤں سے جداگانہ جماعت قرار دے دیا۔ (31) یہ دوسری بات کہ اس نے یہی فیصلہ ''مسلم قادیانی نزاع'' میں نہ کیا، اور یہ بھی **Divide and Rule** کے عین مطابق تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے پاکستان میں کون سی پالیسی اختیار کی جانی چاہیے؟ ہمارے ہاں یوں تو مذہبی معاملات میں اکثر ٹانگ اڑائی جاتی ہے مگر جب بعض اندرونی و بیرونی اسلام دشمن تحریکوں کے انسداد یا ان کی مخصوص حرکات پر گرفت کی باری آتی ہے تو ہمارے مسلمان حکمران عجیب شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ 1953ء میں تو ایسا بھی ہوا کہ حُبِ رسول ﷺ کے جذبہ سے سرشار اور ناموسِ مصطفیٰ کا تحفظ چاہنے والے بے گناہ مسلمانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیے گئے۔ حالانکہ ایک مسلمان حکومت ہر لحاظ سے اس امر کی پابند ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملی وحدت کا تحفظ کرے اور ظاہر ہے اس کے لیے سرِّ وحدت کی حفاظت شرطِ اوّلین ہے کہ:

ع حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو

اور میرے نزدیک تو معاملہ اب صرف جداگانہ اقلیت یا ملی وحدت کے تحفظ ہی کا نہیں رہا بلکہ اپنے مخصوص احوال وظروف کے ماتحت جن کی کسی قدر تشریح پیچھے ہو چکی ہے، خود ہمارے ملک کی بقا و سلامتی سے جا کر مل گیا ہے---- گویا عقیدۂ ختم نبوت کا آئینی تحفظ اب صرف سر

وحدتِ ملت، ہی کا تحفظ نہیں بلکہ وحدتِ ارضِ پاک، کی بقاء وسلامتی کا راز بھی یہی ہے!

5- ختم نبوت اور روادار مسلمان

بعض سمجھ دار لوگ جان بوجھ کر یہ نا سمجھی کی بات کرتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت کا تحفظ چاہنا یا قادیانیوں کے احتساب کا مطالبہ کرنا ''فرقہ وارانہ منافرت'' پھیلانا ہے اور کہ مسلمانوں کو ''فرقہ پرست'' نہیں ہونا چاہیے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ ایک سچا مسلمان کبھی فرقہ پرست نہیں ہوتا، **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا** ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک ایماندارانہ مسئلہ خواہ مخواہ فرقہ وارانہ قرار دے دیا جائے۔ شاید یہ لوگ اپنے آپ کو ''روادار'' ثابت کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ وہ رواداری کا حقیقی مفہوم بالکل نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے حضرت علامہؒ کی یہ عبارت سرمۂ بصیرت کی حیثیت رکھتی ہے:

- ''اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں............ رواداری کی روح ذہنِ انسانی کے مختلف نقاطِ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے کہ ''ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں، ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں، ایک رواداری مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں، ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے، ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر کی جاتی ہے، برداشت کر لیتا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کی رواداری اخلاقی قدر سے معرّا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس سے اس شخص کے روحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' (32)

حضرت علامہؒ کو اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ ''قادیانی فتنہ'' کو سمجھنے کی تعلیم یافتہ

مسلمانوں نے کوئی کوشش نہیں کی، بقول ان کے مغربیت کی ہوا نے ان لوگوں کو حفظ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔(33) اس کے مضرات کو اگر کسی نے سمجھا یا اس کے خلاف سرگرمی دکھائی تو بقول حضرت علامہؒ وہ عام مسلمانوں کا طبقہ تھا، جسے تعلیم یافتہ مسلمان مُلّا زدہ، کا خطاب دیتا ہے......اور اگر آج پڑھا لکھا طبقہ اس نئی امت اور اس کے مفاسد کو کچھ کچھ سمجھ رہا ہے تو یہ برس ہا برس کی جدوجہد اور بہت سے تلخ تجربات و مشاہدات کا ثمر ہے......مگر اس کا کیا کیا جائے کہ یہ طبقہ عالمی استعمار کے اس ''مُہرے'' کے خلاف زبان کھولنے سے اب بھی ہچکچاتا اور منہ موڑتا ہے۔

بہر حال اگر ہمارے تعلیم یافتہ طبقے یا نام نہاد روادار مسلمان نے اپنا یہ طرزِ عمل تبدیل نہ کیا تو وقت انھیں خود ایسا کرنے پر مجبور کر دے گا۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ

قادیانی ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو'' کے مصداق سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر اکثر دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ علامہ اقبال تو قادیانی تحریک کو ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کا نمونہ سمجھتے تھے۔ دیکھو ان کا خطبہ علی گڑھ 1910ء فلاں صفحہ، فلاں سطر اور 29 ستمبر 1900ء کی فلاح تحریر میں انھوں نے مرزا غلام احمد کو جدید ہندی مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی مفکر قرار دیا۔ قادیانیوں کے پاس لے دے کر یہی دو حوالے ہیں جن کی مدد سے وہ حضرت علامہؒ کو قادیانی تحریک کا ہمنوا ثابت کرتے ہیں۔

اب سنیے اس کی حقیقت کیا ہے؟ پہلی عبارت تو واقعتہً حضرت علامہؒ کی ایک ترجمہ شدہ کتاب ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں موجود ہے۔ دوسری جو رسالہ انڈین اینٹی کویری کے حوالہ سے پیش کی جاتی ہے ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزری اور قادیانیوں پر اس بارے میں زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال عبارت پہلی ہو یا دوسری (قطع نظر اس بات کے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں) اوّل تو ان میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا اثبات نہیں، دوسرا جب وہ خود ان کی نفی کر چکے ہیں تو پھر ان سے دلیل پکڑنا یا انھیں حجت ٹھہرانا کیسا؟ مثلاً وہ اپنی 1910ء کی عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

- ''جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید

تھی۔اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سر برآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ 'براہین احمدیہ' میں انھوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل رُوح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔تحریک کے دو گروہوں (34) کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی؟ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔" (35)

دراصل حضرت علامہؒ کی پہلی رائے قادیانیت کے ظاہری خول اور اس کے پروپیگنڈے پر مبنی تھی اور اگر اس دور کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں۔یہ تو ایک عمومی تاثر تھا، جو آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مرزا غلام احمد کے اُس وقت کے نام نہاد (36) مناظروں اور مباحثوں سے پیدا ہو گیا اور ایک حضرت علامہؒ ہی پر کیا موقوف، تب پنجاب کے اکثر مسلمان اسی غلط فہمی کا شکار تھے۔وہ ایک پُر جوش مبلغ و مناظر کی حیثیت سے مرزا غلام احمد کو اسلام کا مخلص اور مسلمانوں کا بہی خواہ خیال کرتے۔خود حضرت علامہؒ کے گرد و پیش حتیٰ کہ ان کے والد (شیخ نور محمد) اور بڑے بھائی (شیخ عطا محمد) تک مرزا غلام احمد سے متاثر تھے۔مگر جب مرزا غلام احمد کے مخفی عزائم و دعادی بے نقاب ہوئے تو مسلمانوں کا سوادِ اعظم ان سے الگ ہو گیا۔نہ صرف الگ ہو گیا بلکہ قادیانی تحریک کو اپنی وحدتِ ملی کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہوئے اس کی زبردست مزاحمت بھی کرنے لگا۔ان حالات کا حضرت علامہؒ اور ان کے گرد و پیش پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔چنانچہ حضرت علامہؒ نے اپنی اس رائے سے جو محض قادیانی تحریک کے ظاہر سے متاثر ہو کر قائم کی گئی تھی رجوع کر لیا۔ان کے والد شیخ نور محمد صاحب نے بھی قادیانی تحریک

سے اپنی وابستگی ختم کردی، بڑے بھائی بھی بیزار ہو گئے اور پھر وہ وقت بھی آیا جب حضرت علامہؒ نے قادیانیت کو''برگِ حشیش'' غارت گرِ اقوام،''فتنۂ ملتِ بیضا،''قوتِ فرعون کی در پردہ مرید'' ''یہودیت کا مثنیٰ''(37)''انتشار کا منبع'' فرنگی انتداب کے حق میں الہامی سند، مرزا غلام احمد کو ''چنگیز'' اور قادیانیوں کو اسلام اور ملک کا غدار قرار دے کر مسلمانوں سے الگ کر دینے کا پُرزور مطالبہ کیا اور یورپ تک اس فتنے کا تعاقب کیا۔ یہاں میں قارئین کی توجہ مرزا غلام احمد کے فرزند اور قادیانی تحریک کے ایک اہم ستون مرزا بشیر احمد ایم۔اے کی اس تحریر کی جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں، جس میں وہ کہتے ہیں:

❑ ''ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا...... شیخ نور محمد صاحب نے غالباً 1891ء یا 1892ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سیّد حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا، اس لیے اُن دنوں میں انھوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ...... آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا، جس میں لکھا تھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیویں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں...... ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے، اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈا تھا۔''(38)

فرمایئے! اس کے بعد 1900ء کی کسی عبارت یا خطبۂ علیگڑھ کے سہارے قائم کیے گئے کسی استدلال میں کیا وزن رہ جاتا ہے؟ حیرت ہے کہ جس دور کو حضرت علامہؒ اپنا دورِ جاہلیت قرار دیتے رہے، اس کی ایک آدھ تحریر تو قادیانیوں کے لیے حجت اور سند کا درجہ رکھتی ہے مگر جس

عمر میں وہ پختہ ہوکر مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے تھے، اس عمر کی متاعِ فکر سے گریز وفرار اختیار کیا جاتا یا صریحاً انکار کر دیا جاتا ہے۔ یاللعجب !

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر حضرت علامہؒ قادیانیوں کو مسلمان نہ سمجھتے تھے تو پھر خالصتاً مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر اٹھنے والی تحریک......تحریکِ کشمیر 1931ء کی صدارت انھوں نے ''قادیانی خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود'' کو کیوں پیش کی؟ اور پھر اس جھوٹ پہ جھوٹ کھڑا کرتے ہوئے کہا جاتا ہے، یہ بات علامہ کے ان گہرے روابط اور اس موانست کو ظاہر کرتی ہے جو وہ جماعتِ احمدیہ سے رکھتے تھے۔

ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

حالانکہ نہ حضرت علامہؒ نے مرزا محمود کا نام تجویز کیا اور نہ ہی وہ قادیانیوں سے کوئی ربط یا انس رکھتے تھے۔ قادیانی جو چاہیں کہیں، حضرت علامہؒ نے قادیانیت پر جو ضربِ کاری لگائی، قادیانی آج تک اسے نہیں بھلا سکے ہیں اور عبدالمجید سالک کو بھی اپنی تمام تر قادیاں نوازی کے باوجود یہ لکھنا پڑا ہے کہ رد قادیانیت میں حضرت علامہؒ نے بعض ایسے نکات پیش کیے، جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔ (39)

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت علامہؒ نے کشمیر کمیٹی میں شمولیت اختیار کی تو ان کے سامنے صرف اور صرف مظلومینِ کشمیر کا مسئلہ تھا، جو برسہا برس سے ڈوگرا حکمرانوں کے ظلم وستم اور جبر وتشدد کا شکار تھے۔ وہ قادیانی نبوت یا خلافت پر مہر تصدیق ثبت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حضرت علامہؒ کو چونکہ خطۂ کشمیر سے قلبی لگاؤ تھا اور یہ ارضِ چناران کے آباء واجداد کا وطن تھی، اس لیے کشمیریوں کے ساتھ جذباتِ ہمدردی کی شدت میں وہ مرزا بشیر الدین محمود کے سیاسی عزائم کو نہ بھانپ سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اور ان کی طرح دیگر مسلمان عمائدین قادیانیوں کے انگریزوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کے پیش نظر یہ امید بھی کرتے ہوں کہ قادیانی خلیفہ اپنے آقاؤں سے کشمیری مسلمانوں کو بعض حقوق دلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ مرزا محمود نے اپنے لامحدود اختیارات...... ''لامحدود'' اس لیے کہ جب کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کا قیام عارضی ہوگا، سرے سے اس کا کوئی دستور ہی نہ بنایا گیا اور بقول حضرت علامہؒ صدر...... (مرزا محمود)...... کو آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے۔ (40) مرزا محمود نے ان

اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کی ذیلی شاخ بنا کر رکھ دیا اور عام مسلمانوں کے چندے سے قادیانی مبلغ سارے کشمیر میں پھیلا دیئے (چنانچہ یہ اسی زمانے کی جدوجہد کا ثمر ہے کہ آج بھی کشمیر میں اس جماعت کے اچھے خاصے اثرات پائے جاتے ہیں) اور نہ صرف طول وعرضِ کشمیر بلکہ پوری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ تمام اسلامی ہند نے اسے اپنا لیڈر مان کر اس کے باپ مرزا غلام احمد کی نبوت کی تصدیق کر دی ہے اور اس کے ساتھ ہی جب یہ بات ان کے علم میں آئی کہ کشمیر کمیٹی کے صدر (مرزا محمود) اور سیکرٹری (عبدالرحیم) دونوں وائسرائے اور دیگر اعلیٰ برطانوی حکام کو خفیہ اطلاعات بہم پہنچانے کا ''نیک کام'' بھی کرتے ہیں۔ (41) تو انھوں نے اس کا انتہائی سختی سے نوٹس لیا اور مرزا محمود کو کمیٹی کی صدارت چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا، قادیانیوں کی منافقت کے ہاتھوں عاجز آ کر خود استعفا دے دیا، کمیٹی تک توڑ ڈالی، اس موقع پر حضرت علامہؒ نے جو بیان جاری کیا، اس کا یہ حصہ خاص طور پر بڑا دلچسپ اور اہم ہے:

❑ ''بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلا میں سے ایک صاحب نے جو میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے، حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا، وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔ میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل ودماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے .... ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔'' (42)

قادیانیوں نے حضرت علامہؒ کی ایک تجویز جس میں کہا گیا تھا کہ ''کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے ایک کھلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کر لی جائے (43) کا سہارا لے

کر ''کشمیر کمیٹی'' کے نام سے پھر دامِ ہمرنگِ زمین بچھانا چاہا، اس کی صدارت کی پیش کش کر کے حضرت علامہؒ کو پھانسنا چاہا، مگر انھوں نے نہایت سختی وحقارت سے اسے بھی مسترد کر دیا۔ فرمایا:

❑ ''مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصولی اختلاف نہیں، بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں اور میرے اس رویہ کی وجوہات وہی ہیں جن کی بناء پر میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی نئی تشکیل ہونی چاہیے......میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہوسکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ واری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔'' (44)

اور واقعہ یہ ہے کہ یہیں سے حضرت علامہؒ کی قادیانیت کے خلاف کھلی کھلی لڑائی کا آغاز ہوا۔ بقول محمد احمد خاں:

❑ ''علامہ اقبالؒ نے کشمیر کمیٹی کے دوران قادیانیوں کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا تھا اور ''کشمیر کمیٹی'' کے یہ واقعات اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان ہی واقعات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانی تحریک کی سختی سے مخالفت کرنی شروع کی۔'' (45)

ذرا سے گریز کے ساتھ میں یہ کہنے کی بھی اجازت چاہوں گا کہ آیا کبھی پاکستان کے مسلمانوں نے اس امر پر غور کیا ہے کہ ہر پاک بھارت جنگ کے دوران کشمیر و قادیان سے ملحق سرحدات کی کمان قادیانی جرنیلوں ہی کے ہاتھ میں کیوں رہی ہے؟ 1965ء کی جنگ سے پہلے سر ظفر اللہ خاں (پاکستان کے سابق وزیر خارجہ) نے حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال (جو آج کل ''پنجاب ہائی کورٹ'' میں جسٹس کے عہدہ پر فائز ہیں) کی معرفت اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں (مرحوم) کو یہ پیغام کیوں بھیجا کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لیے موزوں ہے، پاکستان کی فوج ضرور کامیاب ہوگی۔ جہاں تک ہندوستان کے ہاتھوں بین الاقوامی سرحد کے آلودہ ہونے کا تعلق ہے، ایسی کوئی چیز نہ ہوگی۔ (46) اور مشہور قادیانی جرنیل لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک (لیفٹیننٹ جنرل عبدالعلی ملک کے بڑے بھائی) جو انقرہ میں کسی حادثہ میں ہلاک ہوگئے اور جن کی نعش وہاں سے لا کر ربوہ ''دفن'' کی گئی تھی، یہ انتہائی خواہش و کوشش کس غرض سے تھی کہ اس وقت کے گورنر ملک امیر محمد خان صدر ایوب کو اس بات پر آمادہ کریں کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لیے بہترین ہے۔ یقین ہے کہ ہم کشمیر حاصل کر پائیں

گے۔ (47) صرف یہی نہیں بلکہ قادیانی ''مصلح موعود'' کی یہ پیشینگوئی بھی ان دنوں نہایت اہتمام کے ساتھ آزاد کشمیر میں پھیلا دی گئی کہ ریاست جموں وکشمیر آزاد ہوگی اور اس کی فتح ونصرت احمدیت کے ہاتھوں ہوگی اور قادیانی اب بھی یہی پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ کشمیر قادیانی سورماؤں ہی کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ ظاہر ہے قادیانی ایک وقت میں کئی کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی دائرے میں بہرحال سیاسی اقتدار چاہتے ہیں یا پھر انھیں سیکولر گورنمنٹ ہی برداشت کرسکتی ہے۔ بصورتِ دیگر وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قادیانی سیاست مذکورہ دوائر میں حرکت کرتی ہے۔ کشمیر پر قادیانیوں کی نظر اسی لیے ہے کہ اس طرح وہ کشمیر میں پہلے سے موجود ''قادیانی اثرات'' سے فائدہ اٹھا کر اپنا اقتدار قائم کرسکتے ہیں اور پھر کشمیر میں ان کے پیغمبر کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر بھی ہے، (48) جسے وہ اپنے تئیں مرزا غلام احمد کی صداقت کا ایک بڑا نشان سمجھتے ہیں۔ پھر اسی ریاست سے ہم آغوش ان کے پیغمبر کی جائے پیدائش ہے، جسے وہ ''دارالامان'' کہتے (بلدۃ الامین مکہ مکرمہ اور دارالہجرت مدینہ منورہ کا ہم پلہ بلکہ ان سے بھی افضل قرار دیتے) (49) اور اپنی جماعت کا خدا تعالیٰ کی طرف سے ٹھہرایا ہوا دائمی مرکز سمجھتے ہیں۔ (50) اور ان کا خیال ہے کہ مرزا غلام احمد کی پیش گوئی کے مطابق قادیان قادیانیوں کو ضرور ملے گا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ذہنوں میں بھی یہی بات راسخ کرتے ہیں۔ چنانچہ راہِ ایمان کے نام سے ''احمدی بچوں کے لیے ابتدائی دینی معلومات کے مجموعہ'' کے صفحہ 98 پر قادیان سے ہجرت کی پیشگوئی کے زیرِ عنوان لکھا ہے:

- ''حضرت مسیحِ موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) کو خدا نے الہام اور خواب کے ذریعے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں جماعت احمدیہ کو قادیان سے نکلنا پڑے گا اور خشک پہاڑیوں والے ایک اونچے علاقہ میں اسے اپنا دوسرا مرکز بنانا پڑے گا۔ یہ حالت عارضی ہوگی۔ آخر ایک وقت آئے گا کہ قادیان جماعت احمدیہ کو واپس مل جائے گا۔ پیشگوئی کا ایک حصہ 1947ء میں پورا ہوگیا...... اور ہر احمدی کا ایمان ہے کہ پیشگوئی کا آخری حصہ بھی ضرور پورا ہوگا اور قادیان جماعتِ احمدیہ کو ان شاء اللہ ضرور واپس ملے گا۔''

قارئین خود اندازہ فرمائیں کہ یہ کس طرح ممکن ہوگا؟ کیا حیدرآباد، جوناگڑھ، مناودر اور کشمیر کو ہڑپ کرنے والا بھارت قادیان دے گا؟ قادیانی بزور بازو فتح کریں گے؟ یا بڑی

طاقتوں کی معرفت یہ پیشگوئی پوری ہوگی؟ آخر قادیان قادیانیوں کو کس طرح ملے گا؟ بہرحال قادیانیوں کے یہی وہ سیاسی عزائم تھے جنھیں کشمیر موومنٹ نے بے نقاب کیا اور حضرت علامہؒ انھیں اسلام اور ملک کا غدار قرار دینے پر مجبور ہو گئے۔

قادیانی جب دلیل کے میدان میں عاجز آ جاتے ہیں تو پھر یوں پینترا بدلتے ہیں:

''اپنی عمر کے آخری حصہ میں علامہ اقبال نے جماعتِ احمدیہ سے اختلاف کیا لیکن اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے وجوہ سیاسی تھے۔'' (51)

وہ سیاسی وجوہ کیا تھے؟ ''الفضل'' لکھتا ہے:

''چودھری ظفر اللہ خان ایک خاص عہدے پر نہ لیے جاتے تو یہ تحریریں بھی ہرگز وجود میں نہ آتیں۔'' (52)

حالانکہ جب حضرت علامہؒ حیات تھے تو کسی قادیانی کو اس کی جرأت نہ ہوئی، بلکہ تب قادیانی جماعت کے ''مصلحِ موعود'' مرزا بشیر الدین محمود یہ توجیہ کیا کرتے تھے:

''اللہ تعالیٰ اپنی مشیّت کے ماتحت جماعت احمدیہ کے مخلصین کے اخلاص کو اور بھی زیادہ ظاہر کرنے کے ارادے سے نئے نئے لوگوں کو ہمارے مخالفوں کی صف میں لا کھڑا کر رہا ہے۔ پہلے احراری اٹھے...... پھر اُمراء...... پھر پیروں، گدی نشینوں اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت...... ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے......اسی طرح اعلیٰ عہدہ دار خاموش تھے یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ طوفانِ مخالفت فرو ہونے میں نہیں آتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو انھوں نے کہا کہ ہم پیچھے کیوں رہیں؟ اس خیال کا آنا تھا کہ سر مرزا ظفر علی صاحب نے ایک بیان شائع کر دیا۔ پھر ڈاکٹر سر اقبال کو خیال آ گیا کہ میں پیچھے کیوں رہوں؟'' (53)

گویا اس وقت قادیانی جماعت یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی تھی کہ حضرت علامہؒ کی مخالفت دوسروں کی دیکھا دیکھی محض ''فیشن'' کے طور پر ہے اور بس۔ حالانکہ یہ بات بھی درست نہیں۔ حضرت علامہؒ نے قادیانیت کے بارے میں جو کچھ لکھا، اس میں ان کے ذاتی تجربے، مشاہدے، مطالعے اور تجزیے کو دخل تھا۔ ''الفضل'' نے جو راگنی چھیڑی ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو (ان کے اپنے بیان کے مطابق) 32ء میں چند ماہ کے لیے

عارضی طور پر سر فضل حسین نے اپنی جگہ ایگز یکٹو کا ممبر نامزد کیا۔ مستقل تقرر 34ء کے اواخر میں ہوا۔(54) جبکہ قادیانیت کی بابت حضرت علامہؒ کے خیالات میں تبدیلی اس سے بہت پیشتر آ چکی تھی اور وہ اس تحریک سے بیزاری کا اظہار کرنے لگ گئے تھے، خود قادیانیوں کے ''قمر الانبیا'' مرزا بشیر احمد نے لکھا ہے کہ:

''1891-92ء...... کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو بھی سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔'' (55)

33ء میں حضرت علامہؒ کی مخالفت میں اگر انتہائی شدت پیدا ہوئی تو اسے اُس دور کے پس منظر بالخصوص ''تحریکِ کشمیر'' کے حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ کشمیر کمیٹی کی آڑ میں قادیانیوں نے جو کچھ کیا، وہ ایک حضرت علامہؒ کیا، سب مسلمان رہنماؤں کے لیے تشویش کا موجب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ''تحریکِ کشمیر'' کے بعد قادیانیوں کی مخالفت شدید سے شدید تر ہو گئی۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کے تحفظ کے احساس اور جذبے کو بھی دخل تھا۔ قادیانی جو چاہیں کہیں، حقیقت یہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ظفر اللہ خاں نہ تو حضرت علامہؒ کے کبھی حریف رہے، نہ رقیب۔ پھر حضرت علامہؒ ان باتوں سے ماوراء قسم کے انسان تھے۔ ایگز یکٹو کونسل کی رکنیت ظفر اللہ خاں کے لیے کوئی اعزاز ہو تو ہو، حضرت علامہؒ کے نزدیک پرِ کاہ کے برابر حیثیت نہ رکھتی تھی۔ حضرت علامہؒ نے ''قادیانی فتنے'' کا احتساب 33ء سے اپنی وفات تک برابر جاری رکھا مگر اس دوران کی کسی ایک تحریر کے کسی ایک حرف سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں سر ظفر اللہ خاں سے کوئی ذاتی پرُخاش تھی یا وہ ان کے ایگز یکٹو کا ممبر بن جانے کے باعث قادیانیت کی مخالفت تک پہنچ گئے، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے ایک مضمون ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' (مطبوعہ 1935ء) میں لکھتے ہیں:

❑ ''اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے، حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن یہ توقع رکھنی بیکار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔''

اور اگر بالفرض مسلمانوں کے حقوق پامال ہوتے دیکھ کر (کیونکہ سر ظفر اللہ خاں کو

سر فضل حسین کی جگہ ایگز یکٹو کا رُکن لیا گیا تھا جو ایگزیکٹو میں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شامل تھے) وہ اس تقرر پر احتجاج کرتے یا قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتے (تا کہ مسلمان کہلا کر وہ اسلامیانِ ہند کے حقوق سے متمتع نہ ہوسکیں) تو کیا یہ غلط ہوتا؟

بہر حال حضرت علامہؒ کی لڑائی اصولی تھی، ذاتی نہ تھی اور ویسے بھی وہ گھٹیا سیاسی مفاد کی خاطر مذہب کو آڑ بنانے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے محض ملک وملت کے بہترین مفاد کو سامنے رکھ کر قادیانیت کی مخالفت کی، اور ایسا کرنا ان کے لیے ناگزیر تھا۔

حواشی

1- مناقبِ موفق ج 1 ص 161، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

2- خاتم النبیین ص 33، علامہ انور شاہ کاشمیریؒ۔

3- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخِ طبری، البدایہ والنہایہ، اور ''تاریخ ابنِ خلدون''۔

4- ''حرفِ اقبال'' ص 127، لطیف احمد شروانی۔

5- Thoughts and Reflections of Iqbal, Page 306 By Syed Abdul Wahid.

6- ''حرفِ اقبال'' ص 119، لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

7- ''حرفِ اقبال'' ص 129، لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

8- ''چٹان'' لاہور ص 4۔24 جولائی 1967ء۔

9- ''اقبال کے آخری دو سال'' ص 341، عاشق حسین بٹالوی۔

10- اگرچہ اقبال کے آخری دو سال کے مؤلف نے اس تاریخی حقیقت کو مسخ کر کے قادیانیت کو سپورٹ (Support) کرنے کی بے حد کوشش کی ہے مگر بات بنی نہیں۔ عاشق حسین بٹالوی ہوں یا عبدالمجید سالک، حضرت م ش ہوں یا کوئی اور، کسی میں اتنا بوتا نہیں کہ قادیانیوں کو مسلمانوں میں شامل کر سکے۔ (ن۔آ)

11- 1930ء یا اس سے کچھ پہلے کی بات ہے------ یہ بات میرے استفسار پر جناب خالد نظیر صوفی صاحب (مرتب: اقبال درونِ خانہ) نے اپنی والدہ مکرمہ سے پوچھ کر مجھے بتائی۔ صوفی صاحب کی والدہ زید مجدہا، شیخ عطا محمد صاحب (برادرِ اکبر حضرت علامہ) کی سب سے چھوٹی دختر ہیں، اور جس لڑکی کی شادی کا ذکر ہے وہ موصوفہ سے کوئی دو تین برس بڑی تھیں۔ مرتب۔

12- چودھری نیاز علی کے نام خط 20 جولائی 1937ء مندرج مکاتیبِ اقبال ج 1 ص 250 شیخ عطاءاللہ۔

13- حتیٰ کہ 1900ء میں بانیِ قادیانیت نے حکومت سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ مردم شماری کے

وقت ان کی جماعت اوران کے پیروؤں کا نام عام مسلمانوں سے الگ رجسٹر کیا جائے۔ ملاحظہ ہو اشتہار واجب الاظہار منجانب مرزا غلام احمد قادیانی مطبوعہ 4 نومبر 1900ء، مندرجہ مجموعہ اشتہارات جلد دوم ص 467 طبع جدید اشتہار نمبر 233۔

14- ''حرفِ اقبال'' ص 115، لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

15- روزنامہ الفضل، لاہور ص 5۔30 اگست 1950ء۔

16- ''یروشلم پوسٹ'' 9 اگست 1967ء بحوالہ روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور ص 1 مورخہ 22 مئی 1972ء و 3 ستمبر 1973ء۔

17- روزنامہ ''نوائے وقت'' ص 6۔22 مئی 1972ء۔

18- نوائے وقت لاہور ص 1، 7 اپریل 1973ء۔

19- یہ صاحب آج کل ''ورلڈ بنک'' کے ایک اونچے عہدہ پر فائز ہیں۔ یہ بنک اقوام متحدہ کی ایک ذیلی شاخ کی حیثیت رکھتا اوراس پر بین الاقوامی صہیونیوں کا اثر غالب ہے۔(ن۔آ)

20- ''ابرآلود سورج'' از مولوی فرید احمد۔

21- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 128، لطیف احمد شروانی۔

22- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 118، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

23- ''حرفِ اقبال'' ص 128، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

24- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 129، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

25- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 128، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

26- آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ ص 6۔ مبصر مرزا ناصر احمد ''خلیفۂ ثالث'' شائع کردہ نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمنِ احمدیہ پاکستان ربوہ۔

27- قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ آسمانی نوشتوں میں لکھا ہے اور وہ پورا ہو کر رہے گا کہ یہ مقام (ربوہ) دنیوی لحاظ سے بھی ایک اہم مقام بن جاوے گا، اس عبارت کا ایک ایک لفظ الفضل نامی قادیانی روزنامے سے منقول ہے۔ ملاحظہ ہو اشاعت بابت 7 فروری 1951ء تب یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا تھا۔

28- رومن کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ وہ مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار ہے۔

29- جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اوراس کے پیروؤں نے کیا۔(ن۔آ)

30- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 116، لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

31- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 129، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

-32 ''حرف اقبال'' ص 34-133، لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

-33 ''حرفِ اقبال'' ص 116، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

-34 قادیانی اور لاہوری۔ اوّل الذکر مرزا غلام احمد کو ''نبی'' مانتا اور اس کے منکرین کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتا ہے۔ ثانی الذکر مرزا غلام احمد کو ''مجدد'' تسلیم کرتا ہے۔

-35 ''حرف اقبال'' ص 23-122، لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

-36 نام نہاد مناظرے اور مباحثے اس لیے کہ مرزا غلام احمد نے جو کچھ بھی لکھا یا کہا، وہ سب انگریزی اقتدار کے استحکام کی غرض سے تھا۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: ''اب میں اپنی گورنمنٹ محسنہ کی خدمت میں جُرأت سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہ بست سالہ میری خدمت ہے جس کی نظیر برٹش انڈیا میں ایک بھی اسلامی خاندان پیش نہیں کرسکتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اِس قدر لمبے زمانہ تک کہ جو بیس برس کا زمانہ ہے، ایک مسلسل طور پر تعلیم مذکورہ بالا پر زور دیتے جانا کسی منافق اور خودغرض کا کام نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کا کام ہے جس کے دل میں اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی ہے۔ ہاں مَیں اِس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مَیں نیک نیتی سے دُوسرے مذاہب کے لوگوں سے مباحثات بھی کیا کرتا ہوں۔ اور ایسا ہی پادریوں کے مقابل پر بھی مباحثات کی کتابیں شائع کرتا رہا ہوں۔ اور میں اس بات کا بھی اقراری ہوں کہ جبکہ بعض پادریوں اور عیسائی مشنریوں کی تحریر نہایت سخت ہوگئی اور حدِ اعتدال سے بڑھ گئی اور بالخصوص پرچہ ''نور افشاں'' میں جو ایک عیسائی اخبار لُدھیانہ سے نکلتا ہے، نہایت گندی تحریریں شائع ہوئیں .... تو مجھے ایسی کتابوں اور اخباروں کے پڑھنے سے یہ اندیشہ دِل میں پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے، ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو۔ تب مَیں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کے دبانے کے لیے حکمت عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے۔ تا سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہوجائیں اور مُلک میں کوئی بے امنی پیدا نہ ہو۔ تب میں نے بمقابل ایسی کتابوں کے جن میں کمال سختی سے بدزبانی کی گئی تھی، چند ایسی کتابیں لکھیں جن میں کسی قدر بالمقابل سختی تھی کیونکہ میرے کانشنس نے قطعی طور پر مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو بہت سے وحشیانہ جوش والے آدمی موجود ہیں، ان کے غیظ وغضب کی آگ بجھانے کے لیے یہ طریق کافی ہوگا۔ کیونکہ عوض معاوضہ کے بعد کوئی گلہ باقی نہیں رہتا۔ سو یہ میری پیش بینی کی تدبیر صحیح نکلی۔ اور ان کتابوں کا یہ اثر ہوا کہ ہزار ہا مسلمان جو پادری عماد الدین وغیرہ لوگوں کی تیز اور گندی تحریروں سے اشتعال میں آ چکے تھے، یکدفعہ ان کے اشتعال فرو ہوگئے۔ کیونکہ انسان کی یہ عادت ہے کہ جب سخت الفاظ کے مقابل پر اُس کا عوض دیکھ لیتا ہے تو

اُس کا وہ جوش نہیں رہتا۔ بااین ہمہ میری تحریر پادریوں کے مقابل پر بہت نرم تھی گویا کچھ بھی نسبت نہ تھی۔ ہماری محسن گورنمنٹ خوب سمجھتی ہے کہ مسلمان سے یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اگر کوئی پادری ہمارے نبی ﷺ کو گالی دے تو ایک مسلمان اُس کے عوض میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گالی دے کیونکہ مسلمانوں کے دلوں میں دُودھ کے ساتھ ہی یہ اثر پہنچایا گیا ہے کہ وہ جیسا کہ اپنے نبی ﷺ سے محبت رکھتے ہیں ایسا ہی وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت رکھتے ہیں۔ سو کسی مسلمان کا یہ حوصلہ ہی نہیں کہ تیز زبانی کو اِس حد تک پہنچائے جس حد تک ایک متعصب عیسائی پہنچا سکتا ہے اور مسلمانوں میں یہ ایک عمدہ سیرت ہے جو فخر کرنے کے لائق ہے کہ وہ تمام نبیوں کو جو آنحضرت ﷺ سے پہلے ہو چکے ہیں، ایک عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام سے بعض وجوہ سے ایک خاص محبت رکھتے ہیں۔ جس کی تفصیل کے لیے اس جگہ موقع نہیں۔ سو مجھ سے پادریوں کے مقابل پر جو کچھ وقوع میں آیا، یہی ہے کہ حکمت عملی سے بعض وحشی مسلمانوں کو خوش کیا گیا۔'' (تریاق القلوب صفحہ 361 تا 363 مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 489 تا 491 از مرزا قادیانی)

37- حضرت علامہؒ کے بڑے بھائی کا بیٹا (شیخ اعجاز احمد) آج بھی مرزائی ہے اور بڑا غالی اور کٹر قسم کا مرزائی اور ان کے اہلِ خاندان اس کے جو وجوہ بیان کرتے، وہ ناگفتنی ہیں۔

38- ''سیرت المہدی'' ج 3 ص 249، مرزا بشیر احمد ایم اے طبع اوّل، اپریل 1939ء۔

39- ''ذکرِ اقبالؒ'' ص 211، عبدالمجید سالک۔

40- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 202، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

41- ''پنجاب کی سیاسی تحریکیں'' ص 210، عبداللہ ملک۔

42- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 202، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

43- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 203، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

44- ''حرفِ اقبالؒ'' ص 204، لطیف احمد شروانی، ایم۔اے۔

45- ''احرار اور تحریکِ کشمیر'' ص 161 بحوالہ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خاں۔

46- ''عجمی اسرائیل'' ص 35، آغا شورش کاشمیری۔

47- ''عجمی اسرائیل'' ص 34، آغا شورش کاشمیری۔

48- ''کشتی نوح'' ص 33، مرزا غلام احمد قادیانی۔

49- ''الفضل'' 11 دسمبر 1932ء تقریر مرزا محمود، ''حقیقت الرویاء'' ص 45 مصنفہ مرزا محمود۔

50- ''انوارِ خلافت'' ص 117 مرزا محمود...... ''راہِ ایمان'' ص 92، شیخ خورشید احمد قادیانی۔

51- ''احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'' ص 14۔ عبدالمالک خاں شائع کردہ نظارتِ اشاعت لٹریچر و

تصنیف صدر انجمنِ احمدیہ پاکستان ربوہ۔
-52 ''الفضل''، ربوہ مورخہ 24 جون 1967ء۔
-53 ''الفضل''، قادیان 30 مئی 1935ء بحوالہ ''پنجاب کی سیاسی تحریکیں''، ص 218-217، عبداللہ ملک۔
-54 ''تحدیثِ نعمت''، ص 99-298 و ص 347، چودھری سر محمد ظفر اللہ خان۔
-55 ''سیرت المہدی''، جلد سوم ص 249، جلد اوّل ص 764 طبع جدید از مرزا بشیر احمد، ایم۔اے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ضربِ کلیم اور احمدیت

ضربِ کلیم کی اشاعت پر اکثر اربابِ بینش کو یہ خیال ہوا تھا کہ احمدی حضرات اس کے بعض اشعار کو اپنی تعریض پر محمول کریں گے۔ چنانچہ 10 اکتوبر کے سن رائز میں جو ''ریویو'' اس کتاب پر شائع ہوا ہے، اس نے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ احمدی حضرات نے علامہ مدظلہ کے بعض اشعار کو ''سلسلۂ عالیہ'' کی طرف منسوب کر کے قادیانی خانہ ساز نبوت کا راز اس خوبصورتی کے ساتھ فاش کیا ہے اور اپنی تضحیک کا ایسا دلکش سامان بہم پہنچایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ غالباً اسی لیے کسی دانا نے یہ کہا ہے کہ خدا انسان کو نادان دوستوں سے محفوظ رکھے۔

مدیر ''سن رائز'' کو کیا خبر کہ اس کتاب میں افراد و اشخاص سے بحث نہیں کی گئی بلکہ فلسفیانہ طریق پر عہدِ حاضر کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کی غلط روش، غلط تعلیمات، غلط خیالات اور غلط منطق کی نہایت واضح الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ افرنگ اور دانشِ افرنگ کے ساتھ ساتھ عرب و عجم اور ایران و ہندوستان پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ کے مختلف شعبوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ الغرض ضربِ کلیم مغرب اور مشرق دونوں پر بے لاگ تبصرہ ہے جس کی نظیر اردو تو کیا اس وقت تمام ایشیائی لٹریچر میں بھی ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے انحطاط خیز رجحانات اور ملوکیت پسند تاویلات کی تشریح کے آئینہ میں جو علامہ کے قلمِ معجز رقم نے کی ہے، قادیان اور اربابِ قادیان کو اپنی صورت نظر آ گئی وگرنہ، ہم مدیر ''سن رائز'' کو یقین دلاتے ہیں کہ قادیانیت اس درجہ اہم نہیں کہ علامہ اس کے تذکرہ سے ضربِ کلیم کے صفحات سیاہ فرماتے۔

اس ریویو کو پڑھنے کے بعد جو چیز نمایاں طور سے نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ لکھتے وقت

مدیر ''سن رائز'' کا توازنِ دماغی قائم نہ رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ریویو ضربِ کلیم پر تنقید کے بجائے احمدیت کی تائید کی شکل میں بدل گیا۔ مدیر مذکور نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال جہاد کے قدیم پارینہ اور خونی تصور کے قائل ہیں۔ برطانی ملوکیت کے دشمن ہیں اور بے قوت نبوت کو برگِ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم احمدیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکِ جہاد کو منسوخ اور ناجائز قرار دیتی ہے۔ برطانوی ملوکیت کی ثناخواں ہے بلکہ اسے آیۂ رحمت سمجھتی ہے اور بے قوت نبوت پر ایمان رکھتی ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ اور ان کی تنقید کو Oblique Remarks یعنی در پردہ تعریض کیوں سمجھتے ہیں۔ اس درجہ تفاوت ہے کہ بُعد المشرقین نظر آتا ہے تو مدیر کو شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مسلک کی اشاعت میں آزاد اور مختار ہیں۔ اگر اس کی بنا پر تمھارے مسلک پر زد پڑتی ہے تو کوئی کیا کرے؟ کیا علامہ موصوف محض اس خیال سے اعلائے کلمۃ الحق سے باز رہیں کہ ان کے کلام معجز نظام کی ضرب سے احمدیت کے آبگینے چکنا چور ہو جائیں گے؟ اگر ہم چوری کی مذمت کریں اور کوئی چور اس مذمت کو سن کر یہ کہنے لگے کہ یہ مجھ پر در پردہ تعریض کی گئی ہے تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ اس معاملہ میں سوائے اُس کے کہ اس شخص کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور چارہ کار ہی کیا ہے؟ قرآن مجید میں اس فعل کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔ سُوءِ اتفاق سے ابولہب نے خانہ کعبہ سے سونے کا ایک ہرن چرایا تھا۔ لہٰذا جب کبھی وہ ان آیات کو جن میں چوری کی مذمت کی گئی ہے، سنتا تھا، تو یہی کہتا تھا کہ حضرت محمد ﷺ نے در پردہ مجھ پر چوٹ کی ہے۔ بعینہٖ یہی حال قادیانیوں کا ہے حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ تم ان تینوں باتوں کے قائل ہو۔ ڈاکٹر صاحب ان تینوں باتوں کے سخت مخالف ہیں اور ان کو علیٰ وجہ البصیرت اسلام کی روح کے منافی خیال فرماتے ہیں۔ پھر تم ان کی تنقید کو پڑھ کر نعل در آتش کیوں ہوتے ہو اور ان سے وجہ شکایت کس لیے پیدا کرتے ہو؟ تمہارا مذہب اور ان کا مسلک اور وہ رہ نوردِ کعبہ، تم عازم ترکستان! جب فی مابین، کوئی وجہ اتحاد خیال ہی نہیں تو اس واویلا کی کیا ضرورت ہے!

آیئے! اب نہایت سکونِ قلب کے ساتھ ان حقائق سہ گانہ کا مذہبی اور عقلی زاویہ نگاہ سے تجزیہ کر کے دیکھیں تا کہ ڈاکٹر صاحب کا مسلکِ زریں ہر شخص پر روزِ روشن کی طرح ہویدا ہو جائے۔

(1) اسلامی جہاد کی تعریف

اپنے مذہب یا اس شے کی حفاظت اور بقا کی خاطر، جسے انسان مقدس اور محترم سمجھتا ہو، اپنی زندگی تک قربان کر دینا، یہ اسلامی جہاد کی تعریف ہے۔ عقل، تاریخ اور مشاہدہ تینوں اس کی تائید کرتے ہیں۔

(الف) اگر کوئی شخص اپنے مذہب، ثقافت (کلچر) یا مقدس روایات یا وطنِ عزیز کی حفاظت کے لیے بھی تلوار نہیں اٹھا سکتا تو پھر خدا جانے اس کی تلوار کس دن کام آئے گی؟ تلوار تو بنائی ہی اس لیے گئی تھی کہ اپنی جان و مال اور دین و ایمان کی حفاظت و حمایت میں بلند کی جائے اور یہی تعلیم اسلام کی ہے کہ اس کو اس وقت نیام سے باہر نکالا جائے جب دشمن تم پر یا تمھارے مذہب پر یا تمھارے ملک پر حملہ آور ہو۔

(ب) حضور نبی کریم ﷺ کا طرز عمل بھی اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ آپ ﷺ نے اسلام کی اشاعت کے لیے یا لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے یا دوسروں کو ان کے وطن سے محروم کرنے کے لیے کبھی ہرگز تلوار نہیں اٹھائی۔ آپ نے بلاشبہ جنگوں میں حصہ لیا لیکن وہ سب رفعِ فتنہ کے لیے تھیں۔

(ج) اپنے مذہب اور اپنے مقاماتِ مقدسہ مثلاً بہشتی مقبرہ اور منارة المسیح کی حفاظت کے لیے اپنا خون بہانے اور اپنی جانیں قربان کرنے کا اعلان خود قادیان کی سرزمین سے بھی کئی دفعہ ہو چکا ہے۔

الغرض جہاد کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، ہر شخص کو دنیا میں جینے اور آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی روایات پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر کوئی طاقت اس معاملہ میں اس کی مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا، حتیٰ **یکون الدین کلمت اللہ**، سراسر قرینِ عقل و صواب ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ میں کس مقصد کی تکمیل کر رہا ہوں، اس وقت تک اپنی تلوار نیام سے باہر نہیں نکال سکتا۔ انسان اس وقت جنگ کرتا ہے جب اپنے آپ کو برسرِ حق یقین کرتا ہے۔ حکومتیں انسانی فطرت کے اس پہلو سے آگاہ ہیں۔ اس لیے وہ، دنیاوی جنگوں کو بھی جن کا مقصد قتل و غارت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، مقدس بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ صلیبی جنگوں کا مقصد دراصل یہ تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی

طاقت کو روکا جائے لیکن حکومتوں نے پادریوں کی وساطت سے ان جنگوں کو ''مقدس'' قرار دلوایا تا کہ لوگ آمادۂ پیکار ہوسکیں۔ حالانکہ صلیبی اقوام نے، ارضِ شام میں جس بربریت اور سفا کی کا مظاہرہ کیا، اسے تقدس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ خود ہمارے زمانہ میں جو محاربہ عظیم یورپ میں برپا ہوا، برطانوی مدبرین نے اسے بھی پادریوں کے ''مقدس'' ہاتھوں سے تقدس و بپتسمہ دلوایا۔ چنانچہ کنٹر بری کے اسقفِ اعظم نے اعلانات شائع کیے کہ شریکِ جنگ ہونے سے برطانیہ کو اپنا کوئی نفع مدنظر نہیں ہے۔ اس نے محض حق وصداقت کی حمایت میں تلوار اٹھائی ہے اور کمزور کی حمایت کی غرض سے شریکِ جنگ ہوا ہے۔ حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے جس کا نام **Irene Cooper Wills** ہے، جنگ عظیم کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے **England`s Holy War** ''انگلستان کی جنگِ مقدس''۔ الغرض اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تلوار چلانا، رسول ﷺ کے زمانہ میں بھی ممنوع تھا (**''لا اکراہ فی الدین''**) اور آج بھی ممنوع ہے اور اسلام کی حمایت اور حفاظت کے لیے تلوار اٹھانا ابتدائے اسلام میں بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے اور قیامت تک جائز رہے گا۔ مرزا صاحب سے جو غلطی دانستہ یا نادانستہ طور پر سرزد ہوئی، وہ یہ تھی کہ انھوں نے اسلامی جہاد کے غلط معنی دنیا کے سامنے پیش کیے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دِیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

ان دونوں مصرعوں میں جو لفظ ''اب'' آیا ہے، اگرچہ ادبی زاویۂ نگاہ سے اس کی تکرار بہت مذموم ہے لیکن مرزا صاحب کی، اسلام سے ناواقفیت کا ثبوت دینے کے لیے بہت کافی ہے یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ دین کے لیے جنگ وقتال پہلے جائز تھا، اب جائز نہیں ہے۔ کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے جو انھوں نے دنیا کو دیا!

کاش انھیں تاریخ وفلسفۂ اسلام سے واقفیت ہوتی! بندۂ خدا! دین کی اشاعت کے لیے جہاد کرنا پہلے کب جائز تھا؟ جو تم آج ناجائز قرار دے رہے ہو؟ اسلام پہلے کب بزورِ شمشیر پھیلایا گیا جو آج تم ناصح مشفق بن کر اس کی ممانعت کر رہے ہو؟

اگر جوع الارض کو تسکین دینے کے لیے یا ملوکیت اور شہنشاہیت قائم کرنے کے لیے یا

بے گناہ اقوام کو غلام بنانے کے لیے جہاد کیا جائے تو وہ جہاد ہی کب ہے؟ وہ تو غارت گری ہے۔ خود علامہ فرماتے ہیں:

جنگ شاہانِ جہاں غارت گری است

جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است (1)

تعجب ہوتا ہے تعلیم یافتہ احمدی حضرات پر کہ یہ لوگ کیونکر اس سفسطہ کا شکار ہو سکتے ہیں؟ کیا احمدیوں میں کوئی ایسا روشن خیال انسان نہیں جو اسلامی فلسفہ و تاریخ کا مطالعہ کر کے اس مغالطہ کی دلدل سے باہر نکل سکے؟ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے کہ اسلام میں جہاد کا معنی اور مفہوم کیا ہے؟ جنگ اور قتال اگر اس کا محرک ہوسِ ملک گیری اور استعماری حکمتِ عملی ہو تو یہ بات اسلام میں کبھی بھی جائز نہ تھی۔ پھر مرزا صاحب اپنے اس ''الہامی شعر'' میں کس چیز کو حرام قرار دے رہے ہیں؟ اسی بات کو نا، جو پہلے ہی سے حرام ہے تو حرام کو حرام قرار دینا یہ کون سی دانشمندی ہے؟ اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ کے وقت بھی مسلمانوں کا اپنے مذہب کی حمایت میں تلوار اٹھانا حرام ہے، تو وہ مذہب اسلام سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں سے قادیانی حضرات جو صورت پسند کریں اختیار فرمالیں، مرزا صاحب کی علمی اور مذہبی پوزیشن بہر حال متزلزل ہو جائے گی۔ اگر پہلی صورت صحیح ہے تو مرزا صاحب مغالطہ کے مرتکب ثابت ہوتے اور دوسری صورت کو تسلیم کیا جائے تو اسلام کے اصولوں سے کورے نظر آتے ہیں۔

اسی لیے حکیم الامت علامہ اقبال مدظلہ نے مسلمانوں کو مرزا صاحب اور مرزائیت دونوں کی غلط تعلیمات سے محفوظ کر لینے کے لیے اسرارِ خودی میں اس حقیقت کو آشکار فرما دیا ہے کہ اسلام میں جہاد کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصدِ وحید اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اگر کوئی طاقت مسلمان کو اس کے اس مذہبی فریضہ کی تکمیل سے باز رکھنا چاہے یا اس میں مزاحمت کرے تو وہ حق و صداقت کی حمایت میں تلوار اٹھا سکتا ہے۔ لیکن وہ جہاد جس کا مقصد جوع الارض ہو، تسخیرِ ممالک ہو یا قتل و غارت گری ہو، اسلام میں بالکل حرام ہے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں:

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید

تیغ اُو در سینۂ او آرمید (2)

اب جو شخص بھی مرزا صاحب کے مذکورہ بالا شعر کو پڑھے گا، وہ لامحالہ یہی سمجھے گا کہ دین کی اشاعت کے لیے پہلے اسلام میں جنگ وقتال جائز تھا یعنی نعوذ باللہ قرونِ اولیٰ میں اسلام کی اشاعت اس کے پاکیزہ اصولوں کی وجہ سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوئی اور تیرہ سو سال کے بعد جا کر مرزا صاحب نے اس بات کو حرام قرار دیا ہے۔

معلوم نہیں مرزا صاحب نے جہاد کے متعلق یہ غلط خیال کیوں پھیلایا۔ شاید حکومت کی نظروں میں عزت حاصل کرنے کے لیے، ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دین کی اشاعت کے لیے تلوار چلانا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی جائز نہ تھا اور نہ قرآن مجید کی اس صریح آیت کی موجودگی میں (**لا اکراہ فی الدین**) کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان کرنا جائز ہوسکتا ہے اور اسلام تو سرتاپا معقولیت پسند مذہب ہے۔ وہ کب اس بات کو روا رکھ سکتا ہے کہ لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔

اگر دین کے لیے جنگ وقتال مرزا صاحب سے پہلے حلال ہوتا تو ڈاکٹر آرنلڈ جو ایک سچا مسیحی تھا اور یقیناً مسلم نہ تھا کس طرح اپنی مشہور کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' مرتب کرسکتا تھا؟ اس کتاب میں اس منصف مزاج انگریز نے اسلامی تاریخ کی بناء پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ اسلام اپنی ابتداء سے آج تک تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ (3)

(2) قادیان کے مسلکِ جاسوسی پر عمل کرنے کے لیے دوسرا اعتراض مدیر ''سن رائز'' نے یہ کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی ممالک پر برطانوی اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور دولِ مغرب کی استعماری حکمتِ عملی کے خلاف ہیں۔

جہاں تک میں نے غور کیا اس باب میں بھی، مدیر مذکور کی ناراضگی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارا مسلک انگریزوں کی غلامی ہے۔ یہ تمھیں مبارک رہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مسلک درسِ حریت وآزادی ہے، وہ انھیں مبارک رہے، آخر تم کو ان پر اعتراض کرنے اور ان کی تعلیم پر ناک بھوں چڑھانے کا کیا حق حاصل ہے؟ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے مسلک کی یا اس بات کی جسے وہ صحیح سمجھتا ہے تبلیغ کرے اور بلاخوف وخطر تبلیغ کرے۔ دیکھنا اگر ہے تو یہ، اور غور کے قابل اگر کوئی بات ہے تو یہ کہ کس کی تعلیم منشائے اسلام کے مطابق ہے؟

قادیانیوں کے مذہب میں مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھانا جائز بلکہ فرضِ عین ہے۔

چنانچہ مرزا صاحب خود لکھتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے دو خاص جزو ہیں: ایک خدا کی اطاعت دوسرا گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت۔ اوران کی تمام عمر مسلمانوں کو درسِ غلامی دینے اوران کے جذباتِ حریت کو فنا کرنے میں گزری اور کیوں نہ گزرتی؟ وہ اپنے قائم کردہ سلسلہ کو جسے وہ حقیقی اسلام کہتے تھے، سرکارِ انگلشیہ کا ''خود کاشتہ پودا'' قرار دیتے ہیں اوراس بات کو بڑے فخر ومباہات سے بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو اسلام برطانیہ کے زیرحمایت سرسبز ہو، وہ یقیناً اُس اسلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جس کی صداقت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تھا۔ وہ اسلام تو دنیا میں حریت اور آزادی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس میں دُوئی کی مطلق گنجائش نہیں، وہ تو صرف ایک ذاتِ مطلق کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اور وہ ذات اللہ ہے۔ چنانچہ مسلمان صرف اللہ کا مطیع ہوسکتا ہے، غیراللہ کے سامنے اس کی گردن قیامت تک نہیں جھک سکتی۔ شریعت کا مسئلہ ہے کہ دنیاوی حکومت کا کوئی حکم، خدا کے حکم کے خلاف ہوتو مسلمان کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ غیراللہ کے حکم کو ٹھکرادے۔ چنانچہ اسوۂ حسینی اس پر شاہدِ عادل ہے:

تا قیامت قطع استبداد کرد

موجِ خون او چمن ایجاد کرد (4)

تاریخ شاہد ہے کہ انبیا اپنی قوم کو درسِ حریت دینے کے لیے مبعوث ہوا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی، حضرت داؤدؑ نے اپنی قوم کو حکومت اور طاقت عطا کی، حضرت عیسیٰؑ نے بھی یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی، حضرت ختم المرسلین ﷺ نے بھی اپنی قوم کو حکومت اور طاقت عطا کی لیکن چودھویں صدی ہجری میں جو ''نبی'' پیدا ہوا، اس نے اپنی تمام عمر قوم کو غلامی کا درس دیا اور

گفت دیں را رونق از محکومی است

زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را رحمت شمرد

رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مرد (5)

اگر مرزا صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد ہوتا تو وہ کبھی اپنی قوم کو اغیار کی غلامی کا درس نہ دیتے لیکن وہ تو تمام عمر منارۃ المسیح، بہشتی مقبرہ اور توسیعِ مکان کی تکمیل کی فکر میں

سرگرداں رہے۔قوم کی فکر تھی ہی کب اور ہوتی بھی تو کیونکر؟

اس کے برخلاف، علامہ کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے! اور یہی درد تو انھیں مسلمانوں سے اس طرح خطاب کرنے پر مجبور کرتا ہے:

اے مسلماں! اندریں دیرِ کہن
تا کجا باشی اسیر اہرمن؟ (6)
زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس (7)

پھر کہتے ہیں:

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ؟
زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو
ما و جوئے خون و امید رفو؟ (8)

یہی درد تو انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو بیداری، سخت کوشی اور جدوجہد کا پیغام دیتے ہیں:

شیخ ملت با حدیثِ دلنشیں
بر مراد او، کند تجدید دیں (9)

(3) تیسری بات جس پر مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے خفا ہیں، یہ ہے کہ وہ بے قوت وشوکت نبوت کو برگ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم خود تسلیم کرتے ہو کہ مرزا صاحب قادیانی کی نبوت بے قوت تھی تو پھر ڈاکٹر صاحب نے اسے برگِ حشیش سے تعبیر کیا تو کیا برا کیا، کیا دو اور دو کو چار کہنا جرم ہے! بلاشبہ

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام (10)

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر میں مرزا صاحب کا نام نہیں لیا۔ صرف ایک حقیقت بیان کی ہے لیکن تم نے اس شعر کو ان کی طرف منسوب کر کے خود پردۂ نبوت کو چاک چاک کر دیا۔ تم

بے قوت نبوت کو آیۂ رحمت سمجھتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب اسے برگِ حشیش تصور فرماتے ہیں پھر جب فی مابین اتحادِ خیال ہی نہیں تو ڈاکٹر صاحب سے شکوہ کس بات کا ہے؟

چونکہ ڈاکٹر صاحب ایسی نبوت کو برگِ حشیش سمجھتے ہیں، اس لیے ان کا فرض تھا کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ ایسی نبوت جو مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھائے، ان کے حق میں برگِ حشیش سے کم نہیں۔ علامہ نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کر کے اپنا وہ فرض ادا کیا ہے جو حکیم الامت، مصلحِ قوم اور دانائے راز ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔

خدارا ہمیں یہ تو بتایا جائے کہ مرزا صاحب کی اس نبوت اور ان کے لاتعداد الہامات سے مسلمانوں کو **من حیث القوم** کیا فائدہ پہنچا؟ نبوت بلاشبہ رحمتِ الٰہی ہے لیکن اس نبوت کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے جو قوم کی غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ مضبوط کرے۔

اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ مرزا صاحب نے جو الہامات شائع کیے، وہ صحیح تھے یا غلط؟ سچے تھے یا جھوٹے؟ سوال تو یہ ہے کہ خدائے قدوس نے جو الہامات ان پر نازل فرمائے، ہمارے لیے ان کی قیمت کیا ہے؟ کیا ان کی مدد سے یا ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی، اقتصادی اور تمدنی مشکلات کا خاتمہ ہوسکتا ہے؟

آج مسلمان جن روح فرسا مصائب سے دوچار ہیں، ان میں دو سب سے اہم ہیں۔ اولاً: استعمار پرستانِ مغرب کی دسیسہ کاریاں اور دست درازیاں، ثانیاً: افلاس اور اقتصادی بدحالی۔ کیا مرزا صاحب کے الہامات میں مسلمانوں کی ان دو مصیبتوں کا کوئی علاج مل سکتا ہے؟ ایک دنیا اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ مسلمان رُو بزوال ہیں اور ان کے زوال کا اصلی سبب بے زری نہیں، بلکہ رگوں میں خون کا سرد ہو جانا، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سرد شدہ خون کو از سرنو گرمایا جائے۔ کیا مرزا صاحب کے الہامات مثلاً (1) ربنا العاج (2) بست روپیہ آنے والے ہیں (3) پیٹ پھٹ گیا (4) **شاتان تذبحان و غیر ذالک** کے وردِ زبان کرنے یا، ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں میں شانِ کراری پیدا ہوسکتی ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا ہے، ان کے تمام الہامات، ارشادات، ملفوظات اور تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ غلامی پر قناعت کرو اور دن رات انگریزی حکومت کے گن گاتے رہو۔ محکوموں کے درد کا مداوا یہ نہیں کہ انھیں غلامی کا سبق پڑھایا جائے۔ آج ہمیں مفلوج اور مجہول بنانے والے الہام کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے الہام کی

جو مردہ رگوں میں حیات پیدا کر سکے:

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالمِ افکار (11)

جو نبوت قوم کے افراد کو آغوشِ غلامی میں سُلانے کی کوشش کرے، وہ برگِ حشیش نہیں تو اور کیا ہے؟

الہامات شائع کرنے کے علاوہ دوسرا کارنامہ مرزا صاحب کا پیشگوئیاں شائع کرنا اور ان کو اپنی صداقت کا نشان ٹھہرانا ہے۔ کما قال:

ہاں! نہ کر جلدی سے انکار اے سفیہ ناشناس
اس پہ ہے میری سچائی کا سبھی دار و مدار

(مرزا قادیانی)

لیکن وہی سوال یہاں بھی درپیش ہے کہ ان متعدد پیشگوئیوں کے شائع کرنے سے جن میں اکثر و بیشتر پوری نہیں ہوئیں، مسلمانوں کو کیا دینی یا دنیاوی فائدہ پہنچا؟ ہاں مرزا صاحب کی جودتِ طبع کی داد ضرور دینی چاہیے کہ جب کسی پیشگوئی کے پورا نہ ہونے کے بعد مریدانِ باصفا، اس کی وجہ ان سے دریافت فرماتے تھے تو وہ نہایت تسلی بخش جواب دے دیا کرتے تھے۔ مثلاً آتھم والی پیشگوئی اور محمدی بیگم والی پیشگوئیاں پوری نہ ہوئیں تو انھوں نے متشلکین کی یہ کہہ کر تسلی کردی کہ میری پیش گوئیوں میں عموماً ایک پہلو مخفی ہوتا ہے۔ جس شخص کے متعلق کی جاتی ہے اگر وہ دل میں ڈر جائے تو پیشگوئی التواء کے دفتر میں منتقل ہو جاتی ہے۔

اس جواب کو منطقی پیرایہ میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

سوال: آتھم کو سزا کیوں نہیں ملی؟

جواب: وہ دل میں ڈر گیا تھا۔

سوال: اس کے دل میں ڈرنے کا کیا ثبوت ہے؟

جواب: کیونکہ اسے سزا نہیں ملی۔

یہ ہے قادیانی منطق! جس پر یونانی سوفسطائیوں کی ارواح بھی وجد کر رہی ہوں گی لیکن تعجب تو یہ ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ احمدی بھی اس منطقی مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مرزا صاحب نے بہشتی مقبرہ کی تعمیر کا اعلان شائع کیا تو لامحالہ یہ اعتراض وارد ہوا کہ جناب! پھر تو ایمان اور اعمال صالحہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔ جس کسی نے بہشتی مقبرہ میں مدفون ہونے کا انتظام کرلیا، اسے نجات کا سرٹیفکیٹ بلکہ یوں کہیے کہ بہشت کا پاسپورٹ مل گیا، تو آپ کے تعمیر کردہ بہشتی مقبرہ میں اور پاپایان روم کے ''تذکرۃ الغفران'' میں کیا فرق باقی رہا؟ سوال معقول تھا لیکن قربان جایئے مرزا صاحب کے ذہنِ رسا کے، جواب بھی ترشا ترشایا رکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ جو شخص اس مقبرہ میں مدفون ہوگا وہ بہشتی ہو جائے گا لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ بہشتی لوگ ہی اس مقبرہ میں مدفون ہوں گے۔'' سارے مریدانِ باصفا کی اس معقول جواب سے تسلی ہوگئی اور آج ''شیخ کلیسا'' کی یہ زندہ یادگار، زبانِ حال سے جملہ احمدیانِ کرام کو مژدۂ بہشت سنا رہی ہے۔ چنانچہ جائدادیں وقف ہو رہی ہیں، کتبے لگائے جا رہے ہیں اور ان کو دیکھ دیکھ کر ایمان تازہ ہو رہا ہے۔ سچ کہا ہے کسی عقلمند نے کہ ''یہ دنیا کبھی سادہ لوحوں سے خالی ہوئی ہے، نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔''(12)

سچ پوچھا جائے تو ہمیں تو مرزا صاحب سے دلی ہمدردی ہے۔ نہ ان کو اسلامی تاریخ سے واسطہ تھا نہ مسیحیت کی تاریخ سے کوئی علاقہ۔ ان کی ساری عمر ''مثیلِ مسیح'' کا دعویٰ کرنے میں گزر گئی۔ لیکن انھیں آخر وقت تک یہ پتہ نہ چلا کہ میں کس مسیح کے مثیل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوں؟ آیئے مرزا صاحب کی معلومات کے اس پہلو کو بھی ذرا واضح کردیں۔

جن لوگوں نے تاریخِ یورپ اور اسلام اور مسیحیت کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ موجودہ اناجیل یعنی عہد جدید کا مسیح اور قرآن مجید کا مسیح دو مختلف اشخاص ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جس مسیح کا مذکور ہے وہ اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور ان کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلائیں جیسا کہ شروع سے تمام انبیا کا مقصد رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے اپنی قوم کو درسِ حریت دیا۔

جس طرح تمام سلطنتوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو روا نہیں رکھ سکتیں کہ کوئی شخص، محکوموں کو اس برگِ حشیش کا اُتار پلائے جو ازل سے شہنشاہیت کے دسترخوان سے رعایا کو

مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ رومی حکومت بھی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ جناب مسیح علیہ السلام، قومِ یہود کو حریت کا سبق پڑھائیں، یا ان کے دل میں لیلائے آزادی سے ہمکنار ہونے کی تمنا پیدا کریں۔ پس حکومتِ وقت نے نہایت چابکدستی کے ساتھ علمائے یہود کو آلۂ کار بنایا اور ان کی مدد سے ''حکومت کے باغی'' کو کانٹوں کا تاج پہنا کر اپنی راہ سے ہٹا دیا۔

جب حکومت کو جنابِ مسیح کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ اصلی انجیل کو جو آرامی یا عبرانی زبان میں تھی اور جس میں یقیناً غیر اللہ کی غلامی سے نکلنے کی تاکید ہو گی، رفتہ رفتہ صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لیے نابود کر دیا، اور اس کی جگہ مختلف شہروں میں مختلف ''انجیلیں'' پیدا کر دیں، جن کی تعلیماتِ مذہبی حکومت کے منشاء کے مطابق تھیں۔ کلیسا کے مورخین نے اپنی کتابوں میں تقریباً 150 انجیلوں کا ذکر کیا ہے جو یہود میں تشتت اور افتراق پیدا کرنے کے لیے حکومت کے ایماء سے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے مرتب کیں۔ جب قسطنطین سریر آرائے (سلطنت ہوا تو اس کی) حکومت میں تو صلیب پرستوں کو عروج حاصل ہوا اور انھوں نے اپنی منشاء کے مطابق چار انجیلیں اور شاگردوں کے خطوط منتخب کر کے ''عہدِ جدید'' مرتب کر دیا جو آج ہمارے سامنے موجود ہے، جس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پانچویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس سے پہلے کا حال پردۂ خفا میں مستور ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جناب مسیح نے اگر کوئی کتاب اپنی قوم کو دی ہو گی تو وہ یونانی میں نہیں بلکہ عبرانی یا آرامی زبان میں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کی انجیل کے اس رومن ایڈیشن میں آپ کو ایسی ایسی باتیں ملیں گی جو ہرگز ہرگز خدا کے کسی اولوالعزم نبی کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ مثلاً قیصر کا حق قیصر کو دو، یا میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہود کو رومی قوم سے سخت نفرت تھی لیکن اس انجیل کے مطالعہ سے یہ بات قطعاً ظاہر نہیں ہوتی۔ موجودہ انجیل دونوں کو یہود کی نظروں سے اوجھل کر کے ایک خود ساختہ مسیح اور خود پرداختہ انجیل قوم کو دی۔ موجودہ انجیلوں کا مسیح تو ایک ''صوفی مسیحا'' نظر آتا ہے جو ترکِ دنیا پر اور تجرد اور غلامی پر قناعت کرنے پر زور دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں رومی حکومت کے لیے مفید تھیں۔ اب مرزا صاحب کو دیکھیے۔ آپ نے بھی برطانوی حکومت کی اطاعت کو جزوِ ایمان قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو برگِ حشیش پلانے کی سعیِ ناکام کی ہے۔ جس طرح موجودہ انجیل کا پیش کردہ مسیح رومی حکومت کا مطیع نظر آتا

ہے،اسی طرح موجودہ زمانہ کا ”مثیلِ مسیح“ برطانی حکومت کا مطیع نظر آتا ہے۔لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مرزا صاحب مثیلِ مسیح تو ہیں مگر نقلی مسیح کے مثیل ہیں،جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے نہ احادیث میں۔

واضح ہو کہ مرزا صاحب نے ایک مرتبہ ضلع گورداسپور کے ایسے افراد کی فہرست مرتب کی تھی جو اُن کی نظر میں ”وفادار“ نہ تھے اور حکومت کو ان کے متعلق معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ مرزائیوں نے اکثر اوقات اپنے مرشد کی اس تعلیم پر عمل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں احمدیت کے ان مبلغین کو ”برطانوی جاسوس“ سمجھا جاتا ہے۔غالباً اسی اصولِ جاسوسی کے ماتحت مدیرِ سن رائز نے بھی حکومت کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال مسلمانوں کو درسِ حریت دے رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے پیغام کو پڑھ کر مسلمانانِ ہند اُن کے ہم خیال ہو جائیں۔

مدیرِ مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ علامہ موصوف خدا کے فضل و کرم سے،مرزائیوں کے اس فعل کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔انھیں اس کی مطلق پروا نہیں اگر حکومت کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مسلمانوں کو بیدار کر رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں کو بیدار کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ شاید مرزائیوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بیدار کرنا ہی علامہ موصوف کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔”**ولو کرہ الکافرون**۔“

بیشک علامہ موصوف، اسلامی ممالک پر دولِ مغرب کے تسلط و اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان جس کے دل میں اسلام کی محبت ہے،ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اسلامی ممالک، استعمار پرستانِ مغرب کی ہوس پرستی کا شکار ہو جائیں۔ابھی چند روز کی بات ہے کہ بہت سے مسلمان ارکانِ اسمبلی کے وفد نے جو وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا،صاف لفظوں میں حکومت کو بتا دیا کہ مسلمانانِ ہند حکومت برطانیہ کی اس حکمتِ عملی کو جو فلسطین کے متعلق کارفرما ہے،سخت ناپسند کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ خود حکومت برطانیہ بھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہے کہ مسلمانانِ عالم اس کی استعماری پالیسی سے سخت بیزار ہو چکے ہیں، چنانچہ انگلستان کے بعض مدبرین اور امرائے سلطنت جن کے ناموں سے دنیا واقف ہے،مسلمانوں سے دوستی پیدا کرنے کے لیے ایک انجمن بھی قائم کر چکے ہیں اور حکومت کو بہت سے سیاسی مبصر اکثر متنبہ کرتے رہے ہیں کہ اسے مسلمانوں کے جذبات کے خلاف کوئی قدم

نہیں اٹھانا چاہیے۔ لہٰذا مدیر ''سن رائز'' کو مطمئن رہنا چاہیے کہ علامہ موصوف یا مسلمانانِ ہند پر اُن کی اِن گیدڑ بھبکیوں کا مطلق کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔

تبصرہ نگار نے اس ریویو میں یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کے کلام میں شعریت نہیں ہے۔ ہمیں یہ الفاظ پڑھ کر مطلق تعجب نہیں ہوا کیونکہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست والا مضمون ہے۔ جو لوگ مرزا صاحب کو سلطان القلم کہتے ہیں اور ''درثمین'' کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں، وہ بالِ جبریل یا ضربِ کلیم کے اشعار کی قدر و منزلت کس طرح کر سکتے ہیں۔

مدیر مذکور کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں تلخی پائی جاتی ہے۔ سو اس کے متعلق گزارش ہے کہ تلخی اور تلخ کامی جو ناکامی کا نتیجہ ہے، وہ تو کچھ قادیان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ پرانی باتوں کو جانے دیجیے۔ خلیفۃ المسیح اور حضرت امیر قوم کے خطبات وارشادات ہی کو دیکھ لیجیے جو ہر ہفتے الفضل اور پیغامِ صلح میں شائع ہوتے ہیں اور جن میں ایک دوسرے کے خلاف کیا کیا زہر اگلا جاتا ہے۔ کیا مدیر ''سن رائز'' چاہتے ہیں کہ ہم انھیں ''او بدذات فرقۂ مولویان'' اور ''ذریت البغایا'' جیسی نادر ترکیبیں از سرِ نو یاد دلائیں؟

اس بات کا تو دشمنوں کو بھی اعتراف ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں بشارت ہے، امید ہے، جوش ہے، پاکیزگی ہے۔ مسرت ہے، مختصر یہ کہ نویدِ حیات ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگر احمدیت کو بے نقاب کیا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ اسے اسلام کی سیاسی طاقت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں بلکہ وہ اسے اسلام کی وحدت کے لیے ضرور مضرت رساں خیال فرماتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے بھولے بھالے مسلمانوں کو اسلام کے لباس میں جلوہ گر ہو کر راہِ راست سے ورغلایا۔ انھوں نے یہ کہہ کر ناواقف مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کی کہ میں کسرِ صلیب کے لیے مبعوث ہوں حالانکہ وہ خود مدۃ العمر صلیب پرستوں سے دادِ وفاداری طلب کرتے رہے اور اس مطلب کے چند الہام بھی شائع کیے۔ مگر افسوس کہ کچھ قدردانی نہ ہوئی۔ صلیب کی مخالفت مگر صلیبی قوتوں کی حمایت کیسا عجیب فلسفہ ہے۔ گلگلے کھانا مگر تیل سے پرہیز کرنا غالباً ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہوگا۔ اگر انھیں یورپین تاریخ سے واقفیت ہوتی تو شاید اس قسم کا دعویٰ کرنے کی زحمت گوارا نہ فرماتے کیونکہ ظاہری اور معنوی دونوں پہلوؤں سے یہ کام خود یورپ ہی نے مرزا صاحب کی پیدائش سے پہلے سرانجام دے دیا تھا۔

معنوی رنگ میں کسر کا دور اٹھارویں صدی میں شروع ہوا جب خود عقلائے یورپ نے ریفارمیشن کے بعد مسیحیت کے خلاف عقل اور مشرکانہ عقائد کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ تثلیث، تجسم، کفارہ، ہبوط آدم، سرنوشت ازلی، معصومیتِ پوپ، استحالہ جوہری، عشائے ربانی، الوہیتِ مسیحی اور الہامِ انجیل سب کے پرخچے اڑا دیے اور انیسویں صدی میں تو سڑاؤس نے یسوع کی شخصیت ہی کو (Myth) ثابت کر دیا اور Baur نے تنقید بائبل کے اصول مدون کر کے اس ''الہامی مجموعہ'' کو بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا۔ آج یورپ اور امریکہ میں فی صدی ایک تعلیم یافتہ انسان بھی ان عقائد پر ایمان نہیں رکھتا اور خود کلیسائی عہدہ داروں کو اس تلخ حقیقت کا اعتراف ہے۔ ظاہری رنگ میں کسرِ صلیب کا نظارہ خود بیسویں صدی میں ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا جبکہ بالشویکوں نے مسیحیت کو بہ یک بینی و دو گوش اور اس کے ساتھ ہی مذہب کو بھی اپنے ملک سے خارج کر دیا۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطیں لا کلیسا لا الہ (13)

الغرض کسرِ صلیب تو جس حد تک کی، یورپ نے کی۔ ہمارے مرزا صاحب نے کیا کیا؟ ہماری دانست میں انھوں نے اگر کچھ کیا تو یہ کہ مسلمانوں کو جنابِ مسیح کی قبر کا پتہ بتا دیا۔ حالانکہ وہ قبر جناب مسیح کی نہیں بلکہ بوز آسف کی ہے جو بدھ مذہب کا ایک سرگرم مبلغ تھا۔ مرزا صاحب نے بوز کو بیک جُنبشِ قلم ''یوز'' بنا دیا اور ''یوز'' کا سلسلہ یسوع سے ملا دیا۔ (14)

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے افراد کی زندگی کے ہر شعبہ میں کاہلی، تن آسانی اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے اور اس کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتی ہے چنانچہ آپ مسلمانوں کے گزشتہ تین چار سو سالوں کے آرٹ، لٹریچر، مذہب اور تصوف کا مطالعہ کر لیجیے، یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو جائے گی۔

ہندی مسلمانوں کو شاعری وہ پسند آتی ہے جس میں خلافِ عقل باتیں بیان کی گئی ہوں، جن کو حقیقت اور واقعیت سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنی شاعری میں حقائقِ کائنات بیان کرتا ہے یا انھیں حقائقِ زندگی کی طرف بلاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعری تو نثر کی طرح روکھی

پھیکی ہے، شاعری ہی نہیں ہے۔

تصوف اور مذہب کی وہ تاویل پسند آتی ہے جو ان کے لیے ترکِ دنیا اور تن آسانی کا جواز پیدا کر سکے اور مسیحِ موعود اور مہدیِ معہود کے ظہور کے انتظار میں زندگی بسر کرنے کا موقع دے سکے۔

تحریکِ احمدیت، اسلامیانِ ہند کی اس غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار اور اُن کے انحطاط پر ایک روشن شہادت ہے۔ یہ ان کے زوال کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو آج ہمیں نظر آ رہی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس تحریک کا تمام تر خلاصہ اور مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کیا جائے اور اغیار کی غلامی کو موجبِ رحمت سمجھا جائے۔

اس خاص قسم کی نبوت کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کو برگِ حشیش کے جام پلائے جائیں اور ان کو ایسی خواب آور گولیاں، مذہب کے ورق میں لپیٹ لپیٹ کر کھلائی جائیں کہ وہ اپنی ذلت اور نکبت، محکومی اور غلامی، پستی اور خواری کسی چیز کا احساس ہی نہ کر سکیں۔ اگر میرا یہ قول باور نہ ہو تو تحریکِ احمدیت کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ اس تحریک نے، مسلمانوں کو اپنی حالت کے سنوارنے کا، اپنی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مشکلات کے دور کرنے کا اور دنیا میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ سکھایا ہے؟

اگر آپ مرزا صاحب کی تعلیمات کے ساتھ علامہ اقبال کے کلام اور ان کے روح افروز پیغام کا مقابلہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیائے اسلام کے اس عدیم المثال شاعر کے سامنے، سرزمین پنجاب کا یہ ''نبی'' ادعائے وحی والہام اور پچاس الماری کتابوں اور لایعنی پیشگوئیوں کے باوجود، کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ان دونوں میں موازنہ چہ معنی دارد، دور کی بھی نسبت نہیں ہے، ایک اپنی قوم کو آزادی اور سربلندی کا درس دے رہا ہے، دوسرا اسے غلامی اور رسوائی کے قعرِ مذلت کی طرف لے جا رہا ہے۔ (15)

آج مسلمانوں کے لیے جو مسائل، موت وزیست کا حکم رکھتے ہیں، وہ یہ نہیں کہ مسیح مر گئے یا زندہ ہیں؟ اور مرزا غلام احمد قادیانی مثیلِ مسیح ہیں یا نہیں بلکہ یہ کہ غلامی کی زنجیریں کیونکر کٹیں؟ اور استعمار پرستانِ مغرب کے چنگل سے رہائی کیونکر نصیب ہو۔ جو نبی اس غلامی کو رحمت قرار دیتا ہو، اس کی تعلیمات میں، مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا حل تلاش کرنا ایسا ہی ہے، جیسے ''چیل کے گھونسلے میں ماس'' تلاش کرنا۔

یہ پیشگوئی کہ تین سو سال کے بعد تمام دنیا احمدی ہو جائے گی، مسلمانوں کے موجودہ مصائب کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ پس میں تمام احمدیوں کو مخلصانہ طور پر نصیحت کرتا ہوں کہ اگر وہ اسلام کے دوست ہیں، جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں تو برائے خدا پنجاب کے بھولے بھالے مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائیں اور انھیں غلامی کا سبق پڑھانے سے باز آ جائیں۔

مسلمان بہت دنوں تک خوابِ غفلت میں سوتے رہے اور دشمنوں کو دوست سمجھتے رہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اقبال کے کلام میں حیاتِ تازہ کا سامان تلاش کریں۔ اقبال شاعر نہیں بلکہ مسیحا ہے۔ اس کا کلام مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے اور اس کا پیغام فی الحقیقت اسلام ہی کا پیغام ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر (16)

حواشی

1- کلیاتِ اقبال صفحہ 773۔

2- کلیاتِ اقبال صفحہ 64۔

3- خواجہ کمال الدین جو مرزا صاحب کے نہایت معتمد اور وفادار مریدوں میں سے تھے، اپنی کتاب ینابیع المسیحیت کے ضمیمہ موسومہ اسلامی اصولِ جنگ میں رقمطراز ہیں۔ بعض اوقات ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انسان کے لیے اپنے دین کی حمایت میں تلوار اٹھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جنابِ مسیح کو اپنی قوم کی غلامی کا احساس تکلیف نہیں دیتا تھا؟ اور اگر انھیں موقع ملتا تو کیا وہ اپنی قوم کی بہبود کے لیے مدافعانہ جنگ کا اعلان نہ کرتے؟

اسی کو دوسرے لفظوں میں جہاد کہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے ایک قابل اور تعلیم یافتہ مرید جنھوں نے برسوں اپنے مرشد کی صحبت میں رہ کر فیض حاصل کیا تھا، بھی اسلامی جہاد کو جائز سمجھتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مذہب کی حمایت میں تلوار اُٹھا سکتا ہے۔

ہماری رائے میں مناسب ہے کہ قادیانی اور لاہوری فریق پہلے آپس میں تبادلۂ خیال کر کے یہ فیصلہ کر لیں کہ خواجہ صاحب کا نظریہ مسلکِ احمدیت کے مطابق ہے یا مخالف۔ (مصنف)

4- کلیاتِ اقبال صفحہ 110۔

5- کلیاتِ اقبال صفحہ 820۔

6- بعد میں اقبال نے یہ مصرع یوں بدل دیا: تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن، کلیاتِ اقبال صفحہ 833۔

-7 کلیاتِ اقبال صفحہ 833۔

-8 کلیاتِ اقبال صفحہ 842۔

-9 کلیاتِ اقبال صفحہ 811۔

-10 کلیاتِ اقبال صفحہ 518۔

-11 کلیاتِ اقبال صفحہ 506۔

-12 لیکن اس قسم کی ایجاد کا سہرا بھی مرزا صاحب کے ایک پیشرو مختار کے سر پر ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے امام حسینؓ کے دشمنوں سے جنگ کی تھی اور اس طرح حامیانِ آل علی کی ہمدردی اسے حاصل ہو گئی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دی جسے تاریخ میں کیسانیہ کا نام دیا گیا ہے۔ مختار نے مامور من اللہ اور ملہم ربانی ہونے کا دعویٰ کیا اور بہت سے سادہ لوح اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ آگے چل کر اس نے پیشگوئیوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جن میں سے اکثر پوری نہیں ہوئیں۔ اس پر اس کے بعض منچلے مریدوں نے اس سے سوال کیا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ آپ کی فلاں پیشگوئی، جس کے متعلق آپ نے نہایت وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ ضرور پوری ہوگی، پوری نہ ہوئی؟ مختار نے کہا میں دودن کے بعد اس سوال کا جواب دوں گا۔ سوال مشکل تھا لیکن مختار کے جودت مآب دماغ نے عین وقت پر اس کی امداد کی اور جو جواب اس نے دیا، اسے بدا کہتے ہیں۔ وہ یہ تھا کہ خدا پہلے ایک کام کا ارادہ کرتا ہے اور اس سے اپنے مقربینِ بارگاہ کو مطلع کر دیتا ہے لیکن پھر کسی وجہ سے ارادہ بدل دیتا ہے، اس لیے وہ بات پوری نہیں ہوتی اور محدود الفہم انسانوں کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ (مصنف)

-13 کلیاتِ اقبال صفحہ 815۔

-14 اب رہا مرزا صاحب کا یہ فرمانا:

چوں مرا نُورے پئے قوم مسیحی دادہ اند
مصلحت را ابنِ مریم نام من بنہادہ اند

یعنی آپ نے اپنے نزول کا دوسرا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ آپ کی تعلیم سے مسیحی لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں گے اور ہندوستان میں ''یدخلون فی دین اللہ'' کا نظارہ دوبارہ دیکھنے میں آئے گا۔ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ عیسائیوں کی تعداد میں کمی ہونے کے بجائے رات دن اضافہ ہی ہو رہا ہے، دُور جانے کی ضرورت نہیں، مرزا صاحب کے ضلع گورداسپور میں، گزشتہ 45 سال میں عیسائیوں کی مردم شماری میں جو اضافہ ہوا ہے، ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ چونکہ انھوں نے 1891ء میں مامور اور مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس لیے اسی سنہ سے شروع کرتے ہیں۔

1891ء میں عیسائیوں کی تعداد 2400 تھی۔

1901ء میں آپ نے نبی ہونے کا اعلان کیا اور ''ایک غلطی کا ازالہ'' شائع فرمایا تو ان کی تعداد 4471 ہوگئی۔

1911ء میں آپ کی نبوت کے زمانہ میں ان کی تعداد ایک دم 13365 ہوگئی۔

1921ء میں غالباً فیضانِ نبوت کی بدولت 32832 اور 1931ء میں 43245 ہوگئی۔(مصنف)

-15 اس جگہ اس امر کی صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ موصوف نے مخاطبہ و مکالمہ الٰہیہ کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ انھوں نے یہ کہا کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہوگی کہ وہ کس قدر صداقت، صفائی، خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور جس چیز کو وہ حق سمجھتے ہیں، اسے لگی لپٹی رکھے بغیر اعلانیہ صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں (مصنف)

-16 کلیاتِ اقبال صفحہ 821۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

علامہ اقبالؒ اور ان کے نقاد

اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی نے 1891ء میں پنجاب کے ''زندہ دل'' مسلمانوں سے بیعت لینی شروع کی تھی اور اسی سال سے ''سلسلہ عالیہ احمدیہ'' کی بنیاد ہندوستان میں قائم ہوئی۔ مسلمان علما اور صوفیا نے اپنی فراستِ ایمانی کی بدولت اس حقیقت کا پتہ تو اسی وقت لگا لیا تھا کہ مجددیت کا یہ دعویٰ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بالآخر نبوتِ مستقلہ پر منتج ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بساط کے مطابق اس تحریک کا مقابلہ کیا اور جہاں تک منقولی بحثوں کا تعلق ہے، دعویٰ کے کسی پہلو کو تشنۂ تنقید نہیں چھوڑا۔ لیکن سیاسیاتِ ملکی اور ان عوامل سے جو استعمار پرستانِ مغرب کی پالیسی کے ماتحت درپردہ ہندوستان میں کارفرما تھے، ناآشنا ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن اس تحریک کے حقیقی مبنیٰ اور ماخذ کی طرف منتقل نہ ہوسکا۔

واضح ہو کہ ایسا ہونا بعید از قیاس نہ تھا، کیونکہ دعویٰ کی بنیاد بظاہر احادیث اور بعد ازاں نصوصِ قرآنیہ اور بالآخر رموزِ صوفیا پر قائم کی گئی تھی، چونکہ علما اپنے مخصوص اور دیرینہ طریقِ فکر، اور افتادِ طبع کے باعث، روایاتِ ملیہ اور عقائدِ اسلامیہ کے تحفظ کے لیے (جن پر 1857ء میں شائدِ ضرب لگ چکی تھی) سب سے زیادہ کوشاں اور ساعی تھے۔ اس لیے ان کی توجہ تمام تر اس طرف مبذول ہوگئی کہ جس طرح ہوسکے، احادیث اور نصوص کو بازیچۂ اطفال بن جانے سے بچایا جائے۔ مبادا جنسِ نبوت اس قدر ارزاں ہو جائے کہ ہر کس و ناکس، خدمت اسلام کی آڑ میں اپنی دکان چمکا سکے اور نصوصِ قرآنیہ کو اقتضائے حکومت کے سانچہ میں ڈھال کر پروانۂ خوشنودی حاصل کرسکے۔

فی الجملہ ان علما کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت، اگرچہ مسلمان، اس تحریک کے مضرت رساں نتائج سے خبردار ہوگئے، لیکن ان اسرار و رموز سے آشنا نہ ہوسکے، جو اس تحریک کو عالمِ وجود

میں لانے کا باعث تھے اور اس کی تہ میں کام کر رہے تھے۔

بانیِ تحریک نے علمائے اسلام کے قیاس کے مطابق، امامت، مجددیت، مسیحیت اور مہدویت کے منازلِ عالیہ طے کرنے کے بعد اپنی وفات سے چند سال قبل دعوائے نبوت کر کے محمد عربی ﷺ کے اسلام کو منسوخ کر دیا اور اس کی جگہ ایک ایسا مذہب پیش کیا جس میں حکومتِ ارضی کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری شرطِ ایمان قرار پائی، مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لیے ''تبلیغ واشاعت اسلام'' کا ڈھول نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پیٹنا شروع کر دیا گیا۔

جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا، بھولے بھالے مسلمانوں کی اکثریت احمدیوں کی تبلیغی خدمات کی معترف ہوگئی اور اس جدید اسلام کی اشاعت کے لیے میدان صاف ہونے لگا۔

قریب تھا کہ اس ''خود کاشتہ پودے'' کے اثمارِ شیریں مسلمانوں کے کام و دہن کی ضیافت کا سامان بہم پہنچائیں، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خلافت اولیٰ کے بعد، جماعت احمدیہ خود دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ قادیانی گروہ نے غیر مبہم الفاظ میں مرزا قادیانی کی نبوت کا اعلان کیا، اور لاہوری گروہ نے آنجہانی کو صرف مجدد کے رنگ میں پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ 1914ء سے لے کر 1934ء تک ان دونوں پارٹیوں نے، مسلسل قلمی جنگ کی بدولت غیر احمدیوں کی بصیرت افروزی کے لیے کافی لٹریچر مہیا کر دیا۔ چنانچہ پیغامِ صلح اور روزنامہ الفضل قادیان کی فائلوں کا موازنہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مرزا قادیانی کی تصانیف میں، جو فریقین کا مستدل ہیں، اس قدر تناقض پایا جاتا ہے کہ ایک خالی الذہن محقق اور جویائے حقیقت دونوں کو رد کرنے پر مجبور ہے، اس بست سالہ مناقشہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے لاہوریوں پر یہ الزام لگایا کہ تم حضرت صاحب کے مرتبہ کا استخفاف کر کے کتمانِ حق کرتے ہو اور لاہوریوں نے قادیانیوں پر یہ فردِ جرم عائد کی کہ تم حضرت صاحب کو نبی قرار دے کر غیر احمدیوں کو سلسلہ عالیہ میں داخل ہونے سے روک رہے ہو۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ لاہوریوں کا خیال صحیح تھا۔ اگرچہ اس مناقشہ کی وجہ سے غیر احمدیوں کا حسنِ ظن شبہ اور نفرت کی شکل میں تبدیل ہونے لگا۔

لیکن اس تحریک کی اصلی حقیقت پر ہنوز پردہ پڑا ہوا تھا، بالآخر وہ وقت بھی آ گیا، جب قدرتِ خداوندی نے، حکیم الامت مفکرِ مشرق علامہ اقبال مدظلہ کو اس طرف مائل کیا کہ وہ اپنے اعجوبہ کار اور سحر نگار قلم کی چٹکی سے ناظورۂ حقیقت کے بندِ نقاب وا کر دیں۔ میری مراد اس معرکۃ

الآراء مضمون سے ہے جو علامہ موصوف نے دنیائے اسلام کی سب سے بڑی ضرورت کا احساس کر کے جنوری 36ء میں سپردِ قلم فرمایا۔ یہ مضمون اولاً اخبار ''ٹروتھ'' لاہور میں شائع ہوا اور بعد ازیں اخبار ''اسلام'' لاہور نے اسے پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے، اسلامیانِ ہند کو ممنونِ احسان بنا دیا۔ اخبار ''مجاہد'' اور رسالہ ''طلوعِ اسلام'' میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔

''ٹروتھ'' کے فاضل ایڈیٹر نے 27 جنوری کے پرچہ میں اس مضمون کے متعلق ایک شذرہ لکھا جس کا ملخص حسبِ ذیل ہے۔

''ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہ کا مضمون بعنوان 'اسلام اور احمدیت' نے تحریکِ احمدیت کی تنقید میں ایک اچھوتے باب کا اضافہ کیا ہے، جو اربابِ بینش کی آنکھوں کے لیے کحل الجواہر سے بھی بڑھ کر ثابت ہوگا۔ علامہ موصوف کا شمار اس وقت دنیا کے چیدہ اور منتخب مفکرین میں ہے۔ اس لیے لازمی طور پر ان کی تحریر بغایت دقّت آفریں اور بلحاظ بلندیٔ تخیل عامۃ الناس کی دسترس سے بالاتر ہے۔ یہ مضمون خالص فلسفیانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے جب تک اس کے مشکل مقامات کی تشریح و توضیح نہ کی جائے، اس وقت تک معمولی لیاقت کے لوگ اس کی گونا گوں ندرت آفرینیوں اور بوقلموں خوبیوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔''

اب اسے مسلمانوں کی بدقسمتی کہیے یا ''ٹروتھ'' کے ایڈیٹر کی بالغ نظری کہ ان کا یہ قیاس حرف بحرف صحیح نکلا۔ اس مضمون کا جو ترجمہ روزنامہ ''مجاہد'' میں شائع ہوا جسے بعد ازیں، سیکرٹری شعبۂ اشاعت انجمن اہلحدیث نے پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا، متعدد مقامات پر غلط اور ناقص ہے جو صاحبِ مضمون کے مفہوم کو بالکل ادا نہیں کرتا۔ جب اپنوں ہی نے صحیح نہ سمجھا تو غیروں سے کیا شکایت۔

''ٹروتھ'' کے ایڈیٹر کے قیاسِ مذکورہ کی صحت کا دوسرا ثبوت ایڈیٹر ''لائٹ'' کے اس مقالہ افتتاحیہ کو پڑھ کر ملے گا جو انھوں نے یکم فروری کو اس مضمون کے متعلق سپردِ قلم فرمایا۔ اگر ''لائٹ'' کا ایڈیٹر کوئی ایسا شخص ہوتا جو انگریزی زبان سے کماحقہ واقف نہ ہوتا تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن صاحب موصوف الصدر انگریزی زبان پر کافی عبور رکھتے ہیں اور مجھے ذاتی طور پر بھی معلوم ہے کہ وہ نہایت قابل انشاء پرداز ہیں۔ اندریں حالات سخت حیرانی ہے کہ وہ علامہ اقبال کے مفہوم کو کیوں نہ سمجھ سکے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ علامہ موصوف کے ایک فقرہ کا مطلب بیان کرنے میں انھوں نے ایسی شدید غلطی کا ارتکاب کیا ہے جو ہرگز ان کے

شایانِ شان نہیں ہے۔ چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اس تشریح سے سخت غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے، اس لیے اس فقرہ کا صحیح مفہوم ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

علامہ اقبال نے اپنے مضمون میں ایک جگہ پنڈت جواہر لال نہرو کی اس غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے کہ ترکوں نے اسلام کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ان اصلاحات کا ذکر کیا ہے جو ترکوں نے نافذ کی ہیں اور جن کی بنا پر ہندوستان میں بعض لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ علامہ موصوف نے پنڈت جی اور ان کے ہمخیالوں سے استفسار فرمایا ہے کہ کیا آپ اس وجہ سے ترکوں کو اسلام سے بیگانہ قرار دے رہے ہیں کہ انھوں نے تعددِ ازدواج کی اجازت کو منسوخ کر دیا ہے یا علما کے لیے لائسنس (اجازت نامہ) حاصل کرنا لازمی قرار دے دیا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ یہ دونوں باتیں ترکوں کو اسلام سے خارج نہیں کر سکتیں کیونکہ تصریحاتِ فقہا کی رُو سے، اسلامی حکومت کے امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ یہ دیکھے کہ لوگ شریعت کی عطا کردہ کسی ''اجازت'' کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں تو اس کو معطل کر دیں مثلاً اسلام نے بعض حالات میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن اگر حکمران یہ دیکھے کہ لوگ اس اجازت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں جس کی وجہ سے نظامِ ملّی میں مفاسد پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے تو مفادِ اسلام کی خاطر وہ عارضی طور پر یہ حکم نافذ کر سکتا ہے کہ لوگ اس اجازت سے متمتع نہ ہوں کیونکہ یہ فعل ان کے غلط طریقِ عمل کی وجہ سے ان کے حق میں سودمند ہونے کے بجائے مضرت رساں ہے۔

علامہ موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور سلف صالحین کے طریقہ اور فیصلہ کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ آج سے صدیوں پہلے علامہ ابن قیمؒ نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی، لیکن مقام صد حیرت واستعجاب ہے کہ ایسی واضح بات ''لائٹ'' کے فاضل ایڈیٹر کی سمجھ میں نہ آسکی اور انھوں نے علامہ کے ارشاد کی تشریح اس انداز میں کی جس سے ایک طرف ان کی قلتِ تدبر کا راز فاش ہو گیا تو دوسری طرف علامہ موصوف کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں سخت بدظنی پیدا ہونے کا امکان ہے۔

مدیر ''لائٹ'' یکم فروری کے افتتاحیہ میں یوں رقمطراز ہیں، ''سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ ایک مسلمان بعض احکام قرآنیہ کی علانیہ

خلاف ورزی کرنے کے بعد بھی دائرہ اسلام میں رہ سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف یہ لکھتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی رو سے اسلامی حکومت کا امیر اس بات کا مجاز ہے کہ وہ شریعت کی ''رخصتوں'' کو معطل کر دے بشرطیکہ اسے اس بات کا یقین ہو کہ لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے'' پھر مدیر موصوف نے اس اقتباس پر یوں حاشیہ آرائی کی ہے۔

''ہم ذاتی طور پر، علامہ سے اس معاملہ میں متفق نہیں کیونکہ اگر کوئی مسلمان، احکام قرآنیہ کو پس پشت ڈال کر بھی مسلمان رہ سکتا ہے تو پھر ختمیت محمدی کا عقیدہ باطل ہو جائے گا'' انتہیٰ

اب............سوال یہ ہے کہ علامہ موصوف نے کب اور کس جگہ یہ لکھا ہے کہ ایک مسلمان، احکامِ قرآن کی خلاف ورزی کر کے بھی مسلمان رہ سکتا ہے؟ حکم (Injunction) اور اجازت (Permission) میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ علامہ نے اپنے مضمون میں لفظ اجازت لکھا ہے اور فاضل ایڈیٹر نے اجازت کو حکم کا مترادف بنا کر، علامہ کے ارشاد کو مسخ کر دیا۔ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔

بے شک مدیر''لائٹ'' کا یہ قول صحیح ہے کہ احکام قرآنی کی خلاف ورزی کے بعد کوئی مسلمان، دائرہ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔ مثلاً اسلام زکوٰۃ دینے کا حکم دیتا ہے اور اگر کوئی شخص اس حکم کا انکار کرے تو وہ بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے لیکن تعددِ ازدواج کے متعلق قرآن مجید نے یہ حکم تو نہیں دیا ہے کہ ہر مسلمان پر چار نکاح فرض ہیں (جس طرح ہر صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ فرض ہے) بلکہ حسبِ ضرورت چار تک اجازت دی ہے اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، حکم اور اجازت میں بہت بڑا فرق ہے۔ مجھے حیرانی ہے کہ مدیر''لائٹ'' نے (Permission of the law) کے معنی (Certain Quranic Injunctions) کس قاعدہ کی رو سے سمجھ لیے؟ متکلم کے منشا کے خلاف اس کے کسی قول کی تشریح کرنا، اصولِ دیانت کے بالکل خلاف ہے۔

ممکن ہے، علامہ موصوف کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی یہ کوشش اس لیے کی گئی ہو کہ انھوں نے احمدیت کو بے نقاب کیوں کر دیا؟ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ علامہ موصوف نے یہ مضمون لکھ کر ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ اس کو پڑھ لینے کے بعد اب کوئی تعلیمیافتہ مسلمان احمدی ہونا تو بڑی بات ہے، احمدیت سے حسنِ ظن بھی نہیں رکھ سکتا۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

فتنۂ قادیانیت اور پیامِ اقبالؒ

شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اپنے بلند پایہ ملی افکار کی بناء پر ہمارے جدید حلقوں کا مرجعِ عقیدت ہیں۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لوگوں نے جس فراخ قلبی سے تحقیق و تفتیش کا معرکہ سر کیا ہے، وہ ہمارے ماضی قریب کے کسی لیڈر کے حصہ میں نہیں آیا، لیکن علامہ مرحوم کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو، جو ان کے آخری دورِ حیات میں گویا ان کی زندگی کا واحد مشن بن گیا تھا، مصلحت پسندوں نے اسے اجاگر کرنے سے پہلو تہی کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ دیوبند کے ایک مرد قلندر (علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ) کے فیضانِ صحبت نے فطرتِ اقبال کے اس پہلو کی مشاطگی کی تھی۔ مولانا کشمیریؒ کے سوزِ جگر نے اقبال مرحوم کو قادیانیت کے خلاف شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ علامہ مرحوم جدید تعلیم یافتہ طبقے میں پہلے شخص تھے جن کو ''فتنہ قادیانیت'' کی سنگینی نے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ اس فتنہ کو اسلام کے لیے مہلک اور وحدتِ ملت کے لیے مہیب خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان کی تقریر و تحریر میں ''قادیانی ٹولے'' کو ''غدارانِ اسلام'' اور ''باغیانِ محمد ﷺ'' سے یاد کیا جاتا تھا، اس لیے کہ ان کے نزدیک اس فرقہ کے موقف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی لفظ نہیں تھا، نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اس فتنہ کے استیصال کو سب سے بڑا ملی فرض سمجھتے تھے اور وہ ایک شفیق اور صاحب بصیرت سرجن کی طرح مضطرب تھے کہ اس ''ناپاک ناسور'' کو جسدِ ملت سے کاٹ پھینکا جائے ورنہ یہ ساری امت کو لے ڈوبے گا۔ افسوس ہے کہ اقبال کے جانشینوں نے اقبال کی ''بانگ درا'' پر گوش بر آواز ہونے کی ضرورت نہ سمجھی، ورنہ اگر نقاشِ پاکستان کے انتباہ پر توجہ کی جاتی تو اقبال کے پاکستان کی تاریخ، شہیدِ ملت لیاقت علی خان کے قتل سے شروع ہو کر مشرقی پاکستان کے قتل تک رونما ہونے والے واقعات سے یقیناً پاک ہوتی...... **7** ستمبر **1974**ء کا فیصلہ پیغامِ اقبال کا جواب نہیں، بلکہ اس کی بسم اللہ ہے۔

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اداروں میں اس باغی گروہ کی شرکت امتِ مسلمہ کی موت ہے۔ آج صرف پاکستان نہیں بلکہ پورا عالم اسلام (خصوصاً خطۂ عرب اور مشرق وسطیٰ) ان باغیان اسلام کی سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ تل ابیب سے ربوہ کا رابطہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں، اور یہودی فوج میں قادیانی ٹولے کی ''خدمات'' عالم آشکار ہو چکی ہیں۔ اس تقریب میں ہم عالم اسلام کی خدمت میں ''پیامِ اقبال'' پیش کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یا تو ملتِ اسلامیہ کو عالم اسلام میں پھیلے ہوئے قادیانی گروہ سے جرأتِ مردانہ کے ساتھ نبٹنا ہوگا، یا پھر اسے اپنی خودکشی پر دستخط کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ قاضیِ وقت بڑی عجلت کے ساتھ اپنا آخری فیصلہ لکھنے کے لیے بیتاب ہے اور مستقبل کا پیش کار اس فیصلہ کا ریکارڈ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے مضطرب نظر آتا ہے...... اب یہ سربراہانِ اسلام اور قائدینِ ملت کے تدبر پر منحصر ہے کہ یہ فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے؟

اسلام کی بنیاد

اسلام کا سیدھا سادا مذہب دو قضایا پر مبنی ہے۔ خدا ایک ہے اور محمد ﷺ اس سلسلۂ انبیا کے آخری نبی ہیں، جو وقتاً فوقتاً ہر ملک اور ہر زمانے میں اس غرض سے مبعوث ہوتے تھے کہ نوعِ انسان کی راہنمائی صحیح طرزِ زندگی کی طرف کریں۔ (حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 125)

ملحد دائرہ اسلام سے خارج

جن دو قضایا (عقیدوں) پر اسلام کی تعقلی عمارت قائم ہے وہ اس قدر سادہ ہیں کہ ان میں الحاد ناممکن ہے، جس سے ملحد دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 124)

ختم نبوت کا تصور

ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ اس کے معنی بالکل سلیس ہیں...... حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام عالم اسلام کو

کافر قرار دیتے ہیں۔(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 127)

اسلام کی حد فاصل

اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیا علیہم السلام اور رسول کریم ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، لیکن انھیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیا کے ذریعے وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں۔(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 117)

ختم نبوت کے معنی

ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے، تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا۔ حالانکہ جیسا طبری لکھتا ہے، وہ حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت کی تصدیق تھی۔

(عکسِ تحریر علامہ اقبال بنام جناب نذیر نیازی صاحب، مندرجہ انوارِ اقبال، ص 44-45 مرتبہ بشیر احمد ڈار، شائع کردہ: اقبال اکادمی، پاکستان، کراچی)

قادیانیوں کے لیے دو راستے

میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختمِ نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہوتا کہ انھیں سیاسی

فوائد پہنچ سکیں۔(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 117)

قادیانی علیحدہ امت

میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔اگر حکومت نے یہ مطالبہ منظور نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔حکومت نے 1919ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا۔اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کے لیے کیوں انتظار کر رہی ہے۔(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 118)

قادیانیت اسلام کے لیے مہلک

میرے نزدیک ''بہائیت'' قادیانیت سے زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر (قادیانیت) اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 104)

قادیانیت، یہودیت کا چربہ

اس (قادیانی فرقہ) کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں، اس (قادیانی فرقہ) کے نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ، یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں، گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 104)

قادیانی گستاخ

(جب علامہ مرحوم پر ان کی کسی سابقہ تحریر کا حوالہ دے کر قادیانی اخبار ''سن رائز'' نے اعتراض کیا کہ پہلے تو علامہ اس تحریک کو اچھا سمجھتے تھے، اب خود ہی اس کے خلاف بیان دینے لگے تو اس کے جواب میں علامہ مرحوم نے حسبِ ذیل بیان دیا):

''مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک

سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانیِ تحریک (مرزا غلام احمد) کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ ''براہینِ احمدیہ'' میں انھوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی۔ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں (لاہوری، قادیانی) کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت، بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ (اور یہ قادیانیوں کی روزمرہ عادت ہے...... ناقل) درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے، تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن ''صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔'' (حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 112)

قادیانی حکمتِ عملی

ہمیں قادیانیوں کی حکمت اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانیِ تحریک (مرزا غلام احمد) نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے (ان لوگوں [مسلمانوں] کو ان کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا، یا ان سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دیں جو سڑ گیا ہے اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح ان سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور نہ ہمیں تعلق کی حاجت ہے...... ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی، مندرجہ رسالہ ''تشحیذ الاذہان'' قادیان، ج 6، نمبر 2، ص 211 ناقل۔) دودھ سے تشبیہہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی

جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانوں کی قیام نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اوران سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں، جتنے سکھ ہندوؤں سے۔ کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں اگر چہ وہ ہندو مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور وفکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص117،118)

قادیانی مذہبی سٹے باز

ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی، بشرطیکہ یہ مدعی اُسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے اوراس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا جب اس نے اپنے مذاحیہ انداز میں کہا۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص106)

قادیانی غدارانِ اسلام

''فتوحات'' کی متعلقہ عبارتوں کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ عظیم الشان صوفی (شیخ محی الدین ابنِ عربی) محمد ﷺ کی ختم نبوت پر اسی طرح مستحکم ایمان رکھتا ہے جس طرح کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ اگر شیخ کو اپنے صوفیانہ کشف میں یہ نظر آ جاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی، شیخ کی صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبرِ اسلام کی ختم نبوت کا انکار کر دیں گے تو یقیناً علمائے ہند سے پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غدارانِ اسلام سے متنبہ کر دیتے۔'' (حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص129)

قادیانی ڈرامہ

ان لوگوں کی قوتِ ارادی پر ذرا غور کرو جنھیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، زوال وانحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص134)

قادیانی ملحدانہ اصطلاحات

اسلامی ایران میں مواہدانہ اثر کے ماتحت ملحدانہ تحریکیں اُٹھیں اور انھوں نے بروز، حلول، ظل وغیرہ (قادیانی) اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کے اس تصور کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلم کے قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔ حتی کہ مسیحِ موعود کی (قادیانی) اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اس ملحدانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص105)

قادیانیت، اسلامی وحدت کے لیے خطرہ

مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر (کل مسلمان جو حضرت مسیحِ موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انھوں نے حضرت مسیحِ موعود کا نام بھی نہیں سنا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں----- بیان مرزا محمود احمد، خلیفۂ قادیان، مندرجہ ''آئینۂ صداقت'' ص35) مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص103، 104)

قادیانیت کے خلاف شدتِ احساس

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدتِ احساس کا ثبوت دیا ہے، وہ

جدید اجتماعات کے طالب علم پر بالکل واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے دنوں سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک صاحب نے ملازدہ کا خطاب دیا تھا، اس تحریک کے مقابلہ میں حفظِ نفس کا ثبوت دے رہا ہے، اگرچہ اسے ختم نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے اسے حفظِ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔ (حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 105)

قادیانی، تلعب بالدین

حکومت کو موجودہ صورتِ حالات پر غور کرنا چاہیے اور اس معاملہ میں جو قومی وحدت کے لیے اشد اہم ہے، عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف مدافعت کرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو تلعب بالدین کرتے پائے اس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ سے جھٹلایا جائے۔ پھر یہ کیا مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو، اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔
(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 106، 107)

قادیانی خدمات کا صلہ

(علامہ اقبال، قادیانی تحریک کو انگریز کی آلۂ کار سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے انگریزی حکومت سے طنزاً فرمایا کہ):

”اگر کوئی گروہ (یعنی قادیانی) جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے، حکومت کے لیے مفید ہو تو حکومت اس کی ”خدمات کا صلہ“ دینے کی پوری طرح مجاز ہے، دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ توقع رکھنی بے کار ہے کہ خود (مسلمانوں کی) جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔“ (حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 108)

قادیانی پالیسی

میں نے (سابقہ بیان میں) اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت

کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کی موجودہ حکمران قوم اختیار کرسکتی ہے۔اس کے علاوہ کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں، البتہ مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے فوائد کے خلاف ہے، اگر چہ اس سے بچنے کی راہ کوئی نہیں۔جنھیں خطرہ محسوس ہو، انھیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی۔ میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریقِ کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرلے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا۔

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 109)

اسلام اور ملک دونوں کے غدار

''میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔ (اس وقت ہندوستان انگریزی سامراج کے زیر تسلط تھا، اور قادیانی انگریز سلطنت کی بقاء واستحکام کے لیے سرتوڑ کوشش کررہے تھے......ناقل۔'')

کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی جلد 4، صفحہ 328، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال از شیخ عطاءاللہ صفحہ 567 طبع دوم، (یک جلدی 2012ء)

قادیانیت کا وظیفہ

''مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔''(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 133)

قادیانی تفریق

''قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیشِ نظر، جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کرکے اختیار کی ہے، خود حکومت کا فرض ہے کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اٹھائے۔''

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی ص 116)

میر شکیل الرحمٰن
چیف ایڈیٹر روزنامہ ''جنگ''

اقبالؒ اور قادیانیت

اقبال اپنی شاعرانہ عظمتوں کی بناء پر شاعرِ مشرق کے اعزاز کے حامل ہیں۔ سیاسی بصیرت اور قومی حمیت کی بنا پر وہ ''مصورِ پاکستان'' کی حیثیت سے معروف اور مقبول ہیں لیکن اقبال کا ایک امتیاز جو اب تک پس منظر میں ہے اور جسے ان سطور میں نمایاں کرنا مقصود ہے، وہ ان کی قادیانیت کے خلاف جدوجہد ہے۔ اقبال کو دینی امور میں گہری بصیرت اور قومی معاملات میں پیش بینی حاصل تھی۔ قادیانیت کی حقیقت کو نقد و نظر کی ترازو میں جس طرح اقبال نے پرکھا ہے، کسی دوسرے نے نہیں پرکھا۔

قادیانیت محض مذہبی مسئلہ نہیں جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، یہ اپنے مخصوص احوال کے پیشِ نظر ایک اجتماعی قومی، ملی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اقبال وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فتنۂ قادیانیت کی سنگینی کا صحیح ادراک اور احساس کیا۔ وہ فتنۂ قادیانیت کو جسدِ ملت کا ناسور اور وحدتِ ملی کے لیے زہرِ قاتل تصور کرتے تھے۔

بانیِ قادیانیت کی حکمتِ عملی شروع ہی سے یہ رہی ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں انتشار پسند اور حریص عناصر کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کے اتحاد کو کمزور کیا جائے۔ یورپی طاقتوں کو ہندوستان میں ایک ایسا دینی اور سیاسی قمار باز درکار تھا جو اپنی اور ان کی اغراض کی خاطر مسلم اتحاد کے خلاف ایک جدا مذہبی جماعت کی تشکیل کرسکتا ہو، مرزا غلام احمد قادیانی کی شخصیت میں ان کا مطلوبہ جھوٹا نبی مل گیا۔

ادھر ہندو سیاست اور ذہنیت نے قادیانی تحریک کو سیاسی اعتبار سے مفید پا کر اس کی زبردست حمایت کی۔ ان کے خیال میں قادیانیت کی تحریک ہی مسلمانوں کے اتحاد، عالم عرب

سے تعلق اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ انگریز اور ہندو کی سرپرستی میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت اور تنسیخِ جہاد کے اعلان نے ایک اہم برطانوی ضرورت کو پورا کر دیا۔ قادیانیت کے اس کردار کا اعتراف خود اس کے بانی نے کیا۔ وہ کہتا ہے:

- ''میں خدا تعالیٰ کی تیئیس برس کی متواتر وحی کو کیونکر رد کر سکتا ہوں۔ میں اس کی اس پاک وحی پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ ان تمام خدا کی وحیوں پر ایمان لاتا ہوں جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں۔'' (حقیقۃ الوحی صفحہ 150، روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 154 از مرزا قادیانی)
- ''ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم نبی اور رسول ہیں۔'' (ملفوظات جلد پنجم صفحہ 447، طبع جدید، از مرزا قادیانی)
- ''سچا خدا وہی خدا ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔''

(دافع البلاء صفحہ 11، مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 231 از مرزا قادیانی)

- ''میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان الہامات پر اسی طرح ایمان لاتا ہوں جیسا کہ قرآن شریف پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر اور جس طرح میں قرآن شریف کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام جانتا ہوں، اسی طرح اس کلام کو بھی جو میرے پر نازل ہوتا ہے۔ خدا کا کلام یقین کرتا ہوں۔'' (حقیقۃ الوحی صفحہ 220 مندرجہ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 220 از مرزا قادیانی)
- ''اور چونکہ مشابہت تامہ کی وجہ سے مسیح موعود (مرزا قادیانی) اور نبی کریم ﷺ میں کوئی دُوئی (فرق) باقی نہیں کہ ان دونوں کے وجود بھی ایک وجود کا ہی حکم رکھتے ہیں جیسا کہ خود مسیح موعود نے فرمایا ہے کہ صار وجودی وجودہ (دیکھو خطبہ الہامیہ صفحہ 171) اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ حضرت نبی کریم نے فرمایا کہ مسیح موعود (مرزا قادیانی) میری قبر میں دفن کیا جائے گا جس سے یہی مراد ہے کہ وہ میں ہی ہوں یعنی مسیح موعود (مرزا قادیانی) نبی کریم ﷺ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو بروزی رنگ میں دوبارہ دنیا میں آئے گا تا کہ اشاعت اسلام کا کام پورا کرے اور **هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله** کے فرمان کے مطابق تمام ادیان باطلہ پر اتمام حجت کر کے اسلام کو دنیا کے کونوں تک پہنچاوے تو اس صورت میں کیا اس بات میں کوئی شک رہ جاتا ہے کہ قادیان میں اللہ تعالیٰ نے پھر محمد ﷺ کو اتارا تا کہ اپنے وعدہ کو پورا کرے جو اس نے **آخرین منهم لما یلحقوا بهم** میں فرمایا تھا۔''

(کلمۃ الفصل صفحہ 104، 105، از مرزا بشیر احمد ایم اے ابن مرزا قادیانی)

❑ ''ہم کو نئے کلمہ کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ مسیح موعود (مرزا قادیانی) نبی کریم ﷺ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے **صار وجودی وجودہ نیز من فرق بینی وبین المصطفی فما عرفنی و ماریٰ** اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ وہ ایک دفعہ اور خاتم النبیین کو دنیا میں مبعوث کرے گا جیسا کہ آیت **آخرین منھم** سے ظاہر ہے، پس مسیح موعودؑ خود محمد ﷺ رسول اللہ ہے جو اشاعت اسلام کے لیے دوبارہ دنیا میں تشریف لائے، اس لیے ہم کو کسی نئے کلمہ کی ضرورت نہیں، ہاں اگر محمد ﷺ رسول اللہ کی جگہ کوئی اور آتا تو ضرورت پیش آتی۔'' (کلمۃ الفصل صفحہ 158 از مرزا بشیر احمد ایم اے ابن مرزا قادیانی)

❑ ''حضرت مسیح موعود نے تو فرمایا ہے کہ ان کا اسلام اور ہے اور ہمارا اور، ان کا خدا اور ہے اور ہمارا خدا اور ہے، ہمارا حج اور ہے اور ان کا حج اور۔ اسی طرح ان سے ہر بات میں اختلاف ہے۔'' (روزنامہ الفضل قادیان 21 اگست 1917ء جلد 5 نمبر 15 صفحہ 8)

❑ ''حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں (مسلمانوں) سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریمؐ، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔''

(خطبہ جمعہ مرزا بشیر الدین خلیفہ قادیان، مندرجہ اخبار ''الفضل'' قادیان، جلد 19، نمبر 13، مورخہ 30 جولائی 1931ء)

❑ ''ہم تو دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعودؑ نے غیر احمدیوں کے ساتھ صرف وہی سلوک جائز رکھا ہے جو نبی کریمؐ نے عیسائیوں کے ساتھ کیا۔ غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں، ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا، ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا، اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں۔ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک دینی، دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلقات کا بھاری ذریعہ رشتہ وناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لیے حرام قرار دیئے گئے۔ اگر کہو کہ ہم کو ان کی لڑکیاں لینے کی اجازت ہے تو میں کہتا ہوں نصاریٰ کی لڑکیاں لینے کی بھی اجازت ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ غیر احمدیوں کو سلام کیوں کہا جاتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ بعض اوقات

نبی کریمؐ نے یہود تک کو سلام کا جواب دیا ہے۔''

(کلمۃ الفصل صفحہ 169، 170 از مرزا بشیر احمد ایم اے ابن مرزا قادیانی)

یہ ہے وہ فتنۂ قادیانیت جس کی سنگینی کا اقبال نے بروقت احساس کیا اور اپنے طویل مکاتیب اور مضامین کے ذریعہ، قادیانی فتنہ کی اصل حقیقت، اس کے دوررس اثرات اور نتائج کی وضاحت کی۔

اس سلسلہ میں اقبال نے اس دور کے علما و اکابرین اسلام سے طویل خط و کتابت کی۔ پوری تحقیق اور توثیق کے بعد قادیانی مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و خوض کیا اور نتائج اخذ کر کے مسلمانوں کی جماعت کے مفادات کی مدافعت غیر معمولی کامیابی کے ساتھ انجام دی۔ اقبال نے جن علما سے اس سلسلے میں رجوع کیا، ان میں مولانا سیّد سلیمان ندوی، انور شاہ کاشمیری، سیّد الیاس برنی، مولانا مسعود عالم ندوی اور سیّد نعیم الحق ایڈووکیٹ پٹنہ قابلِ ذکر ہیں۔ عقیدوں کی یہ جنگ ایسی دشوار اور نازک تھی کہ ''اسلام میں الٰہی نظریات کی تشکیلِ نو کے فاضل مقالہ نگار (اقبال) نے ایک مسلمان اور عاشقِ رسول کے جذبے سے اسے کامیابی سے سرانجام دیا۔

تحریک کے اوائل میں اسے ایک مذہبی تحریک خیال کر کے اقبال نے اس کی حمایت کی تھی۔ اس حوالے سے قادیانی ہفت روزہ ''سن رائز'' لاہور نے ان پر متضاد رائے رکھنے کا الزام لگایا۔ جواباً اقبال نے فرمایا: کسی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہوتی، اسے پوری طرح نمایاں ہونے کے لیے برسوں درکار ہوتے ہیں۔ ابتداء میں مولوی چراغ علی مرحوم جیسے اکابرین کے تحریک میں شامل ہونے کی بناء پر میں تحریک کا مداح تھا۔ آج پچیس سال بعد میں قادیانی تحریک سے اس لیے بیزار ہوا کہ ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا ہے اور ایسی نبوت جسے بانی اسلام کی اصل نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کہا گیا ہے اور میں نے ایک بڑے قادیانی کو حضور رسالت مآب ﷺ کی شان میں دشنام طرازی کرتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اقبال نے وضاحت کی کہ میرے رویے میں تناقض یا تضاد ایک زندہ صاحبِ فکر انسان کا حق ہے، وہ اپنی رائے بدل سکتا ہے۔ بقول ایمرسن ''صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''

(حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی 122، 123)

لاہوری جماعت کا قادیانی جماعت کے ساتھ اختلاف اور تنازعہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

اقبال کے مطابق قادیانیت کی اصل حقیقت قرونِ وسطیٰ کے غیر اسلامی تصوف اور دینیات میں پوشیدہ ہے۔اس کا تصورِ خدا ایک ایسے خدا کا تصور ہے جو حاسد ہو اور جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں۔اس فرقہ کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ (جو دراصل مسیح موعود کا یہودی تصور ہے)۔

یہ چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں۔گویا یہ تحریک یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ اسلامی ایران میں موبدانہ (یہودی نصرانی وغیرہ) اثر کے تحت کئی ملحدانہ تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے تناسخ کے یہودی تصور کو چھپانے کی غرض سے بروزی، ظلی نبی اور مسیح موعود وغیرہ کی اصطلاحیں وضع کیں، تا کہ وہ مسلم قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔اس نظریہ کے تحت جن دو جماعتوں نے حال ہی میں جنم لیا ہے، ان میں میرے نزدیک، بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے بندوں اسلام سے منحرف ہے لیکن قادیانیت اسلام کی چند اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے، لیکن اندرونی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ ہے۔یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے استوار ہوتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے قادیانیت کی حمایت میں تین طویل مضامین چھپوائے جو ماڈرن ریویو کلکتہ میں جنوری 1936ء میں شائع ہوئے۔ان مضامین کا لب ولہجہ بڑا سخت اور تعصب آمیز تھا۔اقبال نے جواب میں ان کے اعتراضات کی خاطر خواہ وضاحت کی، فرماتے ہیں: ہندوؤں کی طرح قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے خائف ہیں کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی ترقی سے ان کا مقصد فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب ﷺ کی امت سے ہندوستانی پیغمبر (مرزا قادیانی) کی ایک نئی امت تیار کریں! ایسے نبی کا تصور جس کا منکر، اسلام سے خارج اور جہنمی ہو جاتا ہے، قادیانیت کا ایک لازمی عنصر ہے۔

- ''جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا اور تیرا مخالف رہے گا۔ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا اور جہنمی ہے۔''

(تذکرہ مجموعہ وحی والہامات صفحہ 280 طبع چہارم از مرزا قادیانی)

❑ ’’اب ظاہر ہے کہ ان الہامات میں میری نسبت بار بار بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کا فرستادہ، خدا کا مامور، خدا کا امین اور خدا کی طرف سے آیا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس کا دشمن جہنمی ہے۔‘‘ (انجام آتھم صفحہ 62 مندرجہ روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 62 از مرزا قادیانی)

❑ **’’تلک کتب ینظر الیها کل مسلم بعین المحبة والمودة وینفع من معارفها ویقبلنی و یصدق دعوتی. الا ذریة البغایا.‘‘**

ترجمہ ’’میری ان کتابوں کو ہر مسلمان محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے معارف سے فائدہ اٹھاتا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کرتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے مگر کنجریوں (بدکار عورتوں) کی اولاد نے میری تصدیق نہیں کی۔‘‘

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ 547، 548 مندرجہ روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 547، 548 از مرزا قادیانی)

اقبال نے واضح کیا کہ ایسی مذہبی جماعت جو اسلام کے مسلمہ عقیدوں سے انحراف کرے، دائرہ مذہب سے خارج کیے جانے کے قابل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ایران کا احساس، بہائیوں کے خلاف اس قدر سخت تھا، اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس قدر شدید ہے۔ اپنے جواب کی اس منطقی بناء پر اقبال نے پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ اقبال فرماتے ہیں۔ ’’میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ قادیانی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار (Tratiors) ہیں۔ قادیانیت کی حمایت میں لکھے گئے سٹیٹسمین 14 مئی 1935ء کے اداریہ کے جواب میں اقبال نے مسلمانانِ ہند کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بانیِ تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے تشبیہہ دی اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے منع کیا۔ علاوہ ازیں ان کا اسلام کے بنیادی اصولوں کے قیام نماز اور نکاح وغیرہ میں مسلمانوں کا مقاطعہ اور سب سے بڑھ کر یہ اعلان (جو رسالہ تشحیذ الاذہان) میں شائع ہوا کہ ملت اسلامیہ کافر ہے۔ یہ تمام باتیں قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے کیونکہ وہ غدارانِ اسلام

ہیں۔ میرے نزدیک قادیانیوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں، یا وہ بہائیوں کی طرح ختم نبوت کو صریحاً جھٹلا دیں، یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر ختم نبوت کو صدق دل سے قبول کر لیں، لیکن ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہوتا رہے اور وہ سیاسی فائدے (اعلیٰ ملازمتیں جو مسلمانوں کے لیے مختص ہوں) حاصل کرتے رہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کے نام ایک خط میں جو روزنامہ احسان لاہور میں شائع ہوا، اقبال نے فرمایا ''قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولتی ہے۔ چنانچہ قادیانی بجا طور پر ''باغیانِ محمدؐ'' کہلانے کے سزاوار ہیں۔ ختم نبوت کے معنی ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں، یعنی مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں نہ داخل ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل ہے۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مسیلمہ نبی کریم ﷺ کے لیے اذان دیتا تھا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں (مسیلمہ کے لیے) اذان عبداللہ بن النواحہ دیتا اور اقامت حجیر بن عمیر کہتا اور جب حجیر شہادت کے قریب پہنچتا تو مسیلمہ کہتا اے حجیر خوب زور سے کہو (یعنی شہادت کو بلند آواز سے کہو تا کہ لوگوں کو اچھی طرح سنائی دے) پس حجیر آواز کو بلند کرتا اس طرح مسیلمہ اپنی تصدیق میں مبالغہ کرتا۔''

اخبار سٹیٹسمین کے اداریے کے جواب میں اقبال نے فرمایا: اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الٰہی پر ایمان، انبیا کرام پر ایمان، رسول کریم ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان! دراصل یہ آخری عقیدہ ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے کہ فرد یا جماعت ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ قادیانی رسول کریم ﷺ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کوئی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ اقبال نے فرمایا: قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے، خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق

ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔

قادیانیت ایک ایسی تحریک ہے جس نے مسلمانوں سے جذبۂ جہاد سلب کرنے کی تگ ودو کی۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اس سلسلے میں سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر؟

1935ء، 1937ء کے دوران قادیانی فتنہ اپنے عروج پر تھا۔ اسلام اور قادیانیت کا تنازعہ بحث کا خاص موضوع بن چکا تھا۔ چنانچہ اقبال کی تقریر وتحریر اور مضامین کے علاوہ ضرب کلیم کی اکثر غزلوں میں قادیانیت اور بانیِ قادیانیت کے معاندانہ رویے سے متعلق ناقدانہ اشارے ملتے ہیں۔ بانیِ تحریک اور اس کے مقلد انگریز آقاؤں کے حواری، آلۂ کار، وفادار اور خود کاشتہ تھے۔ اس کردار کا اعتراف خود اس کے بانی نے بڑے کھلے لفظوں میں فخر کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اپنی ایک کتاب (تریاق القلوب) میں ایک مقام پر لکھتا ہے:

❑ ''میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔''

(تریاق القلوب صفحہ 27، 28 مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 155، 156 از مرزا قادیانی)

❑ ''آج کی تاریخ تک تیس ہزار کے قریب یا کچھ زیادہ میرے ساتھ جماعت ہے، جو برٹش انڈیا کے متفرق مقامات میں آباد ہے اور ہر ایک شخص، جو میری بیعت کرتا ہے اور مجھ کو مسیح

موعود مانتا ہے، اسی روز سے اس کو یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں جہاد قطعاً حرام ہے کیونکہ مسیح آچکا۔ خاص کر میری تعلیم کے لحاظ سے اس گورنمنٹ انگریزی کا سچا خیر خواہ اس کو بننا پڑتا ہے۔"

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ضمیمہ، صفحہ 6، 7، مندرجہ روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 28، 29 از مرزا قادیانی)

ایسا امام قوم کی صحیح امامت کا دعویٰ کیونکر کرسکتا ہے جو انگریز حکمرانوں کی اطاعت کو قوم کا مقدس دینی فریضہ قرار دے۔

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی

قادیانی نبوت اور الہام سے منکر ملت اسلامیہ کے خلاف کفر کے فتوے کے اعلان پر اقبال نے فرمایا:

پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر

بانیِ قادیانیت کے وحی والہام کے اعلان سے متعلق جو ملتِ اسلامیہ میں تفریق کا باعث بنا، اقبال کا ارشاد ہے:

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

قادیانی گروہ جس کے ماننے والے برطانیہ کے وظیفہ خوار ہیں، طرح طرح سے قادیانی نبوت کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں جس کا مقصد نبوت کے عقیدے پر ضرب لگانا اور نعوذ باللہ رسول اکرم ﷺ کے کامل واکمل ہونے میں شبہ پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد کے حواری اس طرح کی خرافات کہتے رہتے تھے:

"امام اپنا عزیزو اس زماں میں
غلام احمد ہوا دارالاماں میں
غلام احمد ہے عرش رب اکرم
مکاں اس کا ہے گویا لامکاں میں
غلام احمد رسول اللہ ہے برحق
شرف پایا ہے نوع انس و جاں میں

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شاں میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں"

(روزنامہ بدر قادیان، 25 اکتوبر 1906ء از مرزا قادیانی)

یہ محض "مریداں می پرانند" والی شاعری نہیں ہے، بلکہ یہ اشعار، شاعر نے خود مرزا قادیانی کو سنائے اور اسے لکھ کر پیش کیے۔ مرزا قادیانی نے اس پر جزاک اللہ کہہ کر شاعر کو داد دی اور اس قطعہ کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ چنانچہ ملعون قاضی اکمل 22 اگست 1944ء کے الفضل میں لکھتا ہے: "وہ اس نظم کا ایک حصہ ہے جو حضرت مسیح موعود کے حضور میں پڑھی گئی اور خوش خط لکھے ہوئے قطعے کی صورت میں پیش کی گئی اور حضور اُسے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ اس وقت کسی نے اس شعر پر اعتراض نہ کیا، حالانکہ مولوی محمد علی صاحب (امیر جماعت لاہور) اور اَعْوانُھُم موجود تھے اور جہاں تک حافظہ مدد کرتا ہے، بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ سن رہے تھے اور اگر وہ اس سے بوجہ مرور زمانہ انکار کریں تو یہ نظم "بدر" میں چھپی اور شائع ہوئی۔ اس وقت "بدر" کی پوزیشن وہی تھی بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر جو اس عہد میں "الفضل" کی ہے، حضرت مفتی محمد صادق صاحب ایڈیٹر سے ان لوگوں کے محبانہ اور بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ وہ خدا کے فضل سے زندہ موجود ہیں ان سے پوچھ لیں اور خود کہہ دیں کہ آیا آپ میں سے کسی نے بھی اس پر ناراضی یا ناپسندگی کا اظہار کیا اور حضرت مسیح موعود کا شرف سماعت حاصل کرنے اور جزاک اللہ تعالیٰ کا صلہ پانے اور اس قطعے کو اندر خود لے جانے کے بعد کسی کو حق ہی کیا پہنچتا تھا کہ اس پر اعتراض کر کے اپنی کمزوری ایمان اور قلت عرفان کا ثبوت دیتا۔" (روزنامہ الفضل قادیان، 22 اگست 1944ء جلد 32، نمبر 196، صفحہ 6 کالم 1)

اس سے واضح ہے کہ یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی نہ تھی، بلکہ ایک مذہبی عقیدہ تھا۔ جس کی مرزا قادیانی نے بذات خود نہ صرف تصدیق بلکہ تحسین کی تھی۔

اقبال نے مسلمانوں کو اس فتنے سے بچانے کی زبردست کوشش کی، انھوں نے اپنی زبردست شاعرانہ صلاحیت کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا اور جگہ جگہ اپنے کلام میں مسلمانوں کو

خاتم النبیین کی عظمت اور مرتبے سے واقف کرانے کی کوشش کی اور ختم نبوت پر ایمان اور عشقِ رسول کے تقاضے انھیں یاد دلائے۔ اقبال کا قادیانیوں کو علیحدہ جماعت تسلیم کرنے کا مطالبہ تصورِ پاکستان کی طرح کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ قادیانیت کے فتنہ کے طلسم کو باطل ثابت کرنے کے سلسلے میں یوں تو اقبال نے بہت پہلے ہی سے قدم اٹھا رکھا تھا مگر خاص کر 1935ء سے 1937ء کے عرصے میں، جب وہ خرابیٔ صحت کی بناء پر اکثر علیل رہتے تھے، وہ ملتِ اسلامیہ خاص کر مسلمانانِ برصغیر کے لیے باعث فخر و مباہات ہیں۔ ان مساعی جمیلہ کی بناء پر جس کے نتیجہ میں آج قادیانی فرقہ آئینی اور دستوری طور پر مسلمانوں سے الگ ایک اقلیتی فرقہ تسلیم کر لیا گیا ہے یقیناً شاعرِ مشرق، مصورِ پاکستان، اقبالؒ نظریہ ختم نبوت کے محافظ اور فتنۂ قادیانیت کے استیصال کی کوشش میں نمایاں اور ممتاز ہوئے ہیں۔

قوم کی طرف سے اقبالؒ کو ان مساعیِ جمیلہ کا احترام اور اس عاشقِ رسول کی خدمت میں ہمارا اندرانۂ عقیدت بھی ہوسکتا ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر فتنۂ قادیانیت کے طلسم کے اندھیروں کو عشقِ رسول کے انوار سے دور کر دیں اور ہر طرف ختم الرسل محمد ﷺ کا نور پھیلا دیں۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے!

بشیر احمد

اقبالؒ اور قادیانیت، تحقیق کے نئے زاویے

علامہ محمد اقبالؒ نے 1935ء میں قادیانیت کے خلاف جو باطل شکن مضامین لکھے، ان کے جواب میں مرزا محمود نے 24 مئی 1935ء کو جو خطبہ دیا، اس میں ان کے والد مرحوم اور بھائی کے احمدی ہونے کا ذکر کیا لیکن علامہ اقبال کو احمدی کہنے کی جسارت نہ کی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ خود اس کی تردید کر دیتے۔ خواجہ کمال الدین کے فرزند خواجہ نذیر احمد بار ایٹ لا لاہور میں وکالت کرتے تھے۔ انہوں نے 1953ء کی تحقیقاتی عدالت میں شہادت دی کہ ان کے دوست غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ، علامہ اقبال کے ساتھ 1893ء میں قادیان گئے اور مرزا صاحب کی بیعت کی۔ (اس زمانے میں وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ مصنف)۔ پہلے خواجہ نذیر احمد نے سن بیعت 1893ء یا 1894ء بتایا، بعد میں قصوری صاحب نے جو اس وقت زندہ تھے، انہیں بتایا کہ یہ سن 1893ء نہیں 1897ء ہے۔ (اس وقت وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے طالب علم تھے۔ مصنف) اس پر خواجہ صاحب نے عدالتی ریکارڈ میں تصحیح کرائی۔ (1)

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ جرح کے دوران گواہ نے پہلے تو یہ کہا کہ یہ بیعت 1893ء یا 1894ء میں ہوئی پھر کہا کہ 1897ء میں ہوئی تھی۔ بعد ازاں گواہ نے اپنی شہادت کے کسی اور حصے میں بتایا کہ اقبال 1930ء تک مرزا صاحب کو مجدد مانتے رہے۔ (2) گواہ نے پھر کہا کہ اس نے اپنے بیان میں یہ کہیں بھی نہیں کہا کہ اقبال احمدی تھے۔ (3) خواجہ نذیر احمد نے عدالت کے سامنے یہ وضاحت پیش کی کہ پاکستان ٹائمز لاہور بابت 4 نومبر 1953ء میں جو یہ رپورٹنگ ہوئی ہے کہ اقبال 1931ء تک قادیانی تھے، یہ ان کی گواہی کو غلط طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ علامہ اقبال قادیانی تھے، انہوں نے یہ کہا تھا کہ علامہ اقبال نے بیعت کی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے مبینہ بیعت چاہے زبانی ہو یا تحریری، مرزا صاحب کی بیعت کر لینے کے بعد انہیں قادیانی کہنے میں کیا تامل ہے؟ بہر حال خواجہ صاحب کا بیان تضاد نمونہ ہے۔ خواجہ نذیر احمد اس وقت اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئر مین تھے۔ انہوں نے تحقیقاتی عدالت کو بتایا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی (جو 1931ء میں قائم ہوئی۔ مصنف) کے صدر مرزا بشیر الدین محمود احمد اور علامہ اقبال کمیٹی کے ممبروں میں شامل تھے۔ جب ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے (1933ء۔ مصنف) تو ان کے والد (خواجہ کمال الدین) اقبال سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گئے۔ اس ملاقات میں وہ (خواجہ نذیر احمد) ان کے ہمراہ تھے۔ ان کے والد صاحب نے علامہ اقبال سے بے تکلفی سے پنجابی زبان میں کہا۔

''اوے یار تیری بیعت دا کی ہویا (اے یار تمہاری بیعت کا کیا ہوا)

علامہ اقبال نے جواب دیا:

اوویلا ہورسی اے ویلا ہورا اے (وہ وقت اور تھا یہ اور ہے)

یہ واقعہ 1933ء کا ہے''(4)

خواجہ کمال الدین 29 دسمبر 1932ء کو وفات پا چکے تھے۔(5) 1933ء میں وہ خواجہ نذیر احمد کے ساتھ علامہ اقبال سے ملنے کیسے گئے؟

شیخ عبدالماجد کے والد شیخ عبدالقادر (سابق سوداگرمل نے 1966ء میں تاریخ احمدیت لاہور لکھی۔ وہ اس میں بابو غلام محمد (م۔1946ء) کی ایک روایت درج کرتے ہیں کہ مارچ 1897ء میں لاہور کے بعض تعلیم یافتہ افراد جن میں مولوی محمد علی، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر محمد اقبال، مولوی غلام محی الدین قصوری، چوہدری شہاب الدین، مولوی سعد الدین بی۔ اے ایل ایل بی وغیرہ شامل تھے، مرزا صاحب سے ملنے قادیان گئے۔ ملاقات کے بعد مولوی محمد علی، چوہدری شہاب الدین، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولوی غلام محی الدین قصوری اور خاکسار (بابو غلام محمد) نے کی بیعت کر لی۔ بعض اور لوگوں نے بھی بیعت کی تھی مگر ان کے نام انہیں یاد نہیں رہے۔(6)

بابو غلام محمد قادیانی جن کی گواہی پیش کی گئی ہے، راقم کی تحقیق کے مطابق وہ فورمین تھے اور ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کی جماعت لاہور کے اکابر سے دوستی رہی لیکن مرزا محمود کے غالی مرید تھے۔ انہوں نے مرزا صاحب کی بیعت کی تھی۔ ایسے غیر معروف غالی قادیانی کی روایت کو

کوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی نہ ہی ایسی جعلی روایات بیان کرنے کے قابل ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ اتنے افراد نے جواعلیٰ تعلیم یافتہ تھے،مرزا صاحب کی بیعت کی لیکن قادیانی لٹریچر میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔اس زمانے میں قادیانی اخبار الحکم امرتسر سے شائع ہوتا تھا، 1897ء میں قادیان سے شائع ہونے لگا۔اس میں نئے بیعت کرنے والوں کا ذکر ہوتا تھا لیکن اس اہم واقعے کا کوئی ذکر نہیں نہ ہی مرزا صاحب نے اپنی کسی تصنیف میں فخریہ طور پر اتنے تعلیم یافتہ افراد کی ایک وقت میں بیعت کا ذکر کیا ہے نہ ہی ان کے ملفوظات میں اقبال اور دیگر افراد کی بیعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ 1897ء میں جن لوگوں نے مرزا صاحب کی بیعت کی، ان میں مولوی محمد علی، مولوی شیر علی، غلام رسول راجیکی اور قاضی ظہور اکمل کے نام ملتے ہیں اور یہ نام سلسلہ احمدیہ کے لٹریچر میں موجود ہیں۔(7)

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں۔ یہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ بہرحال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلے میں مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کچھ تعلق رہا تھا۔(8) یا وہ مرزا صاحب کے کسی بھی دعوے کو مانتے تھے۔

شیخ اعجاز احمد بھی تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کی بیعت کرنے کی بات درست معلوم نہیں ہوتی۔(9)

سر ظفر اللہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

'ڈاکٹر اقبال نے جہاں تک میرا علم ہے بیعت نہیں کی۔ان کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شاید انہوں نے بیعت کی تھی تاہم ان کے بڑے بھائی نے بیعت کی تھی۔(10)

سر ظفر اللہ نے اپنے ایک اور انٹرویو میں بھی اقبال کے مرزا صاحب سے بیعت کرنے کا انکار کیا ہے۔(11)

ڈاکٹر بشارت احمد نے مجدد اعظم کے نام سے تین جلدوں میں مرزا صاحب کی سوانح لکھی ہے۔وہ مجدد اعظم جلد اول میں جو 1939ء کے آخر میں شائع ہوئی، لکھتے ہیں کہ فروری 1892ء میں مرزا صاحب سیالکوٹ آئے (اس زمانے میں ان کے مسیح موعود اور محدثیت کے دعاوی کی وجہ سے ان کی مخالفت زوروں پر تھی۔مصنف) انہوں نے میر حسام الدین کے مکان پر قیام کیا۔انہوں نے نماز ظہر کے بعد ایک تقریر کی۔لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی۔(ڈاکٹر) اقبال مشہور

شاعر اس زمانے (1892ء) میں میرے ہم جماعت تھے (میٹرک میں سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے۔مصنف) یہ مسجد کی ڈیوڑھی کی چھت پر چڑھے بیٹھے تھے۔ مجھے (بشارت احمد کو) دیکھ کر کہنے لگے دیکھو شمع پر پروانے گر رہے ہیں۔ان دنوں انہیں حضرت اقدس (مرزا صاحب) سے بہت ارادت تھی۔ چنانچہ شہر سیالکوٹ کے ایک شاعر نے جو جلوہ تخلص کرتا تھا جب ایک نظم حضرت اقدس کی ہجو میں لکھی تو ڈاکٹر اقبال نے اس کا جواب نظم میں ہی لکھا اور اس میں حضرت اقدس کی بڑی تعریف لکھی۔(12)

ڈاکٹر بشارت احمد 1891ء میں نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ 1892ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ان کے انٹرنس (میٹرک) پاس کرنے کا ذکر نہیں ملتا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انٹرنس میں یا تو فیل ہو گئے یا تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے گئے اور کسی اور سکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ اسکاچ مشن سکول کنک منڈی سیالکوٹ میں پڑھتے تھے۔ 1904ء میں پنڈی گھیب (اٹک) میں اسسٹنٹ سرجن تھے (13) اپریل 1943ء میں وفات پائی۔ وہ لاہور جماعت کے ممتاز رکن تھے اور مولوی محمد علی کے رشتہ دار تھے۔

یہ روایت بھی علامہ اقبال کی زندگی میں شائع نہ ہوئی البتہ 1939ء میں شائع کی گئی۔ میٹرک میں زیر تعلیم بشارت احمد کی اس روایت سے 15 سالہ اقبال احمدی ثابت نہیں ہوتے جو محض میٹرک کے طالب علم تھے۔خود بشارت احمد نے 1902ء میں مرزا صاحب کی بیعت کی۔(14)

انہوں نے جس شاعر جلوہ کا ذکر کیا ہے ان کا نام میراں بخش جلوہ تھا اور وہ سیالکوٹ کچہری میں وثیقہ نویس تھے۔ان کے مجموعہ کلام گلشن نعت، جلوہ حق، تحفہ جلوہ، دیوان جلوہ، نوحہ جات جلوہ وغیرہ میں نہ تو مرزا صاحب کی کوئی ہجو درج ہے اور نہ علامہ اقبال کی کسی جوابی نظم کا ذکر ہے جو انہوں نے مبینہ طور پر مرزا صاحب کی مدح میں کہی۔ احمدیہ لٹریچر میں بھی ایسی کسی نظم کا سراغ نہیں ملتا۔

علامہ اقبال سے منسوب ایک نظم

نومسلم سعد اللہ لدھیانوی مرزا صاحب کے سخت مخالف تھے۔ مرزا صاحب نے ان کو ہندوزادہ، دین فروش، ملعون، شیطان فطرت وغیرہ کہا ہے اور ان کے خلاف ایک نظم کہی ہے جس کا مصرع اولیٰ ہے۔ اک سگ دیوانہ لدھیانے میں ہے۔ قادیانی کہتے ہیں کہ اقبال نے

1893ء میں جب وہ سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں ایف اے کے طالب علم تھے، سعد اللہ کے خلاف ایک ہجو کہی جس کا پہلا شعر ہے:

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
مہتروں میں خوب ہوگی قدر دانی آپ کی

اس ہجو کے آخر میں الراقم شیخ محمد اقبال ایف اے کلاس سکاچ مشن سکول سیالکوٹ لکھا ہے۔شیخ یعقوب علی قادیانی نے اپنی تصنیف آئینہ حق نما (1912ء) کے صفحہ 107 پر اس کو درج کیا ہے۔قادیانیوں کا کہنا ہے کہ یہ شیخ محمد اقبال، علامہ اقبال تھے، البتہ قادیانیوں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ نظم ان کے کسی مجموعہ کلام میں نہیں۔(15)

قادیانیوں نے علامہ اقبال کی زندگی میں یہ بات بیان نہیں کی۔شیخ یعقوب علی نے 1912ء میں مرزا صاحب کی صداقت پر مبنی مواد اکٹھا کرتے وقت اس نظم کو اپنی تالیف میں درج کیا ہے لیکن علامہ اقبال سے منسوب نہیں کیا ہے۔یہ سلسلہ قادیانیوں نے ان کی وفات کے بعد شروع کیا۔پہلی بات یہ ہے کہ مبینہ نظم 1893ء میں کہاں چھپی جہاں سے شیخ یعقوب علی نے نقل کی۔اس کا ماخذ قادیانیوں نے کبھی نہیں بتایا تاکہ اس پر تحقیق کی جا سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے 1893ء میں انٹرنس پاس کر کے سکاچ مشن کالج میں ایف اے کلاس میں داخل لے لیا تھا، اس میں ایف اے کلاس سکاچ مشن سکول لکھا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس میں مہتروں، خاکروبوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سعد اللہ لدھیانوی سے خوش ہوں گے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظم نگاہ کا اشارہ مرزا صاحب کے پادری عبداللہ آتھم سے مناظرہ (جنگ مقدس) اور ان کی موت کی پیشگوئی کی طرف ہے۔یہ مباحثہ امرتسر میں 22 فروری 1893ء سے 5 جون 1893ء تک ہوا جس کے بعد مرزا صاحب نے بذریعہ الہام آتھم کے پندرہ ماہ کے اندر مرنے کی پیشین گوئی کی جو پوری نہ ہو سکی۔

اس نظم کے متن سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ سعد اللہ نے پیش گوئی کے پورا نہ ہونے اور آتھم کے ستمبر 1894ء تک وفات نہ پانے کے بعد مرزا صاحب کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔مرزا صاحب نے واضح طور پر اس پیش گوئی کے جھوٹا ہونے کے باوجود اس کے عظیم الشان طور پر پورے ہونے کا دعویٰ کیا۔سعد اللہ، مرزا صاحب کے سخت خلاف تھا اور اس نے ایک کتاب

''شہاب ثاقب بر مسیح کاذب'' لکھی اور 16 ستمبر 1894ء کو ان کے خلاف ایک نہایت سخت الفاظ میں اشتہار شائع کیا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے اپنی کتاب انوارالاسلام کے ایک اشتہار مورخہ 5 اکتوبر 1894ء میں اسے عدواللہ اور ابتر کہا۔ شائد اس زمانے (1894ء) میں یہ نظم لکھنے والے نے مرزا صاحب کی پادری آتھم کے متعلق پیش گوئی کا دفاع کرنے کے لیے سعداللہ کو برا بھلا کہا اور بتایا کہ اس کے اس طرز عمل سے عیسائیوں، مہتروں اور خاکروبوں میں اس کی عزت افزائی ہوگی کیونکہ آتھم کے پیش گوئی کے مطابق وفات نہ پانے پر خوش ہیں۔ اس نظم کا یہ مصرعہ کہ ''اشتہار آخر اک آنت ہے، شیطان کی'' 16 ستمبر 1894ء کے اشتہار کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے داخلی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم ستمبر 1894ء کے بعد کی ہے۔ کیا ایسی نظم سکاچ مشن کالج کے کسی جریدے میں شائع ہو سکتی تھی جس کو پریسبٹیرین چرچ سیالکوٹ چلا رہا تھا اور کیا اس میں عیسائیوں کے لیے ایسے نازیبا الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے؟ قادیانی اس نظم کا نہ تو اصل ماخذ اور نہ ہی اس کا درست پس منظر بتاتے ہیں۔

اقبال 1894ء میں سکاچ مشن کالج میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ سکول سے میٹرک کر لیا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 1935ء کے بہت بعد قادیانیوں نے یہ جعل سازی کی کہ مبینہ نظم کے آخر میں کسی اور شخص کے نام کی جگہ شیخ محمد اقبال لکھ دیا، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی اور صاحب ہوں۔ بہر حال علامہ اقبال کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کے کسی غیر مطبوعہ کلام میں اس کا ذکر ہے۔ یہ نظم اتنی گھٹیا، سوقیانہ اور پھسپھسی ہے کہ علامہ اقبال کے ابتدائی کلام سے اس کو نسبت دینا ہی حماقت ہے۔ علامہ کا اسلوب بیان ان کی ابتدائی شاعری سے عیاں ہے جو رنگ تغزل لیے ہوئے ہے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم کہتے ہیں کہ یہ نظم خود ساختہ ہی نہیں بلکہ پھسپھسی ہونے کے علاوہ لغو ہے، اس قسم کے شوشے چھوڑنا مرزائیوں نے اپنا وظیفہ حیات بنا لیا ہے۔ (16)

1902ء میں علامہ اقبال کا ختم نبوت کے متعلق عقیدہ

فروری 1902ء میں علامہ اقبال کی ایک نظم شائع ہوئی جس میں ختم نبوت کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں مرزا صاحب قادیاں میں مشق نبوت فرما رہے تھے۔

1901ء میں رسالہ ایک غلطی کا ازالہ شائع کرنے کے بعد مرزا صاحب محدثیت کے مقام سے گزر کر نبوت کاملہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا ’’خدا کی وحی میں انہیں بار بار نبی و رسول کہا گیا ہے، اس لیے وہ اس منصب کا انکار نہیں کر سکتے۔ ایسے الفاظ اس زمانے (1901ء) میں پہلے زمانہ کی نسبت سے بہت تصریح اور توضیح کے ساتھ موجود ہیں۔ ’’فنا فی الرسول کی کھڑکی کھلی ہے اور جو اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے، اس پر ظلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے۔ اس طرح محمد ﷺ کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی گو بروزی طور پر، اس طرح ان کی نبوت باعتبار محمد اور احمد ہونے کے ہے، ان کے نفس کی رو سے نہیں۔ یہ نام انہیں فنا فی الرسول کی حیثیت سے ملا وہ بروزی طور پر نبی و رسول ہیں۔ غیب کی خبریں پانے والا نبی کہلاتا ہے۔ اگر اسے محدث کہا جائے تو بتائیں کس لغت کی کتاب میں تحدیث کے معنی اظہار غیب ہیں مگر نبوت کے معنی اظہار امر غائب ہے‘‘۔(17)

اس رسالے کی اشاعت کے بعد وہ لوگ جو ان کو محدث یا جزوی نبی مانتے تھے، ظلی بروزی رنگ میں حقیقی نبی ماننے لگے۔ 23 فروری 1902ء کو علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں ایک نظم پڑھی۔ یہ نظم اجلاس کی روائیداد کے صفحہ 32 پر بعنوان ’اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو‘ شائع ہوئی جس کے دیگر اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

علامہ اقبال نے اس شعر میں ہر مفہوم ظلی، بروزی، امتی، عکسی وغیرہ، میں مطلق نبوت کو ختم مانا ہے۔ اس ایک شعر سے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کے تمام متصوفانہ فلسفے کی نفی ہو جاتی ہے اور اجرائے نبوت کا نظریہ چاہے کسی رنگ، حیثیت یا توجیہہ کے ساتھ پیش کیا جائے اور اس کی آیت خاتم النبیین سے تطبیق کی کوشش کی جائے شرک فی النبوۃ قرار پاتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت مرزا غلام احمد کے دعویٰ بروزیت کی بنا پر ہوئی یعنی علامہ اقبال کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوۃ ہے۔ خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی ظلی، بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔(18)

یہ اشعار ان کے عقیدہ ختم نبوت پر کامل ایمان اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کی

مکمل تردید کے لیے کافی ہیں اور اسی عقیدہ کا اظہار بعد میں انہوں نے اپنے کلام اور خطبات مدارس میں کیا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے دعویٰ نبوت (1901ء) سے پہلے اسی انداز کے شعر کہے، لکھتے ہیں:

ہست او خیرالرسل خیرالانام
ہر نبوت رابروشد اختتام
ختم شد برنفس پاکش ہر کمال
لاجرم شد ختم ہر پیغمبرے

یعنی حضور ﷺ ہی خیر الرسل اور خیر الانام ہیں، ہر نبوت آپ ﷺ پر ختم ہے۔ حضور ﷺ کے پاک نفس پر ہر کمال ختم ہوگیا، اس لیے ہر پیغمبر بھی ختم ہوگیا۔(19)

علامہ اقبال پر انگریز نوازی کا الزام

قادیانی علامہ اقبال پر انگریزی حکومت کی مدح وتوصیف میں نظمیں لکھنے اور انگریز سے سیاسی تعاون کرنے کے الزامات لگاتے ہیں۔ یہ الزامات سرکاری سطح پر نہیں لگائے جاتے۔ یعنی قادیان، ربوہ، یا لاہوری جماعت نے علامہ اقبال کو اس حوالے سے مطعون نہیں کیا کیونکہ ان کو اپنے گھر کے حالات کا مکمل علم تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ الزامات اپنے کارندوں (20) یا سیکولر اور سوشلسٹ عناصر کے ذریعے لگائے۔ شیخ عبدالماجد نے علامہ اقبال کے خلاف جو دو کتابیں لکھی ہیں، انہیں انہوں نے ذاتی حیثیت سے شائع کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔(21) اس طرح انہوں نے اپنی جماعت کو انگریز پرستی کی بحث سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ آیئے ان الزامات کا جائزہ لیں۔

1- علامہ اقبال نے ایسی نظمیں اس عہد کے حالات، سیاسی تقاضوں اور بعض انگریز نواز احباب کے ایما پر لکھیں۔ یہ ان کے سیاسی فکر کے ارتقا کا ایک حصہ تھیں۔ بعد میں انہوں نے ان کو مسترد کرتے ہوئے اپنے مجموعہ کلام میں جگہ نہ دی۔ شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں۔

”علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ کے متروکہ کلام کو بعض دانشوروں نے ’کوہ کندن کاہ برآوردن‘ کے مصداق اکٹھا کر کے شائع کیا۔ ان شیدایان اقبال نے ان مجموعوں میں وہ اشعار بہ

التزام شریک کیے جو پہلی جنگ عظیم 18-1914ء میں انگریزی فتوحات سے متعلق علامہ اقبال کے قلم سے استعمار کے خاندانی جگر گوشوں نے کہلوائے تھے۔ استبداد کا زمانہ تھا اور وہ اشعار محض ابیات کا چربہ تھے۔ علامہ نے اگلا اور ٹھکرا دیا"۔ (22) ان کے اصل سیاسی افکار ان کے بعد کے کلام اور بیانات سے عیاں ہیں اور وہی ان کے حقیقی افکار ہیں، اس لیے ان کی ابتدائی نظموں کو ان کے خلاف تنقید کے لیے جواز بنانا غیر ضروری ہے اور بد دیانتی پر مبنی ہے۔ اگر وہ ہمیشہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے تو واقعی قابل اعتراض بات تھی۔

2- پنجاب کے اکثر سیاسی راہنما، جاگیر دار اور زمیندار انگریز سے تعاون کر کے ان سے مالی مراعات حاصل کرتے تھے لیکن علامہ اقبال نے ایسا کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور فقیری میں نام پیدا کیا۔ اس عہد کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو سامنے رکھ کر خلوص نیت سے انہوں نے ایک راہ متعین کی۔ اس میں ان کے پیش نظر کسی کو خوشنودی یا مخالفت نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی معاشی و سیاسی فلاح تھی۔ وہ انگریز اور ہندوؤں کی سیاسی چالوں کا توڑ اسی میں سمجھتے تھے۔ آج ہم ان سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی سوچ کو غیر دیانتدارانہ نہیں کہہ سکتے۔

ہم نے آئندہ صفحات میں علامہ اقبال کے سیاسی افکار اور ان کی نام نہاد انگریز نوازی کا قادیانیوں کی سیاسی پالیسی اور سامراج نوازی سے تقابل کر کے ان کے درمیان فرق بتایا ہے کیونکہ قادیانیوں کا انگریز سے ایک خصوصی تعلق رہا ہے جو ان کی مذہبی اور سیاسی روش کا ایک مستقل حصہ تھا۔

قادیانی علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی بعض نظموں کو جنہیں انہوں نے بعد میں درخور اعتنا نہ سمجھا اور اپنے مجموعہ کلام میں جگہ نہ دی، ان کی انگریز نوازی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، ان میں سب سے پہلے 1901ء کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک نظم ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی وفات (22 جنوری 1901ء) کے موقع پر لکھی، یہ 110 اشعار پر مشتمل ایک ترکیب بند ہے جس کا عنوان اشک خون ہے۔ علامہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ Tears of Blood کے عنوان سے بھی کیا۔ حکومت نے اس کی کاپیاں طبع کرا کے تقسیم کرائیں۔ (23) قادیانی علامہ اقبال کی اس نظم کو بنیاد بنا کر انہیں انگریز نواز ہونے کا الزام

دیتے ہیں۔مناسب تھا کہ وہ پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کی ان پچاس الماریوں پر نظر ڈالتے جو مرزا صاحب نے انگریز کی تعریف وتوصیف اور برطانوی استعمار کی مدح وستائش، جہاد کو حرام قرار دینے اور مسلمانوں کو برطانوی غلامی کا خوگر بنانے کے لیے تیار کیں۔اس الماری سے دو کتب تحفہ قیصریہ اور ستارہ قیصرہ پیش کی جاتی ہیں۔تحفہ قیصریہ 25 مئی 1897ء کو ملکہ وکٹوریہ کے دور اقتدار کی 60 سالہ جوبلی کے موقع پر تصنیف کی گئی اور اس کی کاپیاں پنجاب کے گورنر، وائسرائے ہند اور دیگر اعلیٰ حکام کو روانہ کی گئیں تاکہ برطانوی حکومت قادیان کے مغل خاندان اور مرزا صاحب کی مذہب کے پردے میں کی گئی سیاسی خدمات جلیلہ کو اچھی طرح جان سکے۔اس کی ایک کاپی ملکہ وکٹوریہ کو بھجوائی گئی۔اس رسالے میں کہا گیا، خدا کی جناب میں ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری ملکہ معظّمہ قیصرہ ہند کو جو اپنی رعایا کی مختلف اقوام کو کنار عاطفت میں لیے ہوئے ہے جس کے ایک وجود سے کروڑہا انسانوں کو آرام پہنچ رہا ہے، تادیرگاہ سلامت رکھے اور ایسا ہو کہ جلسہ جوبلی کی تقریب پر (جس کی خوشی سے کروڑہا دل برٹش انڈیا اور انگلستان کے جوش نشاط میں ان پھولوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں جو نسیم صبا کی ٹھنڈی ہوا سے شگفتہ ہو کر پرندوں کی طرح اپنے پروں کو ہلاتے ہیں) جس زور شور سے زمین مبارک بادی کے لیے اچھل رہی ہے، ایسا ہی آسمان بھی اپنے آفتاب و ماہتاب اور تمام ستاروں کے ساتھ مبارک بادیاں دیوے۔(24)

اس رسالے میں مرزا صاحب فرماتے ہیں:

- اے قیصرہ وملکہ معظّمہ! ہمارے دل تیرے لیے دعا کرتے ہوئے جناب الٰہی میں جھکتے ہیں اور ہماری روحیں تیرے اقبال اور سلامتی کے لیے حضرت احدیت میں سجدہ کرتی ہیں۔اے اقبال مند قیصرہ ہند! اس جوبلی کی تقریب پر ہم اپنے دل اور جان سے تجھے مبارکباد دیتے ہیں اور خدا سے چاہتے ہیں کہ خدا تجھے ان نیکیوں کی بہت بہت جزا دے۔جو تجھ سے اور تیری بابرکت سلطنت سے اور تیرے امن پسند حکام سے ہمیں پہنچی ہیں۔ہم تیرے وجود کو اس ملک کے لیے خدا کا ایک بڑا فضل سمجھتے ہیں اور ہم ان الفاظ کے نہ ملنے سے شرمندہ ہیں۔جن سے ہم اس شکر کو پورے طور پر ادا کرسکتے۔ہر ایک دعا جو ایک سچا شکر گزار تیرے لیے کرسکتا ہے، ہماری طرف سے تیرے حق میں قبول ہو۔خدا تیری آنکھوں کو مرادوں کے ساتھ ٹھنڈی رکھے اور تیری عمر اور صحت اور سلامتی میں زیادہ سے زیادہ برکت دے اور تیرے اقبال کا سلسلہ ترقیات جاری رکھے اور تیری

اولاد اور ذریت کو تیری طرح اقبال کے دن دکھا دے۔ اور فتح اور ظفر عطا کرتا رہے۔(25)

ملکہ وکٹوریہ کی شصت (ساٹھ) سالہ (ڈائمنڈ) جوبلی کے موقع پر قادیان میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ ایک الگ جلسہ احباب برتقریب جشن جوبلی بغرض دعا شکرگزاری جناب ملکہ معظّمہ قیصرہ دام ظلہا ہوا جس میں چھ زبانوں عربی، فارسی، اُردو، انگریزی، پنجابی، پشتو میں دعا اور شکرگزاری کی تقریریں ہوئیں جس پر لوگوں نے بڑی خوشی سے آمین کے نعرے مارے۔ ان جلسوں میں اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ اس گورنمنٹ کی پناہ اللہ کی پناہ ہے۔(26)

اس رسالہ کے جواب میں ملکہ معظّمہ کی طرف سے اظہار خوشنودی کا کوئی خط نہ پا کر 24 اگست 1899ء کو مرزا صاحب نے ستارہ قیصرہ کے نام سے ایک اور رسالہ تحریر کیا جس میں قیصرہ ہند کے عدل عام، رعایا پروری اور داد گستری کی تعریف کی اور کہا کہ انہیں تعجب ہے کہ ایک حکم شاہانہ سے بھی ممنون نہیں کیا گیا۔ اس بات پر افسوس کے بعد انہوں نے دوبارہ اپنے خاندان کی برطانوی حکومت کے لیے خدمات جلیلہ کا ذکر اور اپنی وفاداریوں کا تذکرہ کیا جو اس محسن گورنمنٹ کے لیے جارہی تھیں جس کی نظیر برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان نہیں دکھا سکا۔ وہ لکھتے ہیں:

- ''اے قیصرہ مبارکہ خدا تجھے سلامت رکھے اور تیری عمر اور اقبال اور کامرانی سے ہمارے دلوں کو خوشی پہنچاوے۔ اس وقت تیرے عہد سلطنت میں جو نیک نیتی کے نور سے بھرا ہوا ہے، مسیح موعود کا آنا خدا کی طرف سے یہ گواہی ہے کہ تمام سلاطین میں تیرا وجود امن پسندی اور حسن انتظام اور ہمدردی رعایا اور عدل اور داد گستری میں بڑھ کر ہے۔......سوائے ہماری پیاری قیصرہ ہند خدا تجھے دیرگاہ تک سلامت رکھے۔ تیری نیک نیتی اور رعایا کی سچی ہمدردی اس قیصر روم (جو مسیح کے وقت تھا) سے کم نہیں ہے۔......

اے بابرکت قیصرہ ہند تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں، جس پر تیری نگاہیں ہیں۔ خدا کی رحمت کا ہاتھ اس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے''۔(27)

یہ رسالہ ایسی دعاؤں، التجاؤں اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح وستائش اور انگریزی راج کی تعریف وتوصیف سے پر ہے جس کے سامنے اقبال کا مرثیہ ہیچ دکھائی دیتا ہے۔ علامہ کا مرثیہ شاعری تھا، یہ ایک نبی کے دل کی آواز اور اس کے ضمیر کا عکاس ہے۔ وہ محض لفاظی اور شاعرانہ

طرز کی مدح سرائی ہے لیکن یہ مرزا صاحب کے تاج برطانیہ کے لیے دل وجان سے نچھاور ہونے کا مرقع ہے۔ ان کے خلوص اور ان کی انگریز کے لیے شکرگزاری کا پرتو ہے جو اس وقت تک لوح عصر پر جگمگاتا رہے گا جب تک احمدیت باقی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس کلام کو خود مسترد کر دیا اور اپنے مجموعہ کلام میں اس کو کوئی جگہ نہ دی لیکن مرزا صاحب کی خدا کی وحی کی تائید سے لکھی گئی تحریریں آج تک چھپ رہی ہیں، ان کا نام روحانی خزائن رکھا گیا ہے۔ ان میں تبدیلی ممکن نہیں اور نہ ہی ان کو منسوخ سمجھا جاسکتا ہے۔ قادیانی ان کو اصل حالت میں برقرار رکھنے پر اتنے مصر ہیں کہ کسی کتاب میں درج غلط قرآنی آیات کی بھی تصحیح نہیں کرتے جن سے مرزا صاحب کی علمیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے نیچے محض ایک فٹ نوٹ دے کر کاتب پر تمام الزام ڈال دیتے ہیں لیکن اس کا جواب نہیں دیتے کہ آیات نقل کرنے میں کاتب غلطی کر سکتا ہے لیکن ترجمہ کیوں کر غلط کیا گیا۔

ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر مرزا صاحب نے حکومت برطانیہ کو ایک تار دیا جس میں اپنی اور اپنے پیروکاروں کی طرف سے اس نقصان پر نہایت صدمہ اور دکھ کا اظہار کیا گیا جو ملکہ معظّمہ قیصرہ ہند کی وفات کے نتیجے میں حکومت برطانیہ کو ہوا۔ (28)

سکھوں کی علیحدہ حیثیت اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ

شیخ عبدالماجد نے اقبال اور احمدیت میں ایک اور نکتہ آفرینی کی ہے کہ علامہ اقبال نے اسٹیٹس مین کے لیڈنگ آرٹیکل کا جواب ایک خط کی صورت میں 10 جون 1935ء کو شائع کرایا۔ اس میں کہا کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بنیادی اختلاف کا انتظامی طور پر نوٹس لے جیسے کہ سکھوں کو 1919ء تک انتظامی اعتبار سے ایک علیحدہ سیاسی یونٹ نہ سمجھا جاتا تھا مگر بعد میں ان کی طرف سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کے بغیر انہیں ایسا تصور کیا گیا۔ احمدیوں کو بھی مسلمانوں سے اسی طرح الگ کر دیا جائے۔ شیخ عبدالماجد کا استدلال یہ ہے کہ سکھوں کو تو انتظامی طور پر علیحدہ سیاسی یونٹ قرار دیا گیا تھا مگر احمدیوں کے بارے میں علامہ اقبال کا مطالبہ علیحدہ مذہبی جماعت کا ہے اس لیے سکھوں کی مثال یہاں چسپاں نہیں ہوتی۔ سکھ اپنی عسکری اور سیاسی اہمیت کے تحت علیحدہ قومیت کے حصول کے لیے کوشاں تھے، وہ اپنے آپ کو جداگانہ قوم تصور کرتے تھے، وہ اپنی قوم کے لیے ہندوؤں سے مذہباً علیحدہ کیے جانے کی نہیں بلکہ جداگانہ انتخابات Separate Electorate اسمبلی کے علیحدہ انتخابات یا علیحدہ نشستوں

کے حصول کے لیے کوشاں تھے۔ مصنفِ زندہ رود کے مطابق علامہ کا خصوصی اہمیت کا نکتہ یہ تھا کہ 1919ء میں سکھوں کی سیاسی علیحدگی کے نوٹ کی روشنی میں بلا تاخیر احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا جائے۔(29)

حکومت پنجاب کے نوٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی تین الگ انتخابی فہرستیں Electoral Rolls تیار کی جائیں اور جو کوئی اپنے آپ کو سکھ ہندو یا مسلمان کہے، اس کو سرکاری طور پر تحقیق کے بغیر اس مذہب کا حامل سمجھا جائے۔(30)

شیخ عبدالماجد کا خیال ہے کہ اس نوٹ کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علامہ اقبال کا استدلال یہ تھا کہ انگریزی حکومت نے 1919ء میں سکھوں کو انتظامی لحاظ سے الگ قرار دیا تھا لیکن قادیانیوں کی مسلمانوں سے اس لحاظ سے منفرد حیثیت ہے کہ وہ ختم نبوت کے منکر، اسلام کے اسلامی نظریات کے باغی اور اپنے علیحدگی پسندانہ عقائد اور نئی نبوت پر ایمان کے باعث مسلمانوں سے مذہبی اور سماجی سطح پر الگ ہیں لیکن مسلمانوں میں اس لیے شامل رہنا چاہتے ہیں کہ سیاسی فوائد حاصل کریں۔ چونکہ ان کی 1921ء کی مردم شماری کے مطابق کل تعداد 56 ہزار ہے، اس لیے وہ مجالس قانون ساز میں ایک نشست بھی نہیں حاصل کر سکتے نہ ہی ان کی نشستیں نئے آئین (1935ء) کے تحت مخصوص کی جا سکتی ہیں، اس لیے وہ سیاسی اقلیت کے زمرے میں نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ نہیں کرتے، وہ پنجاب میں اپنی قلیل تعداد کے باعث چوتھی اقلیت (مسلم، ہندوؤں سکھوں کے بعد) کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے حکومت ان کو ان کے الگ مذہبی عقیدے کی بنیاد پر علیحدہ مذہبی اقلیت قرار دے۔ وہ مسلمان نہیں، اسلام کے باغی اور عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں جس کو مانے بغیر مسلمان نہیں کہلا سکتے۔

سکھ اپنے سیاسی مطالبات ہندوؤں سے الگ مذہبی تشخص کی بنا پر پیش کرتے تھے۔ 1921ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی پنجاب میں آبادی 22 لاکھ 94 ہزار تھی جو کل آبادی کا 11 فیصد تھا، ان کو پنجاب کونسل میں 13 نشستیں الاٹ کی گئی تھیں جو کل نشستوں کا 19 فیصد تھیں۔ وہ کونسل میں 33 فیصد نشستوں کا مطالبہ کرتے تھے، 1919ء کی مونٹ فورڈ اصلاحات

کے تحت ان کے جداگانہ حق نیابت Separate Electorate کو تسلیم کیا جا چکا تھا جس کی بنا پر ان کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں 19 فیصد نشستیں ملیں لیکن قادیانیوں کی آبادی اتنی کم تھی کہ وہ نہ تو پنجاب کونسل میں کوئی ایک سیٹ لے سکتے تھے نہ ہی ان کی کوئی نشست مخصوص کی جا سکتی تھی۔ وہ مسلمانوں کے حقوق پر مسلمان بن کر ڈاکہ ڈالتے تھے۔ وہ سکھوں کی طرح کوئی سیاسی سودابازی نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی علیحدہ سیاسی یا انتظامی یونٹ قرار دیئے جانے کے اہل تھے۔ اس لیے علامہ اقبال نے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں سے الگ قرار دیا جائے اور ان کی طرف سے کسی مطالبہ کا انتظار نہ کیا جائے جیسا کہ سکھوں کے ساتھ کیا گیا۔ سکھ علیحدہ نمائندگی کے حق کو حاصل کرنے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہ تھے کیونکہ وہ اس میں اپنا سیاسی نقصان سمجھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم قرار دیتے تھے اور پنجاب کونسل میں معمولی مسلم اکثریت کو نقصان پہنچانے کے لیے کانگریس سے ساز باز کر کے زائد نمائندگی اور ایک تہائی نشستوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ سکھ خود ہندوؤں سے اپنی علیحدہ حیثیت پر اصرار کرتے تھے لیکن قادیانی مسلمانوں میں شامل رہنا چاہتے تھے کیونکہ وہ تعداد کی کمی کے باعث انتظامی طور پر بھی الگ سیاسی یونٹ قرار پانے کے اہل نہ تھے، اس لیے علامہ اقبال نے مطالبہ کیا کہ چونکہ وہ مسلمانوں سے الگ مذہبی اقلیت ہیں، اس لیے ان کی اس حیثیت کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا جائے۔

علامہ اقبال کے مضمون کے خلاف قادیانیوں کا شر انگیز پروپیگنڈا

1950ء کی دہائی کے اوائل میں قادیانیوں نے الفضل ربوہ میں یہ شر انگیز مہم شروع کی کہ علامہ اقبال کا مضمون Islam and Ahmadism جو پنڈت نہرو کے تین خطوط کے جواب میں ہے، انہوں نے تحریر نہیں کیا تھا۔ الفضل نے اس سلسلے میں بعض اداریے تحریر کیے اور داخلی شواہد کی آڑ لے کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ علامہ اقبال کا مضمون ہو ہی نہیں سکتا۔ خدائے قادیانی دجل وفریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ایسے سامان پیدا کیے کہ ان کا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ہم اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

لاہور کے ایک معزز کشمیری خاندان کے تین تعلیم یافتہ افراد تھے۔ ان کے اسمائے گرامی خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش تھے۔ ان کی کوٹھی للّی لاج تھڑیاں بھابھڑیاں میں

تھی جو بازار حکیماں اور سید مٹھا بازار کے درمیان واقع ہے، ان میں سے خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے کے۔اے وحید (خواجہ عبدالوحید) کو تقریباً 30 سال تک علامہ اقبال کو نیازمندی کا شرف حاصل رہا۔انہوں نے اپنے شب و روز کا حال بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے:

1934ء میں انجمن خدام الدین لاہور نے ایک انگریزی پندرہ روزہ 'اسلام، کا اجرا کیا اور اداریہ نویسی کا کام انہیں سونپا گیا۔پرچے پر خواجہ محمد رشید دائیں کا نام بطور ایڈیٹر چھپتا تھا، جن کا لاہور کے معروف آسٹریلیا خاندان سے تعلق تھا۔خواجہ وحید چونکہ سرکاری ملازم تھے، اس لیے کسی پرچے کے ڈیکلریشن کی درخواست نہ دے سکتے تھے۔وہ پندرہ روزہ اسلام کے لیے اہم ملی مسائل پر علامہ اقبال کے بیانات حاصل کرتے رہتے تھے۔وہ جریدہ اسلام کے اداریوں کے لیے اکثر اوقات علامہ اقبال سے ہدایات بھی لیتے تھے۔کبھی کبھی خواجہ وحید یہ چاہتے تھے کہ وہ علامہ سے ان مسائل پر ڈکٹیشن لیں جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں حل طلب تھے۔1930ء کی دہائی میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قادیانی مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کیے ہوئے تھا اور علامہ اقبال اس بحث میں پوری طرح شامل ہو گئے تھے۔ان کے بیانات اور خطوط مشہور اخبارات میں چھپ رہے تھے۔اب علامہ نے سوچا کہ اس مسئلہ پر ایک جامع مضمون لکھا جائے اور یہ رائے دی کہ خواجہ وحید اس کو ایک ہی قسط میں رسالہ اسلام میں شائع کریں۔خواجہ وحید لکھتے ہیں کہ علامہ نے انہیں اپنا مسودہ دیا۔وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں اس کو ٹائپ کروں۔میں نے وہ مسودہ ٹائپ کر دیا۔یہ مضمون تقریباً 25 فل سکیپ کاغذوں پر مشتمل تھا۔وہ جب اسے ٹائپ کر کے علامہ کے پاس لے گئے تو انہوں نے ان کا قلم لے کر اس میں درستی کی۔ہر صفحہ تصحیحات سے بھرا ہوا تھا۔بعض اوقات انہوں نے پورے کا پورا صفحہ کاٹ دیا اور اسے دوبارہ یا تو حاشیہ میں یا صفحے کی پشت پر لکھا۔خواجہ وحید لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس تصحیح شدہ مسودہ کو از سر نو ٹائپ کیا جو 'اسلام، 22 جنوری 1936ء کے شمارے میں شائع ہوا۔اس مضمون نے ملک میں بڑی ہلچل پیدا کی۔اصل ٹائپ شدہ مسودہ جس کی علامہ اقبال نے تصحیح کی تھی اور جس پر دستخط کیے تھے، تقریباً 20 سال تک ان (خواجہ وحید) کے پاس ہی رہا۔

1950ء کی دہائی میں خواجہ وحید نے کراچی سے پندرہ روزہ الاسلام شائع کرنا شروع

کیا۔ اس وقت قادیانی پرچے روزنامہ الفضل ربوہ نے بعض قسط وار اداریے شائع کیے جن میں دعویٰ کیا گیا کہ مضمون، اسلام اینڈ احمدازم، علامہ اقبال نے نہیں لکھا تھا اور بعض داخلی شواہد کی بنا پر کہا گیا کہ وہ ایسا مضمون لکھ ہی نہ سکتے تھے۔

خواجہ وحید نے الاسلام کے پہلے صفحے پر ایک مضمون شائع کیا اور بتایا کہ زیر بحث مضمون کا اصل ٹائپ شدہ مسودہ ابھی تک ان کے پاس ہے اور اس کے آخری صفحے کی فوٹو گراف چھاپ دی جس کے آخر میں علامہ اقبال کے دستخط تھے اور لکھا تھا:

''میں انجمن خدام الدین لاہور کو اجازت دیتا ہوں کہ درج بالا مضمون ایک پمفلٹ کی صورت میں مفت تقسیم کے لیے شائع کر دے'' محمد اقبال 7 جنوری 1936ء۔ اس پر دوبارہ ہل چل مچی۔ بعض پبلک تنظیمیں اس کو محفوظ کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے اسے اقبال اکادمی کو دے دیا جہاں دیگر اہم مسودات کے ساتھ یہ مسودہ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔(31)

انجمن حمایت اسلام سے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کا اخراج

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ (1872ء۔1936ء) کلانور گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ 5 فروری 1892ء کو مرزا غلام احمد قادیانی سے بیعت کی۔ 1897ء میں ایل ایم ایس کا امتحان پاس کیا، پنجاب کے مختلف علاقوں میں بطور ڈاکٹر کام کرتے رہے۔ 1915ء میں لاہور میں پریکٹس شروع کی۔ لاہور جماعت کے مرکز برانڈرتھ روڈ کے قریب ان کی ڈسپنسری تھی۔ انہوں نے مختلف اسلامی انجمنوں میں کام کیا۔ انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے ممبر تھے۔ سر شفیع لیگ کے ممبر رہے۔ 1931ء میں جب کشمیر کمیٹی بنی تو ڈاکٹر صاحب اور محمد یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ لاہور اس کے ممبروں میں شامل تھے۔ 1933ء میں جب مرزا محمود نے کمیٹی سے استعفیٰ دیا اور علامہ اقبال اس کے عارضی صدر بنے تو مرزا یعقوب بیگ نے ان کو دوبارہ صدر بنانے اور کمیٹی میں قادیانیوں کا عمل دخل قائم رکھنے کے لیے کئی سازشوں میں حصہ لیا۔ انہوں نے گذشتہ اختلافات بھلا کر مرزا محمود اور قادیانی جماعت کا بھرپور ساتھ دیا، یہی طرز عمل یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ کا تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک طویل بیان بھی اخبارات میں شائع کرایا۔ علامہ اقبال ان کی سرگرمیوں سے آگاہ تھے۔

1936ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے۔ انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور استعفیٰ واپس لینے کے لیے یہ شرط رکھی کہ انجمن مرزائیوں کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت کرے۔ علامہ اقبال کی تحریک پر انجمن حمایت اسلام لاہور نے 2 فروری 1936ء کو ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے احمدیوں کو انجمن کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا اور آئندہ کے لیے بھی ان کے ممبر بننے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

جنرل کونسل کے اجلاس کے دوران یعقوب بیگ نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔ مولوی غلام محی الدین قصوری کے دو تین مرتبہ ٹوکنے کے باوجود بولتے رہے۔ قادیانی یہ کہتے ہیں کہ اس رنج میں وہ فالج کے حملے کا شکار ہو کر 12 فروری 1936ء کو وفات پا گئے۔ ہفت روزہ لائٹ لاہور نے 16 فروری 1936ء کی اشاعت میں ان کو شہید کا مرتبہ دیا۔(32)

اقبال دشمنی کے دیگر انداز

قادیانیوں کے اقبال دشمن کردار کے متنوع پہلوؤں میں ایک ان کے خلاف شاعری کا سہارا لینا ہے اور دوسرا ان کے فلسفے اور پیغام کی وقعت کو کم کرنا ہے۔ الفضل قادیان اور پیغام صلح لاہور میں تلاش کرنے پر ان موضوعات پر کافی مواد مل سکتا ہے۔ تنگ دامنی کے باعث ہم ایک نظم اور مختصر مواد بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اقبال شناسوں کو چاہیے کہ وہ قادیانی اخبارات و رسائل کو کھنگال کر تمام مواد ایک جگہ جمع کریں اور اس کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیں۔

حسن رہتاسی قادیانیوں کے ایک 'نامور' شاعر تھے، اپنے نسیم سیفی اور ثاقب زیروی کی طرح۔ بعض قادیانی ان کو اقبال کا ہم پلہ شاعر سمجھتے ہیں اور بعض انہیں عوامی شاعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ 'کلام حسن' شائع ہو چکا ہے جس میں چیدہ چیدہ نظمیں قطعے وغیرہ ہیں۔ ہم ان قادیانیوں کے خیال سے متفق ہیں جو ان کو عوامی شاعر کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے صابن کی ٹکیہ اور بیوی کی انگیہ پر بھی مزاحیہ نظمیں کہی ہیں۔

1935ء میں جب علامہ اقبال کے قادیانیت کے خلاف مضامین پر تعلیم یافتہ طبقہ ان کو خراج عقیدت پیش کر رہا تھا تو قادیان میں چگی داڑھی اور منفی چہروں والی ایک کھیپ ان کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھی، اس زمانے میں حسن رہتاسی نے یہ نظم کہی۔(33)

اقبال و حسن

قاتل و سفاک یا خونخوار باش
رہزن و قزاق و خلق آزار باش
مے پرست و میخور میخوار باش
بے حیا و بے وفا غدار باش
دربدر آوارہ و بے کار باش
رخت فتنہ پوش و در بازار باش
قوم چوں بیدار باشد تو بخسپ
چوں بخسپد قوم تو بیدار باش
کار بند قشقہ و زنار شو
زرد پوش و خالصہ سردار باش
کاذب و کذاب باش و مفتری
حیلہ ساز و حیلہ جو مکار باش
پر حذر شو از صف کرپانیاں
باشریفاں بر سر پیکار باش
گر بیفتد ''مسجدے'' پروا مکن
تو بفکر درہم و دینار باش
تا نشستِ کونسلے آمد بدست
غور کن در مشتری ہوشیار باش
زیں مہمات عظیمیہ فرصتے
عزم بیت اللہ کن و زوّار باش
از خدا ہم از نبی بیزار باش
در ہمہ اوصاف برخودار باش

چوں شومی کامل بہر نوع کمال
بر جہادِ قادیاں، تیار باش
تا توانی باجماعت یار باش
رونق ہنگامۂ احرار باش

حوالے وحواشی

-1 زندہ رود، حصہ سوم، ص: 57
-2 وہ جمال الدین افغانی کو مجدد قرار دیتے تھے، ان کے نزدیک یہ اگر کوئی دینی منصب تھا۔
-3 جاوید اقبال، زندہ رود جلد سوم، ص 570
-4 ایضاً، پاکستان ٹائمز لاہور، 15 نومبر 1953ء
-5 دعوت نامہ جلسہ سالانہ 1980ء انجمن احمدیہ لاہور ص 7
-6 شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت ص 39
-7 سووینیر کراچی مجلس خدام الاحمدیہ، کراچی 1987ء ص 21
-8 زندہ رود حصہ سوم، ص 570
-9 اعجاز احمد، مظلوم اقبال ص 191
-10 ماہنامہ انصار اللہ ربوہ نومبر دسمبر 1985ء ص 102 سر ظفر اللہ نمبر
-11 پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور، مئی 1981ء ص 34
-12 ڈاکٹر بشارت احمد، مجدد اعظم جلد اول انجمن احمدیہ لاہور دسمبر 1939ء ص 333
-13 ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان 1977ء ص 188
-14 ممتاز احمد فاروقی، مجاہد کبیر، لاہور 1962ء ص 249
-15 عبدالماجد فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 446
-16 مرزائیل انجمن طلبا اسلام چنیوٹ 1968ء ص 124
-17 مرزا غلام احمد۔ ایک غلطی کا ازالہ، ص 3، 4
-18 غلام رسول مہر، سرود رفتہ ص 30
-19 مرزا غلام احمد: براہین احمدیہ ضمیمہ ص 10 مندرجہ روحانی خزائن ج 1 ص 19
-20 ہفت روزہ لاہور، لاہور جس کے ایڈیٹر ثاقب زیروی ہیں، اس مہم میں پیش پیش رہا ہے۔
-21 شیخ عبدالماجد فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 2

22- ہفت روزہ چٹان لاہور 8 اپریل 1974ء

23- شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 115، 116

24- مرزا غلام احمد، تحفہ قیصریہ صفحہ 2، مندرجہ روحانی خزائن جلد 12 ص 254

25- تحفہ قیصریہ، ص 9، مندرجہ روحانی خزائن جلد 12 ص 265

26- جلسہ جوبلی شصت سالہ حضرت قیصرہ، دام ظلہا مندرجہ (اشتہار، جلسہ احباب، برتقریب جشن جوبلی بغرض دعا و شکر گزاری جناب ملکہ معظّمہ قیصرہ ہند دام ظلہا نمبر 178 بتاریخ 23 جون 1897ء مندرجہ مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 115,114 طبع جدید از مرزا قادیانی)

27- مرزا غلام احمد قادیانی ستارہ قیصریہ ص 12 مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 ص 120

28- بشیر احمد، تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ لاہور ص 72

29- شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت، زندہ رود پر تبصرہ، باب جس طرح سکھوں کو علیحدہ سیاسی یونٹ تصور کرلیا گیا۔ ص 311، 312۔ زندہ رود ص 552

30- راجیوا ے کپور، سکھ سیپریشن لندن ص 79، بحوالہ اقبال اور احمدیت ص 312

31- The Pakistan Times, 9 November, 1977

32- محمد حنیف شاہد، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، لاہور 1976ء ص 134

33- الفضل، قادیان 29 فروری 1936ء

پروفیسر رحمت علی ظفر

علامہ اقبال اور جواہر لال نہرو اور قادیانیت

جواہر لال نہرو ہندوستان کے سیاسی حالات کے تناظر میں قادیانیت کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے جو اس تحریک کو مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ قادیانیت کے غیر اسلامی عقائد ونظریات کو دیکھتے ہوئے جب علامہ اقبال نے ان کے خلاف اپنا پہلا مضمون ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' تحریر کیا جس میں قادیانیوں کے عقائد ونظریات کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہی دلاتے ہوئے انہیں حکومت سے اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

اقبال کے اس مضمون کے اشاعت کے وقت جواہر لال نہرو المموڑا جیل میں تھے جہاں وہ اقبال کے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد قادیانیوں کی حمایت میں کھل کر سامنے آئے اور یکے بعد دیگرے تین آرٹیکل تحریر کیے جن میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی مخالفت کی۔ علاوہ ازیں جواہر لال نہرو نے اپنی ان تحریروں میں قادیانیوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ کانگریس جیسی سیکولر نظریے کی حامل جماعت کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد قادیانی اپنے عقائد اور نظریات کے مطابق پرامن طریقے سے وہاں زندگی گزار سکیں گے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے عقائد و نظریات چونکہ قادیانیوں سے مختلف ہیں، اس لیے ان کے ساتھ مل کر انہیں زندگی گزارنا مشکل ہوگی۔ ان تحریرات کی اشاعت کے بعد جواہر لال نہرو اور قادیانیوں کے درمیان بہترین تعلقات استوار ہوگئے اور قادیانی خلیفہ مرزا محمود کے دل میں بھی جواہر لال نہرو کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگیا جیسا کہ مرزا محمود کے درج ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

❑ ''چونکہ پنڈت جی نے ڈاکٹر اقبال کے مضامین کا رد لکھا ہے جو انہوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراضات اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول ہے اور ان

کے گزشتہ رویے کے خلاف ہے''۔(1)

غرضیکہ قادیانیت کی تحریری حمایت کے بعد 1936ء میں جب جواہر لال نہرو لاہور آئے تو قادیانیوں نے ان کے استقبال کے لیے ایک شاندار جلوس نکالا اور جواہر لال نہرو کو ہاروں سے لاد کر قادیانی رضا کاروں نے بڑے جوش وخروش سے اس کا استقبال کیا۔قادیانی رضا کاروں نے اپنے ہاتھوں میں استقبالی کتبے اُٹھا رکھے تھے جن میں جواہر لال کی شان میں نعرے درج تھے۔اس استقبال کی تفصیل ایک قادیانی اخبار ''الفضل'' نے 31 مئی 1936ء کو اپنی اشاعت میں یوں بیان کی ہے:

❑ ''چونکہ کانگریس نے صرف پانچ صد والنٹیئر وں کی خواہش کی تھی،اس لیے قادیان سے تین صد اور سیالکوٹ سے دوصد کے قریب والنٹیئر 28 مئی کو لاہور پہنچ گئے۔قادیان کی کوسٹر دس بجے پہنچی۔استقبال کے سلسلے میں (قادیانی) کور کا مظاہرہ ایسا شاندار تھا کہ ہر شخص اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور لوگ کہہ رہے تھے کہ ایسا شاندار نظارہ لاہور میں کم دیکھنے میں آیا ہے۔کانگریسی لیڈر کور کے ضبط اور ڈسپلن سے بے حد متاثر تھے اور بار بار اس کا اظہار کر رہے تھے۔حتیٰ کہ ایک لیڈر نے شیخ صاحب (شیخ بشیر) سے کہا ''اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں تو یقیناً ہماری فتح ہوگی''۔

نیشنل لیگ کے پنڈت جواہر لال نہرو کا استقبال کرنے کے حوالے سے مرزا محمود سے کئی سوال پوچھے گئے تو ان کے جواب میں انہوں نے کہا کہ:

❑ ''جب علامہ اقبال نے قادیانیوں کو کافر کہا تو اس کا رد جواہر لال نہرو نے کیا اور علامہ اقبال کے اعتراضات کا خوب جواب دیا۔اس لیے قادیانیوں پر لازم ہے کہ جواہر لال نہرو کا دل کھول کر استقبال کریں''۔(2)

پنڈت نہرو کی لاہور آمد پر کل ہند نیشنل لیگ اور قادیانی رضا کاروں نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور گاڑی سے اترتے ہی اسے ہاروں سے لاد دیا گیا۔قادیانی رضا کار بڑے جوش وخروش سے نعرے لگا کر پنڈت نہرو کا استقبال کر رہے تھے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں کتبے اُٹھا رکھے تھے جن پر یہ نعرے تحریر تھے:

❍ ''فخر قوم!خوش آمدید!

- ''ہم شہری آزادی کی یونین میں شامل ہیں''
- ''جواہر لال نہرو زندہ باد''

پنڈت جی کے لاہور میں کیے گئے استقبال کے بارے میں احمدیہ جماعت کا رسالہ ''پیغام صلح'' تحریر کرتا ہے:

- ''یہ کوئی زیادہ دور کی بات نہیں، خلیفہ قادیان کانگریس کا بدترین دشمن تھا۔ قادیانی جماعت نے کانگریس کی تحریکوں کی مخالفت کر کے اور ان کی جاسوسی کر کے حکومت کی مدد کی۔ آج کل وہ کانگریس کے ایک انتہا پسند اور اشتراکی راہنما کو بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہہ رہے ہیں، افسوس کہ یہ تبلیغ چھوڑ کر بڑے بھونڈے انداز میں (نہرو کے استقبال میں) حصہ لے رہے ہیں۔(3)

انہی دنوں علامہ اقبال نے قادیانیوں کی طرف سے کیے گئے پنڈت جواہر لال نہرو کے استقبال کے حوالے سے ''لا الہ الا فرنگی'' کے نام سے ایک نظم تحریر کی جو 29 جون 1936ء کو ''روزنامہ احسان'' میں شائع ہوئی جو درج ذیل ہے:

اس قدر پنجاب میں بام وزارت ہے بلند
چور چڑھتے ہیں لگا کر نرد بان قادیاں
لاٹ سے روٹھے گئے پنڈت کے استقبال کو
دیکھ کس روزن سے نکلا ہے دخان قادیاں
نیشنل کور و طواف شملہ و منع جہاد
خود غلام احمد نہ سمجھا چیستان قادیاں
لا الہ الا فرنگی کلمۂ دین بروز
الفرنگی اکبر، آواز اذانِ قادیاں (4)

پنڈت نہرو جسے نیشنل لیگ نے بڑے پرتپاک طریقے سے خوش آمدید کہا اور وہ ایک وقت میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان میں برطانوی راج کے خاتمے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ قادیانی قوت کو کچل دیا جائے کیونکہ یہ سامراج کے حاشیہ بردار ہیں۔ اسی لیے قادیانی جماعت میں کچھ قادیانی اس استقبالی ڈرامے کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہوں نے پنڈت نہرو کو ''فخر قوم''

کہنے پر اعتراض بھی کیا تھا، مگر مرزا محمود نے صرف اس وجہ سے اس نعرے کو درست قرار دیا کہ جب علامہ اقبال نے قادیانیوں پر تنقید کی تو جواہر لال نے با قاعدہ قادیانیوں کی حمایت کرتے ہوئے اقبال کی تنقید کا جواب دیا۔

جواہر لال نہرو کی تحریرات سے قبل قادیانی خلیفہ مرزا محمود کانگریس اور جواہر لال نہرو کا بدترین دشمن تھا مگر قادیانیوں کی اس تحریری حمایت کے بعد نہرو قادیانیوں کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔

حوالہ جات/حواشی

-1 رسالہ، پیغام صلح، لاہور 12 اکتوبر 1937ء

-2 اخبار، الفضل، قادیانی 18 جون 1936ء

-3 پیغام صلح 12 اکتوبر 1936ء

-4 روزنامہ احسان 29 جون 1936ء

ماسٹر محمد احسان
ایڈیٹر ماہنامہ ’’حقیقتِ اسلام‘‘

نہرو نے قادیانیت کی حمایت کیوں کی؟

واقف کار حضرات سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ جب علامہ سر محمد اقبال مدظلہ نے قادیانیت کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک معرکۃ الآراء مضمون بعنوان ’’احمدیت اور اسلام‘‘ سپرد قلم فرمایا تھا، تو صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے احمدیت کی حمایت میں چند مضامین لکھے تھے، جن کا مفہوم یہ تھا کہ احمدی حضرات دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں۔ اکثر اصحاب نے پنڈت جی کی اس حمایت کو حیرت کی نظر سے دیکھا تھا کہ آخر پنڈت جی کو اس امر کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی کہ احمدیوں کی حمایت میں اپنے قلم کو جنبش دیں؟ علامہ موصوف نے پنڈت جی کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ احمدیوں کے عقائد اس قسم کے ہیں کہ ان کو تسلیم کرنے کے بعد وحدتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ مسلمان اس امر کو گوارا نہیں کر سکتے کہ رسولِ عربی ﷺ کی امت میں سے قطع و برید کر کے ہندوستانی ’’نبی‘‘ کے لیے ایک جدید امت تیار کی جائے، جس کا مذہبی مرکز مکہ معظّمہ کے بجائے قادیان ہو۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں مسلمانوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ہر اس تحریک سے قطعی طور پر مجتنب اور محترز رہیں جو ان کے اندر افتراق و انشقاق پیدا کرنے کا باعث ہو۔

اگرچہ وہ جذبہ جس نے پنڈت جی کو احمدیوں کی حمایت پر کمربستہ کیا، اربابِ دانش کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے، تاہم اتمامِ حجت کے طور پر ہم ڈاکٹر شنکر داس کے اس مضمون کا اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں، جو انھوں نے کچھ عرصہ ہوا ’’بندے ماترم‘‘ میں شائع کرایا تھا۔

❑ ’’سب سے اہم سوال جو اس وقت ملک کے سامنے درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر کس طرح قومیت کا جذبہ پیدا کیا جائے —— ہندوستانی مسلمان اپنے آپ

کو ایک الگ قوم تصور کیے بیٹھے ہیں اور وہ دن رات عرب ہی کے گیت گاتے ہیں، اگر ان کا بس چلے تو وہ ہندوستان کو بھی عرب کا نام دے دیں۔

اس تاریکی میں، اس مایوسی کے عالم میں، ہندوستانی قوم پرستوں اور محبانِ وطن کو ایک ہی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے اور وہ آشا کی جھلک احمدیوں کی تحریک ہے۔ جس قدر مسلمان احمدیت کی طرف راغب ہوں گے، وہ قادیان کو اپنا مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخر میں محبِّ ہند اور قوم پرست بن جائیں گے۔ مسلمانوں میں احمدیہ تحریک کی ترقی ہی عربی تہذیب اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

جس طرح ایک ہندو کے مسلمان ہو جانے پر اس کی شردھا اور عقیدت رام، کشن، وید، گیتا اور رامائن سے اٹھ کر قرآن اور عرب کی بھومی میں منتقل ہو جاتی ہے، اسی طرح جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے تو اس کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ میں اس کی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے، مکہ، مدینہ اس کے لیے روایتی مقامات رہ جاتے ہیں، یہ بات عام مسلمانوں کے لیے، جو ہر وقت پان اسلام ازم اور پان عربی سنگٹن کے خواب دیکھتے ہیں، کتنی ہی مایوس کن ہو، مگر ایک قوم پرست کے لیے باعثِ مسرت ہے۔

ایک احمدی (مرزائی) چاہے عرب، ترکستان، ایران یا دنیا کے کسی بھی گوشہ میں بیٹھا ہو، وہ روحانی تسکین کے لیے قادیان کی طرف منہ کرتا ہے۔ قادیان کی سرزمین اس کے لیے سرزمینِ نجات ہے اور اس میں ہندوستان کی فضیلت کا راز پنہاں ہے۔ ہر احمدی کے دل میں ہندوستان کے لیے پریم ہوگا، کیونکہ قادیان ہندوستان میں ہے۔ مرزا قادیانی بھی ہندوستانی تھے اور اب تک جتنے خلیفے اس فرقے کی رہبری کر رہے ہیں، وہ سب ہندوستانی ہیں۔

اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب مرزائی قرآن کو الہامی کتاب مانتے ہیں تو وہ اسلام سے الگ کیسے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سکھوں کی موجودہ ہندوؤں سے علیحدہ گرو گرنتھ صاحب میں رام، کشن، اندر، وشنو، سب ہندو دیوی دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے، مگر کیا سکھوں نے رام، کرشن کی مورتیوں کا کھنڈن نہیں کیا؟ گوردواروں سے رامائن اور گیتا کا پاٹھ نہیں اٹھایا؟ کیا سکھ اب ہندو کہلانے سے انکار نہیں کرتے؟

اسی طرح وہ زمانہ دور نہیں جب قادیانی کہیں گے کہ ہم محمدی مسلمان نہیں، ہم تو احمدی مسلمان ہیں۔کوئی ان سے سوال کرے گا کیا تم حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو مانتے ہو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ ہم حضرت محمد ﷺ، عیسیٰؑ، رام، کرشن سب کو اپنے اپنے وقت کا نبی تصور کرتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہندو، عیسائی یا محمدی ہو گئے۔ یہی ایک وجہ ہے کہ مسلمان احمدی تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ احمدیت ہی عربی تہذیب اور اسلام کی دشمن ہے۔ خلافت تحریک میں بھی احمدیوں نے مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا، کیونکہ وہ خلافت کو بجائے ترکی یا عرب میں قائم کرنے کے قادیان میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

(اخبار بندے ماترم 22 اپریل 1935ء)

ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر شنکر داس کے مضمون سے ان اقتباسات کو پڑھ کر مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی، کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے احمدیت کی حمایت میں اپنے قلم کو کیوں جنبش دی تھی اور علامہ اقبال تحریکِ احمدیت کو اسلام کے حق میں کیوں مضرت رساں خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی

علامہ اقبالؒ کے نظریات، تحریف اور تغیر کی زد میں

علامہ اقبالؒ کی حیثیت اہلِ پاکستان کے لیے شاعر سے زیادہ پاکستانی مفکر کی ہے، جس نے الگ وطن کا تصور دیا۔ اس لیے علامہ کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے نقاد اُن کی شاعری کی قدر و قیمت کے مقابلے میں ان کے خیالات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ہر سیاسی جماعت اپنے مسلک کی تائید میں علامہ اقبالؒ کے کلام سے ہی اشعار کا ورد کرتی ہے۔ اس طرح کثرتِ تعبیر سے کلام اقبالؒ عام قاری کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ جاگیردار اپنی تائید کے لیے کلامِ اقبالؒ سے حوالہ لاتا ہے۔ مزدور بھی اپنی تائید کے لیے کلامِ اقبالؒ ہی سے کام چلاتا ہے۔ جمہوریت کا حامی بھی کلامِ اقبالؒ سے ہی اپنی تقریر کو سجاتا ہے اور فسطائیت کا حامی بھی کلام اقبالؒ ہی سے فال نکالتا ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ مخالفینِ اقبال اس کی فکر کو مسخ کرنے کے لیے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ یہ کام پاکستان بننے سے پہلے ہی بہت زور و شور سے شروع ہو گیا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم کی موجودگی میں مجھے ایک واقعہ سنایا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ ہم دونوں اس جلسے میں گئے۔ وہاں علامہ اقبالؒ کے خیالات کی تردید میں مقالہ پڑھا گیا، جس کے خلاف دونوں نے احتجاج کیا اور جلسے سے اٹھ کر چلے آئے۔ اس ردِ عمل کی وجہ سے علامہ کو رجعت پسند قرار دینے کا رجحان دھیما پڑ گیا اور انجمن کے اکابرین نے اس نازک مسئلے پر آئندہ اظہارِ خیال ترک کر دیا اور اقبال کو ترقی پسند کے طور پر قبول کرنے کی پالیسی اپنا لی گئی۔

علامہ اقبالؒ کو رجعت پسند قرار دینے کا آغاز علمی سطح پر سمتھ نے شروع کیا تھا جو اُن دنوں ایف سی کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی کتاب کے دو باب اہم ہیں، جن میں سے ایک کا عنوان Iqbal the Progressive اور دوسرے کا عنوان Iqbal the Reactionary

ہے۔اس دوسرے باب میں علامہ اقبال کی اسلام دوستی کونشانہ بنایا گیا ہے۔اس کے مقابلے میں حصولِ پاکستان کے آس پاس بعض ہندو مصنفین کی تصانیف میں سب سے پہلی آواز 1946ء کے قریب سنہانے اُٹھائی۔اپنی انگریزی کتاب میں علامہ اقبال کوفرقہ پرست مسلمانوں کا حامی اور محدودشاعر قرار دیا گیا۔دونوں آوازیں ایک دوسرے کے متوازی چلتی رہیں۔1949ء کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سے علامہ اقبالؒ کو رجعت پسند قرار دیا جائے----- تو علامہ اقبالؒ کو رجعت پسند قرار دینے کی آواز دوبارہ اہم ہوگئی۔سنا ہے کہ اقبال کی حمایت میں علی سردار جعفری نے اقبال پر اپنی کتاب کا مسودہ تک نذرِ آتش کر دیا تھا۔

اب حال ہی میں اس حوالے سے ایک نیا رجحان سامنے آیا ہےاور یہ اقبال کی عبارتوں کی تحریف کا ہے۔چند برس سے بعض کتابوں میں علامہ اقبالؒ کو قادیانی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔سمن آباد لاہور سے پچھلے چند برس میں اس موضوع پر دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اس کا نوٹس اقبال اکیڈمی کے عہدیدار ڈاکٹر وحید عشرت نے بروقت لیا۔اس سال اقبال کشی کی مہم ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔اقبال کی نثری تحریروں میں 1935ء کے قریب قادیانیوں کی مخالفت بہت بڑھ گئی تھی۔خاص کر پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں علامہ کے بیانات بہت سخت تھے اوران میں قادیانیوں کو ''غدار'' تک قرار دیا گیا تھا،جس کا جواب کسی سے بن نہیں پایا تھا، چنانچہ اس مشکل کا حل بھی مخالفینِ اقبال نے اب نکال لیا ہے۔حال ہی میں لاہور سے نہرو کے نام اکابرین کے خطوط کے مجموعے A Bunch of Old Letters کا اردو ترجمہ بعنوان ''جدوجہد آزادی پر ایک نظر'' شائع ہوا ہے۔اس کتاب کے مترجم ملک اشفاق کے متعلق بھی کتاب کے فلیپ سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ستیانہ فیصل آباد کے رہنے والے ہیں۔ 1986ء میں لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ 1992ء میں بہاولپور سے ایم اے تاریخ میں کامیاب ہوئے۔پھر 1998ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کرلیا۔

موصوف کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔کیلاش کا سفرنامہ، خلیل جبران کے شاہکار افسانے، داستانِ نپولین اور دنیا کی نامور شخصیات ان کی تصانیف ہیں۔نئی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ نہرو کے نام ان خطوط کو وہ پہلی بار اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں، حالانکہ یہ درست نہیں۔اس کتاب کا ترجمہ پہلے پہل جامعہ ملیہ دہلی سے 1942-1941ء میں شائع ہو چکا

ہے۔کمال یہ کیا گیا ہے کہ بعض خطوط کا ترجمہ نہیں، صرف خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔نہرو کے نام علامہ اقبالؒ نے 21 جون 1936ء کو جو خط لکھا ہے، اس میں علامہ نے پورے ایک صفحے میں اپنے موقف کا جواز پیش کیا ہے۔ٹیپ کا جملہ یہ تھا:

"I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India."

یہ خط پورے کا پورا اقبال اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب کے صفحہ 200 پر شائع ہو چکا ہے اور نہرو کی کتاب سے، جو لندن سے 1960ء میں شائع ہوئی، ماخوذ ہے۔اس جملے کا جو ترجمہ ملک اشفاق نے کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ ہو۔فرماتے ہیں:

''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں، نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔(جدوجہدِ آزادی پر ایک نظر، ترجمہ ملک اشفاق، ناشر فکشن ہاؤس 18 مزنگ لاہور، سال اشاعت 1999ء صفحہ 175)۔

میری رائے میں ایسے ترجموں یا خلاصوں کا سختی سے نوٹس لینا چاہیے اور انھیں Ban کر دینا چاہیے کیونکہ اس طرح کی تحریفات سے فکرِ اقبال کو مسخ کرنے کے رجحان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وحید عشرت

اقبال کے خطوط میں تحریف کی تازہ مثال

لاہور کے ایک اشاعتی ادارے فکشن ہاؤس نے 'جدوجہد آزادی پر ایک نظر' کے عنوان سے پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب A Bunch of Old Letters شائع کی ہے اور Letters کے ہجے Latters لکھے ہیں۔ ترجمہ ملک اشفاق کا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ 175 پر پنڈت جواہر لال نہرو کے نام اقبال کا ایک خط شائع کیا گیا ہے جس کی عبارت یوں ہے:

منجانب سر محمد اقبال

لاہور

21 جون 1936ء

پیارے پنڈت جواہر لال

آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے جو خط لکھا تھا، وہ مجھے کل مل گیا ہے۔ آپ نے جو آرٹیکل احمدیت اور ان کا سیاسی رویہ کے بارے میں لکھا ہے، دراصل آپ احمدیوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔

احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں، نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے موقع ضائع کر دیا اور آپ سے لاہور میں ملاقات نہ کر سکا۔ میں ان دنوں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے میں پچھلے دو سال سے ایک قسم کا ریٹائر ہو چکا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ دوبارہ پنجاب کب آ رہے ہیں۔

کیا آپ کو میرا خط مل گیا تھا جس میں آزادی کے لیے سول یونین بنانے کا لکھا تھا؟

آپ مجھے اطلاع دیجیے، نہیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ تک میرا خط نہیں پہنچا۔ آپ کا مخلص

محمد اقبال

اس سے پیشتر کہ ہم اس خط کا تجزیہ کریں اور بتائیں کہ مترجم نے اس خط میں نہ صرف کہ کتر بیونت کی ہے بلکہ خط کا مفہوم ہی الٹ دیا ہے، اقبال کہہ رہے ہیں کہ:

''میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہندوستان کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔''

جس کو ملک اشفاق نے یوں بدل دیا ہے:

''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں، نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔''

عبارت کا پورا مفہوم الٹ دینا نہ تو ترجمے کی غلطی ہے، نہ کمپوزنگ کی اور نہ ہی پروف خوانی کی۔ اشفاق احمد نے صفحہ 392 پر ویسٹ پنجاب کا ترجمہ مشرقی پنجاب کر دیا ہے اور ملک فیروز خان کے حوالے سے یوں ترجمہ کیا ہے۔ ملک فیروز خاں نون نے کہا ''کہ دنیا کے کسی ملک نے ایسا عظیم انسان پیدا نہیں کیا جو مذہبی حوالے سے مہاتما گاندھی جیسا عظیم ہو'' جبکہ اصل عبارت میں یہ ہے کہ ''سوائے مذہبی رہنماؤں کے''۔ اشفاق احمد جاہلِ مطلق ہے یا بدنیت یا اس کے نام سے کسی اور جاہل نے یہ ترجمہ کیا ہے، صرف فکشن ہاؤس ہی یہ معمہ حل کر سکتا ہے۔ یہ واضح طور پر بددیانتی اور دانستہ کی گئی حرکت ہے۔ بعد میں جب یہ کتاب لوگوں کے اعتراضات کا باعث بنی تو اس کی اس عبارت پر کہ ''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں، پر ایک چیپی تصحیح کے لیے لگا دی گئی اور یہ خط یوں ہو گیا ہے:

منجانب سر محمد اقبال

لاہور

21 جون 1936ء

پیارے پنڈت جواہر لال

آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے جو خط لکھا تھا، وہ مجھے کل مل گیا ہے۔ آپ نے جو

آرٹیکل احمدیت اوران کا سیاسی رویہ کے بارے میں لکھا ہے، دراصل آپ احمدیوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے موقع ضائع کر دیا اور آپ سے لاہور میں ملاقات نہ کرسکا۔ میں اُن دنوں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے میں پچھلے دو سال سے ایک قسم کا ریٹائر ہو چکا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ دوبارہ پنجاب کب آرہے ہیں۔

کیا آپ کو میرا خط مل گیا تھا جس میں آزادی کے لیے سول یونین بنانے کا لکھا تھا؟ آپ مجھے اطلاع دیجیے۔ نہیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ تک میرا خط نہیں پہنچا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

تاہم پورا خط پھر بھی تبدیل نہیں کیا گیا جس سے مصنف اور ادارے کی بدنیتی اور واضح ہوگئی ہے۔

جبکہ مرحوم لطیف احمد شیروانی کی مرتبہ کتاب **Speeches, Writings and Statements of Iqbal** کے ص **200** پر علامہ اقبال کے **21** جون **1936**ء کے اسی خط کی انگریزی عبارت اس سے قطعی مختلف ہے، جس کا عکس دیا جا رہا ہے۔ یہی خط **A Bunch of old Letters** کے صفحہ **187-188** پر بھی موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اقبال اکادمی کے نئے ایڈیشن میں یہ خط صفحہ **240** پر آیا ہے جس میں سے پھر ایک فقرہ ادھورا رہ گیا ہے جو صفحہ **240** کے آخری حروف **I** کے بعد اور صفحہ **241** کے لفظ **Ahmadies** کے درمیان آنا تھا۔ یہ فقرہ یوں ہے جسے ان شاءاللہ اگلے ایڈیشن میں درست کر دیا جائے گا۔

Blieved that you had no idea of the political attitude

of the

تاہم نیچے کے خط کے عکس میں یہ موجود ہے۔

Letter to Pandit Jawahar Lal Nehru about the Ahmadis, 21 June 1936

Thank you so much for your letter which I received yesterday. At the time I wrote in reply to your articles, I believed that you had no idea of the political attitude of the Ahmadis. Indeed the main reason why I wrote a reply was to show, especially to you how Muslim loyalty had originated and how eventually. It had found a revelational basis in Ahmadism. After the publication of my paper I discovered, to my great surprise, that even the educated Muslims had no idea of the historical causes which had shaped the teachings of Ahmadism. Moreover your Muslim admirers in the Punjab and elsewhere felt perturbed over your articles as they thought you were in sympathy with the Ahmadiyya movement. This was mainly due to the fact that the Ahmadis were jubilant over your articles. The Ahmadi Press was mainly responsible for this misunderstanding about you. However I am glad to know that my impression was erroneous. I myself have little interest in theology, but had to dabble in it a bit in order to meet the Ahmadis on their own ground. I assure you that my paper was written with the best of intentions for Islam and India. I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India.

I was extremely sorry to miss the opportunity of meeting you in Lahore. I was very ill in those days and could not leave my rooms. For the last two years I have been living a life practically of retiremcnt on account of continued illness. Do let me know when you come to the Punjab next. Did you receive my letter regarding your proposed Union for Civil Liberties? As you do not acknowledge it in your letter I fear it never reached you.

Reproduced from Jawaharlal Nehru. A Bunch of old Letters (London, 1960) PP.187-88 (Ed)

(۶) احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب

۲۱ جون ۱۹۳۶ء

آپ کے مکتوب کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ جب میں نے آپ کے مضامین کا جواب دیا میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویئے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ درحقیقت میرے جواب لکھنے کا بڑا سبب یہ دکھانا تھا' بالخصوص آپ کو' کہ کس طرح مسلمانوں کی وفاداری کی ابتداء ہوئی اور اس نے کس طرح احمدیت میں الہام کی اساس حاصل کی۔ میرے مقالے کی اشاعت کے بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان تاریخی وجوہ کا کچھ علم نہیں جنہوں نے احمدیت کی تعلیمات کو تشکیل دیا۔ مزید برآں آپ کے مداح پنجاب میں اور دیگر مقامات پر آپ کے مضامین سے پریشان ہو گئے کیونکہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ شاید آپ کو تحریک احمدیہ سے ہمدردی ہے۔ احمدی پریس بڑی حد تک آپ کے بارے میں اس غلط فہمی کو پیدا کرنے کا ذمہ وار ہے۔ تاہم یہ معلوم کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے بارے میں میرا تاثر غلط تھا۔ مجھے خود دینیات میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لئے لینا پڑا تاکہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لئے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے آپ سے لاہور میں نہ مل سکنے کا بے حد افسوس ہے۔ میں ان دنوں میں بہت بیمار تھا اور اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ گذشتہ دو برس سے مسلسل علالت کے باعث عملاً میں فارغ شدہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آئندہ جب آپ پنجاب تشریف لائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ آپ کی شہری آزادیوں کی مجوزہ یونین کے بارے میں آپ کو میرا خط ملا؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کی وصولیابی کی کوئی اطلاع نہیں دی خدشہ ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔

(6)

Letter to Pandit Jawahar Lal Nehru about the Ahmadis, 21 June 1936*

Thank you so much for your letter which I received yesterday. At the time I wrote in reply to your articles I believed that you had no idea of the political attitude of the Ahmadis. Indeed the main reason why I wrote a reply was to show, especially to you, how Muslim loyalty had originated and how eventually it had found a revelational basis in Ahmadism. After the publication of my paper I discovered, to my great surprise, that even the educated Muslims had no idea of the historical causes which had shaped the teachings of Ahmadism. Moreover your Muslim admirers in the Punjab and elsewhere felt perturbed over your articles as they thought you were in sympathy with the Ahmadiyya movement. This was mainly due to the fact that the Ahmadis were jubilant over your articles. The Ahmadi Press was mainly responsible for this misunderstanding about you. However I am glad to know that my impression was erroneous. I myself have little interest in theology, but had to dabble in it a bit in order to meet the Ahmadis on their own ground. I assure you that my paper was written with the best of intentions for Islam and India. I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India.

I was extremely sorry to miss the opportunity of meeting you in Lahore. I was very ill in those days and could not leave my rooms. For the last two years I have been living a life practically of retirement on account of continued illness. Do let me know when you come to the Punjab next. Did you receive my letter regarding your proposed Union for Civil Liberties? As you do not acknowledge it in your letter I fear it never reached you.

*Reproduced from Jawaharlal Nehru, *A Bunch of Old Letters* (London, 1960), pp. 187-88, (Ed.)

اس خط کا ترجمہ ممتاز صحافی اقبال احمد صدیقی نے کیا ہے جو دراصل لطیف احمد شیروانی کی کتاب Speeches, Writings and Statements of Iqbal کے اردو ترجمے علامہ اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات کی صورت میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے 1990ء میں شائع کیا ہے۔ اس خط کی بھی نقل یہاں دی جارہی ہے، جو اس کتاب کے ص 269 اور 270 پر موجود ہے۔

احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب

"21 جون 1936ء

آپ کے مکتوب کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ جب میں نے آپ کے مضامین کا جواب دیا میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ درحقیقت میرے جواب لکھنے کا بڑا سبب یہ دکھانا تھا، بالخصوص آپ کو کہ کس طرح مسلمانوں کی وفاداری کی ابتداء ہوئی اور اس نے کس طرح احمدیت میں الہام کی اساس حاصل کی۔ میرے مقالے کی اشاعت کے بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اُن تاریخی وجوہ کا کچھ علم نہیں جنھوں نے احمدیت کی تعلیمات کو تشکیل دیا۔ مزید برآں آپ کے مداح پنجاب میں اور دیگر مقامات پر آپ کے مضامین سے پریشان ہو گئے کیونکہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ شاید آپ کو تحریکِ احمدیہ سے ہمدردی ہے۔ احمدی پریس بڑی حد تک آپ کے بارے میں اس غلط فہمی کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ تاہم یہ معلوم کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے بارے میں میرا تاثر غلط تھا۔ مجھے خود دینیات میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لیے لینا پڑا تا کہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے آپ سے لاہور میں نہ مل سکنے کا بے حد افسوس ہے۔ میں ان دنوں میں بہت بیمار تھا اور اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ گذشتہ دو برس سے مسلسل علالت کے باعث عملاً میں فارغ شدہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آئندہ جب آپ پنجاب تشریف لائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ آپ کی شہری آزادیوں کی مجوزہ یونین کے بارے میں آپ کو میرا خط ملا؟ چونکہ آپ نے

اپنے خط میں اس کی وصولیابی کی کوئی اطلاع نہیں دی، خدشہ ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔''

فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہونے والی کتاب A Bunch of Old Letters کا ترجمہ ہے جو ملک اشفاق نے کیا ہے اور لطیف احمد شیروانی نے بھی اسی پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب سے یہ خط لیا ہے تو دونوں میں عبارت کا اس قدر تضاد کیوں ہے، اس کا جواب اشفاق ملک اور فکشن ہاؤس لاہور کو دینا پڑے گا۔ ملک اشفاق کون ہے اور فکشن ہاؤس لاہور والے کون ہیں؟ انھوں نے اس خط میں بددیانتی کی حد تک تحریف کیوں کی ہے؟ جبکہ جدوجہد آزادی پر ایک نظر اور علامہ اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات ایک ہی سال میں شائع ہوئی ہیں۔ تاہم لطیف احمد شیروانی کی کتاب 1944ء، 1948ء، 1977ء سے مسلسل شائع ہو رہی ہے اور اقبال اکادمی پاکستان نے اس کا نیا ایڈیشن 1995ء میں شائع کیا ہے۔ اس لیے فکشن ہاؤس والے اور اشفاق ملک یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔ قرائن کہتے ہیں کہ اشفاق ملک نے اس خط کا ابتدائی حصہ اور آخری حصہ لے لیا ہے اور باقی حصہ چھوڑ کر جان بوجھ کر تحریف کر کے اسے اپنے یا قادیانی مسلک کے مطابق کر دیا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے جبکہ علامہ کی عبارت میں یہ تحریف اخلاقی اور قانونی طور پر جرم ہے۔ اشفاق احمد ترجمہ کرتے ہیں:

''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں، نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔''

جبکہ اقبال اس خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لیے لینا پڑا کہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند کے غدار ہیں۔''

قادیانی، اقبال کی تحریروں اور خطوط کو کس بدنیتی اور بددیانتی سے توڑ مروڑ رہے ہیں اس کی مثال اقبال نامے کا ایک اور خط بھی ہے۔ اقبال نامہ کے ایک ہی ایڈیشن میں دو مختلف عبارتوں میں اقبال کا ایک خط شائع کیا گیا ہے، جو علامہ اقبال نے 10 جون 1937ء کو سر راس

مسعود کے نام اپنے بچوں کے گارڈین کے حوالے سے لکھا۔اس خط کی عبارت میں بھی شرم ناک تحریف کی گئی اوراس خط سے علامہ اقبال کے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کے قادیانی ہونے کی بنا پر گارڈین شپ سے محرومی کا سبب ہٹا کراس کی عیال داری اورلاہور سے باہر رہنے کو جواز بنا دیا گیا ہے۔ایک ہی ایڈیشن کی دو مختلف عبارتوں کوکس کے ایما پر تبدیل کیا گیا ہے، یہ کوئی سر بستہ راز نہیں۔ یہ تفصیل اقبالیات مجلّہ اقبال اکادمی پاکستان اور بمبئے کے رسالے ’’شاعر‘‘ کے اقبال نمبر میں پوری طرح میرے مضمون ’’قصہ ایک خط کا......‘‘ میں مل جائے گی۔ پھر یہ کتر بیونت بھی اصل خط کے مطابق نہیں۔اصل خط میں نہ صرف تحریف کی گئی بلکہ اقبال کے قادیانی بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے چیلنج کیا کہ یہ خط کہیں موجود نہیں۔ ہم نے سر راس مسعود کے پرائیویٹ سیکرٹری مرحوم سیّد ممنون حسن خان اورڈاکٹر اخلاق اثر سے بھوپال میں رابطہ کیا تو ڈاکٹر اخلاق اثر کی کتاب اقبال نامہ سے یہ خط مل گیا جوہم ذیل میں دے رہے ہیں مگر پہلے شیخ عطااللہ کے اقبال نامے کے خطوط کا عکس ملاحظہ کریں۔

لاہور 10 جون 1937ء — خط نمبر 2

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسب ذیل ہیں:

(1) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (2) چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔ (3) شیخ اعجاز احمد بی۔ اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔ (4) عبدالغنی مرحوم۔

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

لاہور 10 جون 1937ء — خط نمبر 1

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسب ذیل ہیں:

(1) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (2) چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔ (3) شیخ اعجاز احمد بی۔ اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔ (4) عبدالغنی مرحوم۔

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (3) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے، دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

لاہور
۱۰ جون ۱۹۳۵ء

ڈیئر مسعود - پرسوں حج بیت اللہ سے آپکا خط ملا تھا۔
امید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔ اس خط میں آپ نے بہت کچھ لکھنا تھا مگر شکایت لکھا - جواب لکھتا ہوں۔
مرشد مادیہ نواز سینئر کی چار
سٹوریج تھی۔ ۔ دونوں صفحے سٹوریج کی گئی ہے۔ جو سب محفوظ
ہو جاتے ہیں۔ دونوں میں محفوظ ہے۔ تمام ادویات حسب ذیل ہیں۔
(۱) شیخ محمد اکرام - یہ پہلا کھلاڑی ہیں۔ جو قریباً ہمیشہ سیل کھیلتے
تھے۔ مگر اب اکثر امراض میں حاصل اثر نہ ہوتے۔ (۲) جو صحت کی حالت اچھی تھی۔ ہر ہفتہ
بارسی بیان سول سکیم نہ صحت للہ۔ یہ بھی ہے خیر مقدم نہیں۔ تھر بنایا مخلص مسلمان
(۳) شیخ اعجاز احمد کی آخری اطلاع یہ ہے کہ ٹھیک ہیں۔ (۴) عبدالغنی مرزا - جو الف
پیچیدہ ہو رہی ہے کہ تہ تک الجھ گئے۔ اس کا علاج فائدہ - میاں امیر الدین صاحب کی خبر ارسال
وہ شہر کر کے ملاقات کی۔ مگر (۵) شیخ اعجاز احمد بڑا مخلص ہے۔ نماز تیسرے مالی آدمی
انگریزی اور دینی عقائد کو رواج دیا ہے۔ مگر مسلم ہے۔ اور قادیانی بیوی کا معتقد ہے کہ
حالات تمام مسلمان کا ذکر تھی۔ اس لیے پیغمبر کا منشاء ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنا
بہتر نہیں وہ کتنا ہے یا اپنی اس کا عقیدہ وہ بھی
خیال دار ہو۔ تمام لوگ محبت سے بار رہتا ہے۔ جب یہ بات ہو، کہ اسکی جگہ تم کو
مقرر کر دوں - مجھے امید ہے کہ بشیر کا اثر زیادہ اور اسکی مرضی پر ہوگا۔ یہ درست ہے۔
تم لوگوں سے بہت قریب ہو۔ لیکن اگر خبر کی معاملہ ایسا ہوا۔ تو لوگوں میں رہنا
بنا بجنا ہوتا ہے اور کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے
میرا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیکن مسعود منزل کو جانا ہو گا
دیکھا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ فرصت ملنے پر آرام کر لیں گے جس کو
اس کا بہت سفر ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں
ہے تو دوسرا سیال صورت میں۔ سو اس کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمہیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے یہ Guardian ازلائے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

۲۔ چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

۳۔ شیخ اعجاز احمد بی۔ اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

۴۔ عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (۳) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا

آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے
علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے
میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کردوں۔ مجھے
امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور
سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا۔ تو لاہور میں رہنے والے
گارڈین تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت
ہے لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے
ناسعہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا
کہتے ہیں کہ کولوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے یہ ایک تو مرہم
کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت ہے۔ مؤخر الذکر کے
استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

(۲۲۹) ——— (۲۴۲)

خط نمبر ۲

لاہور
۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians اندراج وصیت مقرر کئے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکریٹریٹ۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے، ایل ایل بی، سب جج دہلی۔ (۴) عبدالغنی مرحوم

عبدالغنی بیچارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا پڑا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ مؤخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے

والسلام

محمد اقبال

(۲۲۹) ——— (۲۴۲)

خط نمبر ۱

لاہور
۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians اندراج وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکریٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے، ایل ایل بی، سب جج دہلی۔ (۴) عبدالغنی مرحوم

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے۔ لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ مؤخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔ والسلام

محمد اقبال

اقبال نامہ کے ص 386، 387 کے ایک ہی ایڈیشن میں یہ دونوں خط موجود ہیں۔ خط نمبر 1 پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا۔ مگر کسی کے توجہ دلانے پر یا گرفت پر اس کو فوری طور پر تبدیل کر دیا گیا مگر چند نسخے فروخت ہو چکے تھے، لہٰذا یہ تحریف ایک ثبوت چھوڑ گئی جس طرح فکشن ہاؤس کی کتاب جدوجہد آزادی پر ایک نظر کے ایک ہی ایڈیشن کے ابتدائی فروخت ہونے والے نسخوں اور فوری طور پر چیپی والے نسخوں میں فرق ہے۔ اقبال نامہ کی طرح انھوں نے بھی محض چیپی لگائی ہے، پورا خط پھر بھی شائع نہیں کیا۔ دونوں کا طریقہ واردات ایک جیسا ہے دونوں کی بدنیتی ایک ہی طرز پر ظاہر ہوئی ہے۔ اوپر ملاحظہ کریں۔ اقبال نامہ حصہ اوّل میں شائع ہونے والا خط نمبر 1 اور نمبر 2 اور دونوں کی عبارت میں تضاد کو نوٹ کریں اور نیچے دیا ہوا اقبال کا اصل خط بھی دیکھئے۔ جس کے بارے میں اعجاز احمد نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ دستیاب نہیں۔

لاہور

10 جون 1937ء

جب ہم نے یہ خط شائع کیا تو شیخ اعجاز احمد قادیانی کی تو سٹی گم ہوگئی اور انھوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا مگر بعد میں اقبال اور تحریک احمدیت کے قادیانی مشنری اور مصنف شیخ عبدالماجد نے تحریر کے ایک قادیانی ایکسپرٹ کے ذریعے انکشاف کیا کہ یہ خط اقبال کا نہیں حالانکہ یہ بھوپال سے شائع شدہ کتاب سے لیا گیا تھا جہاں کہ اقبال سر راس مسعود کو خط لکھا کرتے تھے۔ یہ خط اپنے موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے بھی اور سیاق وسباق کے حوالے سے بھی درست تھا۔ اس خط میں شیخ اعجاز احمد قادیانی کو جاوید اقبال اور منیرہ کی گارڈین شپ سے اس لیے ہٹایا گیا کیونکہ بھتیجا، نہایت صالح آدمی ہونے کے باوجود ''افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے، تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں، اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں؟'' اقبال نامہ سے یہ عبارت حذف کر دی گئی۔ ملاحظہ کیجیے یہ خط اور پھر اوپر دیئے گئے اقبال نامہ جلد اوّل کے دونوں خطوں سے اس کا موازنہ کریں:

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات

لکھنا بھول گیا جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسبِ ذیل ہیں۔

(1) شیخ طاہرالدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(2) چودھری محمد حسین ایم۔اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

(3) شیخ اعجاز احمد بی۔اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

(4) عبدالغنی مرحوم۔

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (3) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں، اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کرسکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہوگیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے، دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اقبال کے ان خطوں میں بار بار تحریف کیوں کی جاتی ہے اس لیے کہ ان میں قادیانیوں کے بارے میں اقبال کی آراء بڑی واضح ہیں کہ قادیانی مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ''میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندو دونوں کے غدار ہیں۔'' پنڈت نہرو اور سر راس مسعود کے نام دونوں خطوط سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی لیے ان خطوط میں قادیانی یا قادیانیوں کے ایما پر کتر بیونت کی جاتی ہے۔ اقبال نامہ میں تحریف چونکہ چودھری محمد حسین نے کرائی تھی، لہٰذا یہ امر اب مشتبہ اور تحقیق طلب ہے کہ چودھری محمد حسین کے اپنے عقائد کیا تھے، انھیں قادیانیوں سے اتنی ہمدردی کیوں تھی یا وہ کسی مجبوری کے تحت قادیانیوں کے دباؤ میں تھے۔ عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال میں اقبال اور خاندان اقبال کو قادیانی بنایا۔ اسی طرح کا کام چودھری محمد حسین نے کیا۔ شیخ اعجاز احمد کے بارے میں اقبال کے ردعمل کو چھپایا اور وہ خط ہی بدلوا دیا جس میں اقبال نے قادیانی عقائد کی بنا پر اسے جاوید اقبال کی گارڈین شپ سے محروم کیا تھا۔

قادیانی دوسری بات یہ مشہور کرتے ہیں کہ علامہ اقبال شروع میں قادیانیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ بالخصوص اعجاز احمد قادیانی نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں یہی دعویٰ کیا ہے۔

قادیانیوں کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ علامہ اقبال 1935ء میں احراریوں کی ترغیب پر ان کے خلاف ہوئے جبکہ ان کی تحریریں ثابت کرتی ہیں کہ علامہ اقبال نے 1902ء کے بعد تواتر کے ساتھ قادیانیت کی مخالفت کی۔ ذیل میں ہم اقبال کے قادیانیت کی مخالفت کے ثبوت سن وار پیش کرتے ہیں۔

1902ء: علامہ اقبال نے 1902ء میں سب سے پہلے قادیانیت پر وار کیا۔ 1902ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں انھوں نے مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کو جھٹلاتے ہوئے کہا کہ:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نور شمع عرفان کردہ ای

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی مرتبہ کتاب ''سرودِ رفتہ'' میں ص 30 پر ایک نوٹ لکھا ہے کہ:

''یہ 1902ء کا کلام ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کی ضرورت مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ بروزیت کی بنا پر ہوئی یعنی کہتے ہیں کہ تیرے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک

فی النبوت ہے خواہ اس کا مفہوم کوئی بھی ہو یعنی ظلی اور بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔‘‘

1902ء مئی میں مخزن لاہور اور **11** جون **1902**ء کو محمد دین فوق کے رسالہ ’’پنجۂ فولاذ‘‘ میں قادیانی مذہب کے نتائج کا تجزیہ یوں کیا۔ یادر ہے کہ یہ قادیانیوں کی طرف سے بیعت کے جواب میں شعر لکھے۔

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

(باقیات ص113)

یادر ہے کہ مرزا قادیانی اپنے مخالفین کے لیے موت کی پیش گوئیاں کرتا رہتا تھا۔

1903ء: انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں ’’فریادِ امت‘‘ کے نام سے اقبال نے مارچ **1903**ء میں ایک نظم پڑھی جس کا دوسرا عنوان ’’ابرِ گہر بار‘‘ تھا، اس میں انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا ترا

اقبال نے اس شعر کے ذریعے مرزا قادیانی کے اس دعویٰ کو رد کر دیا کہ وہ مثیلِ مسیح یا مثیلِ محمد ﷺ ہیں۔

1911ء: اقبال نے اپنے ایک مقالے ’’ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر‘‘ میں قادیانیوں کو قادیانیوں کی داڑھی اور وضع قطع کے لحاظ سے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ کہنے کے ساتھ ساتھ انھیں ’’نام نہاد قادیانی فرقہ‘‘ کہا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس مقالے کے ترجمہ میں **So-Called** نام نہاد یا غلط طور پر منسوب کیا گیا کے الفاظ غلطی سے چھوڑ دیے جس کو قادیانیوں نے اپنے حق میں استعمال کیا کہ اقبال ہمیں ٹھیٹھ اسلامی سیرت والا فرقہ سمجھتے تھے

حالانکہ اقبال انھیں غلط طور پر منسوب کیا گیا یا نام نہاد ٹھیٹھ اسلامی سیرت والا فرقہ لکھتے ہیں، جو بظاہر تو اسلامی سیرت وکردار کا ٹھیٹھ نمونہ نظر آتا ہے مگر بباطن کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اگر آپ اصل انگریزی مضمون کو دیکھنے کی زحمت کریں تو آپ پر یہ غلطی واضح ہو جائے گی۔

1914ء میں اقبال نے لکھا کہ

''قادیانی جماعت نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت کی قائل ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔''

1915ء: ''رموزِ بے خودی'' 1915ء میں شائع ہوئی۔ اقبال نے اپنے عقیدۂ ختم نبوت کا واشگاف اعلان کیا۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
لا نبی بعدی ز احسان خداست
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست

1916ء: اقبال نے 1916ء میں ایک بیان میں کہا:

❑ ''جو شخص نبی اکرم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم بہ کفر ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔'' (اقبال اور احمدیت از بشیر احمد ڈار ص 17)

1933ء: اقبال نے کشمیر میں قادیانیوں کی سازشوں کے بارے میں بیان دیا کہ:

❑ ''آخر میں مَیں مسلمانانِ کشمیر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو اُن کے خلاف کام کر رہی ہیں اور اپنے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کریں۔''

(اقبال نامہ جلد اوّل 6 جون 1933ء)

20 جون 1933ء کو اقبال نے کشمیر میں قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں اور کشمیر کو قادیانی

ریاست بنانے کی سازش کے پیش نظر کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ 2 اکتوبر 1933ء کو اقبال نے قادیانی اہلِ قلم ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی سازشوں کے خلاف بیان دیا اور کشمیر کمیٹی کے عہدۂ صدارت کی پیش کش کو فریب قرار دیا اور کہا کہ:

❑ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کسی ایسی تحریک میں شامل ہوسکتا ہے جس کا مقصد غیر فرقہ واری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پراپیگنڈا کرنا ہے۔'' (حرفِ اقبال ص 204)

1934ء: 9 فروری 1934ء کو نعیم الحق وکیل پٹنہ کو لکھتے ہیں:

❑ ''جس مقدمے کی پیروی کے لیے میں نے آپ سے درخواست کی تھی، اس کی پیروی چودھری ظفر اللہ کریں گے...... چودھری ظفر اللہ خان کیونکر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں، مجھے معلوم نہیں۔ شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں۔'' (اقبال نامہ جلد اوّل ص 435)

1935ء: اقبال نے اپنی کتاب ''ضربِ کلیم'' میں اپنی نظم ''جہاد'' میں قادیانیوں کے جہاد کے بارے میں تصورات پر تنقید کی:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

یہاں ''شیخِ کلیسا نواز'' سے مراد مرزا قادیانی ہے۔ ایک دوسری نظم نبوت میں لکھتے ہیں:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

ایک نظم امامت میں لکھتے ہیں:

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

انگریز کی چاکری پر قادیانیوں کے خلاف لکھتے ہیں:

ہو اگر قوت، فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم الٰہی

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

1936ء: 7 اگست 1936ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے......''

پس چہ باید کرد 1936ء میں شائع ہوئی۔ اقبال لکھتے ہیں:

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید
شیخ او لرد فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقام بایزید
گفت دیں را رونق ز محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولت اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

غلام احمد قادیانی انگریز کو اپنے لیے رحمت کہا کرتا تھا اور اس کی غلامی کو اپنے لیے تائید خداوندی شمار کرتا اور برصغیر کے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی قبول کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔

ضربِ کلیم میں تو جا بجا اقبال نے قادیانیوں کے خلاف مسلسل لکھا۔ ایسے لگتا ہے جیسے ضربِ کلیم پوری کی پوری اس کافر جماعت کے خلاف اقبال کی ضربِ مومن ہے۔

1937ء: 27 مئی 1937ء کو پروفیسر الیاس برنی کی کتاب ''قادیانی مذہب'' موصول ہونے پر اقبال نے لکھا:

❑ ''قادیانی تحریک یا یوں کہیے کہ بانیِ تحریک کا دعویٰ مسئلۂ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ بروز کی تحقیق تاریخی لحاظ سے از بس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیّل اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ میری ناقص رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کر دے گی۔''

ہماری اس تحریر سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اقبال نے کسی اضطراری کیفیت میں قادیانیوں کے خلاف مہم جوئی نہیں کی تھی بلکہ ایک پورے تسلسل اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ 1902ء سے اپنی وفات تک قادیانیت کا تعاقب کیا اور ان کے اصل مقاصد، دینی حیثیت اور سیاسی عزائم کو واضح کرتے رہے۔ یہی نہیں اقبال نے قادیانیوں کو خارج از اسلام اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا تا کہ وہ مسلم لیگ کی صفوں میں گھس کر پاکستان کی تحریک کو سبوتاژ نہ کر سکیں اور خدا کا شکر ہے کہ اقبال کی تحریک پر ہی پاکستان میں آئینی طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ اقبال سے اسی دکھ کی وجہ سے قادیانی اقبال کے خلاف مہم جوئی کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں جس کی دو مثالیں اوپر بیان کر دی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ خود اقبال کو قادیانیوں کا دشمن تصور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید عشرت

کیا اقبال احمدی تھے؟

حال ہی میں شیخ عبدالماجد کی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' شائع ہوئی ہے جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''زندہ رود'' پر تبصرہ کرتے ہوئے قادیانیوں نے پھر ایک بار اپنا یہ موقف دہرانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال اور ان کا خاندان قادیانی تھا۔ قادیانی اقبال سے یہ تمسخر کیوں کرتے ہیں جبکہ اقبال اور ان کے خاندان کے افراد اور متعدد دانشور اس بات کی بار بار تردید کر چکے ہیں کہ اقبال کے ایک بھتیجے شیخ اعجاز کے سوا خاندانِ اقبال میں کبھی کوئی قادیانی تھا، نہ رہا اور نہ ہوگا کیونکہ شیخ اعجاز کی اپنی اولاد بھی قادیانیت سے تائب ہو چکی ہے۔ شیخ اعجاز نے چودھری ظفراللہ کی طرف سے سب ججی کے لالچ میں آ کر قادیانی بن کر اپنے خاندان کو مرزا قادیانی کے پیچھے رسوا کیا۔ اقبال، اُن کے بھائی، ان کے والد اور دوسرے عزیز و اقارب کے بارے میں قادیانیت کا الزام جھوٹ کا پلندہ اور قادیانیوں کا دجل و فریب ہے جو پاکستان میں خود کو معتبر، مظلوم اور طاقتور بنانے کے لیے وہ کرتے ہیں۔ اور علامہ اقبال نے چونکہ انھیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کی تحریک چلائی، لہٰذا یہ ان کے خلاف انتقاماً وقتاً فوقتاً تشہیری مہم چلاتے ہیں تاکہ اقبال کے بارے میں لوگوں، ان کے عقیدت مندوں اور نظریۂ پاکستان کے حامیوں کے دل گندہ کیے جائیں مگر ہم بھی خدا کے فضل سے ہر بار ان کے فریب اور مکر و ریا کا پردہ چاک کرنے کے لیے زندہ ہیں اور ہمارے بعد بھی لوگ قادیانیوں کی کاذب نبوت اور جھوٹے پیغمبر کا اصلی روپ لوگوں کو دکھاتے رہیں گے اور یہ شخص جس نے بقول اقبال ''شرک فی النبوت'' کیا اور اپنے ماننے والوں کے لیے دوزخ کی آگ خریدی، کا چہرہ بے نقاب کرتے رہیں گے۔

شیخ عبدالماجد کی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' سے قبل شیخ اعجاز احمد (اقبال کے قادیانی بھتیجے) کی کتاب ''مظلوم اقبال'' شائع ہوئی جس پر راقم نے ''اقبالیات'' میں دو اقساط میں تبصرہ

کیا اور جو بمبئی کے ماہنامہ ''شاعر'' کے اقبال نمبر میں بھی شائع ہوا۔ ان تبصروں میں، میں نے شیخ اعجاز کے اس جھوٹ کو بے نقاب کر دیا کہ

1- اقبال نے انھیں اپنے بچوں کے گارڈین ہونے سے نہیں ہٹایا تھا۔ میں نے وہ خط شائع کر دیا جو علامہ نے سر راس مسعود کو لکھا تھا خود علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط۔ اس خط کو اقبالنامہ سے غائب کرنے اور توڑنے مروڑنے کی سعی قادیانیوں کے ایماء پر کی گئی اور ظفر اللہ کے کہنے اور دباؤ پر چودھری محمد حسین نے ایسا کیا۔ اس خط سے شیخ اعجاز کی کتاب ''مظلوم اقبال'' کا یہ موقف جھوٹ کا پلندہ بن گیا کہ اقبال آخری وقت تک انھیں عزیز رکھتے تھے، حالانکہ صالح آدمی سمجھنے کے باوجود اقبال نے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز کو اپنے بچوں کے گارڈین بنانے سے احتراز کیا۔

2- اس تبصرہ میں یہ بات میں نے کھل کر لکھی کہ اقبال **1901**ء سے ہی غلام احمد قادیانی کو کاذب نبی تصور کرتے تھے اور اس نبوت کے دعویٰ کو شرک فی النبوت تصور کرتے تھے۔ **1902**ء میں اقبال نے لکھا:

اے کہ بعد از نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفان کردۂ

1902ء کے ''مخزن'' اور محمد دین فوق کے ''پنجۂ فولاد'' میں اقبال نے مندرجہ ذیل نظم شائع کرائی جو مرزا قادیانی کے بیعت کے جواب میں تھی۔ یہ قادیانی مذہب کا تجزیہ بھی تھا:

تو جدائی پر جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

مرزا قادیان نے جس طرح خاندانوں میں نفرت کا بیج بویا اور دوسروں کے لیے موت کی پیش گوئیاں کیں، اقبال نے اس کو غیر پیغمبرانہ فعل بتایا اور کہا کہ میں تو محبت اور صلح و امن کا داعی

ہوں۔تمہاری نفرت بونے والی نبوت پر لعنت بھیجتا ہوں۔

3- 1914ء میں اقبال نے قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیا۔فرمایا ’’جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی نبی کا قائل ہے جس کا انکار مستلزمِ کفر ہو، وہ خارج از اسلام ہو گا۔اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔‘‘

’’اقبال نے 1914ء میں ہی قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دے دیا تھا حالانکہ مرزا غلام احمد قادیانی جھوٹے ہونے کی وجہ سے ساری عمر پینترے بدلتے رہے، کبھی خود کو مصلح کبھی مسیحِ موعود، کبھی مہدی، کبھی ظلی نبی اور کبھی بروزی نبی کہتا رہا تاکہ کھل کر دعویٰ نبوت کرنے کی وجہ سے مسلمان کہیں اسے کیفرِ کردار تک نہ پہنچا دیں۔خود حکیم نور الدین نے مرزا قادیانی کو نبوت کے واضح دعویٰ سے باز رکھا اور اپنے خلافت کے عہد میں اسے نبی تسلیم نہ کیا۔غلام احمد قادیانی کی نبوت مشتہر کرنے اور منوانے کا گندا کام اس کے بیٹے بشیر الدین محمود نے کیا۔لہٰذا بہت سے معصوم مسلمان جو اسے مصلح سمجھنے کی وجہ سے اس کے چنگل میں پھنس گئے تھے، اسے مجبوراً نبی ماننے لگے۔اور یوں یہ عفریت مسلمانوں میں پھیل گیا۔

4- 1935ء میں اقبال نے قادیانیوں کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر کے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ اس لیے کیا کہ اقبال نے دیکھا کہ قادیانی مسلمانوں کی نشستوں پر انگریز اور ہندو کی آشیر باد سے قبضہ کر رہے ہیں۔خود پریوی کونسل میں اقبال کے استحقاق پر ہندو اور انگریز کے تعاون سے ظفر اللہ نے قبضہ کر لیا۔1935ء کے دستور کے تحت ہونے والے انتخابات میں ہندو اور انگریز کی سازش سے خدشہ تھا کہ اسمبلیوں میں قادیانی مسلم نشستوں پر پہنچ کر مسلمانوں کے الگ وطن کی تحریک کو سبوتاژ کر کے مسلمانوں کو ہندو کی غلامی میں دے دیں گے۔ پھر قادیانیوں نے کشمیر، پنجاب اور بلوچستان کو قادیانی صوبہ اور مرکز بنانے کی درپردہ سازشیں کیں۔سر فضل حسین کے ساتھ مل کر ظفر اللہ جمہور مسلمانوں کے خلاف جو سازش کر رہا تھا، اقبال اس کے عینی شاہد تھے۔کشمیر کمیٹی میں بھی بشیر الدین محمود ہندو اور انگریز کا جاسوس تھا۔لہٰذا اقبال نے قادیانیوں کی ان سازشوں کے مشاہدے کے بعد ہی انھیں مسلمانوں کے لیے مذہبی اور سیاسی ہر دو لحاظ سے خطرناک قرار دے کر ان کو الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

5- خاندانِ اقبال کے قادیانی ہونے کے بارے میں جتنی بھی گواہیاں آج تک فراہم کی گئی ہیں اور جو بھی عدالتوں میں یا مختلف کتابوں میں تحریریں ہیں، ان کے تمام کے تمام راوی یکسر قادیانی ہیں۔ شیخ اعجاز، بشیر الدین محمود، شیخ عبدالماجد، روزنامہ الفضل، مولانا شیخ عبدالقادر، خواجہ نذیر احمد، خواجہ کمال الدین، مولوی محمد علی اور بعض دوسرے لوگ جو اقبال کو قادیانی بنانے پر تُلے ہوئے ہیں، سب کے سب قادیانی ہیں، لہٰذا اقبال کے قادیانی ہونے کی ان کی گواہی غیر معتبر، یک طرفہ اور تعصب پر مبنی ہے اور ان کی گواہی کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

6- اقبال کے اعزاء ڈاکٹر جاوید اقبال، خالد نظیر صوفی صاحبِ ''اقبال درونِ خانہ'' جو عطا محمد کے داماد اور شیخ اعجاز کے بہنوئی ہیں اور خود مولوی سکندر جنھوں نے اقبال کے عزیزوں کے جنازے پڑھائے اور سیالکوٹ کا سنی قبرستان جہاں یہ لوگ دفن ہیں، اس بات کی شہادت ہیں کہ وہ سب سنی تھے، غیر قادیانی تھے، اور مسلمان ہونے کے ناطے مسلمانوں کی طرح ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، مسلم قبرستان میں دفن ہوئے۔ شیخ اعجاز کے قادیانی ہونے کی وجہ سے بعض نے نماز جنازہ میں شرکت نہ کی اور بعض نے جنازے اپنے طور پر الگ پڑھے۔ شیخ عطا محمد کے داماد اور شیخ اعجاز کے بہنوئی خالد نظیر صوفی اپنی کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' میں لکھتے ہیں:

❑ ''یہ کہنا کہ علامہ کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہ کے والد، والدہ، چچا، چچی، بہن بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں سوائے ایک بھتیجے کے جو جج میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں ''اکلوتا'' قادیانی بن گیا۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

❑ ''علامہ کے برادرِ بزرگ 12 دسمبر 1940ء کو فوت ہوئے۔ ان کا جنازہ حسبِ وصیت سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ یہ وصیت انھوں نے دوران بیماری مجھے کی تھی...... ان کی نمازِ جنازہ بھی حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم امام مسجد جہانگیری نے پڑھائی اور وہ حضرت امام صاحب سے ملحقہ قبرستان میں سالوں پہلے خود بنائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔''

شیخ اعجاز کی والدہ اور اپنی ساس کے بارے میں لکھتے ہیں:

❑ ’’علامہ کے اس اکلوتے قادیانی بھتیجے نے حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم کے پیچھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی والدہ کا جنازہ پڑھا۔ وہ اپنے والد مرحوم و مغفور کے جنازہ پر مسلمانوں سے علیحدہ کھڑے رہنے کا تلخ تجربہ کر چکے تھے۔اس لیے قادیانی مسلک کو دہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔‘‘

لطف کی بات تو یہ ہے کہ شیخ اعجاز کی اولاد کا بھی قادیانیت سے کوئی تعلق نہیں، وہ بھی سنی مسلمان ہیں۔

-7 اصل بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی شروع میں سیالکوٹ کی عدالت میں منشی تھا اور عرائض نویسی کا کام کرتا تھا۔ وہاں سے اسے تبلیغِ اسلام کا شوق ہوا اور اس نے اسلام اور عیسائیت کا مطالعہ کیا اور عیسائیوں کے خلاف مناظرے کرنے لگا کیونکہ ہندوؤں اور عیسائیوں نے مسلمانوں کو شدھی کرنے اور عیسائی بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ عیسائیوں کے خلاف مناظروں میں اسے کامیابیاں ہوئیں اور لوگ اسے پسند کرنے لگے، اس طرح اس کے گرد عقیدت مندوں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا۔ عیسائیوں کے خلاف کامیابیوں اور عقیدت مندوں کی تعریفوں نے اس کا دماغ خراب کر دیا اور وہ خود کو مافوق البشر کوئی چیز سمجھنے لگا۔عیسائیوں کے خلاف مناظروں میں کامیابیوں سے ہی اس کے تعلقات مولوی میر حسن اور خاندانِ اقبال سے قائم ہوئے اور وہ لوگ اسے ایک نیک اور مصلح سمجھنے لگے۔تاہم جونہی اس نے مہدی، مسیحِ موعود اور نبوت کے دعوے شروع کیے،لوگ اس کے کفر و ضلالت اور گمراہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

-8 اقبال نے ان کے نماز پڑھنے، داڑھی رکھنے اور اسلامی اصولوں پر بظاہر عمل کی وجہ سے انھیں ’’ٹھیٹھ اسلامی سیرت‘‘ کا حامل کہا مگر جب انھوں نے دیکھا کہ اسلامی سیرت و کردار کے ٹھیٹھ پن کے پردے میں یہ شاتمِ رسول ﷺ اور گستاخِ رسول ﷺ امتِ مسلمہ میں نفاق کا بیج بونے والے اور ختم نبوت کے حوالے سے شرک فی النبوت کرنے والے یہودیوں، ہندوؤں اور انگریز کے یہ ٹوڈی ہیں، جہاد کے خلاف ہیں اور ملتِ

اسلامیہ کے خلاف سازش کرنے والے ہیں تو انھوں نے انھیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کا مطالبہ کیا کیونکہ یہ 1935ء کی دستوری اور آئینی اقدامات کے بعد مسلمانوں کے نام پر تحریکِ پاکستان اور مسلمانوں کی آزادی کو سبوتاژ کرنے کی سازش میں مصروف تھے۔ پنڈت نہرو کی طرف سے قادیانیوں کی وکالت بھی اس کا ثبوت تھی۔ اقبال کو جب ان کی چند ماضی کی تحریروں کا حوالہ دیا گیا تو اقبال نے واضح طور پر کہا کہ اگر ان کو درست بھی مان لیا جائے تو بھی مجھے نئے حقائق کی روشنی میں نئے نظریات اور رویے اپنانے کا حق ہے۔ اقبال نے لکھا:

❑ ''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر انگریزی میں محفوظ اور نہ اس کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم جو مسلمانوں میں کافی سر برآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کرتے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ ''براہینِ احمدیہ'' میں انھوں نے بیش قیمت مدد پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیے۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر کے شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستے پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''

اقبال کی یہ تحریر واضح کرتی ہے کہ وہ تبلیغِ دین کے حوالے سے مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک کو شروع میں پسند کرتے تھے مگر جب یہ گستاخِ رسول ﷺ ہوئی اور اس کے ختم نبوت کے

عقیدے میں نقب لگائی، حضور ﷺ کی شان میں بدتمیزی کا ذریعہ بنی اور مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور مسلمانوں کو کافر کہنے لگا تو اقبال نے اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کی تحریک پیش کی اور انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اقبال یا اس کا خاندان قادیانی ہو تو بھی یہ کب حجت ہے کہ انھیں دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیا جائے۔ پھر اگر اقبال خود کہتے ہیں کہ وہ بانیِ تحریک کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں تو اب قادیانی کیا ثابت کر کے دائرہ اسلام میں آ سکتے ہیں۔ اقبال کے خاندان کے ذمہ دار افراد جب خاندانِ اقبال اور اقبال کے بارے میں گواہی دیتے ہیں کہ ان کا قادیانیت سے کوئی تعلق نہیں تو چند قادیانیوں کی بار بار کی تکرار انھیں کس طرح قادیانی بنا سکتی ہے۔ یہ فتنہ جب تک ہے پاکستان کے لیے ایک سازش ہے اور مسلمانوں کو قادیانی نبوت کو سمجھ لینا چاہیے کہ اقبال نے یہ بات اپنے ان الفاظ پر ختم کر دی کہ

❑ ''جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو، وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے'' لہٰذا اقبال کے نزدیک قادیانی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔''

(اقبال اور احمدیت از بشیر احمد ڈار ص 17)

شیخ عبدالماجد کی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ اقبال کا قادیانیت سے کوئی تعلق نہیں اور دوسری سانس میں خود ہی قادیانیت سے اقبال کا تعلق گانٹھنے بھی جاتے ہیں۔ اقبال کو قادیانیت کے جال میں پھانسنے سے ان پر ڈورے ڈالنے کے ساتھ ساتھ قادیانیوں نے دوسری حکمت عملی اپنائی ہے۔ ایک طرف وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ملک کے اس نظریہ ساز فلسفی اور علم و حکمت کے سرچشمہ اور عالم اسلام کے حیاتِ نو کے داعی کو کھینچ تان کر قادیانیت سے کسی نہ کسی کمزور تعلق کے واسطے سے ہی سہی، قادیانیت کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ثابت کر دیا جائے۔ چنانچہ اقبال نے خوش عقیدگی سے یا خوش فہمی سے ایک آدھ جملہ اگر اس تحریک کی حمایت میں کہہ دیا یا لکھ دیا ہے تو بس وہ اقبال کے سر ہو گئے ہیں کہ حضور آپ نے فلاں وقت یہ فرمایا تھا۔ اقبال نے فلاں مضمون میں ہمیں ''ٹھیٹھ اسلامی سیرت'' کا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا۔ اقبال کی آپ کے بارے میں یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی، ان سے یہ بھی توقع ہو سکتی تھی

کہ آپ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور آپ جھوٹی نبوت کے حصار سے نکل کر ختم الرسل ﷺ کی غلامی میں آ جائیں گے۔ لاہوری پارٹی کی صورت میں ایک بغاوت ہوئی تھی جنھوں نے بظاہر غلام احمد کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ مصلح مانتے تھے۔ خواجہ کمال الدین اور اقبال کے بعض قادیانی واقف کاروں کا تعلق اسی لاہوری پارٹی سے تھا۔ اقبال بعد میں اس سے بھی بدظن ہو گئے جب انھیں احساس ہوا کہ لاہوری اور قادیانی دونوں ایک ہی کھوٹے سکے کے دو رخ ہیں۔ خواجہ کمال الدین کے بارے میں واقعہ ہے کہ ایک بار علامہ اقبال کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے خواجہ کمال الدین کو کہا کہ سورہ فاتحہ لکھو۔ خواجہ صاحب نے سورہ فاتحہ ایک کاغذ پر خوشخط لکھ دی۔ اقبال نے ان سے یہ کاغذ لے کر کہا سبحان اللہ! کیا کلام ہے۔ پھر اس کاغذ کے دوسری طرف غلام احمد قادیانی کی الہامی خرافات لکھیں اور خواجہ صاحب کو دکھا کر کہا کہ یہ میرے نبی کے خدا کا کلام ہے اور یہ تمھارے نبی کے خدا کا کلام ہے۔ سورہ فاتحہ کے بارے میں سبحان اللہ اور غلام احمد قادیانی کی خرافات کے بارے میں موٹی سی پنجابی میں گالی دے کر کہا کہ کس الو کے پٹھے کے نزدیک یہ الہامی کلام ہو سکتا ہے۔ خواجہ کمال الدین کھسیانے سے ہو کر کہنے لگے ''چھڈو علامہ جی۔ مذاق نہ کرو کوئی ہور گل کرو'' (چھوڑیئے علامہ صاحب مذاق نہ کیجیے کوئی اور بات کیجیے۔) قادیانیت سے اقبال کی نفرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔

شیخ عبدالماجد کو علم ہونا چاہیے کہ اقبال کے کلام میں جو اسلامی رنگ جھلکتا ہے، اس میں اس کے والدین اور اقبال کے اپنے مطالعہ کا عمل دخل تھا۔ اقبال رازی اور غزالی کا بروز قادیانیوں کی تلقین سے نہیں، اپنے علم اور عمل سے بنے ورنہ خود قادیانیوں میں تو یہ بروز اب تک نہیں ہوا۔ اقبال کے بارے میں قادیانی غلط فہمیاں پھیلانے اور بے پر کی اُڑانے میں بڑے مشاق رہے ہیں۔ چنانچہ الحکم اخبار (قادیان) نے محض شرارت سے، بغیر تصدیق اور تحقیق کیے خبر چھاپ دی کہ اقبال نے قادیانی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ حالانکہ الحکم اخبار لاہور سے اور اپنے قادیانی ذرائع سے تصدیق کر سکتا تھا۔ اقبال کو اس سلسلے میں باقاعدہ تردید کرنا پڑی۔ اب شیخ عبدالماجد کے بھولپن کا کیا جواب کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ سینکڑوں معصوم مسلمان لڑکوں کو ملازمتوں اور شادی کا لالچ اور جھانسہ دے کر قادیانی بنانے کا فن قادیانیوں سے زیادہ کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ فلسفے کے معروف استاد قاضی محمد اسلم بھی شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب میں غریب اور معصوم مسلمان طلبا کو

وظائف اور مراعات کے نام پر پھانستے رہے۔ ایسے ہی ایک غریب اور مفلس نوجوان کے قادیانی ہو جانے کا صدمہ مجھے بھی دیکھنا پڑا جو اب سول جج ہے۔ یہ ہتھکنڈہ تو قادیانیوں کا مانا ہوا ہے۔ راحت ملک کی کتاب ''ربوہ کا مذہبی آمر'' کسی نے پڑھی ہو تو وہ بتائے گا کہ ایک قادیانی کا اس جال سے نکلنا کتنا مشکل ہے اور وہ قادیانیت کے جھانسے اور دام میں لانے کے لیے کیا کیا کر گزرتے ہیں؟

شیخ عبدالماجد کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اقبال کو قادیانیوں کے سٹیج سے شہرت ملی۔ جو واقعہ انھوں نے بتایا ہے وہ 1908ء کے بعد یعنی 1910ء کا ہے جبکہ اقبال اپنے انگلستان جانے سے پہلے ہی برصغیر میں ایک فلسفی، شاعر اور دانشور کے طور پر معروف ہو چکے تھے۔ حامد شاہ بھی شیخ اعجاز کی طرح لالچ میں قادیانی ہوا بلکہ خود حامد شاہ کے ایماء اور تحریص پر ہی شیخ اعجاز قادیانی ہوئے اور چوہدری ظفر اللہ خاں کی وساطت سے نوازے گئے۔ اب دو ہی واقعات رہ گئے ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ آفتاب اقبال کو اقبال نے قادیان اس لیے بھیجا تھا کہ اقبال اسے کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخل کرانا چاہتے تھے۔ عیسائی مشنری اداروں سے اقبال کو سخت نفرت تھی اور اسلامی انگریزی مدرسوں میں تعلیم کا معیار اقبال کے خیال میں ناقص تھا۔ قادیان میں تعلیم الاسلام کے نام سے قادیانیوں نے ایک معیاری مدرسہ قائم کیا، چنانچہ اقبال نے اس یقین کے ساتھ کہ آفتاب اقبال پر قادیانیت کا اثر نہیں ہوگا، عمدہ تعلیم کے لیے اسے قادیان بھیجا۔ چنانچہ آفتاب اقبال نے قادیان میں رہ کر بھی قادیانیت کو نہیں اپنایا اور مسلمان رہے۔ لہٰذا قادیان میں بہتر تعلیم کے خیال سے اقبال کا آفتاب اقبال کو داخل کرانا قادیانیوں کے لیے بے حاصل رہا کہ آفتاب اقبال نے باپ سے شاکی ہونے کے باوجود قادیانیت سے نفرت کی۔

اب جہاں تک قادیان سے فتویٰ لینے کا تعلق ہے، وہ بھی غلط ہے۔ اقبال اور بعض بلند پایہ کے مسلمانوں کا یہ خیال رہا ہے کہ قادیانی ہونے کے باوجود حکیم نورالدین فقہ پر گہری نظر رکھنے والا انسان تھا۔ قادیانیت کے حوالے سے اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ اقبال نے حکیم نورالدین کی علمیت پر اعتماد کرتے ہوئے ایک خالص فنی اور فقہی معاملے پر ان سے مشورہ طلب کیا، فتویٰ نہیں مانگا۔ اس ایک واقعے کے سوا اور کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں کہ اقبال نے قادیان سے کبھی مشورہ کیا ہو یا فتویٰ لیا ہو۔ یہ رائے یا مشورہ اقبال نے قادیان سے نہیں بلکہ اپنے اعتماد اور بھروسے کی بناء پر حکیم نورالدین سے لیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی مناسب نہ تھا مگر اس سے قادیانیت پر اقبال کے کسی

یقین، اعتماد اور ایمان کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

شیخ عبدالماجد نے قادیانیوں کی تکنیک اس کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں اختیار کی ہے کہ اقبال کو اگر قادیانی ثابت نہ کرسکو تو ان کے بارے میں اتنا کنفیوژن پھیلا دو کہ لوگ انتشارِ فکر کا شکار ہو جائیں۔ اس سے قبل شیخ اعجاز احمد (اقبال کے قادیانی بھتیجے) ''مظلوم اقبال'' لکھ کر یہ کاوش کر چکے ہیں کہ اقبال قادیانیت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے مگر چونکہ بڑے بھولے تھے لہٰذا احراریوں کے چکر میں آ کر قادیانیوں کے مخالف ہو گئے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ علامہ اقبال بھولے تھے کہ قادیانیت کے چنگل میں نہ آئے اور اپنا دین و ایمان بچا لے گئے یا شیخ اعجاز بھولے ہیں کہ سب جج کے ایک معمولی دنیاوی لالچ میں ایمان بیچ ڈالا اور چہ ارزاں فروخت کر ڈالا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے تدریجی ارتقا اور مسلسل غور و فکر کے بعد ''شرک فی النبوت'' کے مجرم غلام احمد قادیانی اور اس کی تحریک کو رد کیا اور مسلمانوں کو ان کی شر انگیزیوں سے بچانے کے لیے انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا عزم کیا اس لیے کہ قادیانی خود کو مسلمانوں سے الگ سمجھتے تھے۔ اب یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ قادیانی خود تو مسلمانوں کو کافر سمجھیں، ان کی رسوم اور نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہوں مگر چاہیں یہ کہ مسلمان انھیں کافر نہ سمجھیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شیخ عبدالماجد یا کوئی بھی قادیانی اپنے اس کھلے ہوئے متضاد، منافقانہ اور شاطرانہ رویے کا جواز نہیں دے سکتا۔

قادیانیت امتِ مسلمہ کے سینے کا کینسر ہے۔ یہودیت کے مرکز اسرائیل میں ان کے سنٹر کے قیام سے، ہندوؤں سے ان کے گٹھ جوڑ سے اور فرنگ کی اشیرباد کے حصول کا علم رکھنے کے بعد کوئی اندھا ہی ہوگا جو یہ نہ جان سکے کہ اس تنظیم کا سربراہ جو خود عیسائیت کے خلاف ایک مناظر کے طور پر ابھرا اور بعد میں سازش کا شکار ہو کر خود عیسائیت اور ہندومت کے چنگل میں گرفتار ہو گیا اور عیسائیت اور ہندومت نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اسے خود اسلام کے اندر ہی نقب لگانے والا بنا ڈالا اور وہ جو عیسائیوں اور ہندوؤں کو اسلام کی حقانیت کا درس دینے نکلا تھا خود عیسائیوں، ہندوؤں اور یہودیوں کی شطرنج کا مُہرہ بن کر اسلام کے بنیادی عقائد ختم نبوت، جہاد اور وحدتِ امت کا رقیب بن گیا۔ ختم نبوت کا پردہ اس نے اپنی کذابت سے چاک کیا، جہاد کو موقوف قرار دیا، اسلامی عقائد کی تلبیس کی اور امت میں نفاق کا بیج بو کر ایک نئی امت کھڑی کر دی

اور خوش عقیدہ مسلمانوں اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ کیا۔ان کے دین وایمان کا سرقہ کیا۔آج یہ سرطان، کینسر اور ناسور پوری دنیا میں ملتِ اسلامیہ کی رسوائی کا باعث ہے۔اپنے لباس، اپنی صورتوں، اپنے اطوار سے یہ اسلام کا دم بھرتا ہے مگر اپنی روح میں یہ قرآن اور اسلام کی تعلیمات کو جھٹلانے والا ہے۔اور جہاں جہاں قادیانی ہیں وہ استعماریت کے اغراض ومقاصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔مسلمانوں کے غدار اور مرتد ہیں۔ان کے قرآن اور اسلام سے ارتداد کی وجہ سے ہی اقبال نے انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا۔لہٰذا ان قادیانیوں سے تعاون، ان کے افکار کی تشہیر واشاعت اور ممتاز مسلمان زعماء سے ان کی اٹھکیلیوں اور چُہلوں میں کسی کو معاونت نہ کرنی چاہیے کیونکہ اس سے گمراہی کو فروغ ہوتا ہے۔

حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی

علامہ اقبالؒ کے حضور

مارچ 1927ء کا وہ دن میری زندگی کا ایسا دن تھا جس کی یادوں کی چاندنی آج بھی میرے محسوسات کو جگمگائے ہوئے ہے۔ یہ وہ دن تھا جب مجھ ایسے ہیچمدان کو زندگی میں پہلی بار نابغۂ روزگار حکیم الامت علامہ اقبال کے حضور حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ راقم ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملتِ اسلامیہ کے دلوں میں قادیانیوں کے دل آزار و خود ساختہ معتقدات اور ان کی ژاژ خائیوں کے باعث اشتعال و بیزاری کا ایک طوفان برپا تھا اور پورے برعظیم میں نفرت کی فضا تھی۔ پنجاب میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور نے اپنے ایک اجلاس میں جو علامہ اقبالؒ کی صدارت میں ہوا، باضابطہ اعلان کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر انجمن کے اداروں سے الگ کر دیا تھا۔ پنجاب کے بعد علی گڑھ میں بھی طلبہ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور الگ کرنے کا مطالبہ کر رکھا تھا اور اس سلسلے میں مولانا ظفر علی خان اور سیّد عطا اللہ شاہ بخاری جیسی قومی شخصیات کی تقاریر یونیورسٹی میں گونج چکی تھیں۔ طلبہ میں زبردست ذہنی ہیجان برپا تھا کہ یکا یک یہ انکشاف برقِ خاطف بن کر گرا کہ ڈاکٹر سر ضیاالدین وائس چانسلر جامعہ علی گڑھ نے سر ظفر اللہ کو کانوکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دے دی ہے، جسے ظفر اللہ خان نے منظور کر لیا ہے۔ اُن دنوں ظفر اللہ خان وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے اور بہت زیادہ اثر و رسوخ رکھتے تھے اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کے دعویدار تھے۔ یہ خبر ان طلبہ کے لیے برقِ خاطف سے کم نہ تھی جو قادیانیوں کے بحیثیت غیر مسلم اقلیت علیحدگی کے حامی تھے۔ چنانچہ طلبہ نے فیصلہ کیا کہ اس دعوت کو ہر حال میں منسوخ کیا جائے اور پرُ زور مخالفت کی جائے۔ چنانچہ راقم الحروف، قاری انوار صمدانی، محمد شریف چشتی، وغیرہ نے مل کر طے کیا کہ اس کے لیے علامہ اقبال سے رجوع کیا جائے اور اخبارات کے ذریعے بھی احتجاج کیا جائے۔ چنانچہ الجمیعۃ اور زمیندار نے اداریۓ

لکھے اور یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے اس فعل کی مخالفت کی۔طلبہ کے باہمی مشورے سے راقم علامہ اقبال سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے لاہور روانہ ہوا۔علامہ ان دنوں جاوید منزل میں مقیم تھے۔ سہ پہر کو علامہ کی خدمت میں پہنچا، ان دنوں صرف خاص لوگوں کو ملاقات کی اجازت تھی۔ جب راقم نے اطلاع دی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طلبہ کا پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں تو فوراً اذن باریابی مل گیا۔علامہ اقبال ایک بغلی کمرے میں چارپائی پر تشریف فرما تھے، سامنے چند کرسیاں رکھی تھیں، شلوار قمیض میں ملبوس تھے، ایک جانب بڑا تکیہ تھا۔ میں نے ساری صورتِ حال بیان کی اور اس سلسلے میں وہ استفتاء بھی دکھایا جو دہلی میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید سے قادیانیوں کی بابت حاصل کیا تھا اور جس پر مولانا سعید، داؤد غزنوی اور مولانا احمد علی لاہوری کے دستخط بھی تھے۔علامہ اقبال نے ساری صورت حال سننے کے بعد راقم کو ہدایت کی کہ فضل کریم درانی سے ملوں جو ہفتہ وار اخبار ''ٹرتھ'' کے ایڈیٹر تھے اور میمورنڈم تیار کر کے ٹائپ کے بعد لاؤں۔ راقم عرب ہوٹل گیا جہاں فضل کریم درانی مقیم تھے۔ میمورنڈم کا مسودہ تیار کرا کے ٹائپ کے بعد دوبارہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ علامہ نے اس پر دستخط کرنے کے بعد حضرت مولانا ظفر علی خان سے دستخط کرانے کی ہدایت کی، چنانچہ مولانا اور دوسرے اکابر کے دستخط بھی حاصل کیے، اس طرح میمورنڈم کے ایک طرف علمائے ملت اور دوسری طرف اکابرینِ ملت کے دستخط تھے جو جملہ ممبرانِ یونیورسٹی کورٹ اور طلبہ میں تقسیم ہوا جس کے نتیجے میں ظفر اللہ خان کا کانووکیشن منسوخ ہو گیا۔ دورانِ گفتگو علامہ نے یونیورسٹی کی ساری صورتِ حال معلوم کی اور ہدایت کی کہ قادیانیت کے ساتھ اشتراکیت کی بھی مخالفت کی جائے۔ انھوں نے اس سلسلے میں سیّد ظفر الحسن صدر شعبہ اسلامیات کی خدمات کو سراہا اور پروفیسر ستار خیری اور پروفیسر عطا اللہ کا ذکر بڑے اچھے انداز میں فرمایا۔اس میمورنڈم سے قادیانی یونیورسٹی میں اقلیت تو قرار نہ پائے مگر عملاً موت واقع ہو گئی اور عزائم خاک میں مل گئے۔علامہ کے ولولہ انگیز بیانات سے غلغلہ برپا ہو گیا اس لیے کہ ان کی رائے ملت کی نگاہ میں انتہائی اہم تھی۔ علامہ مرحوم سے ایسی روشن ملاقات کے نقوش آج بھی میرے دل پر ہر طرح رقم ہیں۔

حواشی

° حکیم عنایت اللہ نسیم صاحب کو طب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ظفر علی خان نے ہی علی گڑھ بھجوایا تھا۔ مسلمانوں کی اس علمی درسگاہ پر 1934ء میں قادیانیوں نے یورش کر رکھی تھی۔ حکیم نورالدین کے

دو صاحبزادے عبدالسلام اور عبدالمنان علی گڑھ میں تبلیغِ قادیانیت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ یونیورسٹی میں ہر سال 21 اکتوبر کو یوم تبلیغ منایا جاتا تھا۔ حکیم عنایت اللہ نسیم نے یہ صورتحال دیکھی تو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنے دوستوں میں سے حافظ صدیق احمد صدیقی، حافظ فضل الرحمٰن انصاری اور محمد شریف چشتی کو ساتھ ملا کر ایک مجلسِ عمل بنائی اور مولانا ظفر علی خان کو علی گڑھ آنے اور طلبہ سے خطاب کرنے کی دعوت دے دی۔

اس سے قبل قادیانی علی گڑھ کی لائل لائبریری میں سیرت کے نام پر ایک کانفرنس کا اعلان کر چکے تھے۔ عنایت اللہ سوہدروی اس کانفرنس کو رکوانے اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور ان کا پیغامِ عالیہ صحیح تناظر میں اُبھارنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ انگریز پرو وائس چانسلر مسٹر باتھم گھبرا گیا لیکن مسلمان طلبہ مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ انھیں آفتاب ہال دینے سے انکار کر دیا گیا لیکن مولانا نسیم سوہدروی اسی ہال میں ظفر علی خان کی تقریر کروانے کا اعلان کر چکے تھے۔ انھوں نے اجازت نامے کی پرواہ نہ کی اور مولانا ظفر علی خان کو طلبہ کے جلوس میں لے کر آئے اور ہال پر قبضہ کر لیا۔ مولانا کی تقریر نے علی گڑھ کی فضا تبدیل کر دی۔ آفتاب ہال میں بغیر اجازت جلسہ کرنے کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اس سے قبل مولانا محمد علی جوہر نے بغیر اجازت تقریر کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر طرف مسلمانوں کے نعرے گونج رہے تھے۔

اس کامیابی نے حکیم عنایت اللہ کے دینی جذبے کو بہت تقویت دی، مولانا ظفر علی خان کا ہاتھ ان کی پشت پر تھا۔ وہ ان کے فکری، دینی اور سیاسی رہنما تھے۔ 1937ء میں ایک دفعہ پھر قادیانیوں نے سر اٹھایا۔ اس دفعہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سیّد ضیاالدین نے کانووکیشن ایڈریس کے لیے وائسرائے کونسل کے رکن سر ظفر اللہ خان کو دعوت دے دی۔ حکیم نسیم سوہدروی ایک وفد لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور پہنچے اور ان سے ایک میمورنڈم پر دستخط کرا لائے۔ یہ میمورنڈم کانووکیشن سے پہلے علی گڑھ میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا، سر ظفر اللہ خان کا ایڈریس منسوخ کر دیا گیا۔ حکیم صاحب کی زندگی کے یہ دو واقعات ہمیشہ روشن رہیں گے۔ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ جتنی دیر زندہ رہے، ان کا قلم خدمتِ قوم اور خدمتِ وطن میں مصروف رہا۔ اسلام، پاکستان، اقبال، قائداعظم اور ظفر علی خان ان کے مستقل موضوعات تھے۔ ان کا آخری مقالہ دسمبر 94ء میں ان کے انتقال کے دو دن بعد شائع ہوا۔ حق مغفرت کرے، کیا عجب خدمت گزارِ قوم تھے۔ (انور سدید)

نقاش

علامہ محمد اقبالؒ کی قادیانیت شناسی

(1)

’’یاد رہے کہ یہ حوا کا گناہ تھا کہ براہِ راست شیطان کی بات کو مانا اور خدا کے حکم کو توڑا اور سچ تو یہ ہے کہ حوا کا نہ ایک گناہ بلکہ چار گناہ تھے۔ایک یہ کہ خدا کے حکم کی بے عزتی کی اور اس کو جھوٹا سمجھا۔دوسرا یہ کہ خدا کے دشمن ابدی لعنت کے مستحق اور جھوٹ کے پتلے شیطان کو سچا سمجھ لیا۔ تیسرا یہ کہ اس نافرمانی کو صرف عقیدہ تک محدود نہ رکھا بلکہ خدا کے حکم کو توڑ کر عملی طور پر ارتکابِ معصیت کیا۔چوتھا یہ کہ حوا نے نہ صرف آپ ہی خدا کا حکم توڑا بلکہ شیطان کا قائم مقام بن کر آدم کو بھی دھوکا دیا۔تب آدم نے محض حوا کی دھوکا دہی سے وہ پھل کھایا جس کی ممانعت تھی۔اسی وجہ سے حوا خدا کے نزدیک سخت گناہگار ٹھہری مگر آدم معذور سمجھا گیا۔‘‘

(تحفہ گولڑویہ، ص 187 مندرجہ روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 273 حاشیہ در حاشیہ از مرزا قادیانی)

مولانا عبدالحنان نائب ناظم جمعیۃ العلما پنجاب کی نظر سے جب وہ مرصع قصیدہ گزرا جو مرزا قادیانی آنجہانی نے ابوالبشر حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفیقۂ حیات کی شان میں بہ صفتِ غیر منقوط تصنیف فرمایا ہے تو بے اختیار پکار اٹھے کہ الٰہی تیری غیرت کو کیا ہوا۔لوگ تجھ پر بہتان باندھتے ہیں۔جو تو نے نہیں کہا، وہ تجھ سے منسوب کرتے ہیں اور تو ہے کہ ان کو اور ان کے لگے بندھوں کو اپنی بخششِ شدید کی آتشیں زنجیروں میں نہیں جکڑتا۔آدم وحوا علیہما السلام کا قصہ اپنی کلک قدرت سے سپرد لوحِ محفوظ کرتے وقت تو یہ لکھتا ہے کہ **فازلهما الشيطن عنها فاخرجهما مما كانا فيه.** (البقرہ:36)

(پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا کر جنت سے نکال دیا)

مگر مرزائے قادیان تجھے یہ کہہ کر جھٹلاتا ہے کہ آدم کو تیری جنت سے نکالنے والا ابلیس

لعین نہ تھا بلکہ اس مردودِ ازلی کی قائم مقام حوا تھی۔ پھر اے رب کعبہ تو ہی بتا کہ ہم تیرے کلام کو سچ سمجھیں یا غلام احمد قادیانی کے فرمودہ کو۔

مرزائے قادیانی کی امت بڑے فخر سے کہا کرتی ہے کہ ہمارے نبی نے قرآن کی جو تفسیر کی ہے وہ طبری اور رازی کے فرشتوں کو بھی نہ سوجھی ہوگی لیکن جناب کی وسعت نظر ملاحظہ ہو کہ حضرت حوا علیہا السلام کو اپنی عادت کے مطابق گالیاں دیتے وقت کلام مجید کی اس آیت کو آپ نے نظر انداز فرمادیا کہ:

فتلقى اٰدم من ربه كلمٰت فتاب عليه انه هو التواب الرحيم. (البقرہ:37)

(پس آدم نے اپنے پروردگار سے ایک دعا سیکھی جو مقبول ہوئی اس لیے کہ پروردگارِ عالم توبہ کا قبول کرنے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔)

وہ دعا بھی ملاحظہ ہو:

ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنكونن من الخسرين.

(الاعراف:23)

(ہمارے پروردگار۔ ہم نے (یعنی آدم وحوا دونوں نے) اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ٹوٹے میں رہیں گے۔)

یہ دعا جب قبول ہو چکی، جیسا کہ خود خداوند عالم و عالمیاں ارشاد فرماتا ہے، تو ظاہر ہے کہ آدم وحوا کی لغزشوں پر بارگاہ خداوندی سے قلم عفو کھینچ دیا گیا۔ اور دونوں کا شمار اس کے بعد سے اور اپنے آئندہ صالحانہ طرز عمل کے لحاظ سے، **صلحا و اتقیا** میں ہو گیا۔ ایسی حالت میں حضرت حوا کو شیطان کا قائم مقام قرار دینا اور دنیا جہان کے گناہوں کی گٹھڑی ان کے سر اقدس پر لاد دینا مرزا غلام احمد قادیانی جیسے منہ پھٹ شخص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ خدا کلام کرتا ہے اور جبرئیل کو ہمارے پاس بھیجتا ہے اور ہم اس مقام پر جا پہنچے ہیں کہ محمد مصطفیٰ کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ **نعوذ باللہ من تلک الھفوات والخرافات.**

علامہ اقبال کے سامنے جب اگلے دن حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں قادیانیوں کے قبلہ وکعبہ کا یہ عقیدہ پیش کیا گیا تو علامہ ممدوح نے چمک کر کہا کہ یہ وہی حوا ہے جس کی ایک نواسی محمدی بیگم کی خاطر آپ نے کئی ایک شکم زاد الہام سپرد کاغذ کیے۔ جب الہام پورے نہ ہوئے

توان کی بیسیوں خندہ آفریں تاویلیں کیں اور بالآخر خسر الدنیا والآخرہ ہو کر راہ گرائے دار البوار ہو گئے اور پھر یہ وہی حوا ہے جس کی بیٹیوں نے آپ کے خلف الصدق مرزا بشیر الدین محمود سے فلسفہ مشی فی النوم کے اسرار و خفایا پر ان گنت رنگیلی شرحیں لکھوائیں۔ شیطان کی قائم مقامی کا فرض تو انجام دیں مرزائی اور الزام اس شیطنت کا چپکا دیں تمام انسانوں کی ماں کے سر۔ معلوم نہیں قادیانی کس قسم کے انسان ہیں اور کس حوا کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں؟

(2)

حضرت حوا اور متنبّی قادیان

ابوالبشر آدم صفی اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفیقہ حیات حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کا گھناؤنا عقیدہ زمیندار کی کسی گزشتہ اشاعت میں قارئین کرام کی طبیعت کے لیے تنغص کا سامان بہم پہنچا چکا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ علامہ اقبال نے اس ناپاک عقیدہ سے اپنی بیزاری کا اظہار سختی سے کیا تھا جسے راقم الحروف نے اپنے الفاظ میں درج کر دیا۔ جن صاحب کی روایت کی بنا پر یہ سارا واقعہ سپرد قلم کیا گیا، انھیں راقم کے قلم سے شکوہ ہے کہ وہ شاید موضوع کی رنگینی کی سفارش پر کسی قدر شوخ ہو گیا۔ ان کی خواہش ہے کہ علامہ اقبال کے اصل الفاظ کو علامہ ممدوح ہی کی خشک حکیمانہ متانت کے لباس میں دنیا والوں کے کانوں تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے امتثال امر میں کوئی عذر نہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب علامہ اقبال کو ''تحفہ گولڑویہ'' مصنفہ متنبّی قادیان کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی گئی جس میں اس مفتری علی اللہ نے قرآن کریم کی آیات کو جھٹلاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حوا نے شیطان کی قائم مقام بن کر آدم کو جنت سے نکال دیا اور علامہ ممدوح سے استفسار کیا گیا کہ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص کے حق میں آپ کی کیا رائے ہے تو انھوں نے فرمایا:

''یہ عقیدہ مسلمانوں کا تو نہیں البتہ عیسائی ضرور ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ رہے مرزا غلام احمد قادیانی، سو تعجب ہے کہ عورت ذات کے ساتھ ان کے تعلقات کی عمر بھر کی نوعیت نے کس طرح گوارا کیا کہ حضرت حوا کو ایسے نازیبا الفاظ سے یاد کیا جائے۔ اور یوں بھی کسی شریف النفس انسان کا جذبۂ مروت وفتوت صنف نازک پر ایسے رکیک حملہ کی تاب نہیں لا سکتا۔''

اسی انداز میں چند باتیں علامہ اقبال کی زبان سے جناب مرزائے قادیانی آنجہانی کے صاحب زادہ بلند اقبال کی نسبت بھی صادر ہوئیں جو اس وقت ذہن سے اتر گئی ہیں۔ بہر حال یہ بات تو متحقق ہوگئی کہ متنبّی قادیان کے عقائد کو مسلمانوں کے عقائد سے دور کا انتساب بھی نہیں۔ نصرانیت کی ترجمانی کا ڈھنگ البتہ انھیں خوب آتا ہے۔

ہمارے علما نے قادیانیوں کو ان کے باطل عقائد کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا لیکن **بو العجبی** ملاحظہ ہو کہ کسی سر برآوردہ قادیانی کا ذکر جب ناموسِ مصطفوی ﷺ کے ان پاسبانوں کے حلقہ میں آتا ہے تو وہ بلا تکلف اسے ''مولوی'' یا ''مولانا'' کے لقب سے ملقب فرما دیتے ہیں مثلاً اگر وہ اندلسی قادیانیوں کے امام مسٹر محمد علی کا نام لیں گے، جو مسلمانوں کو ''ذریۃ البغایا'' قرار دینے میں اور علمائے امت پر گالیوں کا جھاڑ باندھنے میں اپنے کسی بڑے سے بڑے دمشقی خواجہ تاش سے کم نہیں، تو انھیں ''مولانا محمد علی'' کہہ کر یاد کریں گے۔ جب ان لوگوں کے عقائد بقول علامہ اقبال عیسائیوں کے سے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ علمائے کرام اور عامۃ المسلمین ان کو مولوی کہہ کر پکاریں جو صرف ذی علم مسلمانوں کا امتیازی وصف ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہے جیسا کوئی کہہ دے کہ حضرت مولانا لائڈ جارج نے یوں فرمایا اور حضرت مولوی سیموئل ہور کا یہ ارشاد ہے۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ سے ہر قابل ذکر قادیانی کو عام اس سے کہ وہ اندلسی ہو یا دمشقی، مسٹر کہہ کر مخاطب کیا جائے اور جو ان کے امام ہوں انھیں پادری کے معزز لقب سے یاد کیا جائے اور موسیو کا لقب تو موسیو مرزا بشیر الدین محمود کے لیے وقف ہو ہی چکا ہے۔ (زمیندار 6 جولائی 1932ء)

نوٹ: مولانا ظفر علی خاں نے قادیانیوں کے دو معروف فرقوں کے لیے دمشقی اور اندلسی قادیانی کی بدیع اصطلاحات وضع فرمائی تھیں۔ دمشقی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو مرزا غلام احمد کو مستقل نبی مانتے ہیں۔ اس فرقے کے امام مرزا بشیر الدین محمود تھے۔ اندلسی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو متنبّی قادیان کو مجدد کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس طائفہ کے امام مسٹر محمد علی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے کہ دونوں فرقوں کا یہ فرق صرف لفظی ہیر پھیر ہے، حقیقت میں دمشقی اور اندلسی قادیانی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ (جعفر بلوچ)

جعفر بلوچ

اقبالؒ اور قادیانیت

قادیانیت یا مرزائیت کے لیے بعض مسلم اکابر نے جن میں خود حضرت علامہ اقبال بھی شامل ہیں، احمدیت کی اصطلاح سہواً استعمال کی ہے اور یہ بات غلامانِ احمد مختار ﷺ کے لیے دل آزاری کا باعث بنتی رہی ہے۔ محمد نزم یا محمدیت کی طرح احمدزم یا احمدیت کی اصطلاح بھی اسلام کی متبادل قرار نہیں دی جاسکتی۔ مستشرقین کی وضع کردہ ان اصطلاحات سے کسی وضعی مذہب کا تصور ابھرتا ہے لیکن ان اصطلاحات کو مجبوراً استعمال کرنا بھی پڑے تو پھر محمدی یا احمدی کا اطلاق رسولِ ہاشمی ﷺ پر ایمان رکھنے والوں ہی پر ہوگا۔ عقیدۂ ختم نبوت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے، لہٰذا کوئی ایسا شخص احمدی یا محمدی کہلانے کا حق نہیں رکھتا جو ''لا نبی بعدی'' پر ایمان نہ رکھتا ہو اور شرک فی النبوۃ کا مرتکب ہو۔ محمد ﷺ کی طرح احمد ﷺ بھی خاتم النبیین رسولِ ہاشمی کا اسم ذاتی ہے اور غلامانِ رسول ہاشمی احمدی کہلانے میں فخر و شرف محسوس کرتے ہیں جبکہ متنبّی قادیان کا اصل نام غلام احمد تھا اور اس نے غلامیِ احمد ﷺ کو اپنے لیے ناکافی اور ناشایانِ شان سمجھتے ہوئے کمال عیاری اور غداری سے خود احمد بن جانے کا دعویٰ کیا۔ غلام احمد کی امت و ذریت کو ''غلام احمدی'' کہلانا چاہیے نہ کہ احمدی۔ حضرت اسد ملتانی نے کیا پتے کی بات کہی تھی۔

نسبت ہمیں ہے احمدِ مختار سے اسد
ہم احمدی تو ہیں پر غلام احمدی نہیں

متنبّی قادیان نے اواخرِ عمر میں اپنی نبوت کا اعلان ایسے مبہم اور ملفوف انداز میں کیا کہ عوام تو کیا خواص اہلِ اسلام بھی ایک مدت تک اس کے خبثِ نیت سے پوری طرح باخبر نہ ہو سکے۔ جہاں تک حضرت علامہ اقبال کا تعلق ہے، وہ بھی متعدد دیگر اکابرِ اسلام کی طرح ایک مدت تک مرزا غلام احمد قادیانی کی علمی اور معاشرتی خدمات کے معترف رہے لیکن اس کے دعوائے

نبوت سے کاملاً آ گاہ ہونے میں انھیں شاید کچھ دیر لگی۔ تاہم یہ بھی نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت علامہ ختم نبوت کے ہمیشہ قائل بلکہ مبلغ رہے اور خاتم النبیین کے بعد کسی نبوت کو خواہ وہ ظلی یا بروزی ہی کیوں نہ ہو، ماننے کے بارے میں تو وہ سوچ ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے 23 فروری 1902ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے سترہویں سالانہ جلسہ میں نظم بعنوان ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' پڑھی، اس کے بند نہم کا ایک شعر یہ تھا:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اس شعر کے پہلے مصرع کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں:

- ''یہ 1902ء کا کلام ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کی ضرورت مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے بروزیت کی بنا پر ہوئی۔ یعنی کہتے ہیں کہ تیرے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوت ہے۔ خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی ظلی اور بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔''(1)

جناب اعجاز احمد نے ''مظلوم اقبال'' (مطبوعہ 1985ء) میں اور جناب شیخ عبدالماجد نے ''اقبال اور احمدیت'' (مطبوعہ اپریل 1991ء) میں اقبال اور قادیانیت کے بارے میں سنگین مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سارا غصہ اس بات پر ہے کہ اقبال ایک عرصہ تک مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت سے حسنِ ظن رکھنے کے باوجود مسلمان کیوں رہے اور خود قادیانی کیوں نہ ہو گئے اور بیسیویں صدی کے تیسرے عشرے میں قادیان شکنی کے مرتکب کیوں ہوئے؟ معترضینِ جدید کو خوب معلوم ہے کہ اقبال ان اعتراضات کا مسکت جواب پہلے ہی دے چکے ہیں۔ حضرت علامہ نے قادیانیوں کی تحریک کے بارے میں لکھا تھا:

"I have no hesitation in admitting that about a quarter of a century ago, I had hopes of good results following from this movement. I become suspicious of the movement when the claim of a new prophethood, superior even to the prophethood of the founder of Islam, was definitely put forward and the Muslim world was declared Kafir. (2)

حضرت علامہ کے اس بیان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

❑ ''مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی......ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت......بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت......کا حتمی طور پر دعویٰ کیا گیا اور تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیا گیا۔''

حضرت علامہ اقبال متنبّی قادیاں کے دعویٰ نبوت ہی کو باطل سمجھتے تھے۔ ''بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت'' کا جملہ تو محض ایک جملہ معترضہ تھا اور اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ قادیانی نبوت کا کریلا نیم چڑھا بھی ہے لیکن جناب اعجاز احمد بحث کو غلط رخ دینے کے لیے اسی جملہ معترضہ کو ہی بنیاد بنا کر یوں رواں ہوئے ہیں:

''بانیِ سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا نہ کوئی احمدی بانیِ سلسلہ احمدیہ کو سرکارِ دو عالم سے برتر یقین کرتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو قرآن کریم میں خاتم النبیین کہا گیا ہے اور انھیں خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزوِ ایمان ہے۔''(3)

گویا جناب اعجاز احمد اور شیخ عبدالماجد صاحبان کے نزدیک مرزائے قادیان نبی تو ہے لیکن خاتم النبیین سے برتر نبی نہیں ہے۔ حضرت علامہ اقبال حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے بعد کسی نبوت کے قائل نہ تھے اور انھوں نے ظلی اور بروزی نبوت اور ختم نبوت کی قادیانی تاویلوں کو بھی اپنے مضامین اور بیانات میں بہ دلائل رد کیا۔ علامہ اقبال کی یہ تحریریں جناب لطیف احمد شیروانی کی مرتب کردہ کتابوں ''حرفِ اقبال'' اور ''سپیچز، رائٹنگز اینڈ سٹیٹ منٹس آف اقبال'' اور دیگر کتب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

قادیانیوں کے بارے میں حضرت علامہ کو ابتداءً یقیناً کچھ غلط فہمیاں تھیں لیکن بعد میں وہ دور ہوگئیں۔ اس بات کا اعتراف خود حضرت علامہ نے بھی فرمایا ہے:

❑ ''اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''(4)

تاہم حضرت علامہ نے مرزائے قادیان کے دعویٰ نبوت کی کبھی تائید و تصدیق نہیں

کی۔اس سلسلے میں 23 فروری 1902ء کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔مئی 1902ء کے ''مخزن'' میں حضرت علامہ کی ایک نظم بعنوان ''خطِ منظوم...... پیغام بیعت کے جواب میں'' شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے چالیس اشعار تھے، جن میں سے صرف تیرہ اشعار ''عقل ودل'' کے عنوان سے بانگ درا میں شامل ہیں۔باقی اشعار ''عقل ودل'' ہی کے زیرِ عنوان مولانا غلام رسول مہر کی مرتب کردہ ''سرودِ رفتہ'' میں شامل ہیں۔اس نظم پر مولانا مہر نے ذیل کا نوٹ دیا ہے:

❑ ''یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ پیغام کس طرف سے آیا تھا لیکن قرینہ یہ ہے کہ یہ پیغام قادیانی جماعت کی طرف سے ملا تھا۔اس کی جانب کچھ اشارے خود نظم میں ہیں۔ایک قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس خط کے جواب میں اسی بحر اور اسی زمین میں ایک نظم سیّد حامد شاہ نے لکھی تھی جو قادیانی جماعت کے ممتاز رکن تھے۔اس کا آخری شعر یہ تھا۔

کیوں نہ ہو خاکِ پا مرا اقبال
حامد نائب خدا ہوں میں'' (5)

حضرت علامہ کی اس نظم اور اس پر مولانا مہر کے نوٹ کے بارے میں جناب بشیر احمد ڈار اپنی مرتب کردہ کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں لکھتے ہیں:

❑ ''میرا خیال ہے کہ (مولانا مہر کا اخذ کردہ) یہ نتیجہ بالکل قطعی ہے کہ یہ پیغام (بیعت کا) اسی جماعت کی طرف سے تھا۔اس نظم میں اقبالؒ نے جماعتِ احمدیہ کے متعلق مجمل طور پر وہی بات کہی جو انھوں نے ان کے خلاف اپنے پہلے بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' (1934ء) میں تفصیل سے کہی تھی۔یعنی اس جماعت نے مسلمانوں میں تفریق پیدا کر کے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے۔کہتے ہیں:

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں

پھر امیر جماعت کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ مخالفین کی موت کی پیش گوئی کرتے ہیں

اور جب وہ مرجاتے ہیں تو ان پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

مرگ اغیار پر خوشی ہے تجھے

اور آنسو بہا رہا ہوں میں" (6)

13 نومبر 1915ء کو حضرت علامہ نے ایک قادیانی ہفت روزہ "پیغام صلح" کے ایڈیٹر کے نام خط لکھا اور ان کلمات کی تردید کی جو کسی قادیانی نے قادیانیوں کی حمایت میں حضرت علامہ سے منسوب کیے تھے۔ حضرت علامہ نے لکھا:

❑ "اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو، وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں"۔

مدیر پیغام صلح کے نام حضرت علامہ کا متذکرہ بالا خط کلیات مکاتیبِ اقبال جلد اوّل مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی کے صفحات 429 تا 431 پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

1916ء میں قادیانی جماعت کے بارے میں حضرت علامہ کا موقف یہ تھا:

❑ "جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہو، وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"(7)

حواشی

1- غلام رسول مہر، سرود رفتہ، بار اول 1959ء ص 37

2- Abdul Vahid, Thoughts and reflections of Iqbal. 1973, Page. 297

3- اعجاز احمد، مظلوم اقبال، مطبوعہ شیخ شوکت علی پرنٹرز کراچی، 1985، صفحہ 208

4- حرفِ اقبال۔ لطیف احمد خاں شروانی صفحہ 132

5- سرود رفتہ، صفحہ 103

6- بشیر احمد ڈار، اقبال اور احمدیت۔ صفحہ 10، 11

7- ایضاً ص 17

علیم ناصری

فکرِ اقبال اور قادیانی تحریک

ہندوستان میں 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریز، فاتح کی حیثیت سے مختارِ کل بن گیا۔ اس نے مغل سلطنت کے تار و پود بکھیر دیے اور ہندو ریاستوں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ اس کو مسلمان قوم سے بہر حال خطرہ درپیش تھا کیونکہ اس قوم میں جذبۂ جہاد کسی بھی وقت اُبھر آنے کی توقع تھی۔ اس لیے اس نے اس کے فکری محاذ اور دینی عقائد پر ضربِ کاری لگانے کی ڈپلومیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، اور انگلستان اور دیگر یورپی ممالک سے عیسائی مشنری (مبلغین اور دانشور) یہاں درآمد کرنے شروع کیے۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس پر اکبرالہ آبادی مرحوم نے کہا تھا

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے اب بسولا ہٹا تو رندا ہے

یعنی حرب وضرب (توپ تفنگ) کے سامان کے بعد تعلیم و تبلیغ کے ہتھیار سے کام لینے کا وقت آ گیا۔ بسولا یعنی تیشہ کو سامانِ حرب سے تشبیہ دی ہے اور رندا کو تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ہموار کرنے کے عمل کے لیے بطورِ استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

ان مشنریوں کے مقابلے میں مقامی علمائے اسلام بھی میدان میں اُترے جن میں سُوئے اتفاق سے اس وقت مرزا غلام احمد قادیانی بھی شامل تھا۔ اس شخص نے یقیناً اس میدانِ مناظرہ میں خاصی سرگرمی دکھائی، اور اسلام کے دفاع میں (منافقانہ انداز میں) بھرپور کردار ادا کیا، جس کو اس دور کے اکابرین نے داد و تحسین کی نظر سے دیکھا اور اس کی ہمنوائی بھی کی۔ ان مداحین میں علامہ اقبال کا خاندان یعنی ان کے والد گرامی اور بھائی عطا محمد بھی تھے۔ وہ خود بھی مرزا غلام احمد کو اسلام کا خادم قرار دیتے تھے۔ یہ ان کی طالب علمی کا دور تھا اور ان کی عمر بھی 16، 17 سال سے زیادہ نہ تھی۔ اسی دور میں یعنی انیسویں صدی کی آخری دہائی میں مرزا کے ذہن میں

دینی بلند نظری آفاق گیر نظر آنے لگی اور اس نے مہدی دوراں اور پھر مسیحِ موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔اس کی زندگی کا یہی موڑ تھا جہاں سے اس نے ملتِ اسلامیہ سے الگ راستہ اختیار کیا اور جلد ہی نبی ہونے کا مدعی بھی بن بیٹھا۔علمائے وقت نے اس پر گرفت شروع کر دی اور اس کے دعوے کو ''ختم نبوت'' کے منافی قرار دیا۔اس نے پینترا بدلا اور اپنی نبوت کو ''بروزی نبوت'' کے بہروپ میں پیش کرنا شروع کر دیا اور اس کے متبعین نے طرح طرح کی تاویلوں سے اس کو اس منصب کا اہل،صاحبِ الہام ووحی اور بشیر ونذیر بنانا شروع کر دیا۔لاہور میں اس کے حواریوں نے نبی کے بجائے اس کو عہدِ حاضر کا مجدد بنایا اور ایک باقاعدہ تحریک نے اٹھ کر ''احمدیت'' کا مذہب ایجاد کر لیا،اور دوسرے مسلمانوں کو ''کافر'' قرار دے دیا۔علمائے وقت نے اس ''نبوتِ کاذبہ'' کے خلاف پوری شدت سے مزاحمتی تحریکیں چلائیں۔مناظرے ہوئے،اخبارات و رسائل میں تحریری مباحثے بھی چلنے لگے،اور علامہ اقبال بھی اس پر توجہ دینے پر مجبور ہوئے۔جب ان پر ''ختم نبوت'' کی عظمت پوری طرح اجاگر ہو گئی،اور وہ خود بھی اس وقت تک ملتِ اسلامیہ ہند میں ایک نامور مفکر کے طور پر اُبھرے تو انھوں نے اس کے خلاف مضامین لکھے اور مرزائی نبوت کے خلاف اپنا فیصلہ دے دیا۔بشیر احمد ڈار اپنی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' کے صفحہ نمبر 17 پر لکھتے ہیں......

چنانچہ اقبال نے 1916ء میں اس (کسی مرزائی کے مضمون) کے جواب میں ایک بیان دیا۔

- ''جو شخص نبی ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار مستلزمِ کفر ہو،وہ خارج از اسلام ہوگا۔اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی اسلام سے خارج ہے۔''

اسی کتاب کے ص 59 پر علامہ نے مزید وضاحت کی ہے۔

- ''ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت...... بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت......کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی،جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''

قادیانی مصنف شیخ عبدالماجد نے علامہ اقبال پر ان کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''زندہ رود'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کتاب ''اقبال اور احمدیت'' کے عنوان سے مرتب کی اور بزعم خویش اپنے حقائق بلکہ انکشافات کا جواب طلب کیا۔ اقبال اکیڈمی کے فاضل رکن ڈاکٹر وحید عشرت نے شیخ عبدالماجد مذکور کے ''انکشافات'' کا جواب ماہنامہ ''مہارت'' کے صفحات میں لکھنا شروع کیا، جہاں شیخ مذکور کے مضامین چھپتے تھے۔ انھوں نے پوری ذمہ داری اور تحقیق و کاوش کا مظاہرہ کیا مگر عبدالماجد مذکور کی تشفی نہیں ہوسکی، اور نہ ہوسکتی تھی کیونکہ وہ داستان کو جاری رکھنے کے خواہش مند تھے کہ قادیانیت پر شہرت کے دروازے یوں بھی کھلتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی اقساط میں چلا اور آخر عشرت صاحب نے اسے ''شوقِ فضول'' سمجھ کر بند کر دیا۔ مگر قادیانیت کی فطرت میں دور از کار مباحث میں اُلجھانا شامل ہے۔ اس لیے اب انھوں نے اپنا تمام اثاثہ اس کتاب میں جھونک دیا ہے۔ اس کا ہدف صرف اقبال ہے اور اقبال کو ہمہ پہلو جھوٹا ثابت کر کے وہ لوگ مرزا کی سچائی ثابت کرنا چاہتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جب اقبال جھوٹا ثابت ہوگیا تو ہمیں جو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے وہ بھی منسوخ ہو جائے گا اور ہمارے اسلام ہی کو اصل اسلام سمجھا جائے گا۔ اس طرح دیگر تمام امت اسلامیہ از خود ''کافر'' قرار پائے گی۔

کتاب کے ٹائٹل پر ملکہ وکٹوریہ (برطانیہ) کی تصویر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اقبال کے تین شعر درج ہیں جو اقبال کی اس نظم کا حصہ ہیں جو انھوں نے ملکہ کی وفات (1901ء) پر لکھی تھی۔ اور اس کتاب کے صفحہ 121 تا 127 پر درج ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان مرزا کی نبوت کو انگریز کا ''خود کاشتہ پودا'' قرار دیتے ہیں اور مرزا صاحب پر معترض ہیں کہ انھوں نے انگریز حکومت کی حمایت اور اپنی جماعت کے لیے اس حکومت کو سائبان قرار دیا تھا۔ اسی کی شہ پر مرزا صاحب نے اسلامی جہاد کو منسوخ قرار دیا تھا اور مسلمانوں کو ''نظریاتی افلاس'' کی طرف دھکیلنے کی جسارت کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے علامہ اقبالؒ کی ''عہد شباب'' کی شاعری کو خاص طور پر ہدفِ تنقید بنایا ہے، تاکہ اس کے دینی کردار کو مسخ کیا جائے۔ مصنف کو یہ معلوم رہنا چاہیے کہ ملت اسلامیہ پاکستان اب اُس اقبال کی مداح نہیں ہے جو آپ پیش کر رہے ہیں بلکہ ہمارے سامنے صرف وہ اقبال ہے جو بانگِ درا کے بعد

بالِ جبریل، ضربِ کلیم، پیام مشرق، مثنوی اسرار و رموز، زبورِ عجم اور ارمغانِ حجاز میں نظر آتا ہے۔ نیز ملت اسلامیہٴ پاکستان نے قادیانیت کو اقبال کے کہنے پر غیر مسلم قرار نہیں دیا بلکہ ان نصوصِ قرآن وسنت کے تحت فیصلہ کیا ہے جو عالمِ اسلام کی مشترکہ متاعِ عزیز ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ''آزادیٔ رائے'' کے منافقانہ نظریہ کی بہت مانگ ہے اور اسلامی نظریات سے تہی دامن دانشوروں کو آپ ہی نہیں بہائی اور عیسائی بھی بہت اپیل کر رہے ہیں۔

اس کتاب میں بھی جگہ جگہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو جواب لکھنے کا چیلنج کیا گیا ہے اور ممکن ہے وہ یا ڈاکٹر وحید عشرت اس کے لیے تیار بھی ہوں مگر ہم ''الاعتصام'' میں ایسی ''فضول'' بحث کے روادار نہیں ہیں۔ نہ کبھی مرزا کو ہم ''سچا نبی'' مان سکتے ہیں اور نہ اس کی ذریت کے لیے کوئی نرم گوشہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کا منکر ہماری نظر میں غیر مسلم ہے اور کسی رواداری کا مستحق نہیں!!

آخر میں ہم اقبال اکیڈمی اور دوسرے مسلم دانشوروں سے گزارش کریں گے کہ وہ جب اس موضوع پر کچھ لکھیں تو اس جماعت کے لیے ''احمدی یا احمدیت'' کا لفظ استعمال نہ کریں بلکہ ''قادیانی یا قادیانیت'' لکھا کریں۔ یہ بھی احمد (محمد ﷺ) کے ساتھ اشتباہ کا پہلو رکھتا ہے۔ سرکاری فارموں میں بھی اس کا نوٹس لینا چاہیے۔

مولانا مشتاق احمد

شورش، اقبال اور قادیانیت

علامہ اقبالؒ کے نام پر جھوٹ

ہم سے ایک ذمہ دار دوست نے بعض ایسے کتابچوں کا ذکر کیا ہے، جو قادیانی مشن لندن کی طرف سے شائع ہوئے ہیں، اور جن میں یہ درج ہے کہ علامہ اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے علم وفضیلت پر صاد کیا تھا۔ وہ ان سے بیعت ہوئے، آخر احراریوں کے ورغلانے سے منحرف ہو گئے تھے، وغیرہ......

نیاز صاحب کے تاثرات کا ایک خاص پس منظر ہے، جسے ہم یہاں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، وہ اتنا سطحی ہے کہ ایک ادبی شخصیت کا سماعی روایات پر اس طرح انحصار کرنا کسی طرح بھی ایک سانحہ سے کم نہیں۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان سے جو خطوط انھیں لکھے گئے، وہ لازماً ان کی ممدوح جماعت ہی نے لکھے یا لکھوائے ہوں گے، تاکہ اپنے حق میں بیرونی شہادتیں حاصل کی جاسکیں۔ بہر حال یہ ایک دوسری بحث ہے اور اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ احرار کا سوال بھی ہمارے سامنے نہیں، جو جماعت حکماً کالعدم قرار دی جا چکی ہو اور ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح اس کا وجود بھی غائب ہو، اس کے بارے میں کسی گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا سوال خالص علمی ہے، یا پھر دینی، کہ جب قادیانی جماعت کی مزاحمت یا مدافعت کرنے والوں کی مجالس اپنے سیاسی کردار کے باعث معطل پڑی ہیں، تو قادیانی جماعت کو یہ حق کیونکر پہنچتا ہے کہ اپنے ''مذہبی وجود'' کی آڑ میں ان سیاسی حربوں کو استعمال کرے، جن کا استعمال دوسروں کے لیے ممنوع ہو چکا ہے۔ کیا وہ اپنے نفس کو دھوکا دے رہی ہے یا مسلمانوں کو مغالطے میں رکھنا چاہتی ہے۔ یا پھر اس کے دماغ میں یہ واہمہ سما گیا ہے کہ حکومت کی احتسابی مصروفیتوں کا راستہ دوسرا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ منیر انکوائری کمیشن کے روبرو

قادیانی وکلا نے علامہ اقبال سے متعلق اسی قسم کا الزام عائد کیا تھا، تو مرکزیہ مجلس اقبال نے فوراً ہی تردید کر دی تھی۔ بعض موانعات کے باعث تردید کا مضمون عام نہ ہو سکا۔ مگر جوابی تصریحات، کمیشن کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اب پھر اقبال کا نام استعمال کرنے اور ملک سے باہر اس مطلب کے کتابچے چھاپنے کی ضرورت محسوس کی گئی؟ ہم اس پس منظر کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے لیکن اگر ہم یہ عرض کریں، تو ملکی استحکام کی منشا کے عین مطابق ہوگا کہ قادیانی جماعت کے مبلغوں کو اس امر کا قطعاً حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ میدان خالی پا کر علامہ اقبال سے متعلق بین الاقوامی دنیا کو تاثر دیں کہ اقبال ان سے متاثر تھے، اور جب انھوں نے قادیانی جماعت کا جائزہ لیا، تو خدانخواستہ احرار کے دام تزویر کا شکار ہو گئے تھے۔ جس کا مطلب ہے کہ پاکستان کے فکری موسس کی معرفت وہ اپنا نام اور کام بیرونی دنیا کے سامنے لانا چاہتے، اور اس طرح عہد حاضر کی تعلیم یافتہ نسل پر ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں، کہ اقبال جیسا نابغہ عصر بھی ان کے بانی کی عقیدت کا طوق گلے میں باندھے ہوئے تھا، پھر وہ احرار کے داؤں میں آ گیا۔ گویا وہ متزلزل عقائد کا انسان تھا اور اس کے اپنے مطالعہ و مشاہدہ اور نظر و فکر کی عمارتیں کمزور تھیں۔

احرار کا نام لینا محض ذہنی عیاری ہے، تا کہ احرار سے متعلق اونچے طبقے کا ماضی مرحوم میں جو سیاسی ذہن رہا ہے، وہ ان کے لیے حفاظتی قلعہ ثابت ہو، اور احرار کے خلاف خفیہ رپورٹوں کا جو انبار لگا ہوا ہے، وہ ان کی حفاظت کے کام آتا رہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ تبلیغ اسلام کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں، یا مرزا غلام احمد قادیانی کی ''صداقتوں'' کا ناد پھونکنے کے لیے۔ ہمیں یقین ہے کہ انھیں زر مبادلہ اس مقصد کے لیے نہیں ملتا کہ وہ اپنی جماعت کا چرچا کریں، اور اس واسطے سے بیرونی دنیا میں اپنی جماعت کے نام کا نقش بٹھا کر داخلی طور پر اپنی مختصر سی جماعت کے لیے بین الاقوامی تحفظ حاصل کریں۔ یہ صریحاً سیاسی ہتھکنڈا ہے، اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قادیانی اپنے فن میں بڑے منفرد ہیں۔ اندرون ملک جہاں بیٹھے ہیں، اپنی تنظیم اور مخالفوں کی تنقیص سے ایک لحظہ بھی غافل نہیں رہتے۔ ان کی مشین کا ایک ایک پرزہ صحیح صحیح کام کرتا ہے۔ ہمارے سامنے بعض دلچسپ اور سنگین مثالیں موجود ہیں، لیکن ہم زیر نظر سوال کو طول دینا نہیں چاہتے۔ ہماری استدعا یہ ہے کہ ان حالات میں جب تمام سیاسی جماعتیں ختم ہو چکی ہیں، انھیں بھی لازم ہے کہ اپنا سیاسی مزاج بدلیں اور ان افراد و عقائد کے بارے میں محتاط رہیں،

جنھیں جمہور المسلمین بہ طور خاص عزیز رکھتے ہیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال ان کے بارے میں جو نظریات رکھتے تھے ان کا جوابی چرچا ہو؟ اگر وہ یہ نہیں چاہتے، تو پھر اس صورتحال سے فائدہ کیوں اٹھاتے ہیں؟ (ہفت روزہ چٹان۔ 1 اکتوبر 1961ء)

ختم نبوت زندہ باد

مسلم لیگ اوّل یا ثانی (اس کا فیصلہ وقت کرے گا) کا جلسۂ عام چوہدری خلیق الزماں صاحب کی تشریف آوری پر موچی دروازہ کے باغ پر ہوا، لیکن گڑبڑ کی نذر ہو گیا۔ اخبارات نے لکھا نہیں اور ہمارے روزناموں کی اکثریت کا یہ وتیرہ ہو گیا ہے کہ عوام کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے بجائے وہ اپنی خواہشات کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے پنجابی اضلاع میں ختم نبوت کا مسئلہ ایک زندہ حقیقت ہے اور لاہور کے لوگ خصوصیت کے ساتھ مارشل لا کی اس یاد کو بھولے نہیں، جب انھیں ختم نبوت کے سلسلے میں گولیوں کا نشانہ بننا پڑا، اور لاہور کی سب سے بڑی سڑک مال روڈ پر محمد رسول اللہ ﷺ کی ختم المرسلینی کا اعلان کرنے پر اس وقت کے سیاست دانوں نے حلقہ بگوشانِ رسالت کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے ہر عوامی جلسہ میں ختم نبوت زندہ باد کا نعرہ حاضرین کی پوری طاقت کے ساتھ ہمیشہ گونجا ہے، اور بڑے سے بڑا مقرر اس کی ہمنوائی کے بغیر آگے نہیں چل سکتا ہے۔ مسٹر منظر عالم نے جو کنونشن کے معتمد ہیں، لاہور کے جلسہ عام میں اس ختم نبوت ہی کا سہارا لیا اور جب انھوں نے یہ کہا کہ لیگ کونسل والے ہی تھے جنھوں نے تحریک ختم نبوت میں گولیاں چلائیں۔ تو لوگ چلا اٹھے کہ آپ بھی ان میں شریک تھے، وغیرہ۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سرکاری اطلاعات اس بارے میں کیا ہیں، اور حکومت کیونکر سوچتی ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ختم نبوت کا مسئلہ مسلمانوں کے دل ودماغ کا مسئلہ ہے، وہ مسلمانوں کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان سب کچھ گوارا کر سکتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کی ختم المرسلینی اور خاتم النبیینی میں مداخلت یا سرقہ نہیں گوارا کر سکتے۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یہ چوٹ نہیں سہہ سکتے ہیں، اور یہ عظیم ترین حادثہ ہے کہ پاکستان میں ختم نبوت کے سارقین موجود ہیں۔ ان کے بعض افراد کو مسلمانوں کے حقوق میں سے حقوق ملتے ہیں اور وہ بین الاقوامی اداروں میں بھی مسلمانوں کے نمائندہ کہلاتے ہیں۔

منیر انکوائری رپورٹ بڑے ہی فاضل ججوں نے لکھی ہے، لیکن اس رپورٹ پر دشمنانِ اسلام و نبوت کے سوا کسی نے صاد نہیں کیا۔ حقیقت یہی ہے اور جیسا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یہ رپورٹ تیرہ سو برس میں مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں ہی کے قلم سے سب سے بڑی دستاویز لکھی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال بارایٹ لا نے اپنی ایک تالیف میں اس رپورٹ کی اشاعت روک دینے کا مطالبہ کیا ہے، اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس رپورٹ نے کوئی سا مقصد بھی حل نہیں کیا ہے۔

دماغی بددیانتیوں کی حد ہے کہ جو لوگ علامہ اقبالؒ کے نام سے مختلف قسم کی روایتیں بیان کرتے ہیں، اور جن کی زبان انھیں ترجمانِ اسلام کہتے ہوئے بھی نہیں تھکتی ہے، وہ علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ سے فرضی خطوط اور خانہ ساز بیان منسوب کرتے ہوئے بزعم خویش بڑے کروفر کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جن چیزوں کو حضرت علامہ قدس سرہ العزیز نے اسلام اور نفس اسلام کے لیے خطرہ قرار دیا ہے، ان سے نہ صرف علامہ اقبالؒ کے یہ ''ترجمان'' چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ علامہ اقبال کی ان تحریروں اور افکار ہی کو ختم کر دیا جائے اور یا ان کی ایسی تعبیر کی جائے کہ مطالب کا اصل چہرہ مسخ ہو جائے۔

علامہ اقبالؒ نے 10 جون 1935ء کے سٹیٹسمین میں لکھا تھا کہ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ افسوس کہ جس محمد عربی ﷺ کے نام پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا، وہاں قادیانیوں کی علیحدگی کا سوال تو شدت سے موجود ہے، لیکن جواب انگریزوں کی حکومت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری لیڈر شپ نے اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا، وہ لوگ جو انگریزوں کے وقت سے سول سروس کے ستون تھے، ملک کی آزادی کے ستون ہی نہ رہے، بلکہ پوری بنیاد اور عمارت ہو گئے، اور بہمہ وجوہ انھوں نے قادیانی مسئلہ کو غتر بود کر دیا، بلکہ اس مسئلہ کے نام لیواؤں کو جنونی سے لے کر غدار تک کہا، حالانکہ وہ ان الفاظ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ہر وہ بات حق ہے جو انگریزی حکومت کے نزدیک حق رہی ہے، اور ہر وہ بات باطل ہے، جسے وہ باطل کہہ گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان رسول عربی ﷺ (فداہ امی وابی) کے ننگ وناموس کی حفاظت کے معاملہ میں جنونی ہے اور جنون ہی وہ دولت ہے جو مؤقف یا نصب العین کو پروان چڑھاتی ہے یا جس سے عشق ومذہب کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ رہا غدار کا لفظ تو جب اس کا استعمال انگریزی عہد کے ستون کرتے ہیں، تو اس وقت تاریخ کی شرافت کا چہرہ داغدار ہوجاتا ہے۔

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے جو دنیا کے بعض بڑے آدمیوں نے ان کے نام وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، اس میں 21 جون 1936ء کا ایک خط ہے، اس میں حضرت علامہ لکھتے ہیں:

- ''(قادیانی مذہب کے خلاف) میں نے یہ مقالہ اسلام اور ہندوستان کے ساتھ بہترین نیتوں اور نیک ترین ارادوں میں ڈوب کر لکھا تھا، میں اس باب میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ یہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔''

کسی دعویدار پاکستانی محبّ الوطن کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس خط کو حضرت علامہ کے مجموعۂ مکاتیب میں شامل کرتا۔ تاہم اقبال کے الفاظ میں

''یہ حکایتِ دراز ایک طاقتور قلم کی منتظر ہے''

(ہفت روزہ چٹان۔ 21 جنوری 1963ء)

پانچ ہزار روپیہ

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ نے فرمایا تھا کہ قادیانی مذہب کا تجزیہ وتاریخ ایک طاقت ور قلم کے منتظر ہیں۔ 1799ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے، اس کی روشنی ہی میں قادیانیت کے اصل مظروف تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ سال وہ تھا جب ٹیپو کو شکست ہوئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی نفوذ کی آخری امید منقطع ہوگئی۔ علامہ اقبال نے اپنے پہلے بیان میں اس امر کی ضرورت کو محسوس کر کے اظہار کیا تھا کہ قادیانیت سے مذہبی بحث میں الجھنا عبث ہے۔ اصلی چیز تحریک قادیانیت کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ ان کے نزدیک یہ تمام تر سیاسی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے لیے نبوت کے نام پر برطانوی غلامی کے طوق مہیا کیے اور الہام کی بنیاد پر مسلمانوں میں فسخ جہاد کا نظریہ رائج کرنا چاہا...... جب تک ہم اس عہد کے سیاسی حالات پر نگاہ نہ رکھیں اور ان احوال وظروف کو معلوم نہ کرلیں جو اس وقت کے ہندوستانی

مسلمانوں کی ملی زندگی کا جز و غیر منفک ہو رہے تھے، اس وقت تک ہم قادیانی جماعت کی تاریخ اوراس کا تجزیہ نہیں کر سکتے ہیں۔قادیانی جماعت پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی، یہ سوال بھی کسی طاقت ور قلم کے تجزیہ و تحلیل کا منتظر ہے اوران شاءاللہ کسی دور میں یہ نقاب اٹھ کے رہے گا۔تاہم یہ امور یا نکات اب ڈھکے چھپے نہیں رہے کہ قادیانی جماعت نے انگریزوں کے بہترین خدمت گزار پیدا کیے۔اس فرقے نے نہ صرف انگریزوں کے وثیقۂ غلامی کا جواز پیدا کیا بلکہ اپنی جماعت سے باہر کے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر اخوتِ اسلام کے اس تصور کو ہلاک کرنا چاہا جو محمد عربی ﷺ کے کاشانۂ نبوت سے پیدا ہوا تھا۔اس امر کے شواہد و نظائر بھی موجود ہیں کہ قادیانی جماعت کے ارکان غیر ملکوں میں جاسوسی فرائض انجام دیتے رہے اور مسلمانوں کی بعض قومی تحریکوں کو داخلی طور پر ختم کرنے یا رسوا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ایسا شخص جو مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا طالب علم ہو اور اس کی نگاہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر ان کے اخراج تک کے حالات پر ہو، نیز اس کو اس امر کی تحقیق کا بھی شوق ہو کہ اس عرصہ میں انگریزوں کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری............غرض علامہ اقبال کی مہیا کردہ بنیادوں پر قادیانیت کے سیاسی تجزیہ و تاریخ کو مرتب کرنے والا شخص نہ صرف اپنے اس عظیم کارنامہ کے لیے تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہوگا بلکہ اس کے لیے اللہ اور اس کے حضور ﷺ کی بارگاہ میں بڑا اجر ہے۔اس کی یہ کتاب تاریخ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگی۔ایڈیٹر چٹان کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ اس کتاب کے مرتب و مصنف کو کتاب کے معیاری و مستند ہونے پر اپنی جیب سے پانچ ہزار روپیہ نقد دیں گے۔ہم چندہ فراہم کرنے کے عادی نہیں اور نہ ہم اس عنوان سے عطیات کے قائل ہیں، ورنہ اس رقم میں دوگنا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔جہاں تک کتاب کے انتخاب کا تعلق ہے یہ کتاب چار مختلف ججوں کے پاس بھیجی جائے گی اور وہ اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ کتاب واقعی تاریخ و تجزیہ کے اس معیار پر پوری اترتی ہے، جس کی نشان دہی حضرت علامہ اقبال نے کی ہے۔ان چاروں ججوں کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور شیخ حسام الدین یہ فرض انجام دیں گے تو ہر لحاظ سے وہ اس منصب کے اہل ہیں۔ایڈیٹر چٹان کتاب کا فیصلہ ہوتے ہی یہ رقم ان کے حوالہ کر دے گا۔اس غرض سے دو سال کی مدت کافی ہوگی۔اواخر اپریل 1967ء تک

جو صاحب قلم اٹھائیں، اپنے رشحات و کاوشات ایڈیٹر چٹان کی وساطت سے ان ججوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان ججوں کو عذر و انکار نہ ہو، عذر و انکار کی صورت میں کسی دوسرے بزرگ کا انتخاب ہو جائے گا۔ اللہ کرے یہ تاریخ تیار ہو جائے۔ (ہفت روزہ چٹان۔ 12 اپریل 1965ء)

دانش گاہِ پنجاب میں مسند اقبال

یہ خبر آئی اور نکل گئی کہ پنجاب یونیورسٹی کے ''دانش مندوں'' نے علامہ اقبال کے نام پر جو Chair قائم کی ہے، اس کو شعبہ فلسفہ کے رئیس پروفیسر قاضی محمد اسلم کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ پروفیسر موصوف ظاہر و باطن قادیانی ہیں۔ ان میں وہ تمام عصبیتیں بہ درجہ آخر موجود ہیں، جو ایک قادیانی کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح گردش کرتی ہیں۔ قاضی صاحب قادیانی + ربوہ کی نبوت اور مرزا بشیر الدین محمود کی خلافت پر حاضر و غائب ایمان رکھتے ہیں، بلکہ ان کے فکر و نظر کا تار و پود بھی اس سے تیار ہوا ہے۔ اپنے اس عقیدہ کو وہ چھپاتے نہیں ہیں، انھیں اس کا اقرار و اعتراف ہے۔ اس کے باوجود مسندِ اقبال کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔

کیا یہ بے خبری میں ہوا ہے؟ یا جن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے وہ اس سے بھی آگاہ تھے کہ علامہ اقبال کے نظریات اور قاضی محمد اسلم کے معتقدات میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمتوں کے راہرو ہیں۔

اگر یہ فیصلہ بے خبری میں ہوا ہے تو اس سے زیادہ افسوسناک بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے کارپرداز ملک کے سب سے بڑے مفکر کے افکار و نظریات سے اتنے بے خبر ہیں یا جس شخص کے حوالہ سے اس کے افکار و نظریات کی تعلیم و تدریس کی جارہی ہے، یونیورسٹی اس کے دینی حدود اربعہ سے ناواقف ہے۔

اور اگر ان کارپردازوں کے علم میں تھا کہ علامہ اقبال اور قاضی محمد اسلم کے معتقدات میں کوئی میل نہیں، صبح و شام کا فاصلہ ہے، تو انھوں نے یہ مذاق کیوں روا رکھا ہے؟ مقصد فکر اقبال کو سبوتاژ کرنا ہے یا اسے عام کرنا ہے۔ کیا یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو قاضی محمد اسلم سے بڑھ کر پورے ملک میں ایک شخص بھی اقبال کا ادا شناس نظر نہیں آیا؟ قاضی محمد اسلم کی نگرانی میں فکر اقبال کا مطلب ہے، حسینؑ کی شہ رگ پر یزید کا خنجر۔ قاضی محمد اسلم ہی سے دریافت کر لیا ہوتا کہ وہ اقبال کی تعلیمات سے بکمال و تمام متفق ہیں؟ حضرت علامہ کو فکری اعتبار سے مسلمانوں کی

نشاۃ ثانیہ کا راہنما تسلیم کرتے ہیں؟ ان کے نزدیک اقبال کے فکر ونظر کا مقام کیا ہے؟ اقبال کے خطبات بہ عنوان تشکیلِ جدید الٰہیات کے مندرجات کی روح سے انھیں کس حد تک اتفاق ہے؟ مرزائیوں کے بارے میں حضرت علامہ نے جو بیانات دیے تھے، اور جن مقالات کو حوالہ قلم کیا، قاضی صاحب محترم کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ قاضی صاحب کے نزدیک شاہراہِ اسلام پر اقبال کا درجہ کیا ہے؟ ''احمدیوں'' کو اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی صاحب کا اقبال کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ اقبال کو مسلمان بھی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ان کے نزدیک اقبال اور غلام احمد قادیانی میں سے کونسی شخصیت اس صدی میں اسلام کی راہنما ہے؟ اس قسم کے بیسیوں سوالات موجود ہیں، اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ قاضی صاحب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت اور مرزا بشیر الدین محمود کی خلافت کو خارج کر کے ان سوالات پر سوچ ہی نہیں سکتے ہیں۔ جب اتنی واضح اور واشگاف صورت حال موجود ہو، تو اقبال کی فکر کو ان کے حوالے کرنا حادثہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جیسا کہ انگریزی میں ضرب المثل ہے کہ ''شیطان بائبل کا حافظ ہو گیا ہے؟'' ہم نہیں کہہ سکتے کہ قاضی صاحب نے یہ منصب کیونکر قبول کیا؟ اور اس کے تہہ منظر کون سے مقاصد کارفرما ہیں۔ کل کلاں کوئی شخص یہ تجویز کرے، اور علم و دانش کے وہ پتلے جو اس ملک میں عام پائے جاتے ہیں، اس پر صاد کر دیں کہ قائداعظم کی سوانح عمری، مولانا مظہر علی اظہر لکھیں، یا انجمن ترقی اردو کی باگ ڈور بھارت کی ہندی پرچارنی سبھا کے حوالے کر دی جائے، یا اسلام کی تعبیر و تفسیر کا کام پرشوتم داس ٹنڈن کی نگرانی میں ہو، یا کعبہ اور اس کی عظمت پر ماسٹر تارا سنگھ مقالہ (Thesis) لکھیں، تو کیا عقل سلیم کے نزدیک یہ صحیح ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہر شخص جو حواسِ خمسہ سے بہرہ یاب ہے، اس کو مضحک المیہ قرار دے گا۔

معلوم ہوتا ہے یونیورسٹی کے کارپردازوں کی اکثریت حسیاتِ دین اور روحِ اسلام سے نابلد ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلام صرف ان کے اسلامی ناموں اور معاشرتی رواجوں کے اظہار و اقرار کا نام ہے، اور دین و دانش کا جوہر، فہم و فراست کے اس مغز کا نام ہے جو اس کھیپ کی کھوپڑیوں میں اپنا ایک خاص طول و عرض رکھتا ہے۔

علامہ اقبال نے عمر بھر یورپی دانش و علم کی کارفرمائیوں کا ماتم کیا، اور جو لوگ اسی کے ہو گئے ہیں، یعنی جن کا پیکرِ خاکی یورپی عمارت گروں کا تیار کردہ ہے، ان کے خلاف ہمیشہ نالۂ

احتجاج بلند کیا۔ ان کی نظمیں، ان کی تحریریں، ان کے بیان، ان کے خطوط آخر دم تک یورپی تصویروں اور مصوروں کا ماتم کرتے رہے۔ سید سلیمان ندوی کو انھوں نے 17 ستمبر 1933ء کے ایک خط میں لکھا کہ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔ (''اقبال نامہ'' صفحہ 168) یہی نہیں بلکہ ان کے بیشمار خطوط میں بار بار یہ اضطراب موجود ہے کہ مسلمانوں کے وہ ''دانشورانِ بے دین''، جن کی تربیت یورپی دانش وحکمت کے گہوارہ میں ہوئی ہے اور جن کے علم ونظر کی معراج یورپی فلسفہ وفکر پر ہے، نہ صرف روح اسلام سے بے بہرہ ہیں، بلکہ عملاً اسلام سے صرف سیاسی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس کے دینی فرائض کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوسری جگہ علامہ اقبال نے اس طبقہ کو بے حمیت اور بے غیرت لکھا ہے کیونکہ یورپی عقل ودانش سے مرعوب ہو کر یہ اسلام کے معاملہ میں ہر نئی تعبیر سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار رہتے، اور اس کے مقابلہ میں سپر انداز ہونے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ اقبال کی بعض چیزوں کو تو اپنے حسب حال پا کر قومی تقاضوں کا جزو قرار دیا گیا ہے، اور بعض ایسی چیزیں جو اقبال کے نزدیک اسلام کی حیاتِ تازہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے لازم وملزوم تھیں، انھیں طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال کی بدنصیبی ہے یا مسلمانوں یا پھر اسلام کے دورِ انحطاط کے برگ وبار کہ اقبال کی فکر عنقا ہے۔ پوست موجود ہے، مغز غائب ہے۔ ہڈیوں سے رشتہ باندھا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اقبال اور اس کی فکر سے نہیں بلکہ اپنے کسی خلا کو پورا کرنے کے لیے اقبال کا نام لے رہے ہیں۔

قادیانیوں کے بارے میں اقبال نے جو کچھ کہا، وہ کسی اہم دینی مسئلہ پر ان کی سب سے بڑی تحریر ہے۔ یہ تحریر اس وقت قلمبند ہوئی اور سامنے آئی، جب وہ اپنی عمر عزیز گزار چکے تھے، بڑے غور وخوض کے بعد انھوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا تھا۔ ان کی یہ تحریر ہمہ جہت مکمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت یہ ملک غلام تھا، اور پاکستان بھی معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ پاکستان کا تصور وہ پیش کر چکے تھے، لیکن ابھی مسلم لیگ نے بھی اس کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان نے گول میز کانفرنس کے ضمنی اجلاس میں اس تصور کو احمقانہ تخیل قرار دیا تھا۔

جواہر لال نہرو قادیانی جماعت کی حمایت میں کمر بستہ ہو کر سامنے آئے، تو علامہ نے

بصیرت افروز مقالہ میں قادیانی جماعت کا تارو پود بکھیر دیا، اور اس حقیقت کو اچھی طرح افشاء کیا کہ اس جماعت کو مسلمانوں سے الگ رکھنا کیوں ضروری ہے۔ یہ تحریریں ڈھکی چھپی نہیں، عام ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا، جو ان کے نام بعض اکابر نے لکھے تھے۔ ان خطوط میں علامہ اقبال کا بھی ایک خط ہے، جس میں انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ قادیانی اسلام ہی کے نہیں بلکہ ہندوستان کے بھی غدار ہیں۔ یہ خط ان کے مرض الموت میں مبتلا ہونے سے کچھ ہی دن پہلے کا ہے۔

اقبال نے جب اس فرقۂ ضالہ کے احوال وظروف معلوم کر لیے، تو سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ انھیں خارج از اسلام قرار دے کر انجمن حمایت اسلام سے نکلوا ڈالا۔ اس ضمن میں انھوں نے لاہوری اور قادیانی گروہوں کی تفریق کو بھی تسلیم نہ کیا۔ دونوں کو ایک ہی تھیلی کا پتہ سمجھا۔

20 جون 1933ء کو انھوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا، اور ایک زبردست بیان میں قادیانی جماعت کے اغراض و مقاصد کا پردہ چاک کیا۔ پھر 2 اکتوبر 1933ء کے بیان میں قادیانیوں کی دو ذہنی اور دو عملی کی چھتاڑ کی۔ 1935ء میں قادیانی جماعت کے چہرے سے ہر نقاب اٹھا دی اور کھلے بندوں اعلان کیا کہ دینی اور سیاسی دونوں بنیادیں اس امر کی مقتضی ہیں کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ علامہ نے جو کچھ سپرد قلم کیا، وہ علم وفکر کی بنیاد پر تھا، اور آج تک کسی اسلامی گوشے سے بھی اس کے خلاف کوئی کلمہ نہیں نکلا ہے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں:

1- ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود ان تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، جو اس کے الہامات پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں، ایسی جماعت کو مسلمان اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کریں گے، کیونکہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

2- مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے اور نہ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کے تاریخی اور مذہبی ادب میں ملتی ہے۔ بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن قادیانیت اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور

مقاصد کے لیے مہلک ہے۔

3- نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔مغربیت کی ہوا نے انھیں حفظ نفس کے جذبے سے عاری کر دیا ہے۔

4- ہندوستان میں کوئی سا مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر اس طرح ایک نئی جماعت کھڑی کرسکتا ہے۔

5- جو لوگ مسلمانوں کو اس معاملے میں رواداری کا سبق دیتے ہیں، ان کے بارے میں حضرت علامہ کا ارشاد ہے کہ یہ کیونکر مناسب ہے کہ اصلی جماعت کو تو رواداری کی تلقین کی جائے، حالانکہ اس کی وحدت خطرے میں ہو، باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو، اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔ جس قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ معاند قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے۔

6- میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان اس سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا، جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔

(ماخوذ از قادیانی اور جمہور مسلمان صفحہ 121 تا 134 حرف اقبال مطبوعہ المنار اکادمی۔ لاہور)

حضرت علامہ کے اس بیان پر ''سٹیٹسمین'' کے انگریز ایڈیٹر نے اپنے اداریے میں تنقید کی۔ اس تنقید پر حضرت علامہ نے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا جو 10 جون 1935ء کی اشاعت میں طبع ہوا۔ اس خط میں حضرت علامہ نے اپنے مطالبہ کا اعادہ کیا۔

فرمایا کہ............

1- حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے، اور اس امر کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب یہ مطالبہ کرتے ہیں۔

2- ختم نبوت کے مفہوم کی تاویلیں اور تعبیریں قادیانی اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہوتا کہ انھیں اس طرح سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، تو پھر سیاسی طور پر

مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟

3- ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا، تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔

اس تحریک میں قادیانیوں کو سب سے پہلے اس وقت کے انگریز گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کی حمایت حاصل ہوئی، پھر ''سٹیٹسمین'' کے انگریز ایڈیٹر نے پشت پناہی کی۔ آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو مدافع کے طور پر سامنے آئے۔ انھوں نے ماڈرن ریویو کلکتہ میں تین مضامین لکھے، جن میں بزعم خود مسلمانوں کے مذہبی افکار کا تجزیہ کرنا چاہا اور اس تجزیے میں اس اصل کے پیش نظر قادیانی جماعت کی مدافعت کی کہ پیغمبر عرب کے مقابلے میں غلام احمد بہر حال ایک ہندوستانی پیغمبر ہے۔ حضرت علامہ نے جواب میں ایک طویل مقالہ لکھا ہے، جس کے بعض ضروری اجزاء حسب ذیل ہیں:

1- پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بناء پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

2- قادیانی جماعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ پیغمبر عرب ﷺ کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کرنا چاہتی ہے۔

3- جب کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظام اجتماعی خطرے میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزادانہ اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔ یہ اس کا فرض ہو جاتا ہے۔

4- آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جو مسلمان کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو ملت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام باعث انتشار ہونے کے بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

5- وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے، جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔

6- 1799ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے، اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر ہے۔

7- مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے۔

8- وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

9- یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے۔ لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے، جو اسلام کو مضبوط کرنا چاہتی ہے۔

10- اسلامی وحدت مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت متزلزل ہوتی ہے، جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکانِ شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔

(ماخوذ از حرفِ اقبال صفحہ 138، مطبوعہ المنار اکادمی۔ لاہور)

پروفیسر قاضی محمد اسلم کا تقرران ثقہ حوالوں اور واضح نظریوں کے بعد بالکل ہی بے محل ہو جاتا ہے۔ ادھر شروع میں جو سوال ہم نے قائم کیے تھے، ایک ایک کر کے جواب کے خواہاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ قاضی صاحب جس جماعت کے صحابی یا تابعی ہیں، اس کی نفی نہیں کر سکتے اور نہ اس کے خلاف کسی ایسے شخص کے ساتھ مخلص ہو سکتے ہیں، جو ان کے مذہب، نبی، گروہ اور عقیدہ پر مندرجہ بالا الفاظ میں تجزیہ کر چکا ہو اور آخری وقت تک مُصر رہا ہو کہ اس جماعت کو اسلام کا باغی سمجھا جائے اور اس بغاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ایک علیحدہ ملت قرار دیا جائے اور اگر انگریزی حکومت کو یہ تسلیم کرنے میں بہ مصلحت ہچکچاہٹ ہو تو آنے والی اسلامی ریاست مجبور ہوگی کہ اس فرض سے عہدہ برآ ہو کیونکہ اسلام اپنے دائرے میں ایسے کسی باغی کو تسلیم نہیں کرتا ہے، جو

اس کے گھر میں نقب زنی کا مرتکب ہو۔

اس ضمن میں کچھ نئے سوالات بھی پیدا ہوئے ہیں:

1- قاضی صاحب کے ایک خلافتی عزیز مرزا بشیر الدین محمود کے پوتے اور مرزا ناصر کے بیٹے یونیورسٹی میں فلسفہ کی تکمیل کر رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ دن ہوئے ہیں اپنی ساتھی طلبہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ اقبال کا شہرہ 70ء، 71ء تک ہے۔ اس کے بعد اقبال کے لیے زوال ہے اور جو، ان کے نزدیک شروع ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قاضی محمد اسلم نے شاید اسی مفروضہ پر یہ فرض اپنے فرائض میں شامل کیا ہے۔ ہمارے اپنے علم و آ گاہی کے مطابق قاضی محمد اسلم صاحب اقبال کے نظر و فکر سے مطلقاً آ شنا نہیں۔ انھیں اقبال کے اشعار بھی صحیح پڑھنے نہیں آتے ہیں، نہ وہ ان صداقتوں اور نزاکتوں سے آ گاہ ہیں جو اقبال کے کلام کی روح ہیں اور ان کی تحریروں کے مطالب کی پیشانی کا جھومر ہیں۔ ان کی نظر سے شاید اقبال کے کلام و پیام کا پورا حصہ نہیں گزرا۔ وہ اقبال کی مصطلحات کے مفہوم ہی سے بے بہرہ ہیں۔ اپنے عقائد کی بوقلمونی (اور ہمارے نزدیک خرابی) کے باعث اقبال کے ذوق وشوق کو سمجھنے کی استطاعت سے محروم ہیں۔ وہ یورپی فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ انھیں اس کا احساس ہی نہیں کہ اقبال مغربی فلسفہ کا نقاد ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں جن اسلامی شخصیتوں اور دینی مصطلحات کو بے تکلف استعمال کیا ہے اور اس سے جن نتائج کا استخراج کیا ہے، قاضی صاحب اپنے عقیدہ کی رو سے اس کے مخالف ہیں اور اپنے دماغی نشو کی وجہ سے اس کا فہم نہیں رکھتے۔ پھر جس عقیدہ وفکر کو اقبال جس ایمان و آگہی سے مانتا ہے، قاضی صاحب اس عقیدہ وفکر کو اس انداز واسلوب سے نہیں مانتے۔ یہ اختلاف وتضاد بنیادی ہے۔ قاضی صاحب کا ضمیر تو اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوگا، لیکن یونیورسٹی کے جن دانشوروں نے انھیں اس خدمت پر مامور کیا ہے، افسوس ہے کہ وہ اوّلاً اس کے فہم ہی سے قاصر ہیں۔ ثانیاً اس کی نزاکت واہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ثالثاً اپنی ذات کے سوا ہر معاملہ میں روادار واقع ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے جب اسلام کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں سے سیکھا ہے تو اقبال کو ایک قادیانی کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ انھیں مطلقاً

خبر نہیں کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی اور آتی ہے تو ہم گیر ہو جاتی ہے۔
ہمارے یہ دانشور اسی گمراہی کا شکار ہیں۔

''ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری اشترا کی کی ہے، جس کے نزدیک تمام یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے، جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے...... (معلوم ہوتا ہے، دانش گاہ پنجاب کے بیشتر کار پرداز اسی قبیلہ کے فرد ہیں) ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت جو اس کی محبوب اشیا، یا اشخاص پر روا رکھی جاتی ہے ''برداشت کر لیتا ہے''(گبن)

اس آخری رواداری کا ہدف ان دنوں مسلمانوں کا سواد اعظم ہے۔ فی الجملہ اس تقریر پر ہم کسے مخاطب کریں۔ یونیورسٹی کے ان کار پردازوں کو جو اس تقریر کا باعث ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کے بھائی پروفیسر حمید احمد خان کو جو اقبال سے معنوی اور ظفر علی خان سے خونی رشتہ رکھنے کے باوجود اس فتنہ پر غور نہیں کر سکے ہیں، یا پھر ہم صوبہ کے راسخ العقیدہ مسلمان گورنر ملک امیر محمد خان سے درخواست کریں کہ وہ بحیثیت چانسلر اسلام اور اقبال کو یونیورسٹی کے ان بردہ فروشوں سے بچائیں، جن کی نیام میں کوئی تلوار نہیں ہے مگر اسلام کو اپنے اللے تللوں کی میراث سمجھتے ہیں، جن کی فکرِ مستعار پر پچرنگی مصلحتوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ 19 اپریل 1965ء)

جب علامہ اقبالؒ نے مرزائیوں کو انجمن حمایت اسلام سے نکالا

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ نے مرزائیوں کی دونوں شاخوں کو خارج از اسلام قرار دے کر انجمن حمایتِ اسلام کے دروازے ان پر بند کر دیے تھے۔ مرزائی لاہوری ہو، یا قادیانی، انجمن کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیلات انجمن کے تحریری ریکارڈ میں موجود ہیں۔ اس کے ایک عینی گواہ لاہور کے سب سے بڑے شہری میاں امیر الدین بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ یونیورسٹی کی ہیئت انتظامیہ کے بھی رکن ہیں۔ ان سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاسِ عام کی صدارت فرمانے لگے تو آپ نے سب سے پہلے کھڑے

ہو کر اعلان فرمایا کہ مسلمانوں کی اس انجمن کا کوئی مرزائی (لاہوری یا قادیانی) ممبر نہیں ہو سکتا ہے۔ مرزا غلام احمد کے متبعین کی یہ دونوں جماعتیں خارج از اسلام ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کرسی صدارت کے عین سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہی میاں امیر الدین فروکش تھے۔ حضرت علامہ نے ڈاکٹر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے صدر رکھنا ہے تو اس شخص کو نکال دو...... مرزا صاحب لاہوری جماعت کے پیرو تھے۔ حضرت علامہؒ کے اس اعلان سے تھرا گئے، کانپ اٹھے، جز بز ہوئے، کچھ کہنا چاہا حتیٰ کہ ان کا رنگ فق ہو گیا۔ حضرت علامہؒ مصر رہے کہ اس شخص کو یہاں سے جانا ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، بیک بنی دو گوش نکال دیے گئے۔ ان کی طبیعت پر اس اخراج کا یہ اثر ہوا کہ بے حواس ہو گئے، دو چار دن ہی میں مرض الموت نے آلیا اور اس صدمہ کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے......!

پنجاب یونیورسٹی کے دانشور (؟) بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے مسندِ اقبال کس بناء پر ایک قادیانی کے حوالے کی ہے۔ علامہ اقبال کی عظمت مقصود ہے یا اہانت؟ جس انسان نے اپنی صدارت میں ایک مرزائی کا وجود گوارا نہ کیا ہو اس کے فکر کی صدارت کسی قادیانی کے حوالے کر دینا ہمارے نزدیک ایک خوفناک جسارت سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ 19 اپریل 1965ء)

قاضی محمد اسلم اور مسندِ اقبالؒ

روزنامہ ''نوائے وقت'' کا اداریہ، بہ عنوان ''غلط بخشی'' مورخہ 16 اپریل 1965ء۔

پنجاب یونیورسٹی میں مسندِ اقبال کے اہتمام کا فیصلہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ علامہ اقبالؒ نظریۂ پاکستان کے خالق اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے راہ نما ہیں۔ چنانچہ فکری افلاس کے اس دور میں ان کے پیغام اور افکار کو عام کرنے کا عزم وقت کی اہم ترین ضرورت ہی نہیں، ملک و قوم اور اسلام کی بہت بڑی خدمت بھی ہے۔ ہمیں یہ حسن ظن تھا کہ جن ارباب اختیار نے ایک انتہائی مستحسن فیصلہ کرنے کا لازوال اعزاز حاصل کیا ہے، وہ نئے منصب پر کسی موزوں شخصیت کو فائز کرنے کی سعادت بھی حاصل کریں گے۔ یہ کام چنداں دشوار بھی نہیں تھا کیونکہ اس گئے گزرے دور میں بھی ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کوئی کمی نہیں تھی جو نہ صرف تعلیمات اقبال کی حقیقی روح سے پوری طرح آگاہ ہیں بلکہ انھیں خود بھی اسلام کے فلسفی شاعر کی صحبتوں سے استفادہ کے

مواقع حاصل ہوئے۔لیکن اس انکشاف نے اقبال کے ہر شیدائی اور دردمند مسلمان کو اذیت ناک مایوسی اور اضطراب میں مبتلا کر دیا کہ حکیم الامت کے پیغام اور فلسفہ کو فروغ دینے کی ذمہ داری جن صاحب کو تفویض کی گئی ہے انھوں نے یونیورسٹی میں یورپی فلسفہ پر تو سینکڑوں لیکچر دیے ہوں گے اور بیسیوں کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہوگا، لیکن وہ عقیدتاً اسلام کے اس فلسفہ سے یقیناً بے بہرہ ہوں گے جو پیغام اقبال کی روح اور اساس ہے۔ یہ انتخاب ایسا ہی ہے جیسا کہ یورپ کے کسی مستشرق کو سیرت و قرآن کی تعبیرات اور توضیحات کے کام پر مامور کر کے مؤثر نتائج کی توقع کی جائے بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ مسندِ اقبال سنبھالنے والے پروفیسر قاضی محمد اسلم سے بھی اگر یہ دریافت کیا جائے کہ آیا کوئی مستشرق قادیانیت کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کر سکتا ہے؟ تو ان کا جواب بھی نفی میں ہوگا۔قاضی صاحب کے فرقہ کے متعلق حکیم الامت کا جو موقف رہا، کیا اس کے پیش نظر آپ کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ اپنے نئے منصب سے انصاف کر سکیں؟ اقبالؒ سب مسلمانوں کی طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو خاتم النبیین خیال کرتے تھے۔ان کے نزدیک نبوت کی کوئی نوع نہیں۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا......

اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایام کرد

اس نظر انتخاب سے تو اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ یونیورسٹی کے حل و عقد نے ایک قومی تقاضہ پورا کرنے کے بجائے محض ایک آسامی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونیورسٹی حکام سے کوئی اپیل اب عبث معلوم ہوتی ہے البتہ ہم قاضی صاحب سے یہ کہیں گے کہ انھوں نے مسند اقبال کی سربراہی قبول کر کے اپنے آپ کو بھی بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔لہٰذا مناسب یہی ہوگا کہ وہ خود ہی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔(ہفت روزہ چٹان۔19 اپریل 1965ء)

یونیورسٹی کی شاہکار معذرت

پنجاب یونیورسٹی میں مسند اقبال کو ایک قادیانی پروفیسر کے حوالے کرنے پر ہم نے جو کچھ عرض کیا تھا، ''نوائے وقت'' نے اپنے الفاظ میں ہمنوائی کی، یونیورسٹی کے دانشوروں نے دوسرے ہی دن ایک وضاحتی بیان ارسال کیا، جو روزناموں میں چھپ چکا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بیان 'عذرِ گناہ بدتر از گناہ' کے رنگ و روغن کی ایک اچھوتی بانگی ہے۔ آج ''کوہستان'' اور

''امروز'' نے بھی ہمارے خیال کی توثیق کی ہے۔

اگر مسندِ اقبال قائم کرنے کا مقصد فلسفہ کے نگارخانے میں محض ان کے نام کی عظمت کا اقرار واعتراف ہے اور تعلیماتِ اقبال کی تعلیم وتشریح سے اس کا کوئی تعلق نہیں، تو یہ امر اور بھی افسوسناک ہے۔ اقبال اس اقرار واعتراف کے محتاج نہیں۔ کوئی سا شخص اس عنوان سے اشکبار نہ تھا، کہ یونیورسٹی اس انداز میں اشک شوئی کرتی ہے۔ اقبال کے نام پر مسند محض کا قیام کوئی چیز نہیں۔

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یونیورسٹی کے اربابِ انتظام نے وضاحتی بیان دے کر خود اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دی ہے کہ مسندِ اقبال صرف مسندِ اقبال ہے، فکر اقبال نہیں اور ظاہر ہے کہ عوام وخواص میں سے کوئی فرد بھی اس سے مطمئن نہیں۔

اور اگر مسندِ اقبال قائم کرنے کا مقصد واقعی اقبال کے افکار وسوانح اور تعلیمات ونظریات کی تعلیم وتدریس ہے تو پھر یونیورسٹی کا وضاحتی بیان خود اپنے مطالب کی رو سے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو شخص حکمت اقبال کی نگرانی پر مامور ہوا ہے، وہ اس منصب کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں شخص ہے۔ ہم نے قادیانی جماعت کے بارے میں علامہ اقبال کے جو نظریات پیش کیے ہیں، سوال یہ ہے کہ یونیورسٹی کے کارپردازوں اور قاضی محمد اسلم کے اعوان وانصار کا اس بارے میں مسلک کیا ہے؟

کیا یونیورسٹی علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ کے ان افکار کو غلط سمجھتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ یہ حوصلہ نہیں کرسکتی اور اگر صحیح سمجھتی ہے، تو اس نے ایک قادیانی پروفیسر کو اس منصب پر فائز کیوں کیا؟ اور اگر اس نے مداہنت کی ہے تو یہ اقبال واسلام کی روح کے ساتھ بزدلانہ مذاق ہے۔ آخر قاضی محمد اسلم خود ہی مستعفی کیوں نہیں ہوجاتے، جبکہ وہ اس بات سے کماحقہ واقف ہیں کہ علامہ اقبال ان کے نبی کو متنبّی اور ان کی جماعت کو خارج از اسلام سمجھتے تھے۔ (ہفت روزہ چٹان۔ 26 اپریل 1965ء)

''الفضل'' کی اچھوتی بانکی

ہم نے گذشتہ سے پیوستہ شمارے میں اعلان کیا تھا جو اہل قلم علامہ اقبالؒ کے فرمودات کی روشنی میں قادیانی جماعت کے احوال وظروف پر مقالہ (Thesis) تیار کرے گا جس سے

اس جماعت کی ایجاد کے اسباب ووجوہ معلوم ہوں اوراس امر کی تصدیق ہوتی ہو کہ اس جماعت کو خاص مقاصد ومصالح کے تحت برطانوی سرکار نے پروان چڑھایا تھا، ایڈیٹر ’’چٹان‘‘ بہترین مقالہ کے مصنف کو مقررہ ججوں کے فصلہ پر اپنی جیب سے پانچ ہزارروپیہ نقد انعام دیں گے۔ ’’الفضل‘‘ کے لیے ’’چٹان‘‘ کا نام سوہان روح ہے، چونکہ ’’چٹان‘‘، کے اسی شمارے میں قادیانی پروفیسر کے تقرر پر بھی احتجاج کیا گیا تھا۔ اس لیے ’’الفضل‘‘ مضطرب تھا کہ پنجہ آزما ہو، چنانچہ بھیگی بلی کی طرح اس نے غرانا چاہا ہے۔ لیکن اب کے تنہا نہیں آیا، اپنا پورا قبیلہ ساتھ لایا ہے۔ ’’پیغام صلح‘‘ چیخا ہے، ’’الفرقان‘‘ چلایا ہے۔ لاہور کا ایک ادبی ہفت روزہ بھی اس لشکر کے ہراول دستہ میں ہے۔ ہم ان میں سے کسی کو قابل التفات نہیں سمجھتے، یہ مسئلہ ان کے حدود سے باہر ہے، البتہ ’’الفضل‘‘ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا جواب دینا ضروری ہو گیا ہے۔

’’الفضل‘‘ کی تجویز یہ ہے کہ

’’احمدیوں اور مخالفین کے درمیان متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق ایک تحریری مباحثہ برپا کیا جائے۔ سات سات پرچے دونوں طرف سے ہوں۔ پھران جواب اور جواب الجوابوں کو تین زبانوں اردو، عربی انگریزی مشترکہ خرچ سے چھپوا کر لائبریریوں اور خاص افراد کو مفت بھیجا جائے۔ اس طرح ایک دفعہ فیصلہ ہو جائے گا۔‘‘

دیکھا آپ نے، اسے کہتے ہیں ’’ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ‘‘ سوال گندم جواب ریسماں، یہ کمال صرف قادیانی نبوت کو حاصل ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جوا اور سٹہ کھیلتی ہے اوراس کی نبوت کا دارومدار قماربازی پر ہے۔

قادیانی مسئلہ پر علامہ اقبال کے بیانات موجود ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اوران کے علاوہ کئی اکابر کی تحریریں موجود ہیں۔ ان کا جواب کہاں ہے؟ کہ فرار وگریز کی نئی راہیں تیار کی جارہی ہیں۔ (ہفت روزہ چٹان۔ 26 اپریل 1965ء)

اقبال کے بگلا بھگت

علامہ اقبال نے عمر بھر شاہینوں کی آرزو کی، اور نوجوانوں کو مرد کامل کے اوصاف پیدا کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ انھیں عقاب اس لیے عزیز رہا کہ آزاد فضا میں اُڑتا ہے، بلند پرواز

ہوتا ہے، مردہ شکار نہیں کھاتا، آشیاں نہیں بناتا اور پرندوں میں سب سے زیادہ غیرت مند ہے، لیکن اقبال کے نام پر جن لوگوں نے اکیڈیمیاں بنالی ہیں، ان میں بگلا بھگت زیادہ ہیں...... بلکہ یوں کہیے کہ اقبال ان بگلا بھگتوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ ہمارے سامنے کراچی کی مجلس اقبال کا وہ مطبوعہ کتابچہ ہے، جس میں تین چوتھائی اشتہارات، باقی رطب و یابس ہے۔ یا پھر خاص دوستوں کا چرچا کرنے کے لیے اقبال کے ملفوظات، دو تین پرانے خطوط اور ایک کتاب سے اقتباس۔ اس میں ہے کیا؟

علامہ اقبال کھاتے کیا تھے؟ پہنتے کیا تھے؟ انھوں نے ساری زندگی میں تین دفعہ کوٹ پہنا۔ علی بخش ان کے لیے موٹا جھوٹا خرید لاتا تھا وغیرہ۔ علامہ اقبال کے حقیقی دوستوں کا بیان ہے کہ اس کا نوے فیصد حصہ غلط ہے اور جن صاحب نے علامہ اقبال کے کوٹ کی روایت بیان کی ہے، وہ علامہ اقبال کے ہاں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ کبھی ایک آدھ پھیرا ڈالا ہو تو الگ بات ہے اور اگر یہ درست بھی ہو تو رطب و یابس پر روپیہ ضائع کرنے سے فائدہ؟ آرٹ پیپر کا بے ڈھنگا مصرف ہے۔ صحیح مصرف تو اقبال کے افکار کی ترویج و اشاعت ہے، جس سے بگلا بھگت بھاگتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو علم ہے کہ مرزائی امت کی دونوں شاخیں علامہ اقبال کے خلاف یاوہ گوئی میں منہمک ہیں اور بگلا بھگت اپنے گریز و فرار سے ان کی تقویت کا باعث ہو رہے ہیں۔

لاہوری پارٹی کے ایک ماہنامہ ''روح اسلام'' نے مئی کے شمارے میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دفاع میں علامہ اقبال کے زمانہ طالب علمی کی ایک نظم شائع کی ہے۔ یہ نظم خود ساختہ ہی نہیں بلکہ پھسپھسی ہونے کے علاوہ لغو بھی ہے۔ اس قسم کے شوشے چھوڑنا...... مرزائیوں نے اپنا وظیفۂ حیات بنالیا ہے۔ لیکن بگلا بھگتوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کوئی صاحب دل اس پر روشنی ڈالیں گے کہ اس گریز و فرار اور اعراض و اجتناب کی وجہ کیا ہے؟

(ہفت روزہ چٹان۔ 29 مئی 1967ء)

قلم برداشتہ

مدیر چٹان نے چنیوٹ میں جو تقریر کی ہے، معلوم ہوا ہے اس سے مرزا کی امت حد درجہ پریشان ہے۔ سب سے پہلے لاہور کا ایک ہفتہ وار قادیانی، مسلم ٹاؤن کے عبدالسلام خورشید کی شہ

پر سامنے آیا۔اس نے مغلظات بکنا شروع کیں،اصل بحث سے گریز کیا اور ٹاپنے لگا۔چونکہ اس سے ہمکلامی ہمارے منصب سے فروتر ہے،لہٰذا ہم نے پہلے دن ہی سے اس کو مخاطب کرنا یا اس کی ژاژ خائی کا جواب دینا اپنی توہین سمجھا۔الفضل نے دیکھا کہ اس کا لاہوری پٹھا لائق اعتنا ہی نہیں تو عجمی اسرائیل کا یہ ٹینک فوراً میدان میں آ گیا۔اس نے اپنے ایشور مرزا ناصر کے خوانِ استدلال کی خوشہ چینی کرتے ہوئے چار دن تک اپنی نبوت کے حق میں وہی کھڑاگ رچایا جو استعماری طاقتوں نے اسرائیل کے حق میں رچا رکھا ہے۔اس کی ہم نوائی کو تل ابیب یعنی ربوہ کا الفرقان دیان بن کر نکلا ہے۔جناب ابوالعطاء جالندھری نے آٹھ صفحات میں زہر فشانی کی ہے۔

مدیر چٹان نے جو کچھ کہا،اس کی اساس علامہ اقبالؒ کے افکار پر تھی بلکہ جن حوالوں کو ان تینوں نے اپنے ’’جوابی حملے‘‘ کی اساس بنایا ہے،وہ تمام تر علامہ اقبال کی تحریروں سے ماخوذ ہیں،لیکن خانہ ساز نبوت کے ان خوشہ چینوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ علامہ اقبال کا نام نہیں لیتے اس لیے کہ مسلمانوں کے احتساب سے ڈرتے ہیں لیکن ان کی بنیاد پر شورش کاشمیری پر گالی گفتار کرتے ہیں؟ کیا اس کا نام دیانت ہے؟

شورش کاشمیری نے جو کچھ کہا،وہ تمام علامہ اقبال کے ارشادات ہیں۔مثلاً:

1- قادیانی،برطانیہ کے جاسوس اور اسلام کے غدار ہیں۔

2- ان کی تحریک اسلام کے خلاف بغاوت ہی نہیں بلکہ ان کا وجود یہودیت کا مثنیٰ ہے۔

3- مسلمانوں میں سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لیے شریک ہوتے ہیں لیکن مذہباً ان سے الگ رہتے اور تمام دنیائے اسلام کو مرزا غلام احمد کے انکار کی بنیاد پر کافر سمجھتے ہیں۔

4- حکومت کا فرض ہے کہ انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دے۔

شورش کاشمیری نے علامہ کے ان نکات کی وضاحت میں تقریر کی،کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جو محض یا دشنام ہو۔لیکن سارا قادیانی پریس اس پر چلا اٹھا اور لگاتار چلا رہا ہے کہ

’’ان دنوں گزرے ہوئے احرار کی نمائندگی ہفت روزہ چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری کر رہے ہیں۔‘‘

ابوالفضل نے ایڈیٹر چٹان کو پسماندگان احرار کا سرخیل لکھا ہے۔لاہوری ہفتہ وار کے توشہ خانے میں بھی بول و براز ہے۔

سوال گندم جواب ریسماں۔ ایڈیٹر چٹان کو پسماندگانِ احرار ہونے پر فخر ہے۔ سوال یہ ہے کہ مرزائی پسماندگانِ انگریز میں سے ہیں یا نہیں؟ مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریریں اس پر شاہد ہیں؟ پھر مرزائی اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟

پہلے اپنے ''پیغمبر'' کے فرمودات کی تردید کریں پھر احرار پر تعریضاً قلم اٹھائیں۔ اپنے عیب کو چھپانے کی انوکھی منطق ہے کہ دوسروں کو گالی دی جائے۔ کیا اس نبوت اور اس خلافت پر مرزائی امت کا دارومدار ہے؟

علامہ اقبال کے بارے میں فرمایئے کہ ان کے ارشادات پر آپ کے جوابات کیا ہیں؟ شورش کاشمیری اس وقت احرار کی نہیں، اقبال کی نمائندگی کر رہا ہے۔

جواب مرحمت فرمایئے! جواب میں گالی دینا شیوۂ شرفا نہیں۔ ذرا تاریخ محمودیت پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ پھر سوچیے کہ آپ میں کسی شخص کو گالی دینے کا حوصلہ ہے؟

ابوالعطاء صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ہم اس کا مکمل جواب تو شمارہ آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ اس شمارے میں عربوں پر فتنہ اسرائیل کی یلغار کا تذکرہ تفصیل سے ہو گیا ہے لیکن دو چار باتیں زیرِ قلم تحریر میں عرض کرنی ضرور ہیں۔

اولاً۔ مرزائی قلمکار جو سلطان القلم کے تلامذہ ارشد ہیں، تحریر میں شرافت پیدا کریں، ورنہ جس لہجہ میں انھوں نے گفتگو شروع کی ہے، اس کا جواب دیا گیا تو بہشتی مقبرے کی ہڈیاں چٹخنی شروع ہو جائیں گی اور چوہدری ظفر اللہ خان کی سیرت سے گلستان کا باب پنجم نکال کر شیزان ہوٹل کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

ثانیاً۔ عاجزی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جن میں انکسار ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی دینی بصیرت ایک خود ساختہ عمارت ہے جس میں نہ فہم قرآن کی گہرائی ہے اور نہ ادب و انشاء کی گیرائی۔ ان کا مجموعۂ شعر ''درثمین'' شاعرانہ عیوب کا مرقع ہے۔ جو شخص شاعرانہ محاسن نہیں رکھتا، اس میں ''پیغمبرانہ محاسن'' کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ آج تک ایک مرزائی بھی ایسا نہیں جس کو قدرت نے شاعری کا صحیح ذوق دیا ہو یا جس کو انشاء پر قدرت ہو یا جو اردو، عربی، فارسی کی چند سطریں صحیح لکھ سکتا ہو۔ بفضلہٖ تعالیٰ ایڈیٹر چٹان ہر مرزائی مصنف، شاعر اور مبلغ کی تحریر و تقریر میں زبان و بیان کے اعتبار سے کئی پشتوں تک اصلاح دے سکتا ہے۔

ثالثاً۔ہمیں معلوم ہے کہ مرزائی افسروں کی لادین کھیپ سے رابطہ پیدا کر کے خفی وجلی بنیادوں پر جھوٹی رپورٹیں اور بے مقصد تبصرے کرانے کے عادی ہیں۔ نیز انکوائری رپورٹ میں سی آئی ڈی کے مراسلے اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ ہماری گرفتاری میں بھی بروایت ان مرزائی افسروں کی ذریت کا ہاتھ تھا۔اب بھی ان کی تگ ودو کا سارا انحصار اس پر ہے کہ اپنے مذہبی پاکھنڈ کو سیاسی ہتھکنڈوں سے جاری رکھیں اور ان عناصر کے خلاف ژاژ خائی کر کے پہلو بچاتے رہیں جو ان کی طرح برطانوی سرکار کے گماشتے نہیں تھے جنھوں نے سامراج سے ٹکر لی اور آزادی کی جدوجہد میں قربانی اور استقامت کی شمعیں جلاتے رہے۔مرزائیوں کا شعار ان شمعوں کو گل کرنا اور برطانوی سامراج کی خدمت بجالانا تھا۔انھیں اب یہ ہتھکنڈے جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

رابعاً۔مرزائی اصل سے انحراف کر کے نقل پر اتر آئے ہیں۔انھیں کذب وافتراء سے عار نہیں۔ احرار کے معاملہ میں لاہوری لے پالک اور اس کے چچیرے وخلیرے بھائی اس ڈھٹائی سے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جھوٹ کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹوں پر لعنت بھیجی ہے اور فی زمانہ اس کا صحیح اطلاق مرزا قادیانی کی امت پر ہوتا ہے۔

خامساً۔ابوالعطاء صاحب نے اپنے ویاکھیان کے آخر میں ہمیں تحریری مناظرہ کا چیلنج دیا ہے۔اوّل تو یہ تحریری مناظرہ خوب ہے۔آمنے سامنے کیوں نہیں؟ کھل کر آیئے مسلمانوں کے شہروں میں نہیں تو ہم ربوہ میں آنے کے لیے تیار ہیں۔لیکن شرط یہ ہوگی کہ عام مسلمانوں کو بھی اس میں شریک ہونے کی اجازت ہو۔اس کے باوجود ہم تحریری مناظرہ کے لیے بھی تیار ہیں اور جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس کی صحت پر اصرار کرتے ہیں۔ اصل مسئلہ چند نکات کا نہیں، پوری مرزائیت اور اس کے خدوخال کا ہے۔ بحث اس پر ہونی چاہیے کہ

1- مرزاغلام احمد برطانوی حکومت کے خودکاشتہ تھے یا نہیں؟

2- انھوں نے برطانوی حکومت کی وفاداری پر مذہباً صاد کیا اور چاپلوسی کی حدتک چلے گئے۔

3- مرزائیت کے مشن صرف ان علاقوں میں قائم ہیں، جہاں برطانوی نوآبادیاں رہی ہیں یا برطانوی اثرات موجود ہیں۔

4- مرزائیت نے اصل اسلام سے بغاوت کر کے مسلمانوں کی دینی وحدت کو تاراج کیا۔

5- مرزائی ایک مدت سے اپنی الگ ریاست قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔
6- مرزائیت مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے خارج ہے۔

اب ایک اور بات بھی سن لیجیے۔ یہ دو چار سوال ہیں، فرمائیے! کیا جواب ہے؟

1- اسرائیل کی عربوں سے جنگ میں آپ کا کردار کیا رہا؟
2- آپ کا جو مشن اسرائیل میں تھا، اسلام کی اس مصیبت عظمیٰ پر اس کا رول کیا تھا؟
3- کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے مشن نے اسرائیل کی فتح پر اسرائیل کے صدر کو مبارک باد دی؟
4- کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ بیت المقدس میں اسرائیل کے داخلہ پر اس مشن نے عربوں کی اذیت میں اضافہ کیا اور انھیں گمراہ کرنا چاہا؟
5- کیا سبب ہے کہ صرف آپ کے مشن کو اسرائیل میں رہنے کی اجازت ہے؟ یہ مسلمانوں سے انقطاع کا باعث ہے یا مغلوب مسلمانوں میں برطانوی مقاصد اور اسرائیلی اغراض کی آبیاری کا حیلہ ہے؟
6- اس سے آپ انکار کر سکتے ہیں کہ آپ مسلمانوں کی شکلیں بنا کر مسلمان ملکوں میں استعماری قوتوں کے لیے جاسوسی کرتے ہیں؟

(ہفت روزہ چٹان۔ 19 جون 1967ء)

اقبال سے بغض کی بناء پر نہرو کا استقبال

قادیانیت کا ایک لاہوری متبنّٰی آج کل ہمارے خلاف خانہ ساز نبوت کی ٹکسالی زبان کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ بزعم خویش اس نے ہمیں نہرو کا پیشہ ور ایجنٹ لکھ کر مصلح موعود کی قبر پر فاتحہ پڑھی ہے۔

حقیقت حال کیا ہے............؟

روزنامہ الفضل کا اقتباس ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال سے عناد انھیں کہاں کہاں نہیں لے گیا۔ اوران کے شوقِ جبہ سائی پر کس آستانہ کی خاک نہیں ہے۔ اگر یہ حوالہ غلط ثابت ہو تو ہم ہر سزا وصعوبت کے حقدار ہیں۔ بلکہ جناب ابوالعطاء جالندھری کو دس ہزار نقد چہرہ شاہی پیش کرنے کے لیے تیار۔

فخرِ وطن پنڈت جواہر لال نہرو کا لاہور میں شاندار استقبال
آل انڈیا نیشنل لیگ کورز کی طرف سے
(الفضل کے خاص رپورٹر کے قلم سے)

لاہور۔29 اپریل۔آج حسب پروگرام پنڈت جواہر لال صاحب نہرو لاہور تشریف لائے۔پنجاب پراونشل کانگرس کمیٹی کی خواہش پر (قادیانی جماعت کی) آل انڈیا نیشنل لیگ کورز کی طرف سے آپ کے استقبال کا انتظام کیا گیا تھا۔چونکہ کانگرس نے صرف پانصد والنٹیر وں کی خواہش کی تھی، اس لیے قادیان سے تین صد اور سیالکوٹ سے دو صد کے قریب والنٹیر 28 مئی کو لاہور پہنچ گئے۔قادیان کی کور دس بجے پہنچی۔گاڑی کے آنے پر جناب صدر آل انڈیا نیشنل لیگ اور قائد اعظم آل انڈیا نیشنل لیگ کورز موجود تھے۔پولیس کا بھی زبردست مظاہرہ تھا۔کانسٹیبلوں کی بہت بڑی تعداد کے علاوہ پولیس کے بڑے بڑے افسر بھی موجود تھے۔قادیان سے کارِ خاص کے سپاہی ساتھ آئے اور عصر تک ساتھ رہے۔احمدیہ ہوسٹل میں جہاں قیام کا انتظام تھا، جناب شیخ بشیر احمد صاحب (قادیانی) ایڈووکیٹ لاہور صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے ایک مختصر مگر برمحل اور برجستہ تقریر کی جس میں بتایا کہ آج ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں کہ آزادی وطن کی خواہش میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں، اور ہم نے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا سے ظلم و ناانصافی کو مٹانا ہے اور صحیح سیاسیات کی بنیاد رکھنی ہے۔آپ لوگ اس موقع پر کسی صورت میں کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو سلسلہ کے لیے کسی طرح بدنامی کا موجب ہو۔

علی الصباح چھ بجے تمام باوردی والنٹیر باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے سٹیشن پر پہنچ گئے۔یہ نظارہ حد درجہ جاذب توجہ اور روح پرور تھا۔ہر شخص کی آنکھیں اس طرف اٹھ رہی تھیں۔استقبال کا تقریباً تمام انتظام کور ہی کر رہی تھی اور کوئی آرگنائزیشن اس موقع پر نہ تھی، سوائے کانگریس کے ڈیڑھ دو درجن والنٹیر وں کے۔سٹیشن سے لے کر جلسہ گاہ تک اور پلیٹ فارم پر انتظام کے لیے ہمارے والنٹیر ز موجود رہے۔پلیٹ فارم پر جناب چودھری اسد اللہ خان صاحب (قادیانی) بیرسٹر ایم ایل سی قائد اعظم آل انڈیا نیشنل لیگ کورز بہ نفس نفیس موجود تھے اور باہر جہاں آ کر پنڈت جی نے کھڑا ہونا تھا، شیخ صاحب موجود تھے۔ہجوم میں بے حد اضافہ ہو گیا اور لوگوں نے صفوں کو توڑنے کی کوشش کی۔مگر ہمارے والنٹیر وں نے قابلِ تعریف ضبط و نظم سے

کام لیا اور حلقہ کو قائم رکھا۔ پنڈت جی کے سٹیشن سے باہر آنے پر جناب شیخ بشیر احمد صاحب (قادیانی) ایڈووکیٹ صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے لیگ کی طرف سے آپ کے گلے میں ہار ڈالا۔ کور کی طرف سے حسب ذیل موٹو جھنڈیوں پر خوبصورتی سے آویزاں تھے۔

Beloved of the nation, Welcome you.

محبوبِ قوم خوش آمدید

We join in Civil Liberties Union.

ہم شہری آزادیوں کی انجمن میں شامل ہوتے ہیں۔

Long Live Jawaher Lal.

جواہر لال نہرو زندہ باد

کور کا مظاہرہ ایسا شاندار تھا کہ ہر شخص اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور لوگ کہہ رہے تھے کہ ایسا شاندار نظارہ لاہور میں کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کانگریسی لیڈر، کور کے ضبط و ڈسپلن سے حد درجہ متاثر تھے اور بار بار اس کا اظہار کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک لیڈر نے جناب شیخ صاحب سے کہا کہ اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں تو یقیناً ہماری فتح ہوگی۔ پنڈت جی کے قیام گاہ کی طرف تشریف لے جانے پر کورز باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے احمدیہ ہوسٹل میں آئیں اور وہاں جناب شیخ صاحب نے پھر ایک تقریر کی، جس میں کور والوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ آپ لوگ ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں انصاف قائم کرنے اور ظلم و ناانصافی کو مٹانے کے لیے ہر قربانی کرنا آپ کا فرض ہے۔

احمدیہ ہوسٹل میں کھانے کا بہت اچھا انتظام تھا، جس کے مہتمم بابو غلام محمد صاحب تھے۔ ماسٹر نذیر احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ احمدیہ ہوسٹل نے بھی مہمانوں کی آسائش کے لیے بہت کوشش کی۔ قادیان کی کورز 29 کو 9 بجے کی گاڑی سے واپس پہنچ گئیں۔

(اخبار الفضل قادیان جلد نمبر 23 شمارہ نمبر 278۔ مورخہ 31 مئی 1936ء)

استقبال کی وجہ

اگر پنڈت جواہر لال صاحب نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لیے وہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے، جیسا کہ احرار نے کیا ہوا ہے تو اس قسم کا استقبال بے غیرتی ہوتا لیکن

اگراس کے برخلاف یہ مثال موجود ہو کہ قریب کے زمانہ میں ہی پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال صاحب کے ان مضامین کا رد لکھا ہے جو انھوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گذشتہ رویہ کے خلاف ہے۔ تو ایسے شخص کا جب کہ وہ صوبے میں مہمان کی حیثیت سے آ رہا ہو، ایک سیاسی انجمن کی طرف سے استقبال بہت اچھی بات ہے۔ (میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا خطبہ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد نمبر **24** شمارہ **287** مورخہ **11** جون **1936**ء) (ہفت روزہ چٹان۔ **26** جون **1967**ء)

سلطان القلم کے جانشین

پچھلے پانچ چھ ہفتوں میں قادیانی دانشوروں کے بحث ونظر کا انداز و معیار معلوم ہوا ہے۔ سنا کرتے تھے بلکہ تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ اس جماعت کے مبلغ و مدیر ڈھٹائی میں لاجواب ہیں۔ لیکن چنیوٹ میں مدیر چٹان کی تقریر کے بعد............ یا پھر چٹان نے جو سوالات اٹھائے ہیں، ان کی گرفت سے عاجز آ کر قادیانی امت کے اہل قلم نے جو استدلال اختیار کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ’’سوال گندم جواب ریسماں‘‘ کی بدترین خصوصیتیں ان کے دماغ میں جمع ہو گئی ہیں۔ قادیانی اہل قلم کا طرز استدلال ہی انھیں جھٹلانے کے لیے کافی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں، فرمایئے! علامہ اقبال نے جو کچھ آپ کے بارے میں تسلسل و تواتر سے کہا، وہ درست ہے کہ غلط؟ غلط ہے تو آپ کے پاس اس کا جواب کیا ہے؟ الفضل ربوہ لکھتا ہے کہ شورش صاحب کو خدا جانے کس نے علامہ اقبال کا نمائندہ بنا دیا ہے۔

’’ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو‘‘

یہ جواب ہے علامہ اقبال کے ان مقالات وخیالات کا جو قادیانی تابوت میں میخ کا کام دے گئے ہیں۔ کیا علامہ اقبال نے اپنے ان خیالات پر خط تنسیخ کھینچ دیا تھا؟ کیا ان کی موت کے بعد یہ حصہ منسوخ ہو گیا؟ منسوخ ہوا تو کس نے کیا؟ اور اس کا مجاز کون ہے؟ پھر یہ ممکن ہے کہ صاحب تصنیف کی رحلت کے بعد ورثاء اس کی تصنیف کو منسوخ یا متروک کریں اور ان کا یہ فعل

صاحب تصنیف کا فعل سمجھا جائے۔ یہ تو صحیح ہے کہ جائداد کی وارث اولاد ہوتی ہے۔لیکن اس کا جواز آج تک قائم نہیں ہوا کہ اولاد میں سے کوئی فرد، والد کے ان فرمودات پر قلم کھینچ دے جو علم کی میراث ہو کر قرطاس و قلم کو منتقل ہو چکے ہیں۔صرف دو تحریفیں ساری تاریخ تحریر میں پائی جاتی ہیں۔

ایک عیسائی علما کی تحریف، جس سے بائبل مجروح ہوئی ہے۔

دوسری مرزا بشیر الدین محمود کی تحریف، کہ اپنے والد کی تحریروں کے عیب چھپانے کے لیے انھوں نے عجیب و غریب جسارتیں کی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے قادیانی نبوت اور قادیانی امت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے اسلامی فکر اور دینی شغف کی معراج ہے اور اس سے انکار کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں کا حاصل تھا۔

علامہ اقبال نے عمر بھر کے غور و فکر اور مطالعہ و مشاہدہ کے بعد قادیانی نبوت کا جس کمال علم سے محاسبہ کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس امت کو انھوں نے نہ صرف ہندوستان کا غدار کہا بلکہ اسلام کا غدار بھی لکھا اور اس کو اپنی بصیرت کا حاصل قرار دیا (ملاحظہ ہو پنڈت جواہر لال نہرو کے نام علامہ اقبال کا خط) جواب علامہ اقبال کے ارشاد کا مرحمت فرمایئے۔کوس آپ ایڈیٹر چٹان کو رہے ہیں......کیا موت کے بعد کسی شخص کی تحریریں ساقط ہو جاتی ہیں۔ان کا حوالہ دینا اور اس پر بحث و نظر کی عمارت قائم کرنا غلط ہے؟ اگر یہ معیار ہے تو پھر آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریریں کیوں منسوخ نہیں کی ہیں، آج تک کیوں نقل ہو رہی یا چھاپی جا رہی ہیں۔سیدھا سادا سوال ہے کہ علامہ اقبال نے جو کچھ فرمایا اس کا جواب کیا ہے؟ آپ چونکہ مسلمانوں سے ڈرتے ہیں، اس لیے اقبال کا جواب نہیں دیتے لیکن ایڈیٹر چٹان کے خلاف غرا رہے ہیں۔اصل سوال یہ ہے۔

1- علامہ اقبال نے آپ کو مسلمانوں میں سے خارج کر دینے کا مطالبہ کیا یا نہیں؟

2- انھوں نے آپ کو یہودیت کا مثنیٰ قرار دیا۔

3- انھوں نے آپ کو اسلام اور ہندوستان کا غدار لکھا اور اس کی صحت پر اصرار کیا۔

4- انھوں نے آپ کو ایک سیاسی جماعت قرار دے کر مسلمانوں کی دینی وحدت میں نقب لگانے کا مجرم گردانا۔

5- انھوں نے آپ کو شاتم رسولؐ قرار دیا۔

ان کا جواب دیجیے یا فرمایئے کہ علامہ اقبال نے ان مطالبات کو واپس لے لیا تھا، اس سے مراجعت کر لی تھی؟ کسی خط، کسی تحریر، کسی بیان میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی فرمائی تھی۔ اگر یہ نہیں ہے اور بلاشبہ نہیں ہے تو پھر ان کے خیالات پر ایڈیٹر چٹان کے خلاف سب وشتم کے معنی کیا ہیں؟

حد ہوگئی کہ ان سوالات کے جواب میں علامہ اقبال کی 1910ء کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ جب کبھی مرزائی علامہ اقبال کے ارشادات سے عاجز اور محصور ہوتے ہیں، اسی تقریر کو پیش کرتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اسٹریچی ہال علی گڑھ میں جو خطبہ دیا تھا، اس میں یہ الفاظ موجود تھے کہ

''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔''

اوّل تو اس میں مرزا صاحب کی نبوت اور ان کے جانشینوں کی خلافت کا جواز نہیں۔

دوم یہ اس زمانے کی بات ہے جب مرزا غلام احمد نے مناظرِ اسلام کی حیثیت سے جماعت سازی کی تھی اور ان کے باطنی دعاوی سامنے نہیں آئے تھے۔

اس زمانہ میں بہت سے لوگ ظاہری وجوہ سے ان کے معترف تھے۔ جب ان کی حقیقت کھلی اور مرزا بشیر الدین محمود نے خلافت کو ایک سیاسی کاروبار کی شکل دی تو ایک ایک ورق کھل گیا۔ نتیجتاً جو لوگ ایک عام شہرت کے باعث مرزا کو مناظر و مبلغ خیال کرتے تھے، ظلی اور بروزی نبی کی اصطلاحوں سے چوکنا ہو گئے اور ان پر وقت کے ساتھ تمام حقیقتیں منکشف ہو گئیں کہ مرزا غلام احمد اور اس کے خلافتی جانشینوں کا مقام و منشا کیا ہے اور وہ مسلمانوں میں دینی ارتداد کی ایک سیاسی تحریک ہیں۔

یہ ایک شوخ چشمانہ استدلال ہے کہ 1910ء کی تحریر کو جواز بنا لیا جائے اور 1933ء سے 1937ء تک کی تحریریں منسوخ قرار دی جائیں۔ آخری بات پہلی ہوئی ہے یا آخری؟

قرآن مجید میں کئی آیتیں ہیں جنھیں بعد کی آیتوں نے منسوخ کیا مثلاً حرمت شراب، حکم ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ پھر شراب حرام ہوگئی اور ہر حالت میں حرام ہوگئی۔ اب اگر یہ اصرار کیا جائے کہ شراب صرف نماز میں حرام ہے اور قرآن پاک میں لکھا ہے تو اس کو صرف

قادیانی منطق ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہی چیز کے بارے میں کسی شخص کی آخری رائے ہی قطعی رائے ہوتی ہے۔

اسی طرح کا ایک اور اقتباس 29 ستمبر 1900ء کی تحریر سے کیا گیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کے ایک مضمون صوفی حضرت عبدالکریم جیلانی سے ماخوذ ہے۔ ہمارے سامنے وہ مضمون نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قادیانی حوالوں میں تلبیس کر جاتے ہیں، تاہم ایک لحظہ کے لیے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ علامہ اقبال ہی کے الفاظ ہیں یعنی انھوں نے اس بحث میں ''مرزا غلام احمد قادیانی کو جدید ہندی مسلمانوں کا اغلباً سب سے بڑا دینی مفکر لکھا ہے۔''

تو اس سے بھی یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا کہ وہ مرزا غلام احمد کو مسیح موعود یا ظلی و بروزی نبی مانتے تھے۔ یہ تو ایک عمومی تاثر تھا جو اس وقت کے مباحث سے پیدا ہو گیا تھا۔ جب مرزا صاحب مارِ آستین نکلے یا اس وقت کی صورتحال سے ان کا دماغ خراب ہو گیا تو معترفین نے اپنی رائیں تبدیل کر لیں............

لطف کی بات یہ ہے کہ جس زمانہ کی یہ تحریریں پیش کی جا رہی ہیں، اولاً تو ان تحریروں کو علامہ اقبال نے اپنے فکری و نظری ارتقا کے بعد لائقِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ یہ ان کی ابتدائی تحریری مشقیں تھیں۔ جب ان کا اسلامی شعور اور دینی تبحر پختہ ہو گیا تو ان کے خیالات روشن ہو کر قوم کے لیے سنگ میل ہو گئے اور یہی افکار و نظریات ہیں جن کی صداقت پر انھیں حکیم الامت، شاعر مشرق اور ترجمان اسلام کہا جاتا ہے اور جس کی اساس پر ان کے حکیمانہ وجود کا شہرہ ہے۔

1899ء میں حضرت علامہ نے ایم اے کیا۔ 1900ء میں ان کی عمر صرف 23 برس کی تھی۔ 1900ء تک وہ ایک شاعر تھے اور ان کی فکر کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس عہد کی تحریروں کے اقتباس تو قادیانی امت اپنی ''روائتی سچائی'' کے لیے بطور سند استعمال کرتی ہے، لیکن جس عمر میں وہ پختہ ہو کر مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے، اس عمر کی متاعِ فکر سے فرار غایت درجہ کی بوالعجبی ہے۔ کوئی ساطرز استدلال بھی اس کی تصدیق نہیں کر سکتا ہے!

اقبال کبھی طالب علم بھی تھے تو کیا اس عمر کے اقوال کو حجت قرار دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مشق سخن کے ابتدائی دور میں بہت سے اشعار لکھے جنھیں خیالات کی تبدیلی اور نظریات کی صحت کے بعد حذف کر دیا تو کیا ہم اس کلام کو بھی ان کے مستند کلام پر فوقیت دے سکتے ہیں۔

مرزائیوں کی منطق عجیب و غریب ہے کہ ایک طرف تو انھیں اپنے ''ربانی مشن'' ہونے پر اصرار ہے، دوسری طرف وہ اپنی......نبوت وخلافت کے جواز میں انہی لوگوں کی ابتدائی تحریریں لاتے ہیں جوان کے سب سے بڑے محاسب ہیں اور جن کے سن شعور کی تحریروں نے ان کی عمارت کو بیخ و بن سے ہلا دیا ہے......اگر قادیانی نبوت اور اس کی خلافت کے سچا ہونے پر اصرار ہے تو اقبال کی انگلی تھام کر کھڑا ہونے کی کوشش بے معنی ہے۔ اس انگوٹھے کے متعلق فرمایئے جو اقبال نے آپ کی شہ رگ پر رکھا ہے۔

الفضل نے **24** جون کے زیر بحث اداریہ میں علامہ اقبال کے متذکرہ حوالوں سے اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کی احمقانہ جسارت کے بعد لکھا ہے کہ............

ہم علامہ مرحوم کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس لیے صرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ......

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اور وہ اشارہ کیا ہے؟

چوہدری ظفر اللہ خان ایک خاص عہدہ پر نہ لیے جاتے تو یہ تحریریں بھی ہرگز وجود میں نہ آتیں۔ (الفضل صفحہ **2** مورخہ **24** جون **1967**ء)

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون. بغض سامنے آ گیا۔ اس سے بڑھ کر خود ساختہ نبوت کی مداہنت اور خود کاشتہ خلافت کی خیانت اور کیا ہوسکتی ہے؟ بہر حال الفضل نے اعتراف کر لیا کہ اس کے دل میں کھوٹ ہے اور اس کا نام اس نے احترام رکھا ہے۔

ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، ذرا کھل کر بولیے۔

ربانی مشن ہونے کا دعویٰ اور مصلحتوں کی مینا کاری؟ اعتراف کیجیے کہ آپ کی جماعت اسرائیل کا عجمی پودا ہے اور آپ ربوہ کے تل ابیب میں بیٹھ کر مسلمانوں کی معنوی قوت پر اپنی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے فرمودات کو آپ ذاتیات میں نہیں لا سکتے کہ انھیں چوہدری ظفر اللہ خان کا عہدہ خاص ہونے کا صدمہ تھا۔ سوال تو وہ ہیں جو حضرت علامہ نے اپنے مقالات میں اٹھائے ہیں۔ جوابات یہ نہیں جو آپ کے نہاں خانہ دماغ سے نکلے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آپ کا مذہب برطانوی حکومت کے استعماری مقاصد کی پیداوار ہے یا نہیں؟

آپ فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کو چوہدری ظفراللہ خان کے خاص عہدے پر مقرر ہونے کا صدمہ تھا؟ آخر فہم وفراست کی کونسی شکل ہے جو اس جواب کو صحیح قرار دے سکتی ہے؟

ٹامک ٹوئیاں مارنا چھوڑیئے اور اس کا جواب عنایت فرمائیے۔

(ہفت روزہ چٹان 3 جولائی 1967ء)

روحِ اقبال بنام ممتاز حسن

روزنامہ امروز لاہور کی اطلاع کے مطابق مرزائیوں نے ربوہ میں دو روزہ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کانفرنس وسط اکتوبر میں منعقد ہوگی۔ خبر میں کہا گیا ہے کہ اس کانفرنس کا افتتاح نیشنل بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر ممتاز حسن جو اقبال اکادمی کراچی کے چیئرمین بھی ہیں، فرمائیں گے۔ جو مقالات پڑھے جائیں گے ''ذکر اردو'' کے نام سے شائع ہوں گے۔ دوسو مندوبین کی شرکت کا انتظام کیا جارہا ہے۔ محکمہ ریلوے نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لیے رعائتی ٹکٹ جاری کرنے کا اعلان کیا ہے۔

اعلان کے مطابق زبان اور اس کے مسائل کے لیے دو اجلاس، ادب اور اس کے مسائل کے لیے تین اجلاس، اردو کے محسنین کے لیے دو اجلاس منعقد ہوں گے۔ اردو صحافت کی مشکلات پر ایک مجلس مذاکرہ ہوگی۔ آخر میں ایک مشاعرہ ہوگا وغیرہ۔

(امروز 18 جولائی صفحہ 6 کالم 4)

غور کیجیے............

1- ہم نے کئی ماہ پہلے لکھا تھا کہ مرزائی اپنے مقاصد مشؤمہ کے لیے ادبی اور لسانی محاذ قائم کررہے ہیں۔ یہ گویا ادیبوں، شاعروں کو کرپٹ (Corrupt) کرنے کی ایک حرکت ہے۔ ورنہ جس ربوہ میں کوئی غیر مرزائی آباد نہیں ہوسکتا حتیٰ کہ وہاں کسی غیر مرزائی سب انسپکٹر اور سٹیشن ماسٹر کو بھی لگنے نہیں دیا جاتا، وہاں اردو کانفرنس کا انعقاد؟...........خوب می شناسم۔

2- اس کانفرنس میں نوٹ کرلیجیے کہ مرزا غلام احمد کو سلطان القلم اور مرزا بشیرالدین محمود کو محسنِ اردو کے طور پر پیش کیا جائے گا کہ تاریخ اردو میں ان کا ذکر لاکر اس کے حوالوں کو

اپنی نبوت کے جواز میں پیش کیا جائے گا۔

3- ہم اردو کے اہل قلم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس فتنہ سے خبردار ہو جائیں۔

4- اسلام پسند مصنفین کو ابھی سے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔

5- ریلوے نے کس مفروضہ پر رعایتی ٹکٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟ اس کا یہ برتاؤ آج تک کسی ادبی اور لسانی کانفرنس کے ساتھ ہوا؟ آخر اس رعایت کی دلیل کیا ہے؟

6- مسٹر ممتاز حسن کو مفکر ادیب، نقاد بننے کا بیحد شوق سہی، سبکدوشی سے پہلے بعض افسروں کا یہ رجحان اب عام ہو چکا ہے۔

لیکن ممتاز حسن صاحب اس کانفرنس میں شریک ہونے سے پہلے علامہ اقبالؒ کی روح سے استخارہ کرلیں۔ مبادا انہیں اذیت ہو۔

انجمن حمایت اسلام کی کارروائی پڑھ لیجیے۔ علامہ اقبال نے مرزائی ارکان کو جب تک اجلاس سے نکلوا نہیں دیا تھا، وہ خود صدارت کی کرسی پر تشریف فرما نہیں ہوئے تھے۔

(ہفت روزہ چٹان 24 جولائی 1967ء)

ظفر اللہ اور علامہ اقبال

مجلس انتظامیہ یوم اقبال کراچی نے یوم اقبال 1967ء کے مقالات اور تصویریں بڑے تزک و احتشام سے شائع کی ہیں۔ آدھی تصویریں، آدھے مقالات، نصف انگریزی، نصف اردو، صدر ایوب کا پیغام سب سے زیادہ فکر انگیز ہے۔ ناقص مقالہ پاکستان کے معمر دانشور جناب ممتاز حسن کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ممتاز صاحب اقبال کی روح ہی سے آشنا نہیں۔ وہ چھلکے سے زیادہ اور مغز سے کم محبت کرتے ہیں۔

اصل اعتراض ہمیں اس پیغام پر ہے جو چودھری سر ظفر اللہ خان سے حاصل کیا گیا ہے، چند سطری پیغام ہے ان کا آخری نکتہ یہ ہے کہ ''اقبال کی یاد ان لوگوں سے زیادہ عمر پائے گی جو سیاست اور قانون میں ان کے معاصر تھے۔''

اوّل: تو کراچی کے ان بزرگوں کو معلوم نہیں اور اگر معلوم ہے تو تجاہلِ عارفانہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہ علامہ اس جماعت کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے تھے، جس جماعت

کے چودھری ظفر اللہ خان روح القدس ہیں۔

دوم: ان بزرگوں کو احساس ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان کے مسلمانوں نے ظفر اللہ خان کے وجود کی ماضی مرحوم میں کیا قیمت ادا کی ہے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے اور موجودہ صدر میاں امیر الدین اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ حضرت علامہ نے اپنے زمانہ صدارت میں اپنے پرانے دوست ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو اس بنا پر انجمن کے اجلاس سے نکلوادیا تھا کہ وہ مرزا غلام احمد کے متبع ہیں حالانکہ وہ لاہوری جماعت کے رکن تھے۔

ان واضح شواہد کے ہوتے ہوئے یوم اقبال پر سر ظفر اللہ خان سے پیغام لینا حضرت علامہ کی روح کو دکھی کرنا ہے......ان لوگوں کو حضرت علامہ کی لحد پر حاضر ہو کر معافی مانگنی چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ یہ لغزش ان کے ادھورے علم کی وجہ سے ہوئی ہے۔ چودھری ظفر اللہ خان کا یہ ارشاد کہ اقبال کا نام سیاست اور قانون میں ان لوگوں کی بہ نسبت زیادہ عرصہ رہے گا، جو ان کے معاصر تھے۔ تو ان کی خدمت میں عرض ہے، اقبال کا نام مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں سب پر فائق رہے گا اور یہ سہرا بھی اقبال کے سر بندھے گا کہ انھوں نے وقت کے ایک سب سے بڑے فتنہ کا محاسبہ کیا تھا۔ (ہفت روزہ چٹان 15 اپریل 1968ء)

اقبال کے پیرو جواب دیں

ہم اقبالؒ کے عقیدت مندوں، مفسروں اور پیروؤں کی اس روش کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ اقبالؒ کی اجارہ داری تو اپنی غیر منقولہ جائداد سمجھتے ہیں، لیکن اقبالؒ کے حقیقی ارشادات سے انھیں اتنا تعلق بھی نہیں جتنی ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔ ہم مسئلہ کو طول نہ دیتے ہوئے یہ پوچھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مرزائیوں سے متعلق جو کچھ اقبالؒ نے کہا، وہ غلط ہے یا صحیح؟ اگر غلط ہے تو پھر انھیں اقبالؒ کی وراثت سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اقبال سے بڑھ کر نہ ان کی فراست ہے، نہ ان کی عقل اور نہ تدبر۔ اقبالؒ نے مرزائیوں کو ملک و قوم اور دین و مذہب کا غدار لکھا ہے۔ وہ حکومت سے مطالبہ کرتے رہے کہ انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیا جائے۔ ہم بھی یہی مطالبہ کرتے ہیں۔ ہمیں مرزائیوں کے دین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ دین ہی

نہیں،صرف مسخرہ پن ہے۔ جولوگ اس مسخرے پن پر قائم رہنا چاہتے ہیں،شوق سے رہیں۔علما کا فرض ہے کہ وہ دینی طور پر ان کا تعاقب کریں۔ ہمارا سوال اقبال کے مدرسہ فکر سے ہے کہ وہ قادیانی امت کے متعلق مداہنت یا مصلحت اختیار کر کے نہ صرف اسلام کو ضعف پہنچا رہا ہے بلکہ خود اسلام سے غافل ہے۔ اس قسم کے عناصر ہمارے نزدیک قلم کے میدان میں اس آوارہ عصمت کی طرح ہیں جو آبرو کے سودے پر روپیہ کماتی ہے۔

سلمان احمد

کیا علامہ اقبالؒ اور ان کا خاندان قادیانی تھا؟

علامہ اقبال، ان کے والد شیخ نور محمد، ان کی والدہ امام بی بی اور ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے حوالے سے قادیانی اہل قلم نے لکھا ہے کہ یہ خاندان قادیانیت سے متاثر تھا اور علامہ اقبال، علامہ اقبال کے والد اور بڑے بھائی نے مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت کی تھی۔

اگر ان الزامات کی تحقیق مرزا غلام قادیانی کے بتدریج دعویٰ جات کی روشنی میں پیش کی جائے تو بات سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ مرزا غلام قادیانی کی مذہبی زندگی کے دو ادوار تھے۔ پہلا دور وہ جس میں مرزا غلام قادیانی بطور ایک مصلح اور مناظر اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کر کے داد و تحسین سمیٹا رہا۔ وہ محتاط انداز میں بتدریج دعویٰ جات کی سیڑھی پر چڑھتا رہا اور یہ دور 1900ء میں ختم ہوا۔ اس کی زندگی کا دوسرا دور 1901ء سے لے کر 1908ء تک رہا جس میں اس نے دعویٰ نبوت کیا اور خود کو نعوذ باللہ 'محمد رسول اللہ' کہلوانے کا مدعی ہوا۔

دونوں ادوار میں ایک واضح فرق یہ ہوا کہ 1900ء تک جو لوگ مرزا غلام قادیانی کو مصلح یا عالم مانتے یا اس کی بیعت کرتے آئے، ان میں سے زیادہ تر تعداد ان افراد کی تھی جو اسے بطور مناظر و عالم دیکھتے تھے اور ان کی بیعت وہ بیعت تھی جو انہوں نے ایک عالم و مناظر کو ذہن میں رکھ کر کی۔ مگر 1901ء کے بعد مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت کے باوجود جن لوگوں نے اس بیعت کو جاری رکھا، وہ قادیانی / مرزائی / احمدی کہلائے۔ اس لیے 1900ء سے پہلے کسی بھی شخص کو قادیانی کہنا کسی بھی طور پر قابل عمل نہ رہا۔ اس کے لیے مرزا غلام قادیانی کے بڑے بیٹے کا بیان مددگار ثابت ہوتا ہے کہ 1901ء سے پہلے کے تمام دعویٰ جات منسوخ۔ اگر دعویٰ جات منسوخ تو بیعت کس طرح قائم رہی؟ قادیانی جماعت کا دوسرا خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود لکھتا ہے:

❑ ''جن کتب میں آپ نے اپنے نبی ہونے سے صریح الفاظ میں انکار کیا ہے اور اپنی

نبوت کو جزئی اور ناقص اور محدثوں کی نبوت قرار دیا ہے، وہ سب کی سب بلا استثناء 1901ء سے پہلے کی کتب ہیں اور 1901ء کے بعد کی کتب میں سے ایک کتاب میں بھی اپنی نبوت کو جزئی قرار نہیں دیا اور نہ ناقص اور نہ نبوت محدثیت''۔

(حقیقۃ النبوۃ از مرزا بشیر الدین محمود، صفحہ 120، مندرجہ انوار العلوم جلد 2، ص 442)

❑ ''1901ء سے پہلے کے وہ حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے، اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے''۔

(حقیقۃ النبوۃ از مرزا بشیر الدین محمود، صفحہ 121، مندرجہ انوار العلوم جلد 2، ص 443)

جہاں تک علامہ اقبال کی بیعت کا تعلق ہے تو انہوں نے کسی دور میں بھی مرزا قادیانی کی بیعت نہیں کی۔ بیعت کا قصہ صرف قادیانیوں کا گھڑا ہوا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے 1896ء تا 1897ء میں بیعت ہونے کے من گھڑت بیان کو جماعت قادیانیہ کے مصنفین خود تسلیم کرنے کو تیار نہیں جن میں سرفہرست مرزا غلام قادیانی کا بیٹا مرزا بشیر احمد ایم اے اور قادیانی شیخ اعجاز ہے۔ مرزا غلام قادیانی کا بیٹا اپنی کتاب 'سیرت المہدی' میں لکھتا ہے۔

❑ ''1891ء اور 1892ء کے چند سال بعد سر اقبال کالج پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو بھی سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا''۔

(سیرت المہدی جلد سوم، صفحہ 249، جلد اوّل حصہ سوم ص 764 طبع جدید)

قادیانی جماعت کے اندرونی اختلاف کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ مرزا غلام قادیانی کا بیٹا 1891ء سے 1892ء کے چند سال بعد ہی اقبال کو قادیانیت سے منحرف قرار دے کر اس باب کو وہیں بند کر رہا ہے مگر شیخ عبدالماجد قادیانی اس تعلق کو دیدہ دانستہ غلط بیانی سے کھینچ تان کر 1935ء تک لے جانے پر بضد ہے۔ (منحرف ہونے کے لیے قادیانی ہونا لازم ہوتا ہے جبکہ 1891ء، 1892ء سے پہلے قادیانی جماعت علامہ محمد اقبال کے قادیانی ہونے یا بیعت کرنے کا کوئی ایک بھی ثبوت پیش نہیں کر سکتی۔)

1916ء میں علامہ اقبالؒ کا قادیانی عقائد پر کاری ضرب لگانا قادیانی کیمپ میں آگ برپا کر گیا۔ یاد رہے کہ علامہ صاحب کے یہ عقائد 1935ء میں وجود میں نہ آئے تھے بلکہ ایک عام مسلمان کی طرح علامہ اقبال حضور خاتم النبیین ﷺ کی ختم نبوت کا عقیدہ شروع سے ہی اپنے

دل ودماغ میں بسائے ہوئے تھے۔جس کا برملا اظہار وہ اکثر اوقات اپنی شاعری میں فرماتے تھے۔علامہ اقبالؒ نے 1918ء میں اپنی کتاب رموز بیخودی میں عقیدہ ختم نبوت پر مبنی اپنے افکار کو ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے افراد کے سامنے پیش کیا۔

پس خُدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
اُو رُسل را ختم و ما اقوام را

’’خدا نے ہم پر شریعت ختم کر دی ہے جیسے اور ہمارے رسول ﷺ پر رسالت ختم کر دی ہے۔محفل ایام (دنیا) کی رونق ہماری وجہ سے ہے۔حضور ﷺ آخری رسول ہیں اور ہم آخری امت‘‘

لَا نَبِیَّ بَعْدِیُ ز احسانِ خدا ست
پردہ ناموسِ دینِ مصطفٰے است
قوم را سرمایۂ قوت ازُو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازُو

’’حضور ﷺ کے بعد کسی اور نبی نہ آنا اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔اس سے ناموس دین مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ ہے۔یہی چیز ملت کے لیے سرمایہ قوت اور وحدت ملت کے بھید کی حفاظت کرنے والی ہے‘‘(رموز بیخودی/اسرار رموز)

قادیانی اخبار روزنامہ الفضل مورخہ 9 اکتوبر 1915ء کو ایک مضمون بعنوان’’جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں‘‘ شائع ہوا۔ یہ مضمون انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کا تحریر کردہ تھا اور قادیانیوں میں ان کے دو گروہوں قادیانی اور لاہوری جماعت کے مابین اختلافات سے متعلق تھا۔اس مضمون میں حضرت علامہ اقبال سے ایک من گھڑت بیان منسوب کیا گیا کہ:

’’قادیانی جماعت حق پر ہے اور مجھے ہمدردی لاہور والوں سے ہے‘‘۔

قادیانی جماعت من گھڑت تحریرات سے علامہ اقبالؒ کو قادیانی ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں لگی رہی مگر علامہ صاحب نے ان کی ہر ایک سازش کے پرخچے اڑا دیے۔ 9 اکتوبر

1915ء کے الفضل اخبار کے مضمون کی تردید علامہ اقبالؒ نے ایک خط بنام ایڈیٹر لکھا جو پیغام صلح مورخہ 25 نومبر 1915ء کو شائع ہوا۔ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال نے لکھا:

❑ ''اختلاف سلسلہ احمدیہ سے متعلق وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو مرزا صاحب کی تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو، وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں''۔

1916ء میں جب قادیانیوں نے اعلان کیا کہ مرزا غلام احمد کو نبی نہ ماننے والا کافر ہے تو اقبال نے سختی سے اس کا نوٹس لیا اور بیان دیا کہ:

❑ ''جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہو، وہ خارج از دائرہ اسلام ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے''۔ (اخبار الفضل قادیان، مورخہ 11 اپریل 1916ء ص 9)

شیخ اعجاز نے ساری زندگی اپنے والد شیخ عطا کو کسی نہ کسی طور جماعت قادیانیہ سے جوڑے رکھنے کے لیے من گھڑت روایات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس سلسلے میں شیخ اعجاز اپنی چھوٹی ہمشیرہ کے رشتے کی بابت ایک واقعہ مظلوم اقبال میں بیان کرتا ہے۔

❑ ''وہ بدستور احمدیت پر قائم رہے۔ اس کا ثبوت اُن کے ایک خط سے ملتا ہے جو جماعت میں اختلاف کے پندرہ سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ہوا یہ کہ 1929ء میں میری ایک چھوٹی ہمشیرہ کے لیے ہماری برادری کے ایک معزز احمدی خاندان کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا رشتہ آیا۔ اس خاندان کی مستورات سے ہماری مستورات کا ملنا جلنا تھا اور شاید میاں جی کے ننھیال کے ناطے سے کچھ دور کا رشتہ بھی تھا۔ رشتہ آنے کی خبر نکلی تو ہماری برادری اور محلے کے ایک نوجوان احراری خدائی فوجدار نے چچا جان کو خط لکھا کہ لڑکی کا رشتہ یہاں نہ کیا جائے کیونکہ لڑکا کٹر مرزائی ہے۔ چچا جان نے وہ خط ابا جان کو بھیج دیا۔ میں ان دنوں جھنگ میں سب جج تھا۔ ابا جان نے وہاں مجھے اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ کٹر مرزائی ہونا اس رشتہ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ البتہ اگر لڑکے کے چال چلن وغیرہ پر کوئی اعتراض ہوتا تو غور کے لائق ہے۔ میں خود بھی تو مرزائی ہوں لیکن مجھ میں اُن میں صرف جنازے کے سوال کا فرق ہے۔ یہ خط میرے پاس محفوظ ہے اور

میرے عزیزوں میں سے جو چاہے دیکھ سکتا ہے۔اس خط سے ظاہر ہے کہ 1929ء میں بھی ابا جان احمدیت پر قائم تھے۔(مظلوم اقبال،صفحہ 187،188)

شیخ اعجاز کے اس بیان کی روشنی میں ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ شیخ اعجاز اور شیخ عبدالماجد کا یہ کہنا کہ علامہ اقبال 1935ء میں قادیانیت سے منحرف ہوئے تھے، وہ غلط ہے۔شیخ اعجاز کا یہ تسلیم کرنا کہ ایک مسلمان کا اقبال کو کہنا کہ مرزائیوں میں رشتہ نہ کرو، اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال قادیانی یا مرزائی نہیں تھے ورنہ مرزائی کے رشتہ سے منع کرنا چہ معنی دارد؟

یادرہے مرزا قادیانی اوراس کے خلفا نے غیر قادیانیوں کو اپنی لڑکی کا رشتہ دینے سے منع کیا ہے اوراس پر سخت وعید اور جماعتی بائیکاٹ تک کی دھمکیاں دی جاتی رہی ہیں۔اس حوالے سے چند قادیانی تحریرات پیش خدمت ہیں۔

1- حضرت مسیح موعود کا حکم اور زبردست حکم ہے کہ کوئی احمدی، غیر احمدی کو اپنی لڑکی نہ دے۔اس کی تعمیل کرنا بھی ہر ایک احمدی کا فرض ہے۔

(برکات خلافت از مرزا بشیر الدین محمود صفحہ 158 مندرجہ انوار العلوم جلد 2، صفحہ 211)

2- ’’اپنی لڑکی کسی غیر احمدی کو نہ دینی چاہیے، اگر ملے تو لے بے شک لو۔ لینے میں حرج نہیں ہے اور دینے میں گناہ ہے۔

(الحکم قادیان 14 اپریل 1908ء صفحہ 2، ملفوظات جلد 10، ص 230، ملفوظات جلد پنجم ص 525 طبع جدید)

3- ’’ایک اور بھی سوال ہے کہ غیر احمدیوں کو لڑکی دینا جائز ہے یا نہیں۔ حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریاں کو پیش کیا۔لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔آپ کی وفات کے بعد اس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفۂ اول (حکیم نورالدین) نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا۔اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی۔ باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔‘‘ (انوارِ خلافت صفحہ 93،94 مندرجہ انوار العلوم جلد 3 صفحہ 151 از مرزا بشیر الدین محمود ابن مرزا قادیانی)

4- چنانچہ حضرت مسیح موعود اپنی جماعت کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

’’یادرکھو کہ جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے، تمہارے پر حرام اور قطعی حرام ہے کہ کسی

مکفر یا مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو۔ بلکہ چاہیے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تمہی میں سے ہو۔اسی کی طرف حدیث بخاری کا ایک پہلو میں اشارہ ہے کہ امامکم منکم یعنی جب مسیح نازل ہوگا تو تمہیں دوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں، بکلی ترک کرنا پڑے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔''

دوسری ہدایت جو آپ نے اپنی جماعت کے لیے جاری فرمائی، وہ احمدیوں کے رشتہ ناطہ کے متعلق تھی۔اس وقت تک جیسا کہ احمدیوں اور غیر احمدی مسلمانوں کی نماز مشترک تھی یعنی احمدی لوگ غیر احمدیوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے،اسی طرح باہمی رشتہ ناطہ کی بھی اجازت تھی یعنی احمدی لڑکیاں غیر احمدی لڑکوں کے ساتھ بیاہ دی جاتی تھیں مگر 1898ء میں حضرت مسیح موعود نے اس کی بھی ممانعت فرمادی اور آئندہ کے لیے ارشاد فرمایا کہ کوئی احمدی لڑکی، غیر احمدی مرد کے ساتھ نہ بیاہی جائے۔ یہ اس حکم کی ایک ابتدائی صورت تھی جس کے بعد اس میں مزید وضاحت ہوتی گئی اور اس حکم میں حکمت یہ تھی کہ طبعاً اور قانوناً ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت پر انتظامی لحاظ سے غلبہ حاصل ہوتا ہے پس اگر ایک احمدی لڑکی غیر احمدی کے ساتھ بیاہی جائے تو اس بات کا قوی اندیشہ ہوسکتا ہے کہ مرد، عورت کے دین کو خراب کرنے کی کوشش کرے گا اور خواہ اسے، اس میں کامیابی نہ ہو لیکن بہر حال یہ ایک خطرہ کا پہلو ہے جس سے احمدی لڑکیوں کو محفوظ رکھنا ضروری تھا۔علاوہ ازیں چونکہ اولاد عموماً باپ کی تابع ہوتی ہے اس لیے اس قسم کے رشتوں کی اجازت دینے کے یہ معنی بھی بنتے ہیں کہ ایک احمدی لڑکی کو اس غرض سے غیر احمدیوں کے سپرد کردیا جائے کہ وہ اس کے ذریعہ غیر احمدی اولاد پیدا کریں۔اس قسم کی وجوہات کی بنا پر آپ نے آئندہ کے لیے یہ ہدایت جاری فرمائی کہ گو حسب ضرورت غیر احمدی لڑکی کا رشتہ لیا جاسکتا ہے مگر کوئی احمدی لڑکی غیر احمدی کے ساتھ نہ بیاہی جائے بلکہ احمدیوں کے رشتے صرف آپس میں ہوں۔'' (سلسلہ احمدیہ صفحہ 84، 85 از صاحبزادہ مرزا بشیر احمد ایم اے ابن مرزا قادیانی)

5- چونکہ مندرجہ ذیل اصحاب نے اپنی اپنی لڑکیوں کے رشتے غیر احمدیوں کو دے دیے ہیں، اس لیے ان کو خلیفۃ المسیح الثانی کی منظوری سے جماعت سے خارج کیا جاتا ہے اور وہاں کی جماعتوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان سے قطع تعلق رکھیں۔

1۔ چوہدری محمد الدین صاحب ولد مراد قوم آرائیں سکنہ سیدوالا ضلع شیخوپورہ

2۔ چوہدری جھنڈا صاحب ولد چوہدری جلال الدین صاحب سکنہ چندر کے مگولے ضلع سیالکوٹ

3۔میاں جیون صاحب علاقہ آنبہ ضلع شیخوپورہ

4۔میاں غلام نبی صاحب سکنہ چک نمبر 11 ضلع شیخوپورہ

5۔چودھری علی بخش صاحب تلونڈی جھنگلاں، ضلع گورداسپور

ناظر امور عامہ۔قادیان (اخبار الفضل قادیان مورخہ 6 دسمبر 1934ء)

شیخ عطا محمد نے اپنی بیٹیوں کی شادی مسلمانوں (بقول قادیانی جماعت غیر احمدیوں) میں کی۔اگر شیخ عطا محمد قادیانی تھے اور بیعت کر چکے تھے تو قادیانی جماعت کے جاری کردہ قواعد وضوابط اور گذشتہ طرز عمل سے اخراج ومقاطعہ کی ان سزاؤں سے کس طرح بچ نکلے؟ حقیقی بات یہ تھی کہ شیخ عطا نے کبھی مرزا غلام قادیانی یا مرزا محمود کی بیعت کی ہی نہیں تھی، اس لیے کوئی بھی قادیانی جماعت کی خود ساختہ سزا ان پر لاگو نہیں ہوتی تھی۔اس لیے تو کوئی ایک قادیانی بھی غیر قادیانیوں میں شادی کرنے کی پاداش میں شیخ عطا محمد کے لیے جماعت اخراج کا ایک بیان ان کی وفات تک پیش نہ کر سکا۔

قادیانی جماعت میں چندے کے دھندے کا ایک ایسا جال بچھا ہوا ہے کہ جس طرح ایک مکڑی جالا بچھا کر مکھی کو پھنسا لیتی ہے، ویسا ہی حال عام قادیانی کا ہے۔قادیانی جماعت میں جو شخص 3 ماہ تک ماہواری چندہ نہ دے، اسے جماعت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔اس سلسلہ میں مرزا قادیانی اور ان کے بیٹے مرزا محمود کے چند بیانات ذیل میں پیش خدمت ہیں:

1۔ سو ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اس نئے انتظام کے بعد نئے سرے عہد کر کے اپنی خاص تحریر سے اطلاع دے کہ وہ ایک فرض حتمی کے طور پر اس قدر چندہ ماہواری بھیج سکتا ہے۔مگر چاہیے کہ اس میں لاف گزاف نہ ہو جیسا کہ پہلے بعض سے ظہور میں آیا کہ اپنی زبان میں وہ قائم نہ رہ سکے۔سو اُنہوں نے خدا کا گناہ کیا جو عہد کو توڑا۔اب چاہیے کہ ہر ایک شخص سوچ سمجھ کر اس قدر ماہواری چندہ کا اقرار کرے جس کو وہ دے سکتا ہے گو ایک پیسہ ماہواری ہو۔مگر خدا کے ساتھ فضول گوئی اور دروغ گوئی کا برتاؤ نہ کرے۔ ہر ایک شخص جو مرید ہے اس کو چاہیے جو اپنے نفس پر کچھ ماہواری مقرر کر دے خواہ ایک پیسہ ہو اور خواہ ایک دھیلہ اور جو شخص کچھ بھی مقرر نہیں کرتا اور نہ جسمانی طور پر اس سلسلہ کے لیے کچھ بھی مدد دے سکتا ہے، وہ منافق ہے۔اب اس کے بعد وہ سلسلہ میں رہ نہیں سکے گا۔اس اشتہار کے شائع ہونے سے تین ماہ تک ہر ایک بیعت کرنے

والے کے جواب کا انتظار کیا جائے گا کہ وہ کیا کچھ ماہواری چندہ اس سلسلہ کی مدد کے لیے قبول کرتا ہے اور اگر تین ماہ تک کسی کا جواب نہ آیا تو سلسلہ بیعت سے اُس کا نام کاٹ دیا جائے گا اور مشتہر کر دیا جائے گا۔ اگر کسی نے ماہواری چندہ کا عہد کر کے تین ماہ تک چندہ کے بھیجنے سے لاپرواہی کی اس کا نام بھی کاٹ دیا جائے گا اور اس کے بعد کوئی مغرور اور لاپرواہ جو انصار میں داخل نہیں اس سلسلہ میں ہرگز نہیں رہے گا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

المشتہر: مرزا غلام احمد مسیح موعود از قادیان۔ ضلع گورداسپور 5 مارچ 1902ء

(مجموعہ اشتہارات جلد 3 صفحہ 468 تا 469، جلد دوم صفحہ 556 طبع جدید از مرزا قادیانی)

2۔ ''حضرت اقدس کا صریح ارشاد ہے کہ جو احمدی ماہوار چندہ نہیں دیتا، خواہ وہ پیسہ ہی کیوں نہ ہو، اگر برابر تین ماہ تک ماہواری چندہ ادا نہ کرے تو وہ احمدی جماعت میں نہیں رہے گا''۔(اخبار الفضل قادیان مورخہ 3 دسمبر 1913ء)

3۔ ''پس ہماری جماعت کے لوگوں کو بھی اس امر کا خیال ضروری ہے۔ اگر یہ لوگ التزام سے ایک ایک پیسہ بھی سال بھر میں دیں تو بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ایک پیسہ بھی نہیں دیتا تو اسے جماعت میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ حالانکہ یہاں تو بہت ہلکے چندے ہیں''۔

(اخبار الفضل قادیان مورخہ 25 فروری 1930ء)

4۔ ''پس اگر کوئی معاہدہ نہیں کرتا تو اسے خارج کرنا چاہیے۔ وہ منافق ہے اور اس کا دل سیاہ ہے۔ ہم ہرگز نہیں کہتے کہ ماہواری روپیہ ہی ضرور دو۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ معاہدہ کر کے دو جس میں کبھی فرق نہ آئے''۔(اخبار الفضل قادیان مورخہ 25 فروری 1930ء)

قادیانی جماعت کے ان حوالہ جات کی روشنی میں ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت میں چندے کی اہمیت اس قدر ہے کہ جو تین ماہ تک چندہ نہ دے، وہ جماعت سے خارج ہو جاتا ہے۔ شیخ اعجاز نے اپنی ساری قوتیں اس بات میں صرف کر دیں کہ وہ ثابت کریں ان کے والد شیخ عطا محمد قادیانی تھے، اس کے لیے انہوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے مگر حیرت کی بات یہ ہے یہ کہ شیخ اعجاز ایک حوالہ بھی ایسا پیش نہ کر سکے جس سے ظاہر ہو کہ شیخ عطا محمد جماعت کو قادیانی ہونے کی وجہ سے ماہانہ چندہ دیتے تھے جبکہ وہ صاحب حیثیت بھی تھے۔ یا ایسا کوئی حوالہ کہ چندہ نہ دینے کے باعث ان کو تنبیہ کی گئی اور جماعت سے اخراج کی دھمکی دی گئی ہو۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں شیخ عطا محمد کے حوالے سے ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ کہنا کہ:

''اپنی زندگی کے ایک حصہ میں احمدی مذہب قبول کیا اور کچھ مدت تک جماعت احمدیہ میں شامل رہے مگر بعد ازاں احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑ دیا''۔(زندہ رود جلد سوم صفحہ 570)

اور جناب نظیر صوفی کا یہ لکھنا کہ:

''شیخ عطا محمد قادیانیت کے سخت خلاف تھے''۔(حیات و پیام اقبال، صفحہ 91)

حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے۔

قادیانی جماعت نے خاندانِ اقبال میں ایک واحد نقب 1931ء میں شیخ اعجاز کی صورت میں لگائی۔اس کے علاوہ علامہ محمد اقبالؒ، ان کے والد شیخ نور محمد، ان کی والدہ اور ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سب سچے اور صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔قادیانی جماعت کے بودے دلائل ان سب کو قادیانی ثابت کرنے میں بُری طرح ناکام ہو گئے۔قادیانی حضرات اس امر پر ہمیشہ سے زور دیتے آئے ہیں کہ علامہ محمد اقبال، ان کے والد اور بھائی قادیانی تھے۔قادیانی جماعت نے اس ضمن میں خود ساختہ حوالوں سے صفحوں کے صفحے کالے کر دیے۔حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ قادیانی جماعت کے لٹریچر میں علامہ محمد اقبال اور ان کے خاندان کے کسی فرد کی تعریف میں چند جملے بھی نہیں ملتے۔تاریخ احمدیت لاہور یا تاریخ احمدیت کا مطالعہ کر لیں، مرزا غلام قادیانی کے 313 اصحاب کی شان میں لکھی گئی کتاب تین سو تیرہ اصحاب وفا بھی خاندان اقبال کی تعریف کے معاملے میں بانجھ رہی۔یہ وہی تین سو تیرہ اصحاب ہیں جن میں شیخ اعجاز اپنے والد شیخ عطا محمد (برادر علامہ محمد اقبال) کو شامل کرتے ہیں۔تین سو تیرہ اصحاب صدق و وفا کتاب میں شیخ عطا محمد کا مختصر تعارف کروایا گیا ہے اور ان کے چندہ دینے کے حوالے سے چند کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں جیسا کہ مرزا قادیانی کی کتب ''سراج منیر'' اور ''تحفہ قیصریہ''۔مگر ان دونوں کتابوں میں جس عطا محمد کا ذکر ہے وہ مشتبہ ہے کیونکہ سراج منیر (روحانی خزائن جلد 12 ص 86) میں جس عطا محمد کا ذکر ہے، اس کے نام کے ساتھ اوور سیر کا اضافہ ہے اور تحفہ قیصریہ (روحانی خزائن جلد 12 صفحہ 308) والے عطا محمد کا تعلق ضلع گورداسپور سے بیان کیا گیا ہے جو کہ سراسر ایک مشتبہ دلیل ہے۔

اقبال اور ان کے خاندان کے قادیانی ہونے کے دعوے کے باوجود ان کی مدح میں

قادیانی لٹریچر کی خاموشی خود ایک ایسا سوال ہے جس پر کسی بھی جواب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

البتہ قادیانی لٹریچر میں علامہ اقبالؒ اور ان کے خاندان پر طعن و تشنیع اور ان کی کردار کشی پر مبنی بے حد مواد موجود ہے۔ علامہ اقبالؒ کے فتنہ قادیانیت کی سرکوبی پر مبنی مضامین و مقالات کے ردعمل میں قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا محمود نے اپنے ایک مضمون میں انہیں 'روحانی بیمار' قرار دیا تھا۔ (روزنامہ الفضل قادیان 18 جولائی 1935ء صفحہ 3)

آخر میں شیخ اعجاز کا اپنا بیان پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

''مجھے بھی احمدیہ لٹریچر میں علامہ اقبالؒ کے کسی وقت حضرت صاحب (مرزا قادیانی) کی بیعت کرنے کی کوئی معتبر شہادت نظر نہیں آئی''۔ (مظلوم اقبال صفحہ 189)

جی آر اعوان

قادیانیوں کی اقبال دشمنی

علامہ اقبالؒ نے قادیانیت کو کھلم کھلا الگ مذہب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو ان کے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ ہر گھڑی، ہر ساعت علامہ کی مخالفت میں سرگرم رہتے ہیں۔ جن دنوں میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا، ان دنوں ملک بھر کے دیگر مدارس میں صبح اسمبلی کے وقت علامہ اقبال کی یہ دعا پڑھائی جاتی تھی۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اسی راہ پر چلانا مجھ کو

اس کے برعکس ہمارے ہیڈ ماسٹر ملک حبیب الرحمٰن کے حکم پر سکول میں اسمبلی کے دوران کلام محمود کی یہ نظم کلام اقبال کا ہم پلہ قرار دے کر پڑھائی جاتی تھی۔

نونہالان جماعت مجھے کچھ کہنا ہے
پر ہے یہ شرط کہ ضائع میرا پیغام نہ ہو
خدمت دین کو اک فضل الٰہی جانو
اس کے بدلے میں کبھی طالب انعام نہ ہو
جب گزر جائیں گے ہم تم پہ پڑے گا سب بار
سُستیاں ترک کرو طالب آرام نہ ہو
میری تو حق میں تمھارے یہ دعا ہے پیارو
سر پر اللہ کا سایہ رہے ناکام نہ ہو

جس کو شاعری سے ذرا سا بھی شغف ہے وہ کلام محمود کا اقبال کی شاعری سے موازنہ کرنے کی جسارت ہی نہیں کرسکتا۔ لیکن مرزائی علامہ سے محض اس وجہ سے بغض وعناد رکھتے ہیں کیونکہ جس طرح انھوں نے پاکستان کا عظیم تصور پیش کیا، اسی طرح اس پیکر حکمت نے مرزائیت کو خطرے کی گھنٹی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ قادیانیت، یہودیت کا چربہ ہے۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں: مرزائیت اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوت ارادی کو فنا کردیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ میں نے تحریک مرزائیت کے ایک رکن کو خود اپنے کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے ہوئے سنا۔ سیاسی نقطہ نظر سے وحدت اسلامی اس وقت متزلزل ہوجاتی ہے جب اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت، جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا، صرف اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جاسکتی ہے اور بس یہ وہ حقائق ہیں جن سے مرزائیت کو سب سے پہلے کافر مذہب علامہ اقبال نے قرار دیا اور انھوں نے اپنے مطالعہ سے مرزا قادیانی کو خدا کا باغی، دین کا قاتل اور رسول اللہ ﷺ کا دشمن قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو علامہ سے خاص بغض تھا۔

میں نے کئی مرزائیوں سے سنا کہ اگر علامہ اقبالؒ اور شورش کاشمیری مرزائی ہوتے تو مرزائیت کو کوئی خطرہ نہیں تھا، وہ دنوں میں پھلتی پھولتی اور دنیا پر اپنا تسلط قائم کرلیتی۔ یہاں اس

امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرزائی امت کو اپنے جھوٹے نبی کی تصدیق کے لیے علامہ اقبال اور شورش کاشمیری جیسے عاشقان رسول ﷺ کی کتنی ضرورت تھی۔ دروغ برگردن راوی اکثر مرزائی علامہ اقبال پر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ پہلے مرزائی تھے اور بعد میں انھوں نے اس مذہب کو چھوڑ دیا حالانکہ علامہ اقبال کی بالغ نظری کو جدید وقدیم کی اس چپقلش کا تازیست احساس رہا۔ انھوں نے مرزائیوں کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے، ان میں کئی جگہ عقیدے کو اپنے ناخن فکر سے کھولا۔ یہی وہ عوامل ہیں جو مرزائی نبی اور اس کے برگ و بار خلفا اور امت کو علامہ اقبال کی ذات کے خلاف زہر اگلنے پر مجبور کرتے رہے۔

بھارتی روزنامے ''سٹیٹس مین دہلی'' کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ علامہ انگریزوں کو کھلے خطوط تحریر کرتے رہے جن میں قادیانیوں اور مسلمانوں کی نزاع کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کیا گیا۔

ہم لوگ جب ایف۔ اے میں پڑھتے تھے تو ہمارے نصاب میں علامہ اقبالؒ کا یہ کلام شامل تھا۔

کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ میری حدیث گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا! تجھے کیا ملے گا نماز میں

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی نے یہ کلام پڑھاتے ہوئے زہر اگلا کہ علامہ کی اس نظم کا توڑ مرزا غلام احمد کی بیٹی نواب مبارکہ بیگم نے اپنی کتاب ''درعدن'' میں کر دیا ہے جس کا مطالعہ کر کے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوفہ کی فکر علامہ اقبال سے کتنی بلند ہے۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کہاں ''راجہ بھون کہاں گنگو تیلی''۔ یہ شخص ایک عظیم انسان کو کس ''جنس کا سد'' کے ساتھ ملا رہا ہے۔ نواب مبارکہ بیگم کا کلام ملاحظہ ہو۔

مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
جو خلوص دل کی رمق بھی ہے ترے ادعائے نیاز میں
تیرے دل میں میرا ظہور ہے، تیرا سر ہی خود سر طور ہے
تیری آنکھ میں میرا نور ہے، مجھے کون کہتا ہے دور ہے
مجھے دیکھتا جو تو نہیں تو یہ تیری نظر کا قصور ہے
مجھے دیکھ طالب منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
مجھے دیکھ رفعت کوہ میں مجھے دیکھ پستی کاہ میں
مجھے دیکھ عجز فقیر میں، مجھے دیکھ شوکت شاہ میں
نہ دکھائی دوں تو یہ فکر کر کہیں فرق ہو نہ نگاہ میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
کبھی بلبلوں کی صدا میں سن کبھی دیکھ گل کے نکھار میں
میری ایک شان خزاں میں ہے میری ایک شان بہار میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
میرا نور شکل ہلال میں میرا حسن بدر کمال میں

کبھی دیکھ طرز جمال میں کبھی دیکھ شان جلال میں
رگ جاں سے ہوں میں قریب تر، تیرا دل ہے کس کے خیال میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں

مرزائی امت اس بات کی شدت سے خواہش مند تھی کہ وہ حضرت علامہ اقبال کے مدمقابل کے طور پر اپنے ہاں کوئی ایسی شخصیت سامنے لائے لیکن ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں کہ دانائے راز صدیوں میں آتا ہے جس کا مقابلہ مرزا قادیانی جیسے مسیلمہ کذاب نہیں کر سکتے۔ اکثر مرزائی کلاس فیلو یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ ان کے نبی کے فیض کے اثر سے سب سے زیادہ مرزائی شہر اقبال سیالکوٹ میں ہوئے ہیں۔ قصہ مختصر مرزائیوں نے مرزا قادیانی کی شان بلند کرنے کے لیے جس طرح کئی پاپڑ بیلے، اس طرح علامہ کے مرتبہ کو کم کرنے کے لیے بے شمار حربے استعمال کیے، لیکن نہ وہ اپنے ''نبی'' کا مقام بلند کر سکے نہ علامہ کی شان گھٹا سکے۔

خضر تمیمی ایم۔اے، ایل ایل بی

اقبالؒ کے ہاں

حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتِ گرامی کے متعلق، ایک ہیچمدان کا کچھ کہنا، چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔لیکن ایک صحبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہوگی۔

1936ء قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ایک طرف علمائے اسلام اپنی تحریروں اور تقریروں سے ''قصرِ خلافتِ قادیان، کی بنیادی متزلزل'' کر رہے تھے اور دوسری طرف مرزائی صاحبان اپنی طویل اور قاطع دلیلوں سے ''سعید روحوں'' کو راہِ راست پر لا رہے تھے۔ان ایام میں حضرت ممدوح علیل تھے۔لیکن طرفین کی وزنی دلیلیں، سیدھے سادھے نوجوانوں کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں، اس لیے کئی ایک تشنگانِ ہدایت، راہنمائی حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نوجوان بڑی بیتابی کے ساتھ، آپ کے ارشاداتِ عالیہ کے منتظر ہیں، آپ نے اپنا شہرہ آفاق مضمون ''اسلام اور قادیانیت'' شائع فرمایا، جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں اور وہ دلائل جو سیاق وسباق کا لحاظ رکھے بغیر، سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کرسکتی تھیں، تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں اور نوجوانوں کی متوقعہ بے راہ روی کا مکمل سدِّ باب ہوگیا۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی۔چنانچہ انھوں نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی جس کا جواب حضرت علامہؒ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے تحریر فرمایا۔اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی رفع ہوگئے۔

قصہ کوتاہ ہر طرف قادیانیت کے موافق یا مخالف تذکرے شروع تھے، جن سے مساجد اور عام جلسہ گاہوں کے علاوہ مکلّف کوٹھیوں کے خلوت کدے بھی خالی نہ تھے، ان ایام میں یہی

معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں صرف دو ہی فریق رہ گئے ہیں۔ ایک وہ جو قادیانیت کا مخالف ہے اور دوسرا وہ جو اس کے موافق۔ میں نے اس سال پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے (فارسی) کا امتحان دیا۔ حضرتِ ممدوح ہمارے ایک پرچے کے ممتحنِ اعلیٰ تھے اور اس میں ممدوح نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافتِ الٰہیہ اور مجدد کے نظریے کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا، جس میں ضمنی طور پر قادیانیت بھی زیرِ بحث آ جاتی تھی۔

اپنے دوست، صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم کے ساتھ ''جاوید منزل'' میں، مجھے حضرت ممدوح کی زیارت نصیب ہوئی۔ ہمارے جانے سے پیشتر، قائداعظم مسٹر محمد علی جناح، کسبِ فیض کے بعد موٹر میں سوار کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ آپ نے دروازہ تک ان کی مشائعت کی اور پھر ہماری طرف توجہ فرمائی۔ صوفی صاحب کو دیکھ کر تو آپ بس نہال ہی ہو گئے۔

ڈیوڑھی میں، ایک کُھری چارپائی بچھی تھی، جس کے سرہانے چھوٹا سا تکیہ دھرا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پائنتی کی طرف کوئی کپڑا نہ تھا۔ اس پر ایک کتاب کھلی ہوئی پڑی تھی، جس کے ایک خاص مقام پر پنسل دھری تھی۔ ایک کاپی شاید مختصر یادداشتوں کے لیے پاس تھی۔ حضرت ممدوح صرف سادہ سے کُرتے اور شلوار میں ملبوس تھے۔ آخر الذکر پنجاب کی پانچ گزی شلوار اور پائجامے کے بین بین تھی۔ اللہ اللہ مشرق و مغرب کے جملہ علوم کا ماہر خرابی صحت اور زیادتی عمر کے باوجود اب بھی اس شان سے ہمہ تن مطالعہ تھا!

علی بخش چائے لایا اور آپ نے میٹھی چائے پر نمکین کو ترجیح دی۔ چائے کے ساتھ ساتھ بات چیت کا دور شروع ہوا۔ میں نے ''جاوید نامہ'' کی ان تصریحات کے متعلق استصواب کیا۔

آں زاریاں بود و ایں ہندی نژاد

آپ نے جواب میں قادیانیت اور اس کے بانی کی مختلف تحریروں اور دعاوی کے پیش نظر ظاہر فرمایا کہ ثانی الذکر کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لیے بہت موزوں ہے۔ صوفی صاحب بولے کہ آپ سے بڑھ کر موصوف کا تجزیہ نفسی کون کر سکے گا۔ ارشاد ہوا کہ موضوع واقعی بہت دلچسپ ہے لیکن صحت کی خرابی مانع ہے۔ کوئی نوجوان اس کام کے لیے اُٹھے تو اس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کروں گا۔ اس کے بعد آپ نے ان نقصانات کو گنایا جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں مذاہبِ عالم کو برداشت کرنے پڑے۔ پھر مختلف مذاہب سے اسلام کے امتیازات کو

بشرحِ تمام واضح کر کے ارشاد فرمایا کہ اسلام نہ صرف دنیا کے مذاہب میں سے کامل ترین مذہب ہے بلکہ اس سلسلے میں جو ارتقائی بلندیاں انسان کو ودیعت کی گئی ہیں، ان کی بھی آخری کڑی ہے۔ آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانیت کی تعلیم، اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے کس طرح منافی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات پر آپ نے ظاہر فرمایا کہ قادیانیت کے ارکانِ اعلیٰ، اسلافِ صالحین کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انھیں ایک خاص موضوع پر کی مسلمہ کتب کا علم تک بھی نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ فریقین کی آراء کو ایک طرف رکھتے ہوئے آپ مسئلہ ''ختم نبوت'' کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ **اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ** کی صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میں نے عرض کیا کہ آخر اسلام میں اور فرقے بھی تو ہیں، صرف قادیانی صاحبان کی مخالفت ہی کیوں کی جائے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ ان کا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے اور حقیقت میں یہ اسلامی فرقے مختلف گروہ ہائے خیال **(Schools of thoughts)** ہیں جن کے اختلافات فقہ پر مبنی ہیں۔ ہر ایک فرقہ اسلام کے مسلمات پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن قانونِ اسلامی کے بعض حصوں کی تشریح میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے۔ فقیہوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحاب ''خشک'' ہونے کے باوجود حضور سرورِ کائنات ﷺ کے معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں۔ ایک صاحب اُٹھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فلاں کام اس طرح کیا۔ اس دعوے کی تائید میں وہ ہر ممکن ثبوت (قرآن، حدیث یا دیگر مآخذ سے) بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے صاحب اس کی تردید میں فرماتے ہیں کہ نہیں یہ کام حضور ﷺ نے یوں سرانجام دیا۔ وہ اپنے دلائل الگ پیش کرتے ہیں، جس سے مستفسیر کو حضور ﷺ کی مبارک زندگی کے ایک خاص پہلو کے متعلق موثق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ جہاں کہیں حضور ﷺ کا ذکر آیا، ان جذبات سے عاری مقنّنین کے دلوں میں محبت کے سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگ گئے۔ ان حضرات کی زندگی کا محبوب سرمایہ حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے، جس کے ہر پہلو کو اس قدر حزم و احتیاط سے محفوظ و ملحوظ رکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہاں آپ نے **Gealously Guard** کرتے ہیں کا فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔ اب تم خود اندازہ کر لو کہ ایسی محبوب و مفتخر ہستی کے جملہ اعزازات کے

لیے کسی اور صاحب کو چن لینا، اسلامی علوم کی فلک رفعت عمارت کے انہدام سے مترادف نہ ہو گا؟ بانی مرزائیت کے کوائف زندگی اور انہی حالات میں حضور ﷺ کے مبارک افعال کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے آپ آبدیدہ ہوگئے اور نبی کریم ﷺ کی محبت میں بہتے ہوئے آنسوؤں سے ہم شکوک کے داغوں کو دھوتے اور دلوں کو روشن کرتے، صوفی صاحب کے دولت کدے پر لوٹ آئے۔ سچ ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ڈاکٹر مقبول الٰہی

کیا اقبال قادیانیت سے متاثر تھے؟

''سیارہ'' کے شمارہ 55 میں محترم حکیم سہارنپوری کا جناب بشیر احمد صاحب کی کتاب ''اقبال اور قادیانیت: تحقیق کے نئے زاویے'' پر مطالعاتی تبصرہ پڑھنے کا موقع ملا۔ اس موضوع سے میری دلچسپی اوائل عمر سے رہی ہے۔ اس لیے یہ کتاب اصالتاً پڑھنے کا اشتیاق ہوا۔ عزیزم جناب حفیظ الرحمٰن احسن صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے کتاب مہیا کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ میری خوش بختی کہ ان کے ایما پر جناب شکیل عثمانی صاحب نے ازخود میرے گھر تشریف لا کر میری خواہش پوری کر دی۔ ان دونوں کی عنایت میں ممنون!

جناب بشیر احمد صاحب نے اس دور کی مذہبی فضا میں مرزا غلام احمد قادیانی کے کردار، اعمال، افعال، ان کے ''خلفا'' و ''صحابہ'' اور ''امتیوں'' کی تصانیف، تاویلات، سیاسیات، علامہ اقبال کے قادیانیت کے ساتھ روابط اور تاثرات، ان کو قادیانی یا لاہوری ثابت کرنے کی تادم، اپنے راویوں کی زبانی کوششیں اور اس وقت کی قادیانی صحافت اور موجودہ جاری تحقیق، علامہ کا ان بے بنیاد الزامات سے بارہا اظہارِ براءت و نفرت...... ان سب پر، اور نہرو، اقبال مکاتیب پر حوالہ جات دے کر، قادیانیوں کے الزامات و مزعومات کا جواب دیا ہے۔ ان کی وسعتِ علمی، گہرے مطالعے اور زیرکی کو خراجِ تحسین پیش کرنا پڑتا ہے۔ کتابیات کی فہرست پر ہی ایک نظر ڈالی جائے تو جناب بشیر احمد صاحب کی محنت، لگن اور مقصدیت کے خلوص کا پتہ چل جاتا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ قادیانی اربابِ تاریخ و قلم کی تیسری چوتھی نسل اب تک کیوں اقبال کو قادیانی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ اس سلسلے میں قادیانی حضرات نہ صرف اقبال کے اوّلین دور سے لے کر آخر تک کے بڑے ہی واضح اشعار، تحریرات اور بیانات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے بلکہ اپنے ہی زعما چودھری ظفر اللہ خاں اور شیخ اعجاز احمد اور اپنے ہی ہمدرد

سرپرست سر فضل حسین کے انٹرویو میں دیے ہوئے اور ضبط تحریر میں لائے ہوئے اس بیان کو بھی کہ اقبال مرزا صاحب سے ملے ضرور ہیں لیکن بیعت نہیں کی، کیوں قابل قبول نہیں سمجھتے۔اس لمبے عرصے اور معتبر حضرات پر پھیلے ہوئے انکارِ مسلسل کو کیوں قبول نہیں کیا جاتا؟ کیا ملک محمد جعفر خاں، جو پاکستان میں وزیر رہ چکے ہیں، قادیانی نہیں تھے؟ وہ خود کہتے اور لکھتے رہے تھے، تا آنکہ تائب ہوئے اور ایک بڑی مدلل کتاب ''تحریک احمدیہ'' ردقادیانیت میں لکھی۔ انہیں تو اس کتاب لکھنے کے بعد قادیانیوں نے تاحال قادیانی ثابت کرنے کی کوشش جاری نہیں رکھی۔ قادیانی، اقبال کے تمام تر اور ہمہ جہت انکار اور تصنیفات کے باوجود ابھی تک ایک ہی سرالاپتے جا رہے ہیں، حیرت ہے! ایک بات جس کا وہ سہارا لیتے نہیں تھکتے، وہ اوائل عمری میں اقبال کا یہ کہنا تھا کہ قادیان میں ''اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونے'' کی جھلک ملتی ہے۔ یہ صرف اقبال ہی کا دور کا تاثر نہیں تھا بلکہ اور لوگ بھی اپنے بچوں کو بہتر تعلیم کی خاطر قادیان کے سکول میں بھیجتے تھے اور میں ذاتی طور پر اُن میں سے چند ایک کو جانتا بھی تھا۔ ایک طرف تو یہ شہرہ تھا اور دوسری طرف آفتاب اقبال، جن کو علامہ نے بہتر اسلامی تعلیمی ماحول کے لیے قادیان بھیجا تھا، بزبان اپنی اہلیہ رشیدہ بیگم درج ذیل چشم کشا تحریر چھوڑ گئے ہیں:

- ''آفتاب اقبال جماعت احمدیہ کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کے اخلاق سیئہ سے باخبر ہوئے۔ اور انھوں نے مرزا بشیر الدین محمود کے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سے آگاہ کیا تھا کہ میں ایک عورت ہونے کے ناطے اپنے قلم سے اس روداد کو بیان کرنے سے لرزہ محسوس کرتی ہوں''۔ (''علامہ اقبال اور ان کے فرزندِ اکبر آفتاب اقبال'' صفحہ **131** اور **133**)

ایک طرف اقبال اور دیگر خوش گمان حضرات کا ابتدا میں تاثر پاکیزہ ماحول کا تھا اور دوسری طرف قادیانی معاشرے کے سرکردہ خاندانوں کی یہ ناگفتنی حالت تھی۔ یہ محض آفتاب اقبال کی الزام تراشی نہیں تھی، ہرگز نہیں تھی۔ میں دیگر ایسے اشخاص سے لاہور میں تعلیم کے دوران میں مل چکا ہوں جن کا قادیان کے اندرونی جوان طبقے سے تعلق تھا، جو اس طرح کی قادیانی معاشرت کے چشم دید حالات بتاتے تھے۔ پتہ نہیں کسی نے ان ''لرزہ خیز'' واقعات پر قلم اٹھایا ہے یا نہیں، غالباً شرفِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے مناسب نہیں سمجھا گیا۔ یہ باتیں قادیان سے لاہور پہنچتیں اور محفلوں میں دہرائی جاتیں۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور تو اس سلسلے میں رنگین

بیانی سے رومان پروری تک کیا کرتے تھے، اور ''بیعانۂ سرور''، ''پیمانہ نشاط''، ''صاق صندلیں''، ''رونق عریاں'' وغیرہ کی تراکیب وضع کرتے تھے۔ امرتسر کے ایک شاعر تھے نفیسؔ خلیلی، وہ بھی اس موضوع سیئہ پر مشق سخن کیا کرتے تھے، ان کا ایک چھ سطری بند اس وقت نہ جانے کیوں حسب موقع یاد آ گیا ہے لیکن بقول انھی کے

''خدا کے لیے منہ نہ کھلوایئے گا''

اس بات کو مشتے از نمونہ کے طرز پر چھوڑ کر جناب شکیل عثمانی صاحب کے اٹھائے ہوئے ایک نکتے کی طرف آتا ہوں۔ زیر نظر کتاب کے صفحہ **62** پر مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ اول حکیم نورالدین کے عربی میں القا:

''**مِنْ حَيْثُ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ لَايَعْلَمُوْن**'' کے بارے میں عربی زبان وادب کے ایک ممتاز فاضل اور ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے عرب مجلّے ''**اَلدِّرَسَاتُ الْاِسْلَامِيَّة**'' کے ایڈیٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ حکیم صاحب کا القا مہمل اور قواعد زبان کے لحاظ سے غلط ہے۔ اسی رائے کا اظہار عربی زبان وادب کے چند اور ممتاز ماہرین نے بھی کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عربی میں ''**مِنْ حَيْث**'' بطور علت، معلول کے بعد استعمال ہوتا ہے، جبکہ اس ''القا'' میں ترتیب معکوس ہے۔

جس نبی صاحب کے حکیم صاحب خلیفہ اول تھے، ان کی عربی دانی کے دعوؤں اور حقیقت کا نمونہ بھی پیش خدمت ہے۔ راقم **1941-42**ء میں اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے عربی کا متعلم تھا اور کالج سے ملحقہ ولنر **(Wollner)** ہاسٹل کے کمرہ نمبر **2** میں قیام پذیر تھا۔ اس کے ساتھ تین قادیانی متعلم بھی تھے، نصیر احمد شاہ، مبارک احمد مسعود اور بشارت الرحمٰن۔ موخر الذکر لائق طالب علم تھا اور ساتھ ہی اس زمانے کی فضا کے مطابق قادیانیت کے لیے تبلیغی طور پر سرگرم۔ ویسے تو یہ حق جوانمرگ مبارک مسعود کا تھا جو عبدالرحمٰن مصری کا بیٹا تھا، خوش رو شاعر تھا اور اس کا بڑا بھائی کینیا میں مشن کا انچارج بتایا جاتا تھا۔ بشارت الرحمٰن مرزا صاحب کی عربی دانی کے دعوؤں کی باتیں کرتا رہتا۔ اس زمانے میں ہمارے استاد محمد العربی الہلالی المراکشی نئے نئے اورینٹل کالج میں ملازم ہوئے تھے اور ہمیں عربی ادب پر لیکچر دیتے تھے۔ وہ نوجوان تھے اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔ عربی بولنے پر ہمت افزائی کرتے تھے۔ مجھ پر شفقت فرماتے اور فارغ وقت میں

میرے کمرے میں، جو بہت نزدیک تھا، تشریف لے آتے۔ مجھ سے انگریزی سیکھنے اور اُردو بولنے کی کوشش کرتے۔ میرے ہم جماعت فضل الرحمٰن (بعد کے مشہور ڈاکٹر فضل الرحمٰن، سابق ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد) بھی میرے کمرے میں موجود ہوتے۔ یہ پس منظر قادیانی حضرات کی عربی دانی کی حقیقت کے اظہار کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ اب راقم اپنی 1943ء تا 1945ء کے روزنامچے کے اندراج کی نقل ذیل میں پیش کرتا ہے۔ فوٹو اسٹیٹ بھی حاضر کی جاسکتی ہے۔

''ولنر (Woolner) ہوسٹل کی ایک اور یاد۔ بشارت الرحمٰن قادیانی احمدی مرزا صاحب کی کتاب ''اعجاز المسیح'' کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ کیسے مرزا صاحب نے اپنے زمانے کے علما کو دعوت دی کہ ایسی تشریح وتفسیر لکھیں۔ کیسے انھوں نے دس ہزار روپے اس آدمی کو دینے کا اعلان کیا جو اس میں سے ایک بھی غلطی نکال دے۔ میں نے کتاب دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد کہا گیا کہ انعام ایک ہزار روپیہ تھا، اور چند دنوں کے بعد انعام کی رقم اس سے نصف رہ گئی۔ میں نے کہا کہ میں انعام کا خواہش مند نہیں۔ کتاب دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ وہ کتاب لے آئے۔ میں نے استاذی محمد العربی الہلالی المراکشی سے ذکر کیا۔ انھوں نے مندرجہ ذیل غلطیوں کی طرف چند منٹوں میں میری توجہ دلائی۔ میں نے یہ کاغذ پرزہ اپنے خطوں میں دبا پایا۔ اس کو نقل کر دینا محفوظ سمجھتا ہوں۔ کچھ غلطیاں Indianism کی ہیں۔

یہاں ایک وضاحت کر دوں کہ نظارت اشاعت ربوہ پاکستان نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تمام تصانیف ''روحانی خزائن'' کے نام سے متعدد جلدوں میں شائع کر دی ہیں۔ ''اعجاز المسیح'' جلد نمبر 18 میں شامل ہے۔ جلد نمبر 18 سے مراجعت کی تو یہ بات سامنے آئی کہ اس میں وہ غلطیاں جوں کی توں ہیں جو اُس ایڈیشن میں تھیں جو جناب بشارت الرحمٰن صاحب نے مجھے 1943ء میں پڑھنے کو دیا تھا۔ اس لیے صفحہ نمبر ''روحانی خزائن'' کا دے رہا ہوں تا کہ قاری کو سہولت رہے۔

ٹائٹل: 1- **ولا يحسر عن ساعده**: صحیح یہ ہے **حسر عن رأسه و شمر عن ساعده.**

2- **للمقابلة**: اُردو ترکیب ہے، عربی میں ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔

3- **كتابٌ ليسَ له جوابٌ**: ترکیب اور محاورہ اُردو کا ہے، عربی کا نہیں۔ **كتابٌ لا**

مثیل له او نظیر له ہونا چاہیے۔

4- **بحول اللّٰہ** ہوتا ہے، **من حول اللّٰہ** نہیں ہوتا۔

صفحہ نمبر 3: **اَری لهم: اری** خود متعدی ہے۔ ایک حالت میں دو مفعول تک بھی متعدی ہوتا ہے۔ اس لیے حرفِ جار کی ضرورت نہیں رہتی۔

صفحہ نمبر 4: **وخلت راحتها من بخل المزنة**۔ اگر (اس کی ہتھیلی) بخل سے خالی ہوگئی تو اس کا مطلب سخاوت ہوگا۔ لیکن مرزا صاحب کا مطلب اس کے برعکس ہے۔

صفحہ نمبر 7: **اُبُعِثُ و اُرُسِلتُ** نبیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ **اُنزلَ**۔ وحیٔ فرشتہ یا کتاب اللہ کے لیے''۔

میں نے کتاب واپس کرتے ہوئے بشارت الرحمٰن کو ان غلطیوں کے متعلق بتا دیا تھا۔ ازاں بعد اس موضوع پر ان سے میری بات نہ ہوئی۔ میں بسلسلہ ملازمت دہلی چلا گیا۔ پھر آج تک میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

تو جہاں ایک نبی صاحب کی عربی دانی کا یہ عالم تھا، وہاں اُن کے خلیفہ نے علت و معلول کی معمولی غلطی، نصِ قرآنی کو اپنے القا میں اُلٹ پھیر کر دینے میں کر دی، تو کیا غضب کیا۔

کاش کوئی عرب عالم مرزا صاحب کی عربی تصانیف کا بلحاظ صحتِ زبان محاسبہ کر کے ہمارے سامنے لائے تا کہ جعلی نبوت کا پردہ اس لحاظ سے بھی چاک ہو جائے۔

جناب بشیر احمد صاحب نے کتاب کے صفحہ 73 پر اقبال کے 1911ء کے خطبہ بعنوان ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' پر، جو اصلاً بزبان انگریزی تھا اور جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا، توجہ دلائی ہے کہ مترجم نے لفظ So-called کا ترجمہ کیا ہی نہیں جو فرقہ ٔ قادیان کے بارے میں استعمال کیا گیا تھا۔ عام طور پر so-called کا ترجمہ 'نام نہاد' کیا جاتا ہے، لیکن مصنف نے نام نہاد کے بجائے 'جسے عام طور پر قادیانی کہا جاتا ہے' کرنا پسند کیا ہے۔ ازاں بعد وہ اپنے موضوع بحث، یعنی یہ کہ اقبال نے قادیانی فرقہ کو اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ، کن معنوں اور ماحول میں قرار دیا تھا، کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اقبال کا ایک وضاحتی بیان یہاں پر منقول ہے۔ لیکن اس موضوع پر جامعیت کے ساتھ پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب نے اقبال کے اسی لیکچر کا تعلیقات کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ جو دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی

اسلام آباد کے مجلّے ''دعوۃ'' کے نومبر، دسمبر 2007ء کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ اس کے نوٹ نمبر 20 (صفحات 44 تا 49) میں انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کے تسامحات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ اقبال کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے وضاحتی شذرہ مورخہ 21 اکتوبر 1935ء کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس کی رو سے یہ بحث ختم ہو جانی چاہیے۔ پروفیسر شاکر صاحب کے نوٹ نمبر 20 کی عبارت درج ذیل ہے:

- ''علی گڑھ میں 1911ء میں دیا جانے والا خطبہ اقبال کے اپنے کاغذوں میں محفوظ رہا۔ 1935ء کے دوران میں انھوں نے اس خطبے کو پڑھا تو اس کے ''مسلم ٹائپ آف کیرکٹر'' والے حصے سے پیدا ہونے والے اشتباہ کو دور کرنے کے لیے اس پر اپنے ہاتھ سے ایک وضاحتی شذرہ لکھا جس کے الفاظ یوں ہیں:

(یہاں پہلے انگریزی متن درج ہے۔ اس کے بعد یہ اُردو ترجمہ ہے):

''یہ خطبہ 1911ء میں علی گڑھ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس خطبے میں قادیانیوں کے بارے میں جو رائے دی گئی، اس پر 1911ء میں اس تحریک (قادیانیت) کی روح کے ظہور کی روشنی میں لازماً نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ قادیانی اپنے خارج میں ابھی تک اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقتاً وہ اپنے خارج کے معاملے میں بہت محتاط ہیں، مگر اس تحریک کی روح، جو اکثر پھوٹ پڑتی ہے، مکمل طور پر اسلام کے لیے ضرر رساں ہے۔ بظاہر وہ مسلمان دکھائی دیتے ہیں، اور ایسا دکھائی دینے کے لیے بیتاب بھی ہیں، لیکن داخلی سطح پر ان کی تمام تر ذہنیت مجوسیوں کی سی ہے۔ اس کا غالب امکان ہے کہ آخر کار یہ تحریک بہائیت پر ختم ہو، جس سے یہ اپنے آغاز ہی سے فیض حاصل کر رہی ہے۔

محمد اقبال

21 اکتوبر 1935ء''

زیرِ مطالعہ کتاب کے صفحات 139، 140 پر ردِ قادیانیت کے موضوع پر ایک کتاب His Holiness (ہز ہولی نس) اور اس کے مصنف کے قلمی نام Phoenix کا ذکر ہے۔ بشیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ مصنف نے بعض وجوہ کی بنا پر اپنا قلمی نام Phoenix استعمال کیا۔ لیکن بشیر صاحب نے اس جگہ یا کسی نوٹ میں ان کا اصل نام کا ذکر نہیں کیا۔ میں

''فونکس'' کو 1936ء سے خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ میرے نہایت محترم محبّ و مشفق تھے۔ ان کا اسم گرامی عبدالمجید تھا۔ ان کا تعلق نارووال کے ایک سرکردہ خاندان سے تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور (اب جی سی یونیورسٹی لاہور) میں شعبہ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالمجید، مصنف تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور، ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ بھٹو دور کے ایک سیکرٹری وزارتِ خارجہ مرحوم افتخار علی ان کے ماموں زاد تھے۔ عبدالمجید صاحب صحافت سے تا دیر منسلک رہے اور آخر میں روزنامہ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر رہے۔ گلبرگ 2 لاہور میں ان کا اپنا مکان تھا، جہاں مجھے متعدد بار حاضر ہونے کا موقع ملا۔ علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں معروف و مقبول تھے اور پروفیسر مجید یا ''بھاءٗ'' محمد کے القاب سے پہچانے جاتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال سے اُن کے کس طرح کے مراسم تھے، بشیر صاحب نے خود ظاہر کیے ہیں۔ وہ سرکاری ملازمت میں بھی رہے جیسا کہ اُس زمانے میں نابغوں کا مقدر تھا۔

جناب شکیل عثمانی صاحب نے قادیانی ''محققوں'' اور ''دانشوروں'' کی تحریر کردہ نئی کتابوں کی طرف توجہ دلانے روزنامہ نوائے وقت میں بروقت مضمون لکھنے اور جناب بشیر احمد صاحب کا دستِ راست بن کر ''اقبال اور قادیانیت'' کے موضوع پر کتاب لکھوانے میں بڑا نمایاں کام کیا۔ زیر نظر کتاب میں ان کا لکھا ہوا دیباچہ ان کے مطالعہ، وسعتِ علم اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ بظاہر سیماب صفت لیکن مصروفِ کار شکیل عثمانی! سدا خوش رہو!

محمد متین خالد

انتخابِ اقبالیات

علامہ اقبالؒ حکیم الامت کیسے بنے؟

❑ ”علامہ محمد اقبالؒ کی شخصیت کا سب سے زیادہ ممتاز اور قابل قدر وصف جذبہ عشق رسول ﷺ ہے۔ ذات رسالت مآب ﷺ سے انھیں جو والہانہ عقیدت تھی، اس کا اظہار ان کی چشم نمناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا۔ اس کیفیت کے حوالے سے مولانا غلام حسین جہانیاں فیضوی قادری، اپنی مرتب کردہ کتاب ”حیات القلوب“ میں ڈاکٹر عبدالمجید ملک کے حوالے سے لکھتے ہیں:

❑ ”ڈاکٹر عبدالمجید ملک نے علامہ اقبالؒ سے عرض کیا۔ ”آپ حکیم الامت کیسے بنے؟“ علامہ صاحب نے فرمایا، ”یہ تو کوئی مشکل نہیں۔ آپ چاہیں تو آپ بھی حکیم الامت بن سکتے ہیں“ ملک صاحب نے عرض کیا کہ وہ کیسے؟ علامہ اقبال نے فرمایا، ”میں نے گن کر ایک کروڑ بار درود شریف پڑھا ہے۔ آپ بھی اس نسخہ پر عمل کریں تو آپ بھی حکیم الامت بن سکتے ہیں“۔

(حیات القلوب، تحفۂ درود وسلام فی سیّد الانام از غلام حسین جہانیاں فیضوی قادری، ص 552، مطبوعہ 2001ء مطبع میسون پبلی کیشنز، پل شاہ والا، ملتان)

(اقبال ایک مرد مومن از ڈاکٹر صغریٰ ص 543، 544)

حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کی گواہی

❑ ”علامہ محمد اقبال، علمائے حق اور صوفیائے عظامؒ کا احترام دل کی گہرائی سے کرتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں جبکہ ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا، ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے معلوم ہوا کہ علما و مشائخ کے طبقے میں جو اہل دل تھے، وہ انتہائی پابندیٔ شریعت وطریقت کے باوجود علامہ اقبالؒ کے پایہ شناس تھے۔ لاہور سے چند میل کے فاصلے پر قصبہ شرق پور میں ایک

بزرگ میاں شیر محمدؒ رہتے تھے۔ نہایت نیک، پرہیزگار اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ احترام شریعت پر بے حد مصر تھے اور جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، انھیں ڈاڑھی رکھنے کی سخت تاکید کیا کرتے تھے۔ علامہ اقبال کو متقی اور پرہیزگار بزرگوں سے ملنے کا ہمیشہ ہی سے شوق تھا۔ ایک دن وہ میاں شیر محمد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ میاں صاحب مسجد میں بیٹھے تھے۔ پوچھا کیسے آئے؟ اقبال نے کہا ''میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے'' میاں صاحب نے فرمایا: ''تم ڈاڑھی منڈاتے ہو، میں تمھارے لیے دعا نہیں کرسکتا''۔ مجلس دم بخود رہ گئی۔

علامہ اقبالؒ یہ سن کر اُٹھے اور مسجد سے باہر نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف چلے۔ اڈا ذرا دور تھا۔ اُدھر حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے حضرت میاں صاحب سے پوچھا ''آپ نے پہچانا، یہ شخص کون تھا؟'' فرمایا ''نہیں''۔ وہ کہنے لگا ''ڈاکٹر اقبال''۔ یہ سن کر حضرت میاں صاحب کی عجیب حالت ہوئی۔ مسجد سے نکل کر ننگے پاؤں اڈے کی طرف دوڑے۔ علامہ تانگے پر سوار ہو ہی رہے تھے کہ یہ آن پہنچے۔ بے حد معذرت کی اور کہا کہ میرے نزدیک آپ جیسے شخص پر جس نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان اور عمل کے چراغ روشن کردیئے ہیں، ڈاڑھی کے معاملے میں سختی کرنا مناسب نہیں۔ اس کے بعد علامہ کے لیے دعا کی اور علامہ مسرور و مطمئن واپس لاہور آئے''۔

(ذکر اقبال از عبدالمجید سالک ص130، 131، اقبال ایک مرد مومن از ڈاکٹر صغریٰ صفحہ 514، 515)

عقیدۂ ختم نبوت

❑ ''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے (جس کا ظہور آپ ﷺ کی تعلیمات کی بدولت ہوا۔ مترجم) بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے (جس کی آپ ﷺ نے راہنمائی کی۔ مترجم) لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ﷺ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے (یعنی جن کی زندگی کو راہنمائی کے لیے ضرورت تھی۔ مترجم) لہٰذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کردیا جائے گا، استقرائی عقل کا ظہور ہے۔

اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ (جیسا کہ تعلیماتِ قرآنی کا مقصود بھی ہے۔ مترجم) یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے (کہ انسان اپنے وسائل سے کام لے، اس کے قوائے فکر و عمل بیدار ہوں اور وہ اپنے اعمال و افعال کا آپ جواب دہ ٹھہرے۔ مترجم) کیونکہ یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے، جو باعتبارِ نوعیت (ان معنوں میں کہ اس کا تعلق ادراک بالحواس سے نہیں۔ مترجم) انبیا کے احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے آفاق و انفس دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے، اور اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہی کا ظہور محسوسات و مدرکات (محسوسات، یعنی ہماری وارداتِ شعور، ہمارے داخلی احوال اور تجربات اور مدرکات، یعنی ہمارے وہ مشاہدات جن کا تعلق عالم فطرت کے مطالعہ سے ہے۔ مترجم) میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے (لہٰذا اس کی تنقید لازم ٹھہری۔ مترجم) حاصل کلام یہ کہ تصورِ خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے، جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات نہ کبھی ہوسکتی ہے، نہ ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہرحال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں۔ اس لیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائیں۔ (اور ہم ان کا مطالعہ عقل و فکر اور تعلیمات نبوت کی روشنی میں کریں۔ مترجم)

بعینہٖ جس طرح اسلامی کلمہ (**لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ**۔ مترجم) کے جزو اوّل نے انسان کے اندر یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات (بالفاظ دیگر مظاہر فطرت یا قوائے طبیعیہ۔ مترجم) کا مطالعہ نگاہِ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے۔ (یعنی ان کو دیوی دیوتا تصور نہ کرے۔ مترجم) جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا دستور تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ ان کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو، ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسے اپنی دوسری واردات اور اس لیے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں۔ حضور نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا“۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ از حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ، ترجمہ از سیّد نذیر نیازی ص 193)

❑ (یکم اکتوبر 1930ء میکلوڈ روڈ) ”ختم نبوت کے عقیدے پر گفتگو میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ ”ختم نبوت کے عقیدے کی ثقافتی قدر و قیمت یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ کے لیے اعلان فرما دیا کہ آئندہ کسی انسان کے ذہن پر کسی انسان کی حکومت نہیں ہوگی۔ میرے بعد کوئی شخص دوسروں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرلو۔ ختم نبوت ایسا عقیدہ ہے جس کی بدولت انسانی علم کے دائرے کو وسعت نصیب ہوگئی۔

”علی محمد باب کی دریافت یہ ہے کہ (1) جہاد منسوخ ہوگیا (2) صاحبِ الہام کے لیے کسی گرامر (صرف و نحو) کی پابندی لازمی نہیں ہے، یعنی الہام ایسی عبارت میں بھی ہوسکتا ہے جو گرامر کے لحاظ سے غلط ہو۔“ (ملفوظات اقبال از یوسف سلیم چشتی، مجالس اقبال از جعفر بلوچ ص 83)

اسلامی وحدت کی بنیاد

❑ ”ہندوستان کی سرزمین پر بے شمار مذاہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے کیونکہ ان مذاہب کی بناء کچھ حد تک مذہبی ہے اور ایک حد تک نسلی، اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پر رکھتا ہے اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے، اس لیے وہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان اُن تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنائے نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے

اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے"۔

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 103)

- "اس (امت مسلمہ) کی سالمیت اور وحدت صرف عقیدۂ ختم نبوت کی رہین منت ہے۔"

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 104)

ختم نبوت کا انکار، اسلام کا غدار

- "ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ اس کے معنی بالکل سلیس ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیرِ انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے، آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطہ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا، لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیِ احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ حضرت محمد ﷺ آخری نبی نہیں، میں (یعنی مرزا قادیانی) آخری نبی ہوں۔ اس امر کے سمجھنے کے بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوعِ انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے، بانیِ احمدیت کا خیال ہے

کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد ﷺ کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا، خود محمد ﷺ کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانیِ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔''

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ 19 جنوری 1936ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 127 تا 128)

علامہ محمد اقبالؒ کا عقیدہ

1916ء میں جب قادیانیوں نے اعلان کیا کہ مرزا غلام احمد کو نبی نہ ماننے والا کافر ہے تو اقبال نے سختی سے اس کا نوٹس لیا اور بیان دیا کہ:

- ''جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہو، وہ خارج از دائرہ اسلام ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے''۔ (اخبار الفضل قادیان، مورخہ 11 اپریل 1916ء ص 9، اقبال اور احمدیت از بشیر احمد ڈار ص 17)

ناقابل معافی جرم

- ''علامہ مرحوم ان لوگوں سے تھے جو پورے خلوص اور کامل بصیرت سے اس فرقہ کو تمام عالم اسلامی، عقائدِ اسلامی، شرافتِ انبیا، خاتمیت محمد ﷺ اور کاملیت قرآن کے لیے قطعاً مضر و منافی سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ:

''قرآن کے بعد نبوت و وحی کا دعویٰ تمام انبیائے کرام کی توہین ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ختمیت کی دیوار میں سوراخ کرنا تمام نظامِ دیانت کو درہم و برہم کر دینے کے مترادف ہے۔'' (علامہ اقبال کی صحبت میں از محمد حسین عرشی مطبوعہ ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ 64 تا 66، ملفوظات از محمود نظامی صفحہ 42)

قادیانیت، یہودیت کا چربہ

❑ ''اس سے قبل اسلامی موبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے، میرے نزدیک ان میں بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے۔ لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں، اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ، یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں، گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔''

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء
مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 104)

قادیانیوں کی حکمتِ عملی

❑ ''ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے۔ اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)، مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں، جتنے سکھ، ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے۔''

(علامہ محمد اقبالؒ کا خط اسٹیٹسمین (دہلی) کے نام مطبوعہ 10 جون 1935ء،
مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 117، 118)

قادیانیت، انتشار انگیز تحریک

❑ ''امسٹرڈم میں یہودیوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اسپائنوزا کو

ایسی انتشار انگیز ہستی سمجھنے میں حق بجانب تھے جس سے ان کی جماعت بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح مسلمانانِ ہند یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ تحریکِ قادیانیت جو تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتی ہے اور اس سے معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے، مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملی کے لیے اسپائنوزا کی اس مابعد الطبیعات سے زیادہ خطرناک ہے جو یہود کی حیاتِ ملی کے لیے تھی۔"

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ 19 جنوری 1936ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 122)

مرزا قادیانی، مذہبی سٹے باز

❑ "ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا، جب اس نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ　　　انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ"

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 106)

قادیانی ڈرامے کے اداکار

❑ "پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے"۔

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ 19 جنوری 1936ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 134)

قادیانی گستاخ رسولﷺ

❑ "کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں (ربوی و لاہوری) کے باہمی نزاعات اس

امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔‘‘

(قادیانی ہفت روزہ ’’سن رائز‘‘ (Sun Rise) کے جواب میں،
مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی ایم اے صفحہ 112)

سیاسی غلامی کے لیے الہامی بنیاد

❑ ’’مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے، صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے۔ راسخ عقائد کو موثر طریقہ پر مٹانے اور متذکرہ صدر سوالات میں جو دینیاتی نظریات مضمر ہیں، ان کی نئی تفسیر کرنے کے لیے جو سیاسی اعتبار سے موزوں ہو، ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی۔ اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کیا۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے، جو انھوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں، گویا اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ مدعی نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے، اوّل درجہ کے کافر ہیں اور ان کا ٹھکانہ نارِ جہنم ہے‘‘۔

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ
مطبوعہ حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی صفحہ 131، 132)

❑ ’’احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے‘‘۔

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ
مطبوعہ حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی صفحہ 132، 133)

قادیانیوں کے لیے صرف دو راستے

❑ ''ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسولِ کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں، یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تا کہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں''۔

(علامہ محمد اقبالؒ کا خط اسٹیٹسمین (دہلی) کے نام مطبوعہ 10 جون 1935ء، حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 117)

قادیانیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کرنے کا آئینی مطالبہ

❑ ''میں سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے، خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں اور مجھے اس احساس میں حکومت کے سکھوں کے متعلق رویہ سے اور بھی تقویت ملی۔ سکھ 1919ء تک آئینی طور پر علیحدہ سیاسی جماعت تصور نہیں کیے جاتے تھے لیکن اس کے بعد علیحدہ جماعت تسلیم کر لیے گئے، حالانکہ انھوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں''۔

(علامہ محمد اقبالؒ کا خط اسٹیٹسمین (دہلی) کے نام مطبوعہ 10 جون 1935ء، مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 116)

❑ ''ثالثاً اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو 56,000 (چھپن ہزار) ہے، انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا

سکتی اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہوسکتی۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا علیحدہ لحاظ رکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔''

(اسٹیٹسمین کے جواب میں، مطبوعہ روزنامہ اسٹیٹسمین دہلی، 10 جون 1935ء
مطبوعہ حرفِ اقبال مرتبہ لطیف احمد خان شروانی ایم اے صفحہ 118)

- ''میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرلے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا، جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔''

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) (ضمیمہ) مئی 1935ء
مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 109)

مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے حلف نامے میں یہ شق رکھی کہ:

- ''میں اقرارِ صالح کرتا ہوں اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہوکر کامیاب ہوگیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کے لیے انتہائی کوشش کروں گا۔ (اقبال کے آخری دو سال از عاشق حسین بٹالوی ص 341)

حضرت علامہؒ نے بحیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ اس کی توثیق فرما کر قادیانیت کو سیاسی سطح پر ایک اور ضرب کاری لگائی۔

برداشت اور رواداری کی عجیب منطق؟

- ''اگر قوم کی وحدت وسالمیت کو خطرہ لاحق ہو تو اس کے لیے صرف ایک ہی چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ وہ انتشار انگیز قوتوں کے خلاف اپنا دفاع کرے اور اپنے دفاع کے کیا طریقے ہیں؟

مدلل تحریریں اور ایسے شخص کے دعووں کا ابطال جو اپنی اصل جماعت کی نگاہوں میں ''مذہبی مہم جو'' ہو۔ تو کیا یہ مناسب ہے کہ جس اصل جماعت کی سالمیت خطرے میں ہو' اسے برداشت کی تلقین کی جائے اور باغی گروہ کو تحفظ کے ساتھ اپنی تبلیغ جاری رکھنے کی اجازت دی جائے' خواہ یہ تبلیغ سخت جھوٹ اور گستاخانہ عبارات سے بھی لبریز ہو۔''

(قادیانی اور جمہور مسلمان از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ اسٹیٹسمین (دہلی) 14 مئی 1935ء مطبوعہ حرف اقبالؒ مرتبہ لطیف احمد خان شروانی صفحہ 108)

لا نبی بعدی

پس خُدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
اُو رُسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خدا ست
پردہ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازُو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازُو
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا اَبد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیر اللہ مسلماں برکُند
نعرۂ **لا قَوْمَ بَعْدِیْ** می زَنَد

(مثنوی ''رموزِ بے خودی'' از مجموعہ اسرار و رموز)

ترجمہ: خدا تعالیٰ نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسول ﷺ پر رسالت ختم کر دی۔ ہمارے

رسول ﷺ پر سلسلۂ انبیا اور ہم پر سلسلۂ اقوام تمام ہو چکا، اب بزمِ جہاں کی رونق ہم سے ہے۔ میخانۂ شرائع کا آخری جام ہمیں عطا فرمایا گیا، قیامت تک ساقی گری کی خدمت اب ہم ہی انجام دیں گے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کا یہ فرمان کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، احساناتِ خداوندی میں سے ایک بڑا احسان ہے۔ دینِ مصطفیٰ ﷺ کی عزت و ناموس کا محافظ بھی یہی ہے۔ مسلمانوں کا اصل سرمایہ قوت یہی عقیدۂ ختم نبوت ہے اور اسی میں وحدتِ ملت کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے۔ اللہ عزوجل نے حضور ﷺ کے بعد ہر دعویٰ نبوت کو باطل ٹھہرا کر اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے مجتمع کر دیا ہے۔ اسی عقیدہ کے باعث مسلمان ایک اللہ کے سوا سب سے تعلق توڑ لیتا اور اُمتِ مسلمہ کے بعد کوئی امت نہیں، کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

شیخ اولرد فرنگی را مرید

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآن بغیر از را ندید
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لا الٰہ
در حرم زاد و کلیسا را مرید
پردۂ ناموسِ ما را بر درید
دامنِ رو را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دلِ روشن تہی است
الحذر! از گرمئی گفتارِ او
الحذر! از حرفِ پہلو دارِ او
شیخ او لرد فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید
گفت دین را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقصہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

(مثنوی پس چہ باید کرد)

ترجمہ: میرے زمانے نے ایک نبی بھی پیدا کیا جس کو اپنے سوا قرآن میں کچھ نظر نہ آیا۔خود پسند،عزت چاہنے والا ،کوتاہ نظر اس کا دل لا الٰہ سے خالی ہے۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا اور عیسائیوں کا غلام بنا۔ اس نے ہماری ناموس کے پردے کو چاک کرایا۔ اس سے عقیدت رکھنا حماقت ہے۔ اس کا سینہ دل کی روشنی سے خالی ہے۔ اس کی چرب زبانی سے بچو۔ اس کی چالبازانہ باتوں سے بچو،اس کا پیر شیطان اور فرنگی کا غلام ہے۔ اگر چہ وہ کہتا ہے کہ میں بایزید کے مقام سے بول رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ غلامی میں ہی دین کی رونق ہے۔ اس کی زندگی خودی سے محروم ہے۔ غیروں کی دولت کو وہ رحمت جانتا ہے۔ اس نے گرجا کے گرد رقص کیا اور مر گیا۔

دو موضوعات پر تحقیق کی مزید ضرورت

❑ ’’علمی اعتبار سے علامہ نے دو موضوعات پر مزید تحقیق کی ضرورت پر زور دیا۔ اول، مرزا قادیانی کے واردات کا نفسیاتی مطالعہ اور معاصر ہندو جوگی رام کشن کے ساتھ ان کی یکسانیت۔ دوم، ’’بروز‘‘ کے مسئلے کی تاریخی تحقیق۔ ان کی رائے تھی، ’’اس مسئلے کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہوگی‘‘۔

سالک نے بھی، جو قادیانیوں کے ہمدرد ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ بعد میں لکھا، ’’علامہ اقبال نے انتہائی اشتعال اور نارضی کی حالت میں بھی قادیانی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی، قادیانی جماعت کے خلیفہ مرزا محمود اور دیگر قادیانیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ و عالمانہ انداز اختیار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں میں علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کیے ہیں جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا‘‘۔

(ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک صفحہ 211، اقبال کی منزل 1927ء تا 1946ء از خرم علی شفیق صفحہ 589، 590)

بروز کا مسئلہ

❑ ’’جہاں تک مجھے معلوم ہے، بروز کا مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی

آرین ہے۔...........میری رائے ناقص میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔" (پروفیسر الیاس برنی کے نام، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال از شیخ عطاءاللہ صفحہ 309)

کاذب

❑ "ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔ حالانکہ طبری لکھتا ہے کہ وہ حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت کی تصدیق تھی۔"

(علامہ اقبال کا خط بہ نام نذیر نیازی، مطبوعہ طلوعِ اسلام، اکتوبر 1935ء انوارِ اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ 45-46 اصل عکس، انوارِ اقبال سے اب یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے)

قادیانیت، جدید نبوت کی اختراع

❑ "قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولنا ہے۔"

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں مطبوعہ حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی صفحہ 232،233)

اسلام کے غدار

لاہور

21 جون 1935ء

میرے محترم پنڈت جواہر لال!

"آپ کے خط کا جو مجھے کل ملا، بہت بہت شکریہ! جب میں نے آپ کے مقالات کا جواب لکھا، تب مجھے اس بات کا یقین تھا کہ احمدیوں کی سیاسی روش کا آپ کو کوئی اندازہ نہیں ہے۔ دراصل جس خیال نے خاص طور پر مجھے آپ کے مقالات کا جواب لکھنے پر آمادہ کیا، وہ یہ تھا کہ میں دکھاؤں، علی الخصوص آپ کو کہ مسلمانوں کی یہ وفاداری کیونکر پیدا ہوئی اور بالآخر کیونکر اس نے اپنے لیے احمدیت میں ایک الہامی بنیاد پائی۔ جب میرا مقالہ شائع ہو چکا، تب بڑی حیرت و

استعجاب کے ساتھ مجھے یہ معلوم ہوا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان تاریخی اسباب کا کوئی تصور نہیں ہے، جنھوں نے احمدیت کی تعلیمات کو ایک خاص قالب میں ڈھالا۔ مزید برآں پنجاب اور دوسری جگہوں میں آپ کے مقالات پڑھ کر آپ کے مسلمان عقیدت مند خاصے پریشان ہوئے۔ ان کو یہ خیال گزرا کہ احمدی تحریک سے آپ کو ہمدردی ہے اور یہ اس سبب سے ہوا کہ آپ کے مقالات نے احمدیوں میں مسرت وانبساط کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ آپ کی نسبت اس غلط فہمی کے پھیلانے کا ذمہ دار بڑی حد تک احمدی پریس تھا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ میرا تاثر غلط ثابت ہوا۔ مجھ کو خود ''دینیات'' سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے، مگر احمدیوں سے خود انھی کے دائرہ فکر میں نپٹنے کی غرض سے مجھے بھی ''دینیات'' سے کسی قدر جی بہلانا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے یہ مقالہ اسلام اور ہندوستان کے ساتھ بہترین نیتوں اور نیک ترین ارادوں میں ڈوب کر لکھا۔ میں اس باب میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ یہ احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

لاہور میں آپ سے ملنے کا جو موقع میں نے کھویا، اس کا سخت افسوس ہے۔ میں ان دنوں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ مسلسل اور پیہم علالت کے سبب میں عملاً عزلت گزیں ہوں اور تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آپ مجھے ضرور مطلع فرمائیں کہ آپ پھر کب پنجاب تشریف لا رہے ہیں؟ شہری آزادیوں کی انجمن کے بارے میں آپ کی جو تجویز ہے، اس سے متعلق میرا خط آپ کو ملا یا نہیں؟ چونکہ آپ اپنے خط میں اس خط کی رسید نہیں لکھتے، اس لیے مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ یہ خط آپ کو ملا ہی نہیں۔''

آپ کا مخلص

محمد اقبال

(کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی جلد **4**، صفحہ **328**، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال از شیخ عطاء اللہ صفحہ **567** طبع دوم، (یک جلدی **2012**ء)

مسلمانوں سے اتحاد کی قادیانی خواہش

❑ ''چودھری صاحب جب کبھی موقع پاتے قادیانی سیاست پر کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتے۔ حضرت علامہ کی طبیعت پر بھی بیان کے ردوکد سے جو بار پڑا تھا، دور ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ

چودھری صاحب کہنے لگے: ''مزے کی بات تو یہ ہے کہ اہل قادیان اگرچہ عقیدۃً ہمیں کافر سمجھتے ہیں مگراس کے باوجود اتحاد کے بھی خواہش مند ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم سب کو ایک ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہندو بہر حال ہم سب کو ایک سمجھتے ہیں۔''

حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ خوب منطق ہے۔ اسلام کی بنا پر تو ہم ایک ہیں، نہ ایک ہو سکتے ہیں، البتہ ایک ہیں اور ہو سکتے ہیں تو ہندوؤں کے اس کہنے پر کہ ہم سب مسلمان ہیں''۔

ارشاد ہوا ''دراصل ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو قادیانیوں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیں، البتہ وہ ہمیں برابر کافر سمجھتے رہیں۔ یہ کیا خوب بنائے اتحاد ہے۔'' اس پر ہم سب کو ہنسی آ گئی۔''

(اقبال کے حضور از سیّد نذیر نیازی ص 268)

عجیب و غریب ملغوبہ

❑ ''قادیانیت امت سے کٹ چکی ہے جس کا شاید اسے خود بھی شعور نہیں، اور ہے بھی تو بابیت اور بہائیت کے پیشِ نظر اس کے نزدیک مصلحت اسی میں ہے کہ امت سے اپنا رشتہ قائم رکھے۔''

پھر فرمایا: ''فرض کیجیے قادیانیت کی سوادِ اعظم سے علیحدگی امت کی سیاسی اجتماعی نصب العین سے بے خبری کا نتیجہ ہے، یعنی بطور ایک نظام اجتماع و عمران اسے اسلام کے ماضی و حال کا کوئی فہم ہے، نہ مستقبل کا۔ اس کی مثال ایک انتہائی فرقہ بندی کی ہے، جب ہی اسلامی تعلیمات کے بارے میں اس کے عقائد ایک عجیب و غریب ملغوبہ ہیں اسرائیلی اور مجوسی تصورات کا، جو بوجوہ طرح طرح کے چور دروازوں سے اسلام میں در آئے ہیں۔''

فرمایا: ''قادیانیت کا دامن بہر حال ان حقائق سے خالی ہے جو اصولِ توحید و رسالت میں کئی ایک پہلوؤں سے مضمر ہیں۔'' **(اقبال کے حضور از سیّد نذیر نیازی ص 296)**

قرآن اور فلسفہ ختم نبوت

❑ ''قرآن مجید دل کے راستے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یوں سمجھ میں آئے گی کہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید تلاوت کرتا۔ اس دوران والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا

ذکر ہے کہ والد صاحب حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے، میں تلاوت میں مصروف تھا مگر وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

کہنے لگے ''تم کیا پڑھا کرتے ہو؟'' مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا بلکہ ملال بھی۔ انھیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہرحال میں نے مودبانہ عرض کیا ''قرآن پاک'' کہنے لگے ''تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو؟'' میں نے کہا ''کیوں نہیں؟ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں'' انھوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر چلے گئے۔ میں حیران تھا آخر اس سوال سے ان کا کیا مطلب ہے؟

کچھ دن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا، والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انھوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے ''بیٹا! قرآن مجید وہی سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو'' مجھے تعجب ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہوسکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے، وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے ہوں گے، کہنے لگے ''تمھیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآن مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے تم پر یہ نازل ہو رہا ہے، ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا'' میں ہمہ تن گوش والد ماجد کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی ایسے ہی تلاوت کروں جیسے ان کا ارشاد ہے کہ انھوں نے کہا ''سنو اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج تک پہنچانے کا تھا، اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضور رسالت مآب ﷺ تک کہ آپ ﷺ خاتم الانبیا ہیں، جتنے بھی نبیؑ مبعوث ہوئے، ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارجِ محمدیہ ﷺ ہی سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذاتِ محمدیہ ﷺ کی تشکیل پر ہوا۔''

حضرت علامہ کہنے لگے ''والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد کی تصحیح کی۔ انھوں

نے کہا: ''شعورِ انسانی کی تکمیل کے ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پا لے تو وہ ذاتِ محمدیہ حضور رسالت مآب ﷺ تشریف لائے، بابِ نبوت بند ہوا، انسانیت اپنے معراجِ کمال کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ و کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لیے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا، اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔'' (اقبال کے حضور میں...... از سیّد نذیر نیازی صفحہ 60، 61)

ختم نبوت اور قادیانیت

❑ ''ختم نبوت اور قادیانیت'' ڈاکٹر اقبال کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے ''شاطرانہ'' مغالطوں کو دور کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ قادیانیت پر ایک ضربِ کاری ہے۔

قادیانیت کی روح پر غور کرنے کے سلسلے میں اقبال کہتے ہیں:

''مولوی منظور الٰہی نے بانیِ احمدیت کے الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں نفسیاتی تحقیق کے لیے متنوع اور مختلف مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیِ احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کنجی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ کسی دن نفسیاتِ جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا۔ اگر وہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے (اور چند وجوہ سے اس کو ایسا ہی کرنا پڑے گا جن کی تشریح یہاں نہیں کی جا سکتی) اور اپنے مطالعہ کو بانیِ احمدیت اور اس کے ہمعصر غیر مسلم صوفیاء جیسے رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے تو اس کو اس تجربہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہوگی جس کی بناء پر بانیِ احمدیت نبوت کا دعویدار رہے۔''

(قرآن اور اقبال از ابو محمد مصلح صفحہ 48)

حکیم نور الدین کی حکمت؟؟

❑ ''سر سیّد نے شاید مولوی نور الدین کی کوئی تحریر نہ دیکھی ہو مگر میر حسن کے پاس ایک پوسٹ کارڈ موجود تھا جو مولوی نور الدین صاحب نے غالباً جموں سے بھیجا تھا۔ اگلی مرتبہ وہ سیالکوٹ آئے اور مرزا صاحب کی بات چھیڑی تو میر حسن نے کہہ دیا۔ ''وہ قرآن کی غلط تاویلیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی اصولی چیز نہیں۔ دوسرے معاملات میں کیسے ان کا اعتبار ہو سکتا

ہے۔ دیگر، مرزا صاحب کو لکھنا نہیں آتا۔ جس کتاب کو اٹھاؤ حاشیہ در حاشیہ چلی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ان کے دماغ میں کوئی مطلب صاف نہیں۔''

مولوی نورالدین نے اپنی تحریروں کے بارے میں دریافت کیا تو میر حسن نے جیب سے پوسٹ کارڈ نکال لیا۔ ''آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دے سکتے۔ تشنہ چھوڑ جاتے ہیں...... میں نے آپ سے دوا پوچھی تھی۔ آپ نے دوا لکھ تو بھیجی لیکن یہ نہ بتایا کہ اسے کھاؤں، سونگھوں، گھس کر لگاؤں یا گھوٹ کر پیوں۔ نہ وزن لکھا کہ ماشہ کھاؤں، تولہ کھاؤں یا من کھاؤں۔''
یہ سن کر مولوی نورالدین خاموش ہو گئے۔''

(عبداللہ چغتائی، دمادم رواں ہے یمِ زندگی از خرم علی شفیق صفحہ 82،83)

مجھے بھی الہام ہوتا ہے!

❑ ''ایک دلچسپ روایت ملفوظاتِ اقبال میں اقبال کی زبانی بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے جب نیا نیا الہام کا دعویٰ کیا تو وہ سیالکوٹ کی مسجد میں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز اقبال بھی پہنچ گئے اور کہا کہ مجھے بھی الہام ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے سننے پر رضامندی ظاہر کی تو انھوں نے عربی میں احمدیت کے خلاف کچھ فقرے جوڑ کر پیش کر دیے جس پر وہ ساری جماعت ان کے خلاف ہوگئی اور انھیں جان بچا کر بھاگنا پڑا۔'' (دمادم رواں ہے یمِ زندگی از خرم علی شفیق صفحہ 269)

اصل ایمان

❑ ''(3 اکتوبر 1930ء، میکلوڈ روڈ) علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ مذہب کا دارومدار عقل پر ہے یا جذبات پر؟ یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ چند روز پہلے ایک جرمن عالمِ الٰہیات شلائر میخر کی کتاب میں پڑھا تھا کہ مذہب کی بنیاد عقل کے بجائے جذبے (فیلنگ) پر ہے۔ یہ سن کر علامہ نے فرمایا:

''یہ سوال ہی غلط ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جب ایغو (خودی) اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لیتی ہے تو اس میں جذبہ، شعور اور ارادہ، تینوں کارفرما ہوتے ہیں۔ مذہب کا تعلق انسان سے ان تینوں پہلوؤں سے ہے۔ کوئی جذبہ ایسا نہیں ہے جس میں خودی کے دوسرے پہلو (شعور اور ارادہ) شامل نہ ہوں۔ انسان خالص جذبات یا خالص شعور یا خالص ارادے سے

نا آشنا ہے۔ مثلاً غازی علم الدین شہید کا جذبہ اس کی مکمل شخصیت کی گہرائی سے اُبھرا تھا۔ اس میں شعور اور ارادہ بھی شامل تھا۔

''ایمان دراصل عمل کی استعداد کا نام ہے۔ اسلام ایسے ایمان کو پسند نہیں کرتا جو انسان کو عمل پر آمادہ نہ کر سکے۔'' (ملفوظات اقبال از یوسف سلیم چشتی، مجالس اقبال از جعفر بلوچ ص 84)

قادیانی جھوٹ کی نقاب کشائی

❑ ''1934ء ہی میں انجمن خدام الدین لاہور نے پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''اسلام'' جاری کیا جس کا پہلا شمارہ 7 جون کو شائع ہوا۔ انجمن کے بانی حضرت مولانا احمد علیؒ کے ارشاد پر اس کی ادارتی ذمہ داریاں میں نے سنبھالیں۔ اس اخبار میں حضرت علامہ بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اسے باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور اپنے مشوروں سے نوازتے تھے۔ میں جو اداریے اور شذرات لکھتا تھا، اکثر چھپنے سے پہلے حضرت علامہ کو سنا دیتا تھا۔ وہ جو ترمیم و اصلاح تجویز فرماتے، میں اس کے مطابق اپنی تحریروں میں تبدیلی کر دیتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے اداریے کے لیے موضوع کا تعین فرمایا اور میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔

اس سلسلے میں ایک عجیب صورتِ حال کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چودھری محمد حسین حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر تھے۔ وہ علامہ اقبال کے مستقل حاضر باشوں اور قریبی احباب میں سے تھے۔ میں جب کبھی اخبار ''اسلام'' کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے جاتا تو چودھری صاحب عموماً موجود ہوتے تھے۔ وہ گفتگو میں حصہ لیتے نہ کوئی مشورہ دیتے تھے لیکن جو باتیں ہوتی تھیں، انھیں بہت غور سے سنتے تھے۔ ان کی موجودگی میں بارہا حضرت علامہ نے کسی خاص مسئلے پر اداریہ لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ کبھی کبھی وہ حکومت کی کسی پالیسی کے خلاف لکھنے کے لیے بھی فرماتے تھے۔ چودھری صاحب اس وقت تو کچھ نہ کہتے، لیکن جب اداریہ شائع ہو جاتا تو حکومت کی طرف سے خط آ جاتا کہ ایڈیٹر ''اسلام'' پریس ایڈوائزر سے ملے۔ چودھری صاحب کے علم میں تھا کہ میں سرکاری ملازم ہوں اور اخبار پر بہ حیثیت ایڈیٹر ایک دوسرے شخص کا نام طبع ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں ہی ان سے ان کے دفتر میں جا کر ملتا۔ چودھری صاحب فرماتے:

''دیکھیے آپ نے اپنے اخبار میں فلاں بات حکومت کے خلاف لکھی ہے۔ آئندہ ایسا نہ ہو۔'' میں جواب میں ''بہت اچھا'' کہہ کر چلا آتا۔ چودھری صاحب یہ ظاہر کرتے تھے کہ جب

وہ علامہ اقبال کی صحبت میں ہوتے ہیں تو وہ اپنی سرکاری حیثیت بھول جاتے ہیں اور جب پریس ایڈوائزر کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو انھیں یہ یاد نہیں رہتا کہ علامہ اقبال کے ہاں انھوں نے کیا دیکھا اور کیا سنا تھا۔ چودھری صاحب گویا اس طرح یہ ثابت کرتے تھے کہ وہ بیک وقت حکومت اور علامہ اقبال دونوں کے وفادار ہیں، اور ان متضاد وفاداریوں کو نبھانا خوب جانتے ہیں!

''اسلام کے سلسلے میں علامہ اقبال صرف مشوروں ہی سے نہیں نوازتے تھے بلکہ قلمی اور عملی تعاون بھی فرماتے تھے۔ مئی 1935ء میں جب انھوں نے قادیانیوں کے خلاف ایک بیان جاری کیا تو اخبار ''سٹیٹسمین'' دہلی نے ایک اداریے میں اس بیان پر تنقید کی۔ اس پر علامہ اقبال نے اخبار مذکور کے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا، اور اس کی نقل مجھے عنایت فرمائی تا کہ میں اسے ''اسلام'' میں شائع کر دوں۔ میں نے اس خط کو ''اسلام'' کے دوسرے شمارے (بابت 22 جون 1935ء) میں شائع کیا اور اس پر ایک ادارتی شذرہ بھی لکھا۔ اسلام کے اسی شمارے میں، میں نے علامہ اقبال کا ایک اور بیان بھی شائع کیا، جو میرے علم کے مطابق اب تک ان کی تحریروں کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوا۔ اس بیان کی شان نزول یہ ہے کہ علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان پر مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے ایک خطبے میں تنقید کرتے ہوئے علامہ اقبال سے ایک غلط بات منسوب کی۔ قادیانی اخبار ''سن رائیز'' میں مرزا محمود کا جو خطبہ شائع ہوا، اس میں علامہ اقبال کے بارے میں یہ کہا گیا تھا:

He has a grievance against the Government when he says the British have not been even as wise as were the Romans in the days of Jesus, for the Romans after all crucified Jesus. This is nothing but approving the action of the Romans when they capitulated their own authority and made over Jesus to the Jews, having been influenced by the fanatical clamour of the latter.

میں نے حضرت علامہ سے اس بیان کے بارے میں خصوصاً **Approving the action of the Romans** کے الفاظ کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کرنا چاہے تو انھوں نے مرزا بشیر الدین محمود کے اس بیان کو ''قادیانیوں کی غلط بیانیوں کے فن کا مخصوص نمونہ'' قرار دیتے ہوئے ایک تردیدی بیان مجھے لکھوایا جو میں نے ''اسلام'' میں شائع کیا۔

اسی دوران میں علامہ کے مئی 1935ء والے بیان کے جواب میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ''ماڈرن ریویو'' کلکتہ میں پے در پے تین مضمون لکھے۔ ان مضامین سے بعض غلط فہمیوں کے پھیلنے کا اندیشہ تھا جن کے سدباب کے لیے ضروری ہو گیا کہ حضرت علامہ قادیانیوں کے مسئلے پر تفصیل سے اظہار خیال فرمائیں۔ دسمبر 1935ء کے آخری اور جنوری 1936ء کے ابتدائی چند دنوں میں انھوں نے ایک مفصل مضمون لکھا۔ اس کا مسودہ انھوں نے میرے حوالے کیا کہ میں اسے ٹائپ کرا دوں۔ میں نے مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اسے کسی اور سے ٹائپ کرانا مناسب نہ سمجھا، اور خود ہی ٹائپ کیا۔ ٹائپ شدہ مسودہ لے کر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اسی وقت اس کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ ترمیم و اصلاح بھی فرمانے لگے۔ اس کام کے لیے انھوں نے میرا قلم استعمال کیا۔ میں اس زمانے میں سبز رنگ کی روشنائی استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ اس مضمون کی ساری کاٹ چھانٹ اسی رنگ میں ہوئی ہے۔ علامہ نے مسودے کے ہر صفحے پر ترمیم و اصلاح کی اور متعدد عبارتیں حاشیے پر اضافہ کیں۔ کہیں کہیں پورا صفحہ قلمزد کر کے نئی عبارت اسی صفحہ کی پشت پر تحریر فرمائی۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو پھر اس کی اشاعت کا سوال پیدا ہوا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس مضمون کو ''اسلام'' میں شائع کیا جائے۔ حضرت علامہ نے میری اس تجویز کو منظور فرمایا اور مسودے کے آخر میں یہ الفاظ اضافہ کر دیے۔

انجمن خدام الدین I authorise to publish the above in the form of a pamphlet for free circulation.

اس عبارت کے نیچے انھوں نے دستخط کیے اور 7 جنوری 1936ء کی تاریخ ثبت کر دی۔ اخبار ''اسلام'' کے 12 جنوری 1936ء کے شمارے میں یہ مضمون ''اسلام اینڈ احمدازم'' کے عنوان کے تحت شائع کیا گیا۔ اس کے آخری پروفوں کی تصحیح خود حضرت علامہ نے کی۔ اخبار ''اسلام'' ×/30×20 پر چھپتا تھا لیکن جس شمارے میں یہ مضمون چھپا، اس کا سائز 20×30/16 یعنی عام کتابی سائز تھا۔ سرورق پر اخبار کا نام جلی طور پر درج تھا۔ اس مضمون کو مطبوعہ صورت میں دیکھ کر حضرت علامہ بہت خوش ہوئے لیکن چودھری محمد حسین صاحب نے کہا کہ ٹائٹل پر اخبار کا نام جلی طور پر درج ہونے کی وجہ سے مضمون کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔ علامہ نے اس خیال سے اتفاق کیا، اور مجھے اس کے لیے الگ سرورق چھپوانا پڑا۔ بعد میں یہ پمفلٹ

انجمن خدام الدین کی طرف سے بارہا شائع ہوا۔

اس مضمون کا مسودہ تاریخی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے میں نے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ متعدد احباب اسے دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ آخری مرتبہ مشہور احراری رہنما قاضی احسان احمد شجاع آبادی اسے لے گئے اور دو تین سال اپنے پاس رکھنے کے بعد میری عدم موجودگی میں میرے مکان پر چھوڑ گئے۔ 1950ء کے لگ بھگ اخبار ''الفضل'' (ربوہ) میں ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا جس میں یہ ثابت کرنے کی سعیِ لاحاصل کی گئی کہ یہ مضمون علامہ اقبال کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے نے لکھ کر ان کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ میں اس زمانے میں کراچی کے پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''الاسلام'' کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے اس اخبار میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ بتایا کہ مضمون کا اصل مسودہ جس پر حضرت علامہ کے قلم سے اصلاحیں اور اضافے ہیں، میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے اپنے مضمون کے ساتھ مذکورہ مسودہ کے آخری صفحے کا عکس بھی شائع کر دیا جس پر علامہ اقبال کے دستخط تھے۔ اس مسودے کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر میں نے اسے اقبال اکیڈمی کے حوالے کر دیا، اور اب یہ اقبال اکیڈمی کے دیگر نوادر کے ساتھ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے، اور اسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید، مجالس اقبال مرتب جعفر بلوچ ص 147 تا 151)

سر ظفر اللہ کا وجود؟

❑ ''(8 اکتوبر 1934ء): چودھری ظفر اللہ خاں صاحب (قادیانی) کا ذکر آ گیا تو آپ (علامہ اقبالؒ) نے فرمایا کہ چودھری صاحب اور سر فضل حسین صاحب کے ذریعے حکومتِ برطانیہ نے پراونشل آٹانومی کی روح نکال لی۔ موخر الذکر کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ان کا وجود ہمیشہ مسلمانوں کے لیے باعث مضرت رہا ہے، اور وقت آ رہا ہے کہ ان کی مزعومہ اسلام دوستی اور مسلم نوازی کے بے حقیقت راز سے پردہ اُٹھ جائے۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید، مجالس اقبال مرتب جعفر بلوچ ص 163)

قادیان تباہ ہو جائے گا

❑ ''(15 جون 1935ء): کل شام کو (محمد شریف) پنی صاحب کے ہمراہ سیر کے لیے

نکلا۔(ہم) علامہ سر اقبال کے مکان (کے سامنے) سے گزر رہے تھے کہ وہاں سے راجہ حسن اختر صاحب نے آواز دی، ان کے پاس ٹھہر گئے۔تھوڑی دیر میں حضرت علامہ باہر تشریف لے آئے،اس کے بعد حضرات (عبدالمجید) سالک و (چراغ حسن) حسرت آ نکلے۔پھر مولوی غلام محی الدین خاں قصوری تشریف لے آئے اور پھر حضرت علامہ محمود شیرانی مع پروفیسر (محمد فضل الدین) قریشی و مولوی عبداللہ چغتائی آ گئے۔رات کے نو بجے تک بڑی پرُلطف صحبت رہی۔ حضرت علامہ کے پاس جتنا عرصہ ہم لوگ ٹھہرے، بہت دلچسپ گفتگو ہوئی۔زیادہ تر قادیانیوں کا ذکر رہا۔آپ نے فرمایا مرزا صاحب وحی و الہام اور مہدی و مسیح میں تمیز نہیں کر سکے۔

(حضرت علامہ نے ازرہِ ظرافت چراغ حسن) حسرت صاحب کو مشورہ دیا کہ فوراً (روزنامہ) احسان میں موٹے موٹے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ سترہ یوم کے بعد قادیان تباہ ہو جائے گا اور ہر روز اس اعلان کو شائع کرتے رہیں۔سترہ روز گزر جانے پر اعتراض ہو تو کہہ دیا جائے کہ ''یوم'' قرآنی اصطلاح ہے نہ کہ چوبیس گھنٹے کا وقفہ''۔

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید، مجالس اقبال مرتب جعفر بلوچ ص 168،169)

مرزا محمود کے جواب میں

❑ ''(16 جون 1935ء): کل دفتر میں (عبدالحمید) عارف صاحب (عبدالحمید عارف دفتر اکونٹنٹ جنرل پنجاب میں ملازم تھے۔مولانا عبدالمجید سالک کے بھائی تھے۔مذہباً قادیانی اور عادتاً بحث مباحثے کے بہت شائق تھے۔) نے مجھے ایک رسالہ دیا جو دراصل مرزا بشیر الدین محمود کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے علامہ اقبال کے حالیہ بیانات کے خلاف دیا تھا۔آج میں گھر سے دفتر ''اسلام'' جاتے ہوئے راستے میں حضرت علامہ سے ملا تا کہ وہ رسالہ آپ کو دکھاؤں۔وہاں جو ٹھہرا تو ساڑھے بارہ بج گئے۔حضرت علامہ نے گفتگو کے دوران میں مجھ سے پوچھا کہ تمہارا پرچہ (''اسلام'') (''اسلام'' کے دوسرے شمارے بابت 22 جون 1935ء میں مَیں نے ایک ادارتی شذرے میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ دنیائے اسلام کے تمام علما کی ایک کانفرنس لاہور میں منعقد کی جائے جس میں واضح اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں۔) آئندہ کب چھپے گا۔میں نے عرض کیا کہ اس کا دوسرا شمارہ پریس جا رہا ہے، تو

انھوں نے فرمایا کہ مرزا صاحب کے جواب میں میرا ایک بیان اس میں شائع کر دو۔ چنانچہ آپ نے یہ بیان مجھے لکھوایا۔ پھر خاصی دیر تک اس میں کاٹ چھانٹ ہوئی۔ اس دوران میں چودھری (محمد حسین) صاحب اور (نذیر) نیازی صاحب بھی آ گئے۔ ان سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ اس بیان کے علاوہ حضرت علامہ نے مجھے اپنی اس چٹھی کی ایک نقل بھی دی جو حال ہی میں ''سٹیٹس مین'' میں شائع ہوئی تھی تا کہ اسے بھی ''اسلام'' میں بطور مضمون شائع کر دیا جائے''۔

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید صفحہ 146، مجالس اقبال مرتب جعفر بلوچ ص169، 170)

اسلام اور قادیانیت

❑ ''(19 جنوری 1936ء): گزشتہ دو ہفتے سے میں اس کوشش میں تھا کہ حضرت علامہ کا وہ انگریزی بیان جو پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین مطبوعہ ''ماڈرن ریویو'' کے لیے لکھا گیا تھا، انجمن خدام الدین کی طرف سے شائع ہو۔ الحمدللہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور یہ بیان Islam and Ahmadism (اسلام اور احمدیت) کے عنوان سے ''اسلام'' کے پرچے بابت 22 جنوری 1936ء میں چھوٹی تقطیع کے باون (52) صفحات پر شائع ہو گیا ہے۔ اس شمارے میں تمام تر وہی مضمون چھپا ہے، دوسری کوئی چیز نہیں۔ اس مضمون میں احمدیت کے متعلق بہت سے اہم حقائق واضح کیے گئے ہیں۔ بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ آج تک احمدیت پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے مقابلے میں اس مضمون سے احمدیت پر بڑی زبردست ضرب لگی ہے۔ اس مضمون کی اشاعت نے واقعی احمدیوں کو بوکھلا دیا ہے۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید، مجالس اقبال مرتب جعفر بلوچ ص172)

❑ ''حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتِ گرامی کے متعلق ایک ہیچ مدان کا کچھ کہنا، چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن ایک صحبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہو گی۔

1936ء قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ علمائے اسلام اپنی تحریروں اور تقریروں سے ''قصرِ خلافت قادیان کی بنیادیں متزلزل'' کر رہے تھے اور دوسری طرف مرزائی صاحبان اپنی طویل اور قاطع دلیلوں سے ''سعید روحوں'' کو راہِ راست پر لا رہے تھے۔ ان ایام میں حضرت ممدوح علیل تھے۔ لیکن طرفین کی وزنی دلیلیں، سیدھے سادے نوجوانوں کو سوچنے کا

موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔ اس لیے کئی ایک تشنگانِ ہدایت، راہنمائی حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نوجوان بڑی بیتابی کے ساتھ آپ کے ارشاداتِ عالیہ کے منتظر ہیں۔ آپ نے اپنا شہرۂ آفاق مضمون ''اسلام اور قادیانیت'' شائع فرمایا، جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں اور وہ دلائل جو سیاق وسباق کا لحاظ رکھے بغیر سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کرسکتی تھیں، تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں اور نوجوانوں کی متوقع بے راہ روی کا مکمل سدباب ہوگیا۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی، چنانچہ انھوں نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی جس کا جواب حضرت علامہؒ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی رفع ہو گئے۔

قصہ کوتاہ ہر طرف قادیانیت کے موافق یا مخالف تذکرے شروع تھے جن سے مساجد اور عام جلسہ گاہوں کے علاوہ مکلّف کوٹھیوں کے خلوت کدے بھی خالی نہ تھے۔ ان ایام میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں صرف دو ہی فریق رہ گئے ہیں: ایک وہ جو قادیانیت کا مخالف ہے اور دوسرا وہ جو اس کے موافق۔ میں نے اس سال پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے (فارسی) کا امتحان دیا۔ حضرت ممدوح ہمارے ایک پرچے کے ممتحن اعلیٰ تھے اور اس میں ممدوح نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافتِ الٰہیہ اور مجدد کے نظریے کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا جس میں ضمنی طور پر قادیانیت بھی زیر بحث آجاتی تھی''۔

(اقبال کے ہاں از خضر تمیمی، مطبوعہ ملفوظاتِ اقبال مع حواشی وتعلیقات از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صفحہ 228، 229 ملفوظات از محمود نظامی صفحہ 190، 191)

ضربِ کلیم

❑ ''(4 نومبر 1936ء): حضرت علامہ کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' شائع ہو گئی ہے۔ میں نے اسلام کے آئندہ پرچے کے لیے اس پر ریویو لکھا ہے جس میں قریباً چالیس اشعار نقل کیے ہیں۔ قادیانیوں کے اردو رسالے ''ریویو آف ریلیجنز'' میں حضرت علامہ کی

کتاب ''ضربِ کلیم'' پر پچھلے دنوں ریویو کیا گیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ''کتاب بالِ جبریل سے بھی گری ہوئی ہے''۔ میں نے وہ پرچہ (چراغ حسن) حسرت صاحب کو دیا۔ انھوں نے ''مطائبات'' میں اس تنقید کا خوب مذاق اڑایا۔ (عبدالرشید) طارق صاحب نے ''ریویو آف ریلیجنز'' کے جواب میں ایک مضمون لکھا جسے لے کر وہ میرے پاس آئے تا کہ میں اسے اپنے پندرہ روزہ انگریزی پرچے ''اسلام'' میں شائع کردوں۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید، مجالس اقبال مرتب جعفر بلوچ ص 176)

مالیخولیا کا مریض نبی؟

❑ ''میں نے حضرت علامہ سے سوال کیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے......؟'' آپ نے فرمایا: ''قادیانی لوگ اسلام سے خارج ہیں۔ انھوں نے ختم نبوت کے متفقہ اسلامی اصول توڑ کر امتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ مرزا غلام احمد کے اشد ترین مخالف مثلاً مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ سنجیدگی کے ساتھ بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ مرزا غلام احمد کا دماغ ٹھیک نہیں تھا اور اس کو مالیخولیا کا عارضہ لاحق تھا۔ پس جب کہ ایک شخص دماغی توازن کھو بیٹھا ہو اور مالیخولیا میں مبتلا ہو، شرعی نقطہ نگاہ سے وہ کس طرح ماخوذ ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ''تو پھر مالیخولیا کا ایک مریض نبی کس طرح ہوسکتا ہے......؟

میں نے عرض کیا، میں اس کی نبوت کے حق میں نہیں ہوں۔ نہ اس کو نبی سمجھتا ہوں اور نہ اس کی نبوت کے جواز میں کوئی دلیل پیش کرنی چاہتا ہوں۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ شرعی نقطہ نگاہ سے ان لوگوں کا کوئی احتساب اور مواخذہ نہیں ہوسکتا، جن کا دماغ ٹھیک نہ ہو، وہ کسی قسم کے جرم کا ارتکاب ہی کیوں نہ کریں۔ اس اصول کے مطابق جب مرزا غلام احمد کے متعلق اس کے مخالف صاف اعلان کر چکے ہیں کہ اس کا دماغ ٹھیک نہیں تھا، تو اس کو کافر کہنا اور مواخذہ میں لانا شرعاً کہاں تک جائز ہوسکتا ہے......؟

یہاں حضرت علامہ سر نیچا کر کے گہری سوچ میں پڑ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد سر اوپر کو اٹھا کر فرمایا کہ ''سوال صرف مرزا کی نبوت کا ہے اور یہ طے شدہ بات ہے کہ نبوت ختم ہو چکی ہے۔

اور ایک ایسا آدمی کسی طرح بھی نبی نہیں ہوسکتا، جس کا دماغ ٹھیک نہ ہو......!''

(روایت میر عبدالعزیز کرد (مستونگ) روزنامہ احسان، لاہور بابت 30 مئی 1938ء)

مخبوط الحواس نبی؟

❑ ''اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر علامہ اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق فرمایا:

"He feels a dupe of his own imigination."

(یعنی وہ اپنے ہی مذموم تخیلات میں الجھ کر رہ گیا۔)

ڈاکٹر صاحب کی تقریر میں کچھ مقامات تو ایسے تھے جہاں میری عقل عاجز و درماندہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اردو کے ساتھ انگریزی فقرے اور الفاظ بھی استعمال فرماتے تھے۔ یہ شاید اس لیے کہ گفتگو کی نوعیت ایسی تھی جس کا مفہوم انگریزی میں زیادہ سہل ہو جاتا تھا''۔

(محفلے دیدم از حیرت شملوی، آپ بیتیوں میں ذکر اقبال از محمد ارشد چودھری صفحہ 278)

جھوٹا

❑ ''ایک شخص جس نے کچھ عرصہ ہوا پنجاب کے کسی گاؤں میں نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا، اقبال کے پاس آیا اور انھیں اپنی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا کہ کل رات میں رسول کریم ﷺ کے دربار میں حاضر تھا۔ وہاں آپ کا ذکر آیا اور حضور ﷺ نے آپ کے حق میں بڑے اچھے کلمے کہے۔ چنانچہ میں آپ کو اس کی بشارت دینے آیا ہوں۔ اقبال نے سر جھکا لیا اور کچھ سوچ کر بولے کہ صاحب آپ کا شکریہ۔ لیکن مجھے اس معاملہ میں کچھ تعجب سا ہے۔ نبوت کے مدعی صاحب نے پوچھا کیا بات ہے؟ اقبال بولے کہ صاحب حیران میں اس لیے ہوں کہ کل رات رسول کریم ﷺ کے دربار میں، مَیں خود بھی موجود تھا، مگر میں نے وہاں آپ کو نہیں دیکھا''

(روایت ممتاز حسین، کیا خوب آدمی تھا، حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی)

اگر میری بیٹی ہوتی تو..............!

❑ ''حضرت علامہ اقبال قادیانیت سے اس درجہ نفرت کرنے لگے تھے کہ ان کے نزدیک اس سے بڑا معاشرتی ناسور اور کوئی نہ تھا۔ یہ 1938ء سے پہلے کی بات ہے کہ علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کے سلسلے میں ان سے ایک رشتہ کا ذکر

کیا اور اُن کی رائے دریافت کی۔ لڑکا اور اس کے والدین ختم نبوت کے منکرین (قادیانیوں) میں سے تھے۔ آپ نے جواب دیا۔

''بھائی صاحب! اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو میں ہرگز ہرگز یہاں اس کی شادی نہ کرتا''۔

اس پر شیخ عطاء اللہ نے کہا: ''کیا یہ تمہاری بیٹی نہیں؟ اگر تمہیں ناپسند ہے تو یہ رشتہ کبھی نہ ہوگا۔'' چنانچہ اسی وقت انکار کر دیا گیا۔

یہ تھی حضرت علامہ اقبال کی دینی حمیت، ملی غیرت اور سیاسی بصیرت۔''

(اقبال درونِ خانہ جلد اول از خالد نظیر صوفی ص 25)

علامہ محمد اقبالؒ کے مطالبات

❑ ''حضرت علامہ اقبالؒ نے انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے ایک مرزائی رکن مرزا یعقوب بیگ کو رکنیت سے خارج کرنے کے مطالبے کے بعد استعفیٰ دے دیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ:

1- جب تک مرزا یعقوب بیگ انجمن کی رکنیت سے خارج نہیں کیے جاتے۔

2- جب تک انجمن، ختم رسالت ﷺ اور قادیانیوں کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح نہیں کرتی اور اس امر کا اخبارات میں اعلان نہیں کرتی، اقبال نہ تو انجمن کا صدر رہے گا نہ کسی جلسے میں شریک ہوگا''۔ (اقبال کا تصور ملت اور آزادی ہند از ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان صفحہ 412)

جہاد اور قادیانیت

❑ ''آخری عمر میں قریباً ہر صحبت میں مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر آ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ: ''سلطان ٹیپوؒ کے جہادِ حریت سے انگریز نے اندازہ کیا کہ مسئلہ جہاد اس کی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ جب تک شریعتِ اسلامیہ سے اس مسئلہ کو خارج نہ کیا جائے، انگریز کا مستقبل مطمئن نہیں، چنانچہ اسی زمانہ سے مختلف ممالک کے علما کو آلہ کار بنانا شروع کیا۔ ہندوستانی علما سے بھی ایسے فتاویٰ حاصل کیے، لیکن ایک منصوص قرآنی مسئلہ کو مٹانے کے لیے علما کو ناکافی سمجھ کر ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی، جس کا بنیادی مسئلہ یہی ہو کہ اقوام اسلامیہ میں نسخِ جہاد کی تبلیغ کی جائے۔ احمدیت کے اسبابِ وجود پر آج تک جو کچھ لکھا گیا، اس کی وقعت سطحیت سے زیادہ نہیں۔ اس کا حقیقی سبب اسی ضرورت کا احساس تھا۔''

اس کے بعد علامہ نے مجھے خاص طور پر کہا:

''تم ایسے فتاویٰ کی نقول تلاش کرو، ممکن ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری سے اس کا کچھ سراغ نکلے۔ میں نے امرت سر پہنچ کر مولوی صاحب موصوف سے دریافت کیا، تو انھوں نے سر سیّد مرحوم کے کتب خانہ علی گڑھ کی طرف راہنمائی کی۔ میں نے علامہ کو اس مطلب کا ایک خط لکھ دیا۔ پھر معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے اس بارہ میں کوئی قدم اٹھایا یا نہیں۔ ایک دفعہ میری موجودگی میں آپ نے سیّد ریاست علی صاحب ندوی کو بھی اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ یہ کام اسی وقت کرنے کا ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا، ہم اس کی سہولتوں سے دور ہوتے جائیں گے اور اس ''ملتِ جدید'' پر تقدس کے غلاف چڑھتے جائیں گے۔

(علامہ اقبال کی صحبت میں از محمد حسین عرشی مطبوعہ ملفوظاتِ اقبال مع حواشی وتعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ 64 تا 66، ملفوظات از محمود نظامی صفحہ 41)

❑ ''مرزا غلام احمد، قادیانی فرقہ کے بانی جو بعد میں دو فرقوں میں بٹ گیا، قادیان ان کا مرکز تھا جو اب بھارت میں ہے۔ پاکستان میں ربوہ کو قادیانیوں سے اپنا تحریک کا مرکز بنایا۔ قادیانی تحریک کے متعلق علامہ کا نکتہ نظر صاف ظاہر ہے۔ انھوں نے اپنے مکاتیب میں صاف صاف لکھا ہے کہ قادیانی نہ اسلام کے وفادار ہو سکتے ہیں اور نہ اس ملک کے۔ علامہ کا یہ تجزیہ درست ہے کہ سلطان ٹیپو شہید کے جہادِ حریت کے بعد انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کا مسئلہ جہاد ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اور انھوں نے شریعتِ اسلامیہ سے اس مسئلۂ کو خارج کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ مثلاً مسلمانوں کے جہاد کا ذکر کرتے ہوئے یہ تاثر پیدا کیا کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ مسلمان تبلیغِ دین کے لیے نہیں صرف ملک گیری کی ہوس میں جنگ کرتے تھے، حالانکہ علامہ اقبالؒ کے بقول:

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟

اور مسلمانوں کا کردار یہ تھا:

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

چنانچہ علامہ کے بقول انگریزوں نے بعض نام نہاد علما کو اپنا آلۂ کار بنایا کہ وہ اسلام اور شریعت اسلامیہ میں رخنہ اندازی کریں۔ ایک سیاسی مسئلہ جہاد کا تھا، چنانچہ بعض اطراف سے یہ توجیہ کی گئی کہ جہاد سے مراد صرف جہد یا کوشش ہے، تلوار اٹھانا اور خون بہانا جہاد نہیں اور بعض نے ''جہاد بالسیف'' کی جگہ ''جہاد بالقلم'' کو اس دور کی ضروریات کے مطابق جہاد بتایا۔ غرض علما کے ایک طبقہ سے اس طرح کی تاویلات فراہم ہوگئیں لیکن اس کا اثر عامۃ المسلمین پر نہ ہوا، اس لیے بقول علامہ ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مرزا غلام احمد اس خدمت پر متعین ہوئے اور مختلف مراحل سے گزر کر کبھی مسیح موعود، کبھی مہدی، کبھی نبی ظلی کے روپ میں ایک ایسی شریعت کے بانی ہوئے جو اسلام کے نام پر اسلام کی تلبیس تھی۔ قادیانیت کے خلاف مسلم علما اور زعماء نے آواز اٹھائی اور بہت کچھ لکھا گیا لیکن علامہ کا یہ خیال درست ہے کہ اصل مسئلہ یعنی قادیانیوں کے تنسیخ مسئلہ جہاد پر جس توجہ کی ضرورت تھی، وہ نہیں ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد بھی قادیانیت کی تبلیغ و تنظیم کا سلسلہ جاری رہا اور قادیانی بعض کلیدی آسامیوں پر قابض رہے جن سے نازک آسامیوں پر ان کا اور ان کی جماعت کے لوگوں کا اثر و اقتدار بڑھا اور طرح طرح کے سیاسی، سماجی اور انتظامی مسائل پیدا ہوئے۔ اس کے خلاف زبردست ردعمل بھی ہوا اور بالآخر حکومتِ پاکستان کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا پڑا۔

علامہ کے اکثر مکتوبات میں قادیانیوں کے بارے میں واضح خیالات موجود ہیں‘‘۔

(علامہ اقبال کی صحبت میں از محمد حسین عرشی، ملفوظاتِ اقبال مع حواشی وتعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ 382 تا 384)

قادیانی Tender

❑ ’’میں نے سوال کیا: مرزا محمود صاحب قادیانی، سیاسیات میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے گفت وشنید فرما رہے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ علامہ اقبالؒ نے فرمایا: ہاں، میں نے بھی اخباروں میں یہ خبر پڑھی ہے۔ انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ سے Tender مانگے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ انگریز سے کہہ رہے ہیں کہ میں تم سے خفا ہوں، جلدی کرو اور مجھے مناؤ‘‘۔

(اقبال کے ہاں ایک شام از ڈاکٹر سعید اللہ، مطبوعہ ملفوظاتِ اقبال مع حواشی وتعلیقات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ 144، ملفوظات از محمود نظامی صفحہ 112)

نوک جھونک

❑ ’’گفتگو کا رخ مرزا غلام احمد قادیانی اور بہاء اللہ کی تعلیمات کی طرف پلٹا، فرمایا: ’’پچھلے دنوں ایک امریکن خاتون جس نے بہائی مذہب اختیار کر رکھا تھا، میرے پاس آئی اور بہاء اللہ کی بابت باتیں کرتی رہی۔ میں نے قرآن پاک کی چند آیات پڑھ کر سنائیں اور جب اسے ان کے مطالب اور معانی سے آگاہ کیا تو اچھل پڑی کہ ہیں یہ تعلیمات تو ہمارے آقا بہاء اللہ کی ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا نہیں یہ احکام تو خدا کے ہیں اور رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیم ہے۔ بہاء اللہ نے صرف ان میں تھوڑا سا تغیر کر کے اپنا لی ہیں۔ اس کا دعویٰ درحقیقت سراسر باطل ہے۔ تم دونوں کی تعلیمات میں بے حد مشابہت اور مماثلت پاؤ گی، یا اگر سچ پوچھو تو بہاء اللہ کی تعلیمات علومِ قرآنیہ کی فرع ہے۔ اس سے اس کی تشفی ہوگئی مگر جاتے ہوئے بہاء اللہ کی تعلیمات کا ایک مختصر سا رسالہ چھوڑ گئی۔‘‘

پھر مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کے ملی استحکام کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے اور آئندہ پہنچائے گی اگر اس کا استیصال نہ کیا گیا۔ اس ضمن میں کہنے لگے: ’’سیالکوٹ کی ایک مسجد میں مرزا صاحب دعویٰ مسیحیت کے ابتدائی ایام میں

صبح صبح اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں تازہ الہامات سنایا کرتے تھے، ایک روز مجھے جو دل لگی سوجھی تو میں بھی وہاں جا پہنچا اور کہا کہ مجھے بھی الہامات ہوئے ہیں، سنیے۔ میں نے عربی کے چند جملے جن میں احمدیوں اور ان کے مذہب کی بابت مزاحیہ رنگ میں نوک جھونک تھی سنائے جس سے وہ طائفہ سخت برہم ہوا اور مجھے بھاگنا پڑا۔"

(مئے شبانہ از عبدالرشید طارق، مطبوعہ ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی 254،255، ملفوظات از محمود نظامی صفحہ 214،215)

بہاء اللہ ایرانی اور مرزا قادیانی

❑ "جنوری 1935ء میں مَیں، صوفی صاحب اور میرے دوست سیّد الطاف حسین ان کی بارگاہ میں بیٹھے تھے کہ ایک پست قامت سپید رنگ، کہنہ سال اجنبی حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ نو وارد کا نام موسیٰ جار اللہ ہے اور وہ روسی عالم اور جید ہیں۔ ادھر ادھر کی بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اس بزرگ نے "جاوید نامہ" نکالا، تعریفیں ہونے لگیں اور کہنے لگا کہ دو باتیں آپ سے سمجھنے آیا ہوں۔ اس کے بعد دین اور سیاست اور نظریۂ لادینی کی بابت استفسار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلے پر کافی روشنی ڈالی۔ مغربی سیاست اور وطنیت کے زہر آلود نظریے کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔ اس میں رنگ، نسل اور قومیت کی تمیز نہیں۔ اسلام میں دین اور سیاست کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری چیز جس کی بابت روسی عالم نے وضاحت چاہی وہ یہ شعر تھا:

ایں ز حج بیگانہ کرد آں از جہاد

جس پر ڈاکٹر صاحب نے بہاء اللہ ایرانی اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مخترع مذاہب، ان کے اسباب و علل، اثرات و نتائجِ بد پوری تفصیل سے بیان فرمائے۔

اسی سال انھوں نے قادیانی مذہب کے خلاف اپنا پہلا بیان دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، پیر کا دن تھا اور مئی کی چھ تاریخ۔ چار کو میرا امتحان ختم ہوا، جس سے فراغت حاصل کر کے اک گونہ آزادی اور سرور کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے کھانا کھایا اور ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کی راہ لی۔ شاید بارہ بجنے والے تھے کہ وہاں پہنچا۔ دل میں پہلے خیال آیا کہ بڑا ناموزوں سا وقت ہے، شاید

ڈاکٹر صاحب آرام فرما رہے ہوں یا فرمانے والے ہوں اور میں خواہ مخواہ مخل ہوں، مگر اس بارگاہ میں نا امیدی اور مایوسی مفقود ہے۔ میں نے ذرا ٹھٹک کر سامنے والے بڑے کمرے کی چق اٹھا کر دیکھا تو ڈاکٹر صاحب کاؤچ پر بیٹھے کسی امتحان کے پرچے ملاحظہ کر رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا اور اجازت چاہی، انھوں نے عینک میں سے دیکھا اور کہا ''آؤ بھئی طارق۔'' مجھے اس سے بے اندازہ خوشی ہوئی اور کہنے لگے: ''چلو دوسرے کمرے میں چلیں۔'' ہم اٹھ کر ساتھ والے چھوٹے کمرے میں آ بیٹھے جسے ڈاکٹر صاحب بطور خواب گاہ استعمال کرتے تھے۔ وہاں ایک پلنگ، ایک کرسی اور چند سوٹ کیس دھرے تھے، کچھ کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ علی بخش ڈاکٹر صاحب کے لیے کھانا لے آیا۔ شاید شوربا پکا تھا۔ ان کے کھاتے کھاتے چودھری محمد حسین صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ان دنوں مسلمانوں کی طرف سے شور بلند ہو رہا تھا کہ مرزائیوں کو اسلام سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت شمار کیا جائے۔ قادیانی عقائد کے خلاف مسلمانوں میں کافی جوش و خروش تھا اور طبقۂ علما نے اس فرقہ پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا تھا۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں اس نوع کے ریزولیوشن بھی پیش ہوئے جن سے ہلچل مچ گئی۔ گورنر پنجاب نے ایڈریس کے جواب میں مسلمان قوم کی بے ربطی، باہم نفاق و افتراق اور بے لیڈری پر اظہارِ تاسف بھی کیا۔ نا معلوم طریق پر ہماری گفتگو کا رخ بھی اسی طرف پھرا۔ میں نے مرزائی ریشہ دوانیوں اور طرزِ تبلیغ کی چند مثالیں اپنے اسلامیہ کالج کے زمانے کی سنائیں۔ ڈاکٹر صاحب اس بارے میں ایک بیان کی فکر کر چکے تھے۔ اب جو یہ موضوع چھڑا تو ان میں جوش پیدا ہو گیا اور فیصلہ کیا کہ مزید تاخیر کے بغیر اسے شائع کرا دیا جائے۔ انھوں نے علی بخش کو آواز دی اور کاغذ، قلم دوات لانے کو کہا۔ مجھ سے فرمایا کہ میں بیان لکھتا جاؤں۔ چنانچہ میں نیچے دری پر بیٹھ گیا۔ ایک سوٹ کیس سے میز کا کام لیا۔ میں بیان لکھتا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے غور سے سنتے اور درمیان میں متعدد مقامات پر تصحیح فرماتے جاتے تھے۔ کئی ایک جملے کٹوا کر دوبارہ لکھوائے اور وہ یقیناً ماسبق سے زیادہ واضح اور برجستہ ہوتے، خصوصاً اکبر مرحوم کے اس شعر کا پہلا ترجمہ:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

موجودہ ترجمے سے بالکل مختلف، لفظی اور کم وقیع تھا۔ ''کراس'' اور ''چین'' کے الفاظ اور آخری جملہ بعد کی سوجھ کا نتیجہ تھے۔ پہلی سعی جس قدر منثور تھی دوسری اتنی ہی مترنم اور دلکش تھی۔ یہ ان کا شاعرانہ کمال تھا کہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس قسم کے بیانات لکھواتے وقت آہستہ آہستہ اور سوچ سمجھ کر لکھوایا کرتے۔ نہ صرف معانی و مطالب بلکہ الفاظ کی برجستگی، موزونی اور نشست کا خیال بھی رکھتے، لیکن اس کوشش میں تکلف اور آورد کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ ان کی نگاہیں اپنے سامنے دور کسی غیر مرئی شے پر جم جاتیں جس کی حقیقت اور وجود سے گویا ہم لوگوں کو آشنا کرتے جاتے۔ بیان لکھ چکنے کے بعد ان کو پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے دو ایک اور تبدیلیاں کیں۔ اب اس کی نشر و اشاعت کا سوال درپیش ہوا۔ چودھری صاحب نے شاید انگریزی اخبارات میں چھپوانے کا ذمہ لیا۔ مجھ سے فرمایا کہ اردو اخبارات میں سب سے پہلے زمیندار کے دفتر جاؤں اور مولانا ظفر علی خاں سے کہوں کہ وہ خود اس کا ترجمہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب کو یقین تھا کہ اس کا بہترین ترجمہ وہی کر سکتے ہیں۔ میں وہیں سے بائیسکل لے کر زمیندار کے دفتر دوڑا، لیکن مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ لاہور سے باہر تھے۔ واپس آ کر صورتِ احوال بیان کی، اس کے بعد یاد نہیں کیا فیصلہ ہوا۔ بہر کیف وہ اخبارات میں چھپا اور اک شور برپا ہوا''۔

(مئے شبانہ از عبدالرشید طارق، مطبوعہ ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی 258 تا 262، ملفوظات از محمود نظامی صفحہ 218 تا 222)

مصلح موعود

ایک خاص فرقے کا ایک آدمی جو اپنے آپ کو مصلح موعود کہتا تھا، ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا، مجھ سے اللہ تعالیٰ باتیں کرتا ہے۔ علامہؒ ہنس کر کہنے لگے: خدا کی سب باتیں مان نہ لیا کرو۔ وہ بعض باتیں یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے۔ اُس نے کہا میں 1938ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا اور دہلی کو پایۂ تخت بناؤں گا۔ علامہؒ فرمانے لگے: ''ہم تو غالباً اس وقت موجود نہ ہوں گے۔ البتہ جاوید کو نہ بھولنا اور کم از کم مہرولی کا علاقہ اُسے ضرور بخش دینا''۔ علامہؒ کے مرض الموت میں یہ شخص عیادت کے لیے آیا اور کہنے لگا۔ آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہوگا۔ علامہ ہنسے اور کہنے لگے۔ واہ ہم اور آپ کو نہ پہچانیں! ولی را ولی می شناسد۔

(علامہ اقبالؒ، بچوں اور نوجوانوں کے لیے از عنایت علی ص 85،86، ذکر اقبال از عبدالمجید سالک ص 340،341)

اقبال دشمنی

مفکر پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کبھی بھی جھوٹے مدعی نبوت آنجہانی مرزا قادیانی سے بیعت نہیں ہوئے۔ روایت ہے کہ مرزا قادیانی کے کسی مرید نے علامہ اقبال کو مرزا قادیانی سے بیعت ہونے کی ترغیب و تبلیغ پر مشتمل ایک خط تحریر کیا جس کا جواب علامہ اقبال نے منظوم انداز میں دیا۔ یہ جوابی خط ماہنامہ مخزن لاہور میں شائع ہوا۔ اس روایت کی مزید توثیق اس سے ہوتی ہے کہ اس دور کے قادیانی اخبار الحکم قادیان نے 10، 17 اور 24 جنوری 1903ء کی اشاعتوں میں علامہ اقبالؒ کی اس نظم کا تردیدی جواب 'پاک شاعری' کے نام سے شائع کیا اور ان کے خلاف ژاژ خائی کر کے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی۔ قادیانیوں نے علامہ اقبالؒ کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھا:

''بہتر ہوتا کہ وہ اس راہ میں اس انداز سے قدم رکھتے ہوئے خدا کا خوف کرتے۔ طبع آزمائی کے لیے جہاں میں اور میدان تھوڑے ہیں۔ اپنی مشغلہ پسند طبیعت کو اسی طرف مصروف رکھتے۔ آگے کی خدا جانے مگر اب تک جو اس آسمانی مرد (آنجہانی مرزا قادیانی) کے مقابل میں آیا ہے، اس کا نتیجہ آخر کار ایک افسوس ناک حالت پر مبنی ہوا ہے۔ ہر رنگ میں خدا نے غلبہ اپنے بندے کو بخشا ہے۔ بہتر ہے کہ شیخ صاحب اپنے قلم کو روک لیں اور اپنے زور طبیعت کے لیے اور میدان پسند کریں اور وہ اپنے فعل کو بجائے متعدی کے لازمی ہی رہنے دیں''۔

(اخبار الحکم قادیان، 10 جنوری 1903ء ص 8)

صفحات کی قلت کے پیش نظر ذیل میں صرف حضرت علامہ اقبالؒ کا منظوم جواب درج کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

علامہ اقبال کا منظوم جواب

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں
تشنہ کام مئے فنا ہوں میں
ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

کانپ اُٹھتا ہوں ذکر مرہم پر
وہ دِل درد آشنا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغِ اُلفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں
گل پژمردۂ چمن ہوں مگر
رونق خانۂ صبا ہوں میں
کارواں سے نکل گیا آگے
مثلِ آوازۂ درا ہوں میں
دستِ واعظ سے آج بن کے نماز
کس اَدا سے قضا ہوا ہوں میں
مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد
دیدۂ حور کی حیا ہوں میں
ہے زباں مائل ترانۂ شوق
سننے والے کو دیکھتا ہوں میں
میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمز وحدت سے آشنا ہوں میں
پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں
سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ
کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں
میں کسی کو بُرا کہوں! توبہ!
ساری دنیا سے خود بُرا ہوں میں
جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن
مئے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اُس عبادت کو کیا سراہوں میں

بت پرستی تو ایک مذہب ہے
کفر غفلت کو جانتا ہوں میں

مرگِ اَغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے پہ رو رہا ہوں میں

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکوں کی راہ نما ہوں میں

ہوں زمیں پر گذر فلک پہ مری
دیکھ تو کس قدر رَسا ہوں میں

علم پلتا ہے میری گودی میں
رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں

رہبری دہر میں ہے کام مرا
رشکِ خصر خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسر کتاب ہستی کی
مظہر شانِ کبریا ہوں میں

تو مری ہمسری کرے! توبہ!
دیدۂ ہست کی ضیا ہوں میں

بوند اِک خون کی ہے تو لیکن
غیرتِ لعل بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
میرے دم سے جہان بستا ہے
اس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے چینی
اس مرض کی مگر دَوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں
گلشن طور میں بہار مری
قطرۂ بحر آشنا ہوں میں
تو ہے وابستہ زمان و مکاں
اور اس قید سے رہا ہوں میں

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں
تو یہ سمجھے کہ دہریا ہوں میں
اہل دل کو بگاڑ سے مطلب؟
سب بزرگوں کی خاکِ پا ہوں میں
فیض اقبالؔ ہے اُسی دَر کا
بندۂ ''شاہِ **لافتا**'' ہوں میں

(ماہنامہ مخزن لاہور، ایڈیٹر شیخ عبدالقادر بی اے، شمارہ نمبر 2، جلد نمبر 3، مئی 1902ء ص 48)

محاسبہ قادیانیت

❑ ''گذشتہ ڈیڑھ سال سے اقبال کی بیرونِ خانہ سرگرمیاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں، اس لیے انھیں مطالعے اور لکھنے پڑھنے کے لیے خاصا وقت مل جاتا تھا۔ بالِ جبریل جنوری 1935ء میں چھپ گئی۔ آئندہ مجموعۂ کلام کے لیے بھی خاصا کلام جمع ہو گیا تھا۔ اس کا نام انھوں نے صورِ اسرافیل تجویز کر رکھا تھا۔ (بعد ازاں اسے ضربِ کلیم سے بدل دیا گیا) شعر گوئی کے ساتھ عمومی مطالعہ بھی کرتے رہتے۔ اسی زمانے میں الیاس برنی کی کتاب 'قادیانی مذہب' ان کے ہاتھ لگی۔ اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور پھر اصل قادیانی کتابیں منگوا کر پڑھیں تو قادیانیت کی حقیقت ان پر پوری طرح الم نشرح ہو گئی۔ اس سے قبل علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کو قریب سے دیکھ کر ان کے اصل عزائم کا کچھ اندازہ تو کر لیا تھا۔ اقبال نے محسوس کیا کہ وہ صرف اپنے امیر مرزا بشیر الدین محمود کا حکم مانتے ہیں اور انھیں کشمیریوں سے حقیقی ہمدردی نہیں ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کو بھی یہی تجربہ ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی 'آتش چنار' میں لکھا ہے: ''قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بہت جلد ہم پر آشکارا ہونے لگے۔ انھوں نے جب ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو عام کرنا شروع کر دیا تو میرے ساتھ میرے کچھ اور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشویش محسوس کی اور قادیانی حضرات مجھ سے بھی برگشتہ ہو گئے''۔ بعد ازاں جب شیخ صاحب نے لاہور میں ایک مجلس مشاورت میں مرزا محمود کی موجودگی میں یہ تجویز پیش کی کہ ہر مکتب خیال کے راہنما یہ طے کر لیں کہ وہ تحریک کے پلیٹ فارم کو اپنے ذیلی مقاصد کی تبلیغ کی نشر گاہ نہیں

بنائیں گے تو مرزا محمود نے برملا کہا کہ ہمارے لیے اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں۔

علامہ اقبال بھوپال سے 10 مارچ کو واپس آئے۔ وسط مئی تک دو اڑھائی ماہ کا عرصہ ان کے لیے انتہائی پریشانی کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی علمی وفکری سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے قادیانیت کی تردید میں **Qadianism & Orthodox Muslims** کے عنوان سے ایک مفصل مضمون قلمبند کیا، جو کلکتہ کے اخبار **Statesman** میں 14 مئی 1935ء کو شائع ہوا۔ اسی مضمون کے تکملے **(Postscript)** میں علامہ اقبال نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ **(Separate Community)** قرار دے۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے یہ پہلی مؤثر آواز تھی، جس پر **Statesman** نے اداریہ بھی لکھا۔ پھر یہی مضمون ایسٹرن ٹائمز، ٹریبیون، سٹار آف انڈیا اور دکن ٹائمز میں بھی شائع ہوا۔ علامہ کے اس بیان پر قادیانیوں نے یکے بعد دیگرے کئی اعتراض کیے۔ ان کے ہفت روزوں لائٹ اور سن رائز نے قادیانیت کے بارے میں اقبال کے ہاں بعض تناقضات اور تضادات کا ذکر کیا تو اقبال نے وضاحت کی کہ بلاشبہہ مجھے ربع صدی قبل اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع تھی، لیکن اس وقت معلوم نہیں تھا کہ یہ تحریک آگے چل کر کیا شکل اختیار کرلے گی۔ ذاتی طور پر مجھے قادیانی تحریک سے اس وقت کھٹک پیدا ہوئی، جب بانی قادیانیت نے (نعوذ باللہ) حضور نبی کریم ﷺ سے بھی برتر، ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا اور اس (خانہ ساز اور جعلی) نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کو ''کافر'' قرار دیا۔

یہ صرف اقبال کا تجربہ نہ تھا، شیخ محمد عبداللہ کو بھی جب قادیان میں بتایا گیا کہ ''جو مرزا غلام احمد کی نبوت پر ایمان نہ لائے، اسے (ہم) خارج از اسلام سمجھتے ہیں''۔ تو ان کا احساس تھا: ''اس صاف گوئی سے میری آنکھوں پر سے پردہ سا ہٹ گیا اور ان کی نیت اور حکمتِ عملی کا سارا راز فاش ہوگیا''۔

آگے چل کر علامہ نے لکھا: میرا شک وشبہہ اور کھٹک، اس وقت بغاوت میں تبدیل ہوگئی، جب میں نے اپنے کانوں سے ایک قادیانی کی زبان سے رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں توہین وتحقیر آمیز کلمات سنے۔ علامہ نے مزید کہا: بات یہ ہے کہ درخت اپنی جڑ سے نہیں، پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پھر ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کو اپنی رائے بدل لینے کا حق حاصل ہے۔

ایمرسن کے بقول صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدل سکتے۔

اقبال نے اپنے مؤقف کی وضاحت میں جون 1935ء میں ایک اور بیان جاری کیا۔ ادھر کلکتہ کے اخبار ماڈرن ریویو میں پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں تین مضمون لکھے، اسی لیے قریبی زمانے میں جب پنڈت نہرو لاہور آئے تو قادیانیوں نے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا۔ قادیانی اخبار الفضل کے مطابق استقبال کے لیے پہلے سے باقاعدہ تیاری کی گئی تھی اور قادیان اور سیالکوٹ سے 500 کارکن منگوائے گئے تھے۔ الفضل کے مطابق استقبال کا یہ نظارہ حد درجہ جاذب توجہ اور روح پرور تھا۔

باوجود علالت کے، اقبال نے جنوری 1936ء میں ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے ایک اور مضمون لکھا، جو پنڈت نہرو کی تحریروں کا مدلل جواب تھا۔ پھر نہرو کے ایک خط کے جواب میں علامہ نے 21 جون 1936ء کے ایک خط میں لکھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے کا علم نہیں ہے۔ آپ کے مضامین سے مسلمانوں نے یہی سمجھا کہ آپ کی ہمدردیاں احمدیوں کے ساتھ ہیں، کیونکہ آپ کے مضامین کی اشاعت پر احمدیوں نے بڑی خوشیاں منائی ہیں۔ بہرحال میں خوش ہوں کو میرا تاثر غلط تھا۔ میں نے اپنا مضمون اسلام اور ہندوستان کی بہتری کے لیے لکھا تھا۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان، دونوں کے غدار ہیں۔ علامہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India."

علامہ کے اس خط کے بعد قادیانیوں کے بارے میں نہرو کا ذہن بڑی حد تک صاف ہوگیا، چنانچہ اگلے برس وہ لاہور آئے تو قادیانیوں نے ان کا استقبال نہیں کیا، کیونکہ قادیانی سمجھ گئے تھے کہ اب نہرو پر قادیانیت کی اصل حقیقت بے نقاب ہوچکی ہے۔ اس موقعے پر نہرو علامہ سے ملنے جاوید منزل گئے اور ڈیڑھ دو گھنٹے تک مفصل گفتگو رہی۔

قادیانیت کی بحثوں میں علامہ اقبال نے یہ سوال اٹھایا کہ قادیانیوں نے معاشرتی طور پر خود کو مسلمانوں سے الگ کرلیا ہے اور وہ مسلمانوں کو کافر سمجھتے اور کہتے ہیں تو پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے پر کیوں مصر ہیں؟ علامہ اقبال کے بیانات اور مضامین کے ردِعمل میں

قادیانی حلقوں نے طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے، لیکن مسلم پریس نے اقبال کے مؤقف کی تائید کی اور قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے مزید دلائل مہیا کیے"۔

(علامہ اقبال، شخصیت اور فکر وفن از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص 230 تا 232)

جہاد کے دفاع میں

❑ "علامہ اقبال بجا طور پر سمجھتے تھے کہ گذشتہ 13، 14 سو برسوں میں اسلام کی قوت اور امت مسلمہ کی بقا کی انحصار جہاد فی سبیل اللہ پر رہا ہے۔ برعظیم پر انگریزی استعمار کے تسلط، غلامانہ ذہنیت، سیاسی شکست خوردگی اور مغربی فکر و فلسفے سے مرعوبیت نے تاویلات کے ذریعے تصور جہاد کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے اس معذرت خواہانہ طرزِ فکر کو قطعی رد کر دیا جس کا بیج سر سید احمد خاں نے تعلیم یافتہ ذہنوں میں بویا تھا اور قادیانی مذہب انگریزی استعمار سے وفاداری کی خاطر اس کی آبیاری کر رہا تھا۔ علامہ اقبال بخوبی جانتے تھے کہ نفی جہاد کی اس مہم کے پس پردہ کون سی استعماری طاقت کام کر رہی ہے۔ نظم "جہاد" (ضرب کلیم، ص 28) میں انھوں نے صورتِ حال کا پرلطف تجزیہ کیا ہے:

فتویٰ ہے شیخ کا، یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

اقبال کی یہ نظم مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک نظم: "دینی جہاد کی ممانعت کا فتویٰ" (1935ء) کا جواب ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے خیال میں اقبال، اس نظم میں تنسیخ جہاد کا اعلان کرنے والی قادیانی جماعت سے مخاطب ہیں۔ وہ جناب شیخ (مرزا قادیانی، مرتب) سے کہتے ہیں کہ آپ کے وعظ و نصیحت کا اصل مستحق یورپ ہے، جس نے حفظِ باطل کے لیے نوع بہ نوع اور جدید ترین اسلحے کے انبار جمع کر رکھے ہیں...... اگر آپ امن کے خواہاں ہیں تو ذرا یورپ کا محاسبہ بھی کیجیے ع: مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر۔

احادیثِ نبوی ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام عبادات سے افضل ہے۔ ایک دن کا جہاد، ہزار دنوں کی عبادت سے بہتر ہے، بلکہ جہاد کے لیے نکلنے کو صحبتِ نبوی ﷺ میں رہنے پر ترجیح دی گئی ہے۔ جہاد کی اسی فضیلت کے پیش نظر، علامہ اقبال نے تاریخ

اسلام کے ان اکابر وشخصیات کی مدح وستائش کی ہے، جن کا شمار زمرہ مجاہدین وشہدا میں ہوتا ہے‘‘۔(اقبالیات: تفہیم وتجزیہ از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص119)

کوئی جواب نہ دیں

❑ ’’ارشاد ہوا: جناح نے مرزا محمود احمد کا خط مجھے بھیج دیا ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں: ہماری جماعت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اگر آپ نے ہمیں لیگ میں شامل نہ کیا تو مجبوراً کانگریس میں شمولیت کرنا پڑے گی۔‘‘

میں نے عرض کیا’’ آپ کی کیا رائے ہے؟‘‘

فرمایا’’رائے کا کیا سوال ہے؟ لیگ میں شامل ہوں یا کانگریس میں، ہم ان کی شمولیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جو جی چاہیں کریں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرزا صاحب کے نزدیک ہم مسلمان، مسلمان ہیں یا نہیں؟ اگر ہمیں اور انہیں بھی اسلام کا دعویٰ ہے تو پھر لیگ یا کانگریس میں شرکت اور عدم شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔............مرزا صاحب تو لیگ اور کانگریس سے سودا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یا تو بحیثیت ایک جماعت وہ مسلمانوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں، یا ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے۔ میں نے بہرحال جناح کو لکھ دیا ہے کہ اس قسم کے خطوں کا کوئی جواب نہ دیں‘‘۔(اقبال کے حضور از سیّد نذیر نیازی ص192،193)

احترام قرآن کا صحیح مرزائی جذبہ

❑ ’’مرزا غلام احمد قادیانی کے منجھلے صاحبزادہ میاں بشیر احمد نے سیرۃ المہدی کے کئی مقامات (جلد اوّل ص154، 158، 159، 160 طبع قدیم اور جلد اوّل ص140، 144، 145، 251 طبع جدید) پر مولوی میر حسن صاحب سیالکوٹی کا ذکر کیا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم مرے کالج سیالکوٹ میں عربی، فارسی اور اردو کے پروفیسر اور علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کے استاد تھے۔ یاد رہے کہ علامہ مرحوم دراصل سیالکوٹ کے باشندہ تھے۔ لیکن عرصہ دراز سے لاہور میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ سیرۃ المہدی جلد اول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی میر حسن صاحب مسیح قادیاں کے خاص سیالکوٹی احباب میں سے تھے۔ اسی بنا پر ایک مرتبہ بشیر احمد صاحب نے سیرۃ المہدی کی تالیف کے وقت ان سے اپنے باپ کے وہ حالات دریافت کیے جو

مرزا صاحب کے قیام سیالکوٹ کے دوران میں ان کے علم و مشاہدہ میں آئے تھے۔ چنانچہ اس استدعا کے بموجب انہوں نے مرزا صاحب کے چشم دید حالات لکھ بھیجے۔ چونکہ مولوی صاحب خدانخواستہ مرزائی نہیں تھے، اس لیے قرینہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے بھلے برے حالات بے کم و کاست لکھ بھیجے ہوں گے لیکن بشیر احمد صاحب نے ان میں سے صرف مفید مطلب چیزیں انتخاب کر لی ہوں گی۔ مثلاً مولوی میر حسن صاحب کا مندرجہ ذیل بیان جو ایک سیالکوٹی پروفیسر صاحب نے خاکسار راقم الحروف سے بیان کیا: ''سیرۃ المہدی'' میں درج نہیں ہے اور نہ اس قسم کے واقعات کے اندراج کی کوئی توقع ہو سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مولوی میر حسن مرحوم کے سامنے مسیح قادیاں کے سوانح حیات جو کسی مرزائی گم کردۂ راہ نے ترتیب دیے ہوں گے، پڑھے جا رہے تھے۔ ان میں لکھا تھا کہ مرزا صاحب کے دل میں قرآن پاک کی بڑی عظمت تھی۔ یہ سن کر مولوی میر حسن صاحب مرحوم نے فرمایا کہ ہاں ''عظمت قرآن کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ مرزا صاحب کی تلاوت کا جو نسخہ قرآن تھا، اس میں مرزا صاحب نے خاتمہ قرآن پر یعنی سورہ الناس کے اختتام پر قوت باہ کا ایک نسخہ لکھ رکھا تھا''۔

(رئیس قادیان، آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کے مستند حالات از ابوالقاسم مولانا رفیق دلاوری ص 55،56)

خلیفۂ قادیان پر فحش الزام

❑ ''جب میں یورپ میں تھا تو آپ نے پروفیسر میسنگ نون کا ذکر کرتے ہوئے مجھے مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:

''آج کل پیرس میں خوب موسم ہوگا۔ قادیان کے احمدیوں میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور خلیفۂ قادیان پر ان کے باغی مریدوں کی ایک جماعت نے نہایت فحش الزام لگائے ہیں۔ نقص امن کے احتمال سے وہاں کل سے دفعہ 144 کا نفاذ کیا گیا ہے۔ سید راس مسعود وزیر معارف بھوپال دفعتہً اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ بڑے مخلص اور دردمند آدمی تھے۔ پروفیسر میسنگ نون سے آپ کی ملاقات ہو تو میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کیجیے۔ والسلام محمد اقبال''

میں پروفیسر میسنگ نون سے اپنے قیام پیرس کے دوران میں، 1937ء میں، ملا ہوں

اور کالج میں مڈل ایسٹ پر ان کا لیکچر بھی سنا ہے۔ پیرس کے علمی حلقوں میں ان کو بہت شہرت حاصل تھی اور مشرقِ وسطیٰ پر ان کو محقق تصور کیا جاتا تھا۔ انھوں نے مسئلہ فلسطین اور یہودیوں کی مشرقِ وسطیٰ میں مداخلت پر تحقیق کی ہے اور اس موضوع پر کالج میں لیکچر بھی دیے ہیں۔''

(اقبال کی صحبت میں از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ص 272)

گورنمنٹ کا جاسوس

❑ ''ایک رات پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دو آدمی علامہ اقبالؒ کے مکان پر آئے۔ انھوں نے علی بخش سے پوچھا کہ علامہ صاحب کہاں ہیں؟ ہم ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ علی بخش نے کہا: ''وہ سو رہے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ انھیں فوراً جگا دیں۔ ہمیں ان سے ایک ضروری کام ہے اور اسی وقت ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ قریب ہی علامہ بھی سوئے ہوئے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر بیدار ہو گئے تو انھوں نے علامہ اقبالؒ کے سامنے وہ تمام ریکارڈ رکھ دیا جو مرزا محمود (بشیر الدین محمود) نے گورنمنٹ کو بھیجا تھا۔ نیز انھوں نے کہا کہ اگر ہمارے متعلق یہ پتا چل جائے کہ ہم یہ فائلیں اٹھا کر یہاں آئے ہیں تو ہماری سزا موت کے سوا کچھ نہیں مگر ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ آپ نے ایک ایسے آدمی کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنا دیا ہے جو گورنمنٹ کا جاسوس ہے۔''

(قادیانی تحریک کا سیاسی پس منظر ص 30-31 از علامہ اختر فتح پوری)

جہاں میں بندہ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

قادیانیت شکن شاعری

حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا شمار آسمان علم وادب کے اُن درخشندہ ستاروں میں ہوتا ہے جو اپنے بے نظیر تخیل اور منفرد انداز بیاں کے سبب اردو کے بلند پایہ اور عہد آفریں شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُن کی ایمان افروز شاعری، محبتِ رسول ﷺ کا وہ سمندر ہے جس کی موجیں آسمان کو چھوتی ہیں۔ اُن کے افکار ونظریات اور جذبات ومحسوسات آب حیات کا وہ خزانہ ہے جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہی نہیں بلکہ سچے عاشق رسولؐ بھی تھے۔ انھوں نے فلسفے کی اعلیٰ تعلیم یورپ میں حاصل کی۔ دانشِ افرنگ کا سحر ان کے ایمان وایقان میں شکوک وتذبذب کا زہر پیدا نہ کرسکا بلکہ یورپ کی لادینی اور بے لگام تہذیب و ثقافت نے اقبالؒ کے اسلامی عقائد اور ایمان وایقان کو مزید استقامت کا موقع فراہم کیا۔ بقول شخصے: ’’اقبال قافلہ امت کا حدی خواں ہے۔ اُس کی نوا بانگ درا‘ اُس کا تخیل بالِ جبرئیلؑ کی طرح بلند پرواز‘ اُس کی تنقید ضربِ کلیم اور اس کا پیغام ارمغانِ حجاز ہے۔ اس کے کلام میں حافظ کی شیرینی‘ زُہیر کی دانائی اور غالب کا تفکر ملتا ہے۔ وہ خود شناسی‘ جدوجہد اور انقلاب کا پیغامبر ہے۔ وہ ایک بامقصد شاعر ہے جس کی شاعری کا مقصد بھٹکے ہوؤں کی راہبری ہے۔ اقبال کا دل مسلمان‘ اُس کا ذہن اسلامی اور اس کی فکر آفاقی ہے۔ اس کے ہاں عقل وعشق کا امتزاج ہے۔ تعقل و جذبات کا اتصال ہے۔ اس کی شاعری عمل وحرکت سے عبارت ہے۔ وہ رجز خواں ہے‘ خارا شگاف ہے۔ وہ ایسا مرد قلندر ہے جس کے شعر میں صورِ اسرافیلؑ کی آہنگ ہے۔ وہ جمود کو توڑتا‘ ولولوں کو اُبھارتا اور مردہ دلوں میں خونِ زندگی دوڑاتا ہے۔ اس کا ایمان پختہ‘ یقین محکم اور عزم بلند ہے۔ اس کے کلام میں نغمگی‘ شکوہ‘ وجد آفرینی اور قوتِ تاثیر ہے۔‘‘

مفکر اسلام حضرت علامہ محمد اقبالؒ حب اسلام کی مستی میں گرفتار اور محبت رسول ﷺ کے جام سے سرشار تھے۔ اُن کے کلام میں حکیمانہ ذوق عرفاں اور قلم وزبان میں جوش طوفان ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ وہ زندہ رہے تو دین اسلام کی سربلندی کے لیے اور رخصت ہوئے تو ’آبروئے ما زنام مصطفیٰ ﷺ است‘ کا وظیفہ جپتے ہوئے۔ انہیں ملت اسلامیہ سے ایک گہرا تعلق تھا۔ وہ

غیرت وحمیت، آزادی اور خودی کے جوہر کے محافظ تھے۔ حضرت علامہؒ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُن کی شاعری میں شکست، محرومی، بے یقینی، بے چارگی، غلامی، مایوسی، نا اُمیدی یا زندگی سے فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انہوں نے اپنی زندہ، فکر انگیز اور انقلابی شاعری کے ذریعے امت مسلمہ کو عز و شرف کی بلندیوں پر ہمکنار کیا۔ قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کروایا اور ان میں حقیقی حیات کی روح پھونکی۔ خودی، بلند ہمتی اور یقین محکم کی لازوال دولت سے مالا مال کیا۔ وہ بلاشبہ حقیقی معنوں میں حکیم الامت اور دانائے قوم تھے۔ انہوں نے عمیق غور وفکر اور اپنی مومنانہ فراست کے نور سے حالات و واقعات کا ادراک کرتے ہوئے قوم کو آنے والے خطرات سے باخبر کیا اور صحیح معنوں میں راہنمائی کی۔ انہیں خواب غفلت سے بیدار کر کے میدان عمل میں جھپٹنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کا حوصلہ دیا۔ اس سلسلہ میں حضرت علامہؒ نے برطانوی سامراج کے خود کاشتہ پودے فتنہ قادیانیت کا محاسبہ کرتے ہوئے اُن کے باطل عقائد ونظریات اور دجل وکذب کا مکمل تجزیہ کیا۔ قادیانی تاویلات کا عقل ونقل کی بنیاد پر نہایت مسکت اور دندان شکن جواب دیا۔ روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے والی بصیرت افروز شاعری کے ذریعے قادیانی ارتداد کے طوفان بلاخیز کے آگے بند باندھا۔ بلاشبہ اُن کا کلام آزادیت کا علمبردار اور حریتِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی شاعری پڑھ کر خون رگوں میں جوش مارتا اور دل شان مومن پیدا کرنے کی تمنا کرتا ہے۔ تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ذیل میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی چند ایمان افروز اور قادیانیت شکن نظمیں اور قطعات پیش خدمت ہیں۔ پڑھیے اور سر دھنیے!

ڈاکٹر اقبالؒ! اے ملک سخن کے شہر یار
نازش اسلامیاں، اے فلسفی نامدار
تیرے شعروں نے دلوں میں جوش ایسا بھر دیا
از سر نو ملت مردہ کو زندہ کر دیا
مردہ دل کو ہیں تیرے اشعار پیغام حیات
تشنہ کام آرزو کے واسطے جام حیات

لانبی بعدی

پس خُدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
اُو رُسل را ختم و ما اقوام را

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خدا ست
پردہ ناموسِ دینِ مصطفٰے است

قوم را سرمایۂ قوت ازُو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازُو

حق تعالٰی نقشِ ہر دعوٰی شکست
تا اَبد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مسلماں بر کُند
نعرۂ لا قَوْمَ بَعْدِیْ می زند
(مثنوی ''رموزِ بے خودی'' از مجموعہ اسرار و رموز)

ترجمہ:

1- اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسول ﷺ پر رسالت ختم کر دی۔

2- ہمارے رسول ﷺ پر سلسلۂ انبیا اور ہم پر سلسلۂ اقوام تمام ہو چکا، اب بزمِ جہاں کی رونق ہم سے ہے۔

3- میخانۂ شرائع کا آخری جام ہمیں عطا فرمایا گیا، قیامت تک ساقی گری کی خدمت اب ہم ہی انجام دیں گے۔

4- رحمۃ للعالمین ﷺ کا یہ فرمان کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، احساناتِ خداوندی میں سے ایک بڑا احسان ہے۔ دینِ مصطفیٰ ﷺ کی عزت و ناموس کا محافظ بھی یہی ہے۔

5- مسلمانوں کا اصل سرمایہ قوت یہی عقیدۂ ختم نبوت ہے اور اسی میں وحدتِ ملت کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے۔

6- اللہ عزوجل نے حضور ﷺ کے بعد ہر دعویٰ نبوت کو باطل ٹھہرا کر اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے مجتمع کر دیا ہے۔

7- اسی عقیدہ کے باعث مسلمان ایک اللہ کے سوا سب سے تعلق توڑ لیتا اور اُمتِ مسلمہ کے بعد کوئی امت نہیں، کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہر مفہوم شرک

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای
سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای

اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو
خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہ ای

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو
اُمیے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای

فیضِ تو دشتِ عرب را مطمحِ انظار ساخت
خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ ای

دل نہ نالہ در فراقِ ماسوائے نورِ تو
خشک چوبے را ز ہجرِ خویش گریاں کردہ ای

(یہ نعت علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔ یہ انجمنِ حمایت اسلام کی روداد 1902ء کے صفحہ 32 سے منقول ہے۔ اسے سب سے پہلے آغا شورش کاشمیری مرحوم نے ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور کے شمارہ 8 اپریل 1974ء کے صفحہ 17 پر شائع کیا تھا)

ترجمہ:

1- آپ ﷺ وہ ہیں کہ آپ ﷺ نے دلوں کو رموزِ عشق سے آشنا فرمایا اور اپنے جلوؤں سے سینوں کو مطلعِ انوار بنا دیا۔

2- آپ ﷺ کے نشانِ پا سے سینکڑوں طُور ابھرتے ہیں اور آپ ﷺ ہی کے خرامِ ناز کا

فیض ہے کہ خاکِ بطحا معرفت کی تجلّیاں لیے ہوئے ہے۔

3- آپ ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت بہر نوع، بہر مفہوم اور بہر رنگ شرک (فی النبوّت) ہے اور آپ ﷺ ہی نے محفلِ ہستی کو معرفت کی شمع سے نورانی کر دیا۔

4- آپ ﷺ دیارِ علم ہیں اور شہرِ علم کا دروازہ حضرت علیؓ ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ''علی'' ہے، آپ ﷺ نے امّی ہوتے ہوئے علم و دانش اور حکمت و بصیرت کے ایوان آراستہ فرمائے۔

5- آپ ﷺ کے فیض نے عرب کے ریگستان کو نگاہوں کا مرکز بنا دیا اور اس ویرانے کی خاک آپ ﷺ کے قدموں کے طفیل گلشن بداماں ہے۔

6- میرا دل آپ ﷺ ہی کی پرُنور شخصیت کے فراق میں گریاں ہے۔ یہ آپ ﷺ ہی تھے جن کے ہجر نے خشک لکڑی (اسطوانہ حنانہ) کو رُلا دیا تھا۔

(ترجمہ، پروفیسر محمد اقبال جاوید)

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

در حرم زاد و کلیسا را مرید
پردۂ ناموسِ ما را بر درید

دامنِ او را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دلِ روشن تہی است

الحذر! از گرمئ گفتارِ او
الحذر! از حرفِ پہلو دارِ او

شیخ او لُردِ فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید

گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

(مثنوی پس چہ باید کرد)

ترجمہ:

1- میرے زمانے نے ایک نبی بھی پیدا کیا
جس کو اپنے سوا قرآن میں کچھ نظر نہ آیا
2- خود پسند ، عزت چاہنے والا ، کوتاہ نظر
اس کا دل لا الٰہ سے خالی ہے
3- مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا اور عیسائیوں کا غلام بنا
اس نے ہماری ناموس کے پردے کو چاک کرایا
4- اس سے عقیدت رکھنا حماقت ہے
اس کا سینہ دل کی روشنی سے خالی ہے

5- اس کی چرب زبانی سے بچو
اس کی چالبازانہ باتوں سے بچو،
6- اس کا پیر شیطان اور فرنگی کا غلام ہے
اگرچہ وہ کہتا ہے کہ میں بایزید کے مقام سے بول رہا ہوں
7- وہ کہتا ہے کہ غلامی میں ہی دین کی رونق ہے
اس کی زندگی خودی سے محروم ہے
8- غیروں کی دولت کو وہ رحمت جانتا ہے
اس نے گرجا کے گرد رقص کیا اور مر گیا

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد

رفت ازو آں مستی و ذوق و سرور
دینِ او اندر کتاب و او بگور!

صُحبتش با عصرِ حاضر در گرفت!
حرفِ دیں را از دو ''پیغمبر'' گرفت!

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد
آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد!

تا جہاد و حج نماند از واجبات
رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰت!

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام
فرد ناہموار و ملت بے نظام!

سینہ ہا از گرمیِ قرآں تہی
از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی!

از خودی مردِ مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سرگذشت

(جاوید نامہ)

ترجمہ:

1- وہ مستی اور ذوق وسرور ہو چکا ہے۔ دین اب کتاب ہی میں رہ گیا ہے۔ مسلمان مر چکا ہے۔
2- وہ عصرِ حاضر کی صحبت اختیار کر چکا ہے، اب وہ دو جعلی پیغمبروں سے دین سیکھتا ہے۔
3- ان میں سے ایک (بہاء اللہ) ایرانی ہے اور دوسرا (مرزا قادیانی)۔ پہلے نے حج منسوخ کر دیا اور دوسرے نے جہاد۔
4- جب جہاد اور حج واجب نہ رہے، تو صوم وصلوٰۃ کی رُوح بھی ختم ہوگئی۔
5- نماز روزے کی روح جاتی رہی تو فرد بے لگام ہو گیا اور ملت بے نظام۔
6- سینے حرارتِ قرآنِ پاک سے خالی ہو گئے۔ ایسے لوگوں سے بھلائی کی کیا اُمید؟
7- مسلمان نے خودی ترک کر دی۔ اے خضر! مدد کو پہنچ، پانی سر سے گزر گیا۔

کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را!

من آں علم و فراست با پر کا ہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ ساز د مرد غازی را

بہر نرخے کہ ایں کالا بگیری سودمند افتد
بزور بازوئے حیدرؓ بدہ ادراک رازی را

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیامن باتو آموزم طریق شاہبازی را

اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چہ نادانی!
دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را

(زبورِعجم)

ترجمہ:

1- میری نظر میں اس علم وحکمت کی قیمت گھاس کے ایک تنکے کے برابر بھی نہیں جو مردِ غازی کو اس کی تلوار اور ڈھال (عملِ جہاد) سے بیگانہ کردے۔

2- جس بھاؤ سے بھی تو یہ سودا خریدتا ہے، تیرے لیے سودمند ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قوتِ بازو کے عوض، امام فخرالدین رازی کی فہم وفراست چھوڑ دے۔ (ایسا علم کس کام کا جو مسلمان کو عملِ جہاد سے روک دے)۔

3- اگر تو خون کا ایک قطرہ رکھتا ہے (عمل کی رمق باقی ہے) اور اگر تو مٹھی بھر پر رکھتا ہے (ہمت پرواز بھی ہے) تو میرے پاس آ۔ میں تجھے شاہبازی (دنیا پر حکمرانی) کے اصول سمجھادوں گا۔

4- (اور) اگر تو اس کام (زندگی گزارنا) کو سانس کا کام سمجھتا ہے تو یہ تیری کیسی نادانی ہے۔ بانسری بجانے کے لیے (عام سانس کی نہیں) تلوار کی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (جس طرح بانسری بجانے کے لیے صرف سانس پھونکنا ہی کافی نہیں، اس کے لیے سینے میں قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِسی طرح عملی زندگی میں جان قربان کر دینے کی تمنا کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنا ضروری ہے)۔

نبوت

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدِث، نہ فقیہہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام

ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام!

''وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام''!

(ضربِ کلیم)

جعلی نبوت

غدّارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر

پنجاب کے اربابِ نبوّت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر

آوازۂ حق اُٹھتا ہے کب اور کدھر سے
''مسکیں دلِکم ماندہ دریں کشمکش اندر!''

(ضربِ کلیم)

مہدی

قوموں کی حیات اُن کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مُرغِ چمن کو

مجذوبِ فرنگی نے بہ اندازِ فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تُو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

ہو زندہ کفن پوش تو میّت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردکِ ناداں کے کفن کو؟

(ضربِ کلیم)

مہدئ برحق

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار

ہیں اہلِ سیاست کے وہی کُہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

(ضربِ کلیم)

امامت

تُو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دُشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

(ضربِ کلیم)

پنجابی مسلمان

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیّاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد

(ضربِ کلیم)

جہاد

فتویٰ ہے شَیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دُنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

لیکن جنابِ شَیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سُود و بے اثر

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں؟
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذّت سے بے خبر

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر

تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ ، یورپ سے درگزر

(ضربِ کلیم)

الہام

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

اے مردِ خدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

(ضربِ کلیم)

O

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اُس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(ضربِ کلیم)

درسِ غلامی

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذّتِ کردار، نہ افکارِ عمیق

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(ضربِ کلیم)

کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمان جدید؟
ہے جہاد اس دور میں مرد مسلماں پر حرام!

(ارمغانِ حجاز)

نفسیاتِ غلامی

سخت باریک ہیں امراض امم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

دین شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی!

(ضربِ کلیم)

نکتۂ توحید

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے!

سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے!

جہاں میں بندۂ حر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے!

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے!

(ضربِ کلیم)

O

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات

خود گیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

محکوم ہو سالک تو یہی اس کا 'ہمہ اوست'
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات!

(ارمغانِ حجاز)

O

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

(ارمغانِ حجاز)

O

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

(ارمغانِ حجاز)

علی محمد باب

تھی خوب حضورِ علما باب کی تقریر
بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سمٰوٰت

اُس کی غلطی پر علماء تھے متبسم
بولا تمھیں معلوم نہیں میرے مقامات

اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد
محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

(ضربِ کلیم)

اس نظم میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں جھوٹے مدعی نبوت علی محمد باب کی جہالت کا پردہ چاک کیا ہے۔اس شخص نے **1844**ء میں بمقام طہران (ایران) یہ دعویٰ کیا کہ میں مامور من اللہ ہوں، تا کہ لوگوں کو مہدی مسعود اور مسیح موعود کے قبول کرنے کے لیے تیار کروں، جو میرے بعد ظاہر ہوگا۔اسی لیے میں نے باب کا لقب اختیار کیا یعنی وہ دروازہ ہوں جس سے مسیح موعود دنیا میں داخل ہوگا۔جب اس شخص نے ماموریت کا دعویٰ کیا تو ایران کے مجتہد اعظم نے اس کو طلب کیا اور بہت سے نامور علماء کو جمع کر کے اس سے گفتگو کی۔علماء نے اس سے مناظرہ کیا۔دوران مناظرہ میں علی محمد باب نے اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن کی بعض آیات بھی پڑھیں، لیکن لفظ ''سمٰوٰت'' کے اعراب غلط پڑھے۔اس کی اس جہالت پر علماء اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے اور بات بھی صحیح تھی جو شخص عربی کی عبارت صحیح نہ پڑھ سکے، وہ قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر کیسے کر سکتا ہے۔مثلاً جو شخص خَلَقَ السَّمٰواتِ کو خلق السمٰوٰتَ پڑھے، وہ دوسرے لفظوں میں یہ ثابت کر رہا ہے کہ میں عربی گرامر سے بالکل ناواقف ہوں اور اس قاعدہ سے واقف نہیں ہوں کہ

سمٰوات کی حالت نصبی کو فتحہ سے ظاہر نہیں کرتے، بلکہ کسرہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ القصہ جب باب صاحب نے یہ دیکھا کہ علماء میری جہالت پر متبسم ہیں تو اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کمال ایمانداری اور خلوص سے کام لے کر برملا کہہ دیا کہ حضرات! افسوس ہے کہ آپ میرے جلالت شان سے واقف نہیں ہیں، میں روحانیت کے اس بلند مقام پر پہنچ چکا ہوں، جہاں پہنچ کر انسان صرف ونحو کی پابندیوں سے بالکل بالاتر ہو جاتا ہے۔ بے شک میرے ظہور سے پہلے آپ لوگوں نے قرآنی آیات کو صرف ونحو کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، لیکن اب میری امامت کے طفیل میں، آیاتِ قرآنی، اعراب کی پابندی سے آزاد ہو گئی ہیں، چنانچہ آج کی تاریخ سے سمٰوٰتُ، سمٰواتَ اور سمٰواتِ تینوں صورتیں جائز ہیں۔

(فکر اقبال از پروفیسر یوسف سلیم چشتی مطبوعہ ماہنامہ ''چشم بیدار'' اپریل 2014ء)

کتابیات

نام کتاب	مصنف	پبلشر
زندہ رود	جسٹس (ر) جاوید اقبال	غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ	سید نذیر نیازی	بزم اقبال، کلب روڈ لاہور
اقبالؒ کے حضور: نشستیں اور گفتگوئیں	سید نذیر نیازی	اقبال اکادمی پاکستان
روزگارِ فقیر (جلد اول، جلد دوم)	فقیر سید وحید الدین	مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور
فیضانِ اقبالؒ	شورش کاشمیریؒ	فضلی سنز اردو بازار کراچی
اقبالی مجرم	شورش کاشمیریؒ	ادارہ مطبوعاتِ چٹان لاہور
اقبال اور قادیانیت	شورش کاشمیریؒ	ادارہ مطبوعاتِ چٹان لاہور
اقبالؒ درونِ خانہ (جلد اول، دوم)	خالد نظیر صوفی	اقبال اکادمی پاکستان
اقبالیات (تفہیم و تجزیہ)	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	اقبال اکادمی پاکستان
علامہ اقبالؒ (شخصیت اور فکر و فن)	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	اقبال اکادمی پاکستان
علامہ اقبالؒ اور میر حجاز ﷺ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	بزمِ اقبال لاہور
علامہ اقبالؒ اور جواہر لال نہرو	پروفیسر رحمت علی ظفر	دار الکتاب اردو بازار لاہور
Thoughts And Reflections of IQBAL	سید عبد الواحد	محمد اشرف پبلشرز انار کلی لاہور
حرفِ اقبالؒ	لطیف احمد خان شروانی	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لاہور
Speeches, Writings & Statements of IQBAL	لطیف احمد خان شروانی	اقبال اکادمی پاکستان
علامہ محمد اقبالؒ (تقریریں، تحریریں اور بیانات)	اقبال احمد صدیقی	اقبال اکادمی پاکستان
اقبالؒ اور احمدیت	بشیر احمد ڈار	آئینہ ادب انار کلی لاہور
انوار اقبال	بشیر احمد ڈار	اقبال اکادمی پاکستان
اقبالؒ اور قادیانیت	بشیر احمد ایم اے	مجلسِ علم و دانش راولپنڈی
اقبالؒ اور قادیانی	نعیم آسی	مسلم اکیڈمی وزیر پور سیالکوٹ

اقبالؒ اور قادیانیت	پروفیسر خالد شبیر احمد	احرار فاؤنڈیشن پاکستان
ختم نبوت اور عقیدۂ اقبالؒ	عبدالمجید خان ساجد	ادارہ تحقیق و ادب ملتان
علامہ اقبالؒ اور قادیانیت	مولانا مشتاق احمد چنیوٹی	انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ پاکستان
قانون دان اقبالؒ	ظفر علی راجا	جمہوری پبلیکیشنز ایوانِ تجارت روڈ لاہور
قندیل اقبالؒ	محمد رفیق چوہدری	مکتبہ قرآنیات لاہور
اقبالؒ دشمنی ایک مطالعہ	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	جنگ پبلشرز آغا خان روڈ لاہور
اقبالؒ کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	بیت الحکمت اردو بازار لاہور
اقبالؒ کی شخصیت اور فکر و فن پر اعتراضات	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	اقبال اکادمی پاکستان
اقبالؒ کے فہم اسلام پر اعتراضات ایک مطالعہ	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	اقبال اکادمی پاکستان
علامہ اقبالؒ اور عبدالماجد (عقائد اور افکار)	ڈاکٹر ارشد خانم	بیکن بکس اردو بازار لاہور
اقبالؒ کا آخری معرکہ	سید نور محمد قادری	ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور
اقبالؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ	جعفر بلوچ	اقبال اکادمی پاکستان
مجالس اقبالؒ	جعفر بلوچ	دار التذکیر اردو بازار لاہور
اقبالیاتِ شورش	مولانا مشتاق احمد	احرار فاؤنڈیشن پاکستان
علامہ اقبالؒ کی کردار کشی	منشی عبدالرحمٰن خان	جاوید اکیڈمی چھلیک ملتان
اقبالؒ ایک مردِ مومن	ڈاکٹر صغریٰ	مجلس دانشوراں لاہور
اقبالِ کامل	عبدالسلام ندوی	کامران پبلیکیشنز صدر راولپنڈی
اقبالؒ اور محبتِ رسول ﷺ	ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی	اقبال اکادمی پاکستان
اقبالؒ اور عشق رسول ﷺ	سید رئیس احمد جعفری	غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور
بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں	محمد شریف بقا	البدر پبلیکیشنز اردو بازار لاہور
آیاتِ الٰہی کا نگہبان	محمد الیاس کھوکھر	مکتبہ فروغِ اقبال، اقبال ٹاؤن لاہور
علامہ اقبالؒ اور اتحاد بین المسلمین	سلطان جہاں	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
نقوش اقبالؒ	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	مجلس نشریات اسلام کراچی
زوال سے اقبالؒ تک	ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی	پنجاب یونیورسٹی لاہور
معارف فکر اقبالؒ	طالب حسین ہاشمی	بک کارنر جہلم
فقر اقبال، حیات اقبال میں	ڈاکٹر تحسین فراقی	بزم اقبال، لاہور

اقبال کی منزل 1927 تا 1946	خرم علی شفیق	اقبال اکادمی پاکستان
دمادم رواں ہے یم زندگی	خرم علی شفیق	اقبال اکادمی پاکستان
علامہ اقبالؒ بچوں اور نوجوانوں کے لیے	عنایت علی	بزم اقبال، لاہور
اقبال کا تصور ملت اور آزادی ہند	ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان	اقبال اکادمی پاکستان
اقبالؒ اور قرآن	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	اقبال اکادمی پاکستان
قرآن اور اقبالؒ	ابو محمد مصلح	اقبال اکادمی پاکستان
ملفوظاتِ اقبال	محمود نظامی	اقبال اکادمی پاکستان
رئیس قادیان	مولانا رفیق دلاوری	عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان
ثبوت حاضر ہیں جلد اول تا چہارم	محمد متین خالد	علم و عرفان پبلشرز لاہور
قادیانیت برطانوی سامراج کا خودکاشتہ پودا	محمد متین خالد	علم و عرفان پبلشرز لاہور
فتنہ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے	محمد متین خالد	علم و عرفان پبلشرز لاہور
شہیدان ناموس رسالت ﷺ	محمد متین خالد	علم و عرفان پبلشرز لاہور
قادیانیوں کو لاجواب کیجئے	محمد متین خالد	علم و عرفان پبلشرز لاہور
قادیانی تحریک کا سیاسی پس منظر	علامہ اختر فتح پوری	ادارہ اشاعۃ السنۃ النبویہ فیصل آباد
مقالات اقبال	سید عبدالواحد معینی	القمر انٹر پرائزز اردو بازار لاہور
اقبال سب کے لیے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	الوقار پبلیکیشنز اردو بازار لاہور
اقبالنامہ: مجموعہ مکاتیبِ اقبالؒ	شیخ عطاء اللہ ایم اے	اقبال اکادمی پاکستان
کلیاتِ مکاتیبِ اقبالؒ (جلد اول تا چہارم)	سید مظفر حسین برنی	بک کارنر پبلشرز جہلم
کلیاتِ اقبالؒ (اردو)	علامہ محمد اقبالؒ	بزمِ اقبال، لاہور
کشافِ کلیات اقبالؒ فارسی	مرتب: احمد رضا	ادارہ اہل قلم اقبال ٹاؤن لاہور
کلیاتِ اقبالؒ مع اشاریہ و کشف الابیات	مرتب: احمد رضا	ادارہ اہل قلم اقبال ٹاؤن لاہور
دبستان نعت، شمارہ نمبر 5 جنوری دسمبر 2020	ڈاکٹر سراج احمد قادری	نعت ریسرچ سنٹر انڈیا
سیارہ ڈائجسٹ (سالنامہ 2008ء)	حفیظ الرحمٰن احسن	دفتر ماہنامہ سیارہ گنپت روڈ لاہور
ماہنامہ مخزن لاہور (مئی 1902ء)	شیخ عبدالقادر بی اے	خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور

قادیانی کتب

روحانی خزائن جلد 1 تا 23	مرزا غلام احمد قادیانی	نظارت اشاعت ربوہ پاکستان
تذکرہ (مجموعہ وحی والہامات)	مرزا غلام احمد قادیانی	نظارت اشاعت ربوہ پاکستان
سیرت المہدی	مرزا بشیر احمد	نظارت اشاعت ربوہ پاکستان
اقبال اور احمدیت	شیخ عبد الماجد	
فکر اقبال اور تحریک احمدیہ	شیخ عبد الماجد	
مظلوم اقبال	اعجاز احمد	
روزنامہ الفضل کے مختلف شمارے		
اخبار الحکم قادیان کے مختلف شمارے		
ماہنامہ تشحیذ الاذہان کے مختلف شمارے		

QADYANIAT IN THE EYES OF LAW

فتنۂ قادیانیت کے خلاف

عدالتی فیصلے

محمد متین خالد

- وہ محکم فیصلے جن کا ہر لفظ قولِ فیصل، ہر سطر برہانِ قاطع اور ہر جملہ شاہد عدل ہے۔
- وہ تاریخ ساز فیصلے جنہوں نے ملت کی بے زمامِ ناقہ کو منزل تک پہنچانے میں رہبر کا کردار ادا کیا۔
- وہ شفاف فیصلے جو کذب کو صداقت کا آئینہ دکھاتے ہیں۔
- وہ عہد آفریں فیصلے جنہوں نے حق و باطل کے مابین خط امتیاز کھینچ کر رکھ دیا۔
- وہ واضح فیصلے جنہوں نے جعلی نبوت کے پیروکاروں کے چہروں پر پڑے تقدیس کے ہر نقاب کو اُلٹ دیا۔
- وہ آئینہ صفت فیصلے جس میں قادیانی گروہ کا سربراہ اور اس کے پیروکار اپنا اصل چہرہ دیکھ کر بلبلا اُٹھے۔

یہ عدالتی فیصلے

- قادیانیوں کی زہریلی سازشوں اور تخریبی کارروائیوں کی لرزہ خیز روداد ہیں۔
- قادیانیوں کی طرف سے شانِ رسالت ﷺ میں توہین، قرآن مجید اور کلمہ طیبہ میں تحریف، شعائر اسلامی کا تمسخر، آئین کا مذاق اور قانون کی خلاف ورزیوں کا وہ حقائق نامہ ہے جس نے ہر قادیانی کو رسوائے زمانہ گستاخِ رسول ''سلمان رشدی'' قرار دیا ہے۔
- ججوں، سیاستدانوں، آئین شناسوں، وکیلوں، صحافیوں، دانشوروں، علماء اور طالب علموں کے لیے ایک راہنما کتاب کا کام دیں گے۔

عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت حضوری باغ روڈ، ملتان۔ 061-4783486

مولانا ظفر علی خانؒ اور فتنۂ قادیانیت

تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر مولانا ظفر علی خانؒ کے معرکہ آرا مضامین، مقالات، توضیحات، اداریے، خطبات، مکاتیب اور شاعری کا دلکش مرقع

محمد متین خالد

عالمانہ شکوہ، ادیبانہ جلال و جمال اور صحافیانہ بے باکیوں پر مشتمل مربوط و مبسوط ایک ایسی دل آویز کتاب

- جس کے مضامین کا انتخاب انتہائی محنت شاقہ اور عرق ریزی سے اردو کے قدیم اور تاریخ ساز اخبار ’زمیندار‘ اور ’ستارہ صبح‘ کی فائلوں سے کیا گیا ہے۔
- جو فتنہ قادیانیت کے رد میں لکھے گئے تاریخ ساز مضامین اور ولولہ انگیز نظموں کا سدا بہار گلدستہ ہے۔
- جو استعماری آب وگل سے تیار ہونے والے فتنہ قادیانیت کا علمی، تحقیقی، استدلالی اور تجزیاتی محاکمہ ہے۔
- جو پرشکوہ ترکیبوں، نادر استعاروں، دلکش تشبیہوں، تیز دھار روزمروں، سنگلاخ زمینوں، اوق قافیوں، دلچسپ محاوروں، نایاب ضرب الامثال اور جدید الفاظ و اصطلاحات کا ایک پوشیدہ جہاں اپنے اوراق وصفحات کے دامن میں نگینوں کی طرح سمیٹے ہوئے ہے۔
- جس کے گراں بہا رشحات، فتنہ قادیانیت کے لیے روز حشر کا محاسبہ ہیں۔
- جو اپنے دامن میں روانی وسلاست اور فصاحت و بلاغت سے بھرپور نظم ونثر کا ایک جامع، بلند پایہ اور سحر انگیز ادبی سرمایہ لیے ہوئے ہے۔
- جو معجزانہ نشاۃ پر مبنی علم و تحقیق کا ایک بے مثال اور حیرت انگیز گنج گراں مایہ ہے۔
- جس کی بعض شعلہ فشاں تحریروں کے باعث مولانا ظفر علی خانؒ کو گوناں گوں مصائب وشدائد، جبر و استبداد اور زنجیر وتعزیر کے مراحل کا سامنا کرنا پڑا۔

نابغۂ عصر جناب محمد آصف بھلی، معروف سیرت نگار جناب پروفیسر تفاخر محمود گوندل اور نامور سکالر جناب عبدالروف کی علمی رفعتوں پر مبنی ایمان افروز تقاریظ کے ساتھ

پڑھیے! تحفظ ختم نبوت کے لیے آگے بڑھیے! شفاعت رسول ﷺ آپ کی منتظر ہے۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت حضوری باغ روڈ ملتان۔ 061-4783486

علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت

تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر علامہ محمد اقبالؒ کے معرکہ آرا مضامین، توضیحات، خطبات، مکاتیب اور شاعری کا مربوط و مبسوط مجموعہ

محمد متین خالد

مستند تاریخی حوالہ جات اور معتبر شواہد و دستاویزات پر مبنی ایک ایسی اثر انگیز کتاب جو

- علامہ محمد اقبالؒ کے عشق رسالت مآب ﷺ، غیرتِ اسلامی اور حمیت ملی کے آئینہ دار ایمان افروز واقعات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔
- علامہ محمد اقبالؒ کے افکار و نظریات کی روشنی میں قادیانیت کی فتنہ طرازیوں اور شرانگیزیوں کا مکمل محاکمہ، محاسبہ، تجزیہ اور تحلیل کرتی ہے۔
- علامہ محمد اقبالؒ کے مقالات، خطبات، توضیحات، شاعری اور مکاتیب کو جو قادیانیت کے خلاف قولِ فیصل اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں، اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔
- جو فتنہ قادیانیت کے رد میں لکھے گئے شہرہ آفاق دانشوروں کی چشم کشا، فکر انگیز، تحقیقی اور تاریخی تحریروں کا گلدستہ ادراک ہے۔
- حضرت علامہ اقبالؒ کے بارے میں قادیانیوں کے پھیلائے ہوئے بے بنیاد شکوک و شبہات، تلبیسات، دسیسہ کاریوں اور کذب و افترا کے دندان شکن جوابات اور ناقابل تردید دلائل و براہین کا گنج گراں مایہ ہے۔
- جو کارکنان تحفظ ختم نبوت کے لیے مشعل راہ اور مینارہ نور سے کم افادہ رساں نہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ سے دلی محبت اور ذہنی ارادت رکھنے والوں کے لیے ایک متاع گراں بہا اور شاہکار تحفہ

ماہر اقبالیات جناب محمد سہیل عمر اور نامور کالم نگار جناب حافظ شفیق الرحمٰن کی زریں حروف سے مرقوم اور دانش و بینش کے موتیوں سے مزین تقاریظ کے ساتھ

پڑھیے! تحفظ ختم نبوت کے لیے آگے بڑھیے! شفاعت رسول ﷺ آپ کی منتظر ہے۔

ILM-O-IRFAN PUBLISHERS

Al-Hamd Market 40-Urdu Bazar Lahore.
37223584 '37232336 '37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers1@gmail.com
www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

95-Y Block Commercial, Basement Phase-3 DHA Lahore
0333-4067757 | 0333-4359445
7thskybooks@gmail.com
7thskybooks